سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

* * *

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

شمارے کا مصور

موجودہ شمارے کے مصور جی این قاضی کا شمار پاکستان کے نامور مصوروں میں ہوتا ہے، انھوں نے کراچی اسکول آف آرٹ سے گریجویشن کرنے کے بعد اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مصوری میں کو اپنایا۔ ان کے موضوعات میں تاریخی عمارتیں، غیر متحرک زندگی اور بازار انتہائی نمایاں ہیں۔ بظاہر ان موضوعات میں یکسانیت نظر نہیں آتی اور تمام موضوعات ایک دوسرے سے قدرِ مختلف نظر آتے ہیں لیکن ان کے فن پاروں میں رنگوں کی یکسانیت دیکھنے والوں پر ایک جیسا تاثر چھوڑتی ہے۔ ان کی تصاویر میں خاکی اور نیلا رنگ حاوی نظر آتا ہیں جو انھیں جاذبِ نظر بناتے ہیں۔

جی این قاضی کے فن پاروں کی نمائشیں نہ صرف پاکستان، بل کہ دنیا کے کئی دوسرے ممالک میں بھی ہو چکی ہیں اور اب وہ پاکستان کے ساتھ ساتھ بیرون ملک بھی اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔

(ثمینہ وصی)

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ نمبر 110، اکتوبر تا دسمبر 2016

نگران : پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
مدیر منتظم : ڈاکٹر راشد حمید

مدیر : اختر رضا سلیمی

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ ۔ ایٹ/ون، اسلام آباد

مجلسِ مشاورتِ متن

ڈاکٹر توصیف تبسم
ڈاکٹر اقبال آفاقی
محمد حمید شاہد
ڈاکٹر وحید احمد

ضروری گزارشات

- ☆ مجلے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے نگارشات کے ساتھ اپنا پورا نام اور پتہ بھی تحریر کریں۔
- ☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھیجی جا سکتی ہیں:

قیمت موجودہ شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک)　　40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک)　160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت:	علی یاسر	051-9269712
سرکولیشن:	میر نواز سولنگی	051-9269708

مطبع: NUST پریس، سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر
اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
رابطہ: 051-9269714
Email: ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو　پیش نامہ　9

مری کعتِ سخن کو حرف کے لعل و گوہر دے دے (عقیدت)

خورشید بیگ میلسوی　نگاہِ کم نظر کو وسعتِ حسنِ نظر دے دے　11

❖❖

حسین سحر　جن کے رستے میں ہے دربِ جبریل　12
جان کاشمیری　دل خاص، نظر خاص، زباں خاص، ادا خاص　13

❖❖

نورین طلعت عروبہ　کتنی بلند و پاک ہے برتر ہے کربلا　14

اپنے ہی خون سے لکھنی تھی حکایت مجھ کو (فکشن)

زیب اذکار حسین　بندوبست　15
زاہد حسن　دردمندوں کا دیس　29
محمد عاصم بٹ　مٹھو ایلین (عرف ٹیڈی بکری، عرف خام خلائی)　39
زلیف سید　انخلا　50

❖❖

آغا سلیم / رنگر چنا　روشنی کی تلاش　سندھی سے ترجمہ　59
اوسنگ۔ون / اطہر قیوم　بے وفائی　کورین سے ترجمہ　90
طاہر بن جلّون / نجم الدین احمد　آگ　انگریزی سے ترجمہ　107
پروفیسر جمال ملک / بشریٰ اقبال ملک　مدرسے کا خواب　جرمن سے ترجمہ　126

❖❖

محمود احمد قاضی　بُکّل دے وچ چور　153
شعیب خالق　کچھ او جھل سا　156

ایوب اختر ابہام 161
بلال احمد من دیگرم نیست ---- 169
نجم الدین احمد حادثے سے سانحے تک 173
عامر رضا زحل مشتری کے اثر میں 179
تیمور اختر عالمِ برزخ 186

مجھ کو کچھ یوں بھی خوش آیا ہے غزل کا پیکر (غزلیں)

انور شعور ہاتھ گو ہم کشادہ رکھتے ہیں 189
قیوم طاہر کچھ رنگ الگ اُس کے ہیں، کپڑا ہے الگ سا 190
محمد آصف مرزا عُقدۂ مشکل و آساں سے نکل آیا ہوں 191
شوکت کاظمی تجھ سے کوئی بھی گلہ ہے نہ شکایت مجھ کو 192
سید ضیا عالدین نعیم خبطِ عظمت میں گرفتار نہیں بھی ہوتے 193
نسیم عباسی اب مری چاہت بھی چائے کی پیالی ہو گئی 194
علی احمد قمر آباد ہو گئے ہیں اندھیرے مکان میں 195
انجم خلیق یہ پرندِ عشق کیسے ترے دام تک نہ آئے 196
احمد حسین مجاہد بُت سمجھنے لگے سبھی مجھ کو 197
نثار ترابی کڑے عذاب کی زد پر تھا منزلوں کا سفر 198
افضل گوہر خواب سے کیسے نکلنے کی تگ و تاز کروں 199
رحمان حفیظ چراغ آنکھ کی سب بولیاں سمجھتے ہیں 200
رانا سعید دوشی عقل! سمجھ لے ختم ہوا ہے دور تری سرداری کا 201
سعید خان جی کو جنوں لگے تو ہوس چھوڑیے جناب 202
شمشیر حیدر کوئی خواب بنوں گا کوئی منزل ہو جاؤں گا میں 203
سجاد بلوچ خواب ہوئے وہ میخانے اور خواب دکھانے والے لوگ 204
میثم نقوی وہ آگ دیکھی کہ جس کا کوئی دھواں بھی نہیں 205
اظہر فراغ لوگ اپنا کیا بھگت رہے ہیں 206

نظموں کی ابھی شال کا ریشم نہیں کاتا (نظمیں)

ناصر زیدی مصلحت 207
نصیر احمد ناصر روح کے پاؤں نہیں ہوتے 208
علی محمد فرشی آدی سا دی 209

حسن منظر لاوارث سامان 210
اشفاق سلیم مرزا موت کا کھیل 214
عزیز اعجاز دسمبر آ گیا ہے 217
آصف ہمایوں دریا 219
اخلاق عاطف پھول میں کتاب 220
ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ وطن کے لیے 221
قاسم یعقوب رات اور رنگوں کی روشنی 222
امجد بابر رات 224
مہناز انجم دسمبر گزر جائے گا 225
عالیہ مرزا میری گواہی دینا 226

کسی پابندیِ عنواں سے نکل آیا ہوں (رپورتاژ، مزاح)

محمد حمید شاہد چین کے سدابہار شرگس ونگ میں 227

◆◆

خالد صدیقی تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے 243

روشنی کی سطر کوئی لکھ رہا تھا سانس پر (خصوصی گوشہ: نسلِ نو)

غزلیں

قندیل بدر شکستہ ہے مگر ڈوبا نہیں ہے 247
قندیل بدر شکستہ ہو گئی میں بھی انا بھی 248
حماد نیازی یہ کس جنوں کا شرار لہو میں ڈھل آیا 249
حماد نیازی اس صحیفہ رو کی پیشانی کو جب چوما گیا 250
سید عقیل شاہ ترا کرم کہ میں جب مات تک پہنچ جاتا 251
سید عقیل شاہ ستم کے راج میں، میں پا شکستہ کیا کرتا 252
فیضان ہاشمی کوئی خزانہ چھپا ہے کہ آئینہ ہے مرا 253
فیضان ہاشمی سامنے ہوتے تھے پہلے جس قدر ہوتے تھے ہم 254
نصر اللہ حارث آوازوں کو قید نہ کرتے، باتیں کرتے 255
نصر اللہ حارث میں وہ نہیں ہوں کہ دل سا وبال دوں تجھ کو 256
تہذیب حافی یہ شاعری یہ مرے سینے میں دبی ہوئی آگ 257
تہذیب حافی پرائی آگ پہ روٹی نہیں بناؤں گا 258

روبینہ شاد نارسائی کی اذیت سے بہت ڈرتی ہوں 259
سید سلمان ثروت آنکھ ہے اک کٹورا پانی کا 260
سید سلمان ثروت کئی سلسلوں سے جڑا ہوا یہ جو زندگی کا سفر رہا 261
محمد عتیق احمد میں اپنی خاک کو جب آئینہ بناتا ہوں 262
ثمامہ اُفق کسی بے تاب ساعت کی لپک ہے 263
ثمامہ اُفق نئے منظر بنانے پر تلے ہیں 264
عالم عجیب تمام شہر ہی کرتا ہے احترام مرا 265
عالم عجیب اجازت ہو تو میں آغاز کر لوں 266
سعید شارق اُداسی بھی تو کم ہوتی تھی جب سامان کم تھا 267
سعید شارق گھٹا بھی دھیرے دھیرے اپنے پَر پھیلا رہی ہے 268
وسیم تاشف قُدرت نے جو بھی بَخت ہمارے بنائے تھے 269
وسیم تاشف آدھے اُس کے، آدھے میرے ہوتے ہیں 270
نادر عریض شعر کہنے میں خسارہ ہے مری نظروں میں 271
نادر عریض بولے تو اچھا، برا محسوس ہو 272
احسان اصغر اور اب تو دوست یہ کہنا بڑا مناسب ہے 273
احسان اصغر نئے دنوں میں محبت پرانی ہو جائے 274
اسامہ امیر کتنے اسرار واہمے میں ہیں 275
اسامہ امیر اندر باہر ایک سا موسم ایک سی وحشت طاری ہے 276

نظمیں

ذاکر رحمان کوئی گھڑی ٹھہر بھی جائے خواب میں 277
ذاکر رحمان نظموں سے خالی نظم کے لیے ایک نظم 278
ذیشان حیدر نقوی قبراں اُتے پھُل 280
فریحہ نقوی ایک سو بیس صدیاں 281
فریحہ نقوی تمہارے لیے خط 282
عبادت حسین عرضِ حال 284

افسانے

محمد عباس صدمہ 285
عثمان عالم ہرج 300

آدم شیر عالمِ تمثال 303
طیب عزیز ناسک ادھورا آدمی 307
ابنِ مسافر نیا دل 310
شاہنواز ادھوری داستاں 314

ہم اُن کہی کو بھی درمیاں سمجھتے ہیں (بین الاقوامی ادب)

چنوا الیش بے/محمود احمد قاضی فوق مافوق 317
میکسم بادانووک/ضیاء الدین نعیم یہ جی میں ہے 322
گبرئیل گارشیا مارکیز/محمد اسلم وہ خواب دیکھتی تھی 323
انا لوکا لوینو/خالد فرہاد دھاریوال اکیلا ایمان دار 328
کیٹ چوپن/عنبرین صلاح الدین ایک گھنٹے کی کہانی 330

چراغ آنکھ کی سب بولیاں سمجھتے ہیں (پاکستانی زبانوں کا ادب)

براہوی

نیلم موہل/نیلم موہل لوکل بس 333

بلوچی

منیر احمد بادینی/شرف شاد دہشت 337
عندلیب گچکی/محسن بالاچ عورت 346
غنی پہوال/غنی پہوال الوداع 347

پشتو

خوشحال خان خٹک/سلطان فریدی نعمتِ دنیا یہاں ہر رنگ ہے 349
اقبال حسین افکار/ثمینہ قادر تمنا 350
طاہر آفریدی/زینت سلطانہ خوف 351
سید ولی خیال/سعید ساعی تلاش اپنی کی، تو جہاں پا سکو گے 354

پنجابی

مشتاق عاجز/خالد مصطفیٰ لالچ کے الاؤ روشن ہیں ہم جن میں جلتے رہتے ہیں 355
زاہد حسن/زاہد حسن منصوبے کے تحت لکھی، کہانی 356
پروین ملک/سجاد بلوچ مجھے کیا خبر کہ میں کون ہوں 362
اعظم ملک/اعظم ملک گھاؤ 365

چھاچھی

منظور عارف/علی یاسر	گیت	366

سرائیکی

خواجہ غلام فرید/سید تابش الوری	سانوریا!	367
غلام حسن حیدرانی/سلیم شہزاد	باپ یا بھائی	368

سندھی

رمضان نول/محمد مشتاق آثم	طوفان	374
رمضان نول/محمد مشتاق آثم	چراغ	375
ادل سومرو، ڈاکٹر/حبدار سولنگی	ہاں تم بہت بااختیار رہو	376
مصطفیٰ ارباب/حبدار سولنگی	اُس کو دیکھنے کے لیے	378
منور سراج/حبدار سولنگی	پانچواں طرف	379

کشمیری

غلام حسن بٹ/غلام حسن بٹ	گاؤں کا استاد	387
غلام حسن بٹ/غلام حسن بٹ	لالچی طبیب	390

ہندکو

بشریٰ فرخ/خالد مصطفیٰ	کیا ملا ضبط آزمانے سے	393
مشتاق عاجز/خالد مصطفیٰ	منت مانگی، منت کر کر ہار گئی	394
ملک ناصر داؤد/سید ماجد شاہ	قینچی	395
عبدالوحید بسمل/مفیدہ ماجد	ساز	398

☆☆☆☆

اداریہ

عالمی سطح پر اس وقت فکشن خاص کر ناول اور ناولٹ مقبول ترین صنف ہے لیکن ہمارے ہاں ناول اور ناولٹ ابھی تک وہ مقبولیت حاصل نہیں کر پائے جو دیگر اصناف کا خاصہ ہیں۔ حالاں کہ پاکستانی زبانوں خاص کر اردو میں لکھے جانے والے ناول اور ناولٹ دنیا کی کسی بھی زبان کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ ناول کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہم نے موجودہ شمارے میں ناول کے لیے الگ سے ایک گوشہ مختص کیا ہے جس کے تحت چار معاصر ناول نگاروں کے زیر تخلیق ناولوں کا ایک ایک باب شامل کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں چار مکمل ناولٹ بھی اس گوشے کا حصہ ہیں۔ جن میں سے ایک پاکستانی زبان سندھی سے جب کہ تین بین الاقوامی زبانوں سے ترجمہ کردہ ہیں۔

ادبیات کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ادب کا مستقبل نئے لکھنے والوں ہی سے وابستہ ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کچھ عرصہ قبل مختلف اصناف کے حوالے سے خصوصی ورکشاپوں کا بھی اہتمام کیا۔ جس میں متعلقہ اصناف کے اہم لکھنے والوں نے خصوصی لیکچر دیے۔ علاوہ ازیں ہم نے **نئے لکھنے والوں کے لیے رہنما کتابیں** کے عنوان سے ایک نئی سیریز بھی شروع کر رکھی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب: **ٹی وی ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے**، کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے باقی کتابیں بھی بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوں گی۔

اس شمارے میں نئے لکھنے والوں کے لیے ایک الگ گوشہ بھی مختص کیا گیا ہے۔ جس میں نئی نسل کے ممتاز لکھنے والوں کی شعری ونثری تخلیقات شامل ہیں۔ اس گوشے میں شامل نگارشات ہمیں یہ امید دلاتی ہیں کہ پاکستانی ادب کا مستقبل بھی اتنا ہی تابناک اور درخشاں ہے، جتنا کہ ماضی اور حال۔

حسب روایت موجودہ شمارے میں بھی جہاں حمد، نعت، سلام، غزلیں، افسانے، دیگر اردو اصناف شامل ہیں: وہاں دیگر پاکستانی زبانوں: براہوی، بلوچی، پشتو، پوٹھوہاری، پنجابی، چھاچھی، سرائیکی، سندھی، کشمیری اور ہندکو کے ممتاز لکھنے والوں کی نگارشات کے تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں بین الاقوامی زبانوں سے تراجم بھی اس شمارے کا حصہ ہیں۔

امید ہے حسب سابق آپ کو یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی رائے انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

خورشید بیگ میلسوی

نگاہِ کم نظر کو وسعتِ حسنِ نظر دے دے
مری شب ہائے تیرہ کو تب و تابِ سحر دے دے

حروفِ نارسائی کو مٹا دے لوحِ قسمت سے
دعائے نیم شب کو یا الٰہی بال و پر دے دے

کھڑا ہوں کاسۂ امید لے کر دونوں ہاتھوں میں
مری کشتِ سخن کو حرف کے لعل و گہر دے دے

ترا در چھوڑ کر اب کس کے آگے ہاتھ پھیلائیں
جو بے گھر ہو گئے ہیں میرے مولا ان کو گھر دے دے

ترے بندوں کی خدمت جس کا نصب العین ہو یا رب
مری ارضِ وطن کو کوئی ایسا راہ بر دے دے

خزاں موسم نے اس کے خال و خد یکسر جھلس ڈالے
مرے اس گلشنِ ویران کو گل ہائے تر دے دے

سکونِ قلب کی دولت تری مرہونِ منت ہے
دلِ خورشید کو بھی راحتِ قلب و نظر دے دے

☆☆☆☆

حسین سحر

جن کے رستے میں ہے درِ جبریل
اُن کے آگے ہے خم سرِ جبریل

شبِ معراج تھا وہ ہمراہی
اور تھے آپؐ رہبرِ جبریل

دفعتاً رک گیا ہے رستے میں
جل نہ جائے کہیں پرِ جبریل

جو ہیں محبوب رب دو عالم
ہیں وہی جان و دلبرِ جبریل

دیکھ کر ان کے قدِ رعنا کو
رشک کرتا ہے پیکرِ جبریل

وحیِ معبود کی ہے جو مرکز
ہے وہی ذات محورِ جبریل

نعت ان کی سحؔر اگر لکھیں
چاہیے ہم کو شہپرِ جبریل

☆☆☆☆

جان کاشمیری

دل خاص ، نظر خاص ، زباں خاص ، ادا خاص
خاصوں کا یہ خاصا ہے وہ کرتے ہیں عطا خاص

دونوں میں رچی اصل میں خوشبوئے نبیؐ ہے
مکے کی فضا خاص مدینے کی فضا خاص

اے ربِ جہاں! اتنا بتا ارض و سما میں
کیا شے ہے، ترے پاس محمدؐ کے سوا خاص

جو پھول وہاں کھلتے ہیں مرجھاتے نہیں ہیں
چلتی ہے مدینے کے گلستان میں ہوا خاص

لفظوں سے لپٹ جاتی ہیں رحمت کی گھٹائیں
کرتے ہیں مِرے حق میں ہمیشہ وہ دعا خاص

کردارِ محمدؐ ہے کرشمہ ہی کرشمہ
تا عمر رہا جو اک بار ہُوا خاص

سائل کو دیا ، پیشِ نظر ظرف کو رکھ کر
دیکھا نہیں انسان کوئی عام ہے یا خاص

طیبہ پہ مِرے رب کی خصوصی ہے عنایت
اس کوچۂ رحمت میں ملا، جو بھی ملا خاص

اے جاؔن ثنا خوانیِ احمدؐ کا صلہ ہے
ملتی ہے جو محفل میں ثنا خواں کو جگہ خاص

☆☆☆☆

نورین طلعت عروبہ

کتنی بلند و پاک ہے برتر ہے کربلا
ہاں چرخِ پیر تیرے برابر ہے کربلا

خوشبو سمیٹتے ہیں بہاروں کے قافلے
شبیر کے لہو سے معطّر ہے کربلا

اک آنکھ سے رواں ہے جسے دیکھتے ہیں سب
اور ایک میری روح کے اندر ہے کربلا

آلِ نبیؐ کا خون چمکتا ہے اس طرح
بس ایک سرخ رنگ کا منظر ہے کربلا

بختِ یزیدیت پہ ہے کالک لگی ہوئی
تاریخ کے جہاں میں منوّر ہے کربلا

نورِ نگاہِ حیدرِ کرارؓ کے طفیل
روشن ہے جس سے عرش وہ اختر ہے کربلا

☆☆☆☆

زیب اذکار حسین

بندوبست

افسروں کا تبادلہ شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ میں نے سوچا اسی بہانے ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے میری پیش گوئی کے مطابق پرانے باس کو آج قدرے افسردہ نظر آنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے اسے یہاں سے رخصت ہونے کا کچھ ملال نہیں ہے، مسلسل قہقہے لگا رہا ہے، وہ اصحاب کہاں رہ گئے؟ چند ہم میں تو پیش پیش تھے، کیا یہ تقریب کا تعارفی حصہ ہے؟ چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں، کون ہدف تنقید بن رہا ہے؟ بارے خدایا آواز بلند تعارف کراؤ، ہمیں بھی تو معلوم ہو، کس کے بارے میں کیا تبصرہ ہو رہا ہے؟ ؟ نئے افسر کے کان میں کیا کہہ رہے ہو؟ آداب محفل کا خیال نہیں ہے، کھسیانا بن کر بغرض ملاقات آیا ہوں، اسی عالم میں واپس جاؤں گا، کن انکھیوں سے مری جانب دیکھ رہے ہو؟ چبا چبا کر شیرینی کھاؤ، زیادہ باتیں کرو گے تو گڑبڑ ہو جائے گی، یہ یقین سے کیا کہا جا سکتا ہے؟ آپ اس قدر رشتہ گفتگو بھی کر سکتے ہیں؟ یہ تو آج معلوم ہوا......خوب!! نپے تلے الفاظ استعمال کر رہے ہو، نئے باس کو کب سے جانتے ہو؟ ’’خوش مزاج‘‘ اور ’’ہمدرد‘‘ انسان کے طور پر تعارف کرانا بے معنی نہیں ہے، سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک قرار دے رہے ہو؟ مالک سے آپ کی مراد؟ یہ افسروں کا تبادلہ ہے یا معنی خیز اشاروں کا تبادلہ ہے؟ نئے باس کا گرم جوشی سے ہاتھ دبانا مجھے خوفزدہ کر رہا ہے۔ گمان گزرتا ہے، کسی نے کان بھرے ہیں، ہمدردانہ انداز کیوں اپنا رہے ہو؟ بس ہاتھ روک لو، بہت کھا چکے ہو!! اب اگر کچھ کھاؤ گے تو بلی کا بال کھاؤ گے۔

اتفاقاً دیکھ رہا ہوں، میزوں کے نیچے بھاگتی پھر رہی ہے آنکھ بچا کر آ جائے گی۔ پرانے باس کو خدا حافظ کہتا ہوں، پچھلی باتیں دوہرانے سے کیا حاصل؟ آپ نے جاتے جاتے بھی کاری زخم لگایا ہے، مدتوں یاد رکھوں گا۔

نئے باس کا پہلا جملہ سن لیا ہے میں نے ’یس آئی ول سٹڈی ہز کیس۔‘‘ (Yes I Will Study His Case)۔

میں پوچھتا ہوں کس کیس کا مطالعہ کرے گا وہ؟ اور کیس کی نوعیت کیا ہے؟ آواز بیٹھی جا رہی ہے۔

الائچی کا استعمال کرو افاقہ ہو جائے گا۔

دمے کا مرض تو ہے نہیں تمھیں اور اگر کھسر پھسر تمھاری عادت بن چکی ہے تو پھر کچھ نہیں کہا جا سکتا!!

شرکائے محفل کا شکریہ ادا کر رہے ہو!!

تمام کا؟؟ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا چاہتے ہو؟؟

خصوصی طور پر کس سے مخاطب ہو؟

میرا نام تو نہیں لیا؟

لینا بھی مت!! کیا ہوا؟؟ اچھا آپ ہر شخص کو کارکردگی سے مطمئن کر رہے ہیں۔ آپ کو تمام افراد کا تعاون حاصل رہا ہے، کسی سے شکایت نہیں رہی ......تو پھر کھل کر تقریب کے خاتمے کا اعلان کیوں نہیں کرتے، لوگ پریشان ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کرو، دیکھو!! کس قدر بے زاری ٹپک رہی ہے ......ٹپ ٹپ ٹولیوں کی شکل میں ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں۔ بار بار ایک دوسرے کو یاد دلاتے ہیں۔

’’کل صبح جلدی آنا ہے۔‘‘ دیکھو ایک آدمی میری جانب ......کون ہو تم؟؟

میرے پاس کیوں آئے ہو؟؟ ادھر ہی رہو!!

شاید یہ شخص کسی ٹولی سے بچھڑ گیا ہے، راستہ پوچھ رہا ہے؟

برادرم!! جھوٹ کیوں بولوں، میں راستہ بتانے کے قابل نہیں ہوں، خود ہی سوچو!! اپاہج آدمی کسی کو کیا راستہ بتائے گا۔ اپنا وجود ہی برقرار رکھ لے تو بہت ہے۔ ہاں ایک حادثے میں ہاتھ پاؤں مارے گئے۔ اسی لیے کہتے ہیں زیادہ ہاتھ پاؤں کا نکالنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ بظاہر میں ٹھیک ٹھاک نظر آتا ہوں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں، دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ گرتا پڑتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ دراصل میرے سائز (Size) کی بیساکھی مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہے، ٹھگنے قد کا آدمی ہوں نا!! یقین کرو گے، میں آج یہاں آنا نہیں چاہتا تھا، ان لوگوں نے مجھے خبر ہی نہیں ہونے دی، کب تبادلہ موثر ہوا ہے؟ یہ تو مجھے قبل از وقت معلوم ہو گیا تھا کہ ’’تبادلہ‘‘ ہونے والا ہے مگر انھوں نے یہ خبر چھپانے میں بہتری سمجھی، ہوگی کوئی مصلحت، حالاں کہ یہ فرض کرنا درست نہیں ہے کہ میں کسی کا تبادلہ رکوانے کے حق میں ہوں، یہ لوگ تو اس دن بھی خاموش تھے، میں نے خود ہی آواز دی، کیا بات ہے؟ کس کا تبادلہ ہو رہا ہے اور آپ لوگوں پر چندہ جمع کرنے کی دھن کیوں سوار ہو گئی ہے۔ پہلے پہل تو میں ڈر ہی گیا تھا خدانخواستہ کوئی فوت ہونے والا ہے، پیشگی اقدامات کے ضمن میں پریشانی کا سامنا ہے یا کفن دفن کا مسئلہ درپیش ہے؟ دراصل میں اپنا دماغی نظام محفوظ رکھنا چاہتا ہوں، ساری تگ و دو اسی واسطے ہے۔ بعد میں خیال آیا میری خوراک کا وقت گزر رہا ہے۔

دوا دوار کے سلسلے میں انتہائی ’’سخت‘‘ ہوں۔ بے وقت کی دوا، ری ایکشن (Reaction) بھی کر سکتی ہے۔

گولیاں اور کیپسول جیب میں رکھ لایا ہوں تم معقول آدمی دکھائی دیتے ہو، میری مدد کر سکتے ہو؟ دور کہیں ایک مکان نظر آ رہا ہے، امید ہے وہاں پانی بھی ہوگا اور گیس کا چولہا بھی۔

ذرا سی زحمت ایک آدمی کی جان بچا سکتی ہے۔

ابلا ہوا پانی لا سکتے ہو، گھبراؤ مت،

دوا لیتے ہی سکون آ جائے گا!! دودھ کے دانت گر رہے ہیں، عقل داڑھ کے آنے میں ایک لحہ درکار ہے، ابھی خوش آ جائے گا کیا پوچھ رہے ہو؟ کس کمپنی کا واٹر کولر پائیداری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا؟

اب میں تمھیں کیا جواب دوں، تم نے مجھے گڑبڑا دیا ہے۔ پہلے تو ایمان داری سے یہ بتاؤ، مجھ سے مشورہ کرنے پر کس نے اکسایا ہے تمھیں؟ پاگل تو نہیں ہے؟ اصولاً تم اتنے عقلمند نہیں لگتے اور نہ ہی اس قدر باہمت دکھائی دیتے ہو کہ مجھ سے اوٹ پٹانگ موضوعات پر بحث کر سکو، یہاں موجود لوگوں کو دیکھ رہے ہو، پکارنے کی دیر ہے، تکا بوٹی کر دیں گے، ایک ہوٹل بند کر دیا گیا ہے، جانتے ہو، دھوکے سے انسانوں کو انسانی گوشت پیش کیا جاتا تھا، ظالم آدمی ....

بات دراصل یہ ہے کہ...... اصل میں بات یہ ہے کہ...... درحقیقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں کسی کی محرومی بانٹنا نہیں چاہتا، آپ سمجھ تو گئے ہوں گے؟

مزید کچھ کہوں؟

میں کسی کے ''کمپلکس'' کی وجہ سے اپنی شخصیت کی بربادی نہیں چاہتا۔

اس بات کو موضوع بحث مت بناؤ کہ میں کسی جلسہ گاہ کا ذکر کر رہا ہوں یا کسی مخصوص محفل کے تعلق سے بات کر رہا ہوں یا بات کر رہا ہوں کسی تفریحی مقام کی؟

میں بات کر رہا ہوں جہنم کی؟ اب تو ٹھیک ہے؟

ہم سب جہنم کے ایک حصے میں بیٹھے تھے، بیٹھے تھے، بیٹھے تھے اور محو گفتگو تھے، ہم کہہ رہے تھے کہ ہمیں بتاؤ سمجھاؤ کہ ہم کون ہیں؟

ہمارا دل ہماری ہائے دیکھو!!
یہ کیا رجحان ہے، کیا رائے دیکھو!!
مذاقاً ہی کہی جاتی ہیں باتیں!!
ہنسی آتی ہے تم کو ہائے دیکھو!!
یہ کیا حربہ ہے، کیا حربہ گری ہے؟
ذرا یہ رسی دیکھو، گائے دیکھو!!
یہ کیا آتا ہے سر میں درد بن کر؟
پڑی ہے کیتلی میں چائے دیکھو!!
سمجھنا اس قدر مشکل نہیں ہے
سمجھ ہی جاؤ گے، سمجھائے دیکھو!!

ہمیں سمجھانا مشکل تو نہیں ہے!!
سمجھ جائیں گے تم سمجھائے دیکھو

نئے باس کی قلبی کیفیات کا اندازہ نہیں ہو پاتا، جس قدر سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اس قدر الجھ جاتا ہوں۔

کس مرض میں مبتلا ہے؟ بتاتا بھی تو نہیں، گم صم سا رہتا ہے، یا پھر کھویا کھویا سا رہتا ہے، یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا، کوئی غم اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ ثبوت کے طور پر وہ تمام فائلیں پیش کی جا سکتی ہیں جن کی جلدیں بگڑ چکی ہیں۔ ہر فائل کور (File Cover) آپ کو ناگفتہ بہ حالت میں ملے گا۔

بائیں طرف دیکھیے !!

کتنی ہی اہم فائل کیوں نہ ہو، پنسل سے لکیریں کھینچنے لگتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بری بات نہیں ہے، ہو سکے تو حساب کتاب کا رجسٹر بھی بگاڑ دو!! مگر آنکھیں کھلی رکھو، پنسل کی نوک پلک درست کرتے رہو، مدہم لکیریں اچھی نہیں لگتیں، پنسل تراش اپنے قریب رکھو۔ گم نہ ہونے پائے۔ میز سے گرا اور خاکروب کے قبضے میں آیا، علم سے محروم آدمی صفائی ستھرائی میں منہمک رہتا ہے۔ بے دھیانی میں باہر ہی نہ پھینک دے، روز روز کیا منگواؤ گے، میں تو جاؤں گا نہیں، خرید و فروخت کا دھندا ترک کر دیا ہے، ایک تو اس کام میں فائدہ نہیں تھا اور دوسرے صحت اجازت نہیں دیتی تھی۔ تھکاوٹ ہی رہنے لگی تھی، ویسے بھی عمر کے اس دوراہے پر ہوں کہ بھاگ دوڑ کا کام کر لوں یا بیٹھ جاؤں۔

نئے افسر سے میرے تعلقات کی نوعیت بھی مختلف ہوگی۔ زندگی کا نیا باب شروع ہو رہا ہے۔ آزادانہ، رضا کارانہ اور باہمی رضامندی کے ماحول میں کام کروں گا، مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنے سٹاف کو وسعت دینا چاہتے ہیں اور اس ضمن میں خواتین کو بھی 'بھرتی' کے مواقع فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اس پر ہرگز اعتراض نہیں ہے البتہ جن افراد سے آپ اس نوعیت کے حساس معاملات ڈسکس (Discuss) کرتے رہتے ہیں ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں، میں بہت قریب سے جانتا ہوں، بعض لاوارث اور یتیم لڑکیوں کے بارے میں یہ لوگ اکثر گفتگو کرتے رہے ہیں، مجھے یقین ہے ان لڑکیوں کو اپنی پناہ گاہوں سے محروم کرنا، ان افراد کا نصب العین ہے۔ سابق افسر کو بھی گمراہ کرنے کی کوششیں اس کی ''رخصتی'' تک جاری رہیں، وہ شخص فراخدلی سے ہر ایک کی سنتا رہا اور اپنی سی کرتا رہا۔ اب آپ سے سابقہ پڑا ہے تو یاد ہی کریں گے۔ پرانا باس جاتے جاتے خدا جانے آپ کو کیا گھول کر پلا گیا ہے۔ پیاس ہی نہیں لگتی، اس کے بقول آپ ''خوش مزاج'' اور ''ہمدرد'' انسان ہیں جب کہ برعکس قول میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ انسان ہی نہیں، انسان دشمن بھی ہیں، ہر وقت ''آدم بو، آدم بو'' کرتے رہتے ہیں، میں نے آپ کو خواب میں قائم مقام سربراہ مملکت بنتے ہوئے دیکھا ہے، بلا شبہ تمکنت اور وقار کے ساتھ، بظاہر مقدس کلام کا ورد کرتے ہوئے بھی، مگر یہ دھوکہ ہے، کسی فریب میں مت آیئے، محافظ دستہ نالاں نظر آتا ہے ''سلامی'' کا چبوترہ خالی کر دیجیے، ایک ایک

ملازم کے بارے میں بتاؤں گا بشرطیکہ آپ ان کے خلاف کارروائی عمل میں لائیں۔ جس کا نام لیا جائے اسے معطل کر دیا جائے بصورت دیگر خمیازہ بھگتنا ہوگا، اس روز دعوت میں "مطالعہ" کا ذکر کیا گیا تھا؟ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پہ سچ بولنا ادھار رہا۔ اتنا تو بتادو، کس قسم کا مطالعہ درکار ہے؟ میرے "مطالعہ" پر شک ہے؟ درجہ بدرجہ مکمل کیا ہے۔ کہو تو اسناد پیش کروں؟

پرسنل فائل میں بھی ہر ایک سند کی تصدیق شدہ فوٹو کاپی موجود ہے، آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں، گھنٹی بجائیے، ابھی منگوا لیتے ہیں، میں خود لانے سے تو رہا۔ اگر آپ دفتری کاغذات وغیرہ بذات خود اٹھاتے ہیں تو کیا ہوا؟ داد و تحسین بھی وصول کرتے ہیں۔ مفت کی مشقت کہاں ہے؟ ایک بار کی نمائش ہمیشہ کے لیے رنگ لائے گی، جملہ عملہ ممکنہ مشقت اٹھاتے ہوئے فخر محسوس کرے گا اور آپ کو نیک الفاظ میں یاد کرے گا، اس پر بھی تسلی نہ ہو تو ...... کچھ دوسرا علاج کروں؟ اپنے مطالبات سامنے لاؤ، زبانی نہ سہی لکھ کر ہی دے دو!!

طبیب کو حقیقت کا علم نہیں ہوگا تو تشخیص کیوں کر ممکن ہوگی اور مریض شفایاب کیسے ہوگا، علامات کی مدد سے ہی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں، کوئی بھی ذمہ دار شخص یہ بات یقینی طور پر کہنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ فلاں انسان سرطانی کیفیت میں مبتلا ہے یا فلاں آدمی "ہمدردی" کا مریض ہے، حد تو یہ ہے کہ امراض کے نام بھی بہ اعتبار سہولت رکھے جاتے ہیں۔ پیدائش کے فوراً بعد تجویز کیے جاتے ہیں البتہ ادویات کا معاملہ قدرے مختلف ہے اس میں ایجادی آدمی کا عمل دخل ضرور سمجھا جاتا ہے اب کسی مریض کا نام ایک مرض کے لیے وقف کرنا چاہتا ہے طبیب، کیا خیال ہے؟؟

آئندہ افراتفری پھیلاؤ گے؟ مجھے دفتری امور میں غیر مشروط طور پر شریک کرو گے یا نہیں؟ مزید مسائل تو پیدا نہیں کرو گے؟ سوچ سمجھ کر جواب دو؟ نہیں مانو گے؟؟ اچھا، کچھ علاج تجویز کرتا ہوں، وجہ خود بخود معلوم ہو جائے گی!!

۱۱	۴۴	۰۷	۴۴
۳۰	۲۲	۰۹	۳
۱۵	۲۱	۸۸	۲
۴۰	۶۰	۸۰	۱

یہ لو!! جب سیاہی اپنی حقیقت عیاں کر دے، جب پانی، لفظوں کو کھا جائے، پی لینا، ایک بات کا خیال رکھنا، دوپہر کا وقت مستحب ہے، شفایاب ہو جاؤ گے، پھر بھی گھبراہٹ محسوس ہو تو مجھے بتانا!! میرا جرم کیا ہے؟ بتاؤ!! خواتین کی بھرتی سے قبل احتیاطی تدابیر کے طور پر کچھ اقدامات ناگزیر ہیں؟؟ مجھے راستے سے ہٹانا مقصود ہے؟؟ تذبذب کیسا؟؟ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا، خطرہ کیسا؟؟ بلا خوف و خطر بیان کرو!!

سرپرست سے ملاقات کا تقاضا مت کرو، یہ ممکن ہی نہیں ہے، ویسے بھی اگلے چند دنوں میں یہ خبر

سن لو گے، میں خودسر پرست بننے والا ہوں، پھر اطمینان ہو گا؟ مہندی کی تاریخ طے ہو چکی ہے، نکاح کی تاریخ طے کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ پہلے میرا ارادہ تھا، تمھیں ضرور مدعو کروں گا، خدا کا شکر ہے، بروقت معلوم ہو گیا، تم تو انتہائی خطرناک آدمی ہو، عین موقع پر گڑ بڑ کر سکتے ہو، اب میں نے سوچا ہے اس دفتر کا کوئی بھی شخص بارات میں شریک ہو گا اور نہ ہی ولیمے میں، کسی کو بھولے سے بھی مدعو نہیں کروں گا اور اس کے ذمہ دار تم ہو!! حالاں کہ خبطی آدمی ایک مدت سے میری شادی میں شرکت کا متمنی رہا ہے اور میں بھی اسے یقین دلاتا رہا ہوں کہ خدا نے چاہا تو تمھیں تمام رسومات میں شریک کروں گا، مگر تبدیلی حالات کے پیش نظر میں اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکوں گا۔ مجھے افسوس ہے کیوں کہ اسے مدعو کرتا ہوں تو وعدہ ایفا ہوتا ہے۔ ہلکے پیٹ کا انسان ہے، سب کو خبر کر دے گا، متوقع مدعوئین کے ضمن میں تمام تر اختیارات والدین کے سپرد کرتا ہوں، انسان عنقا ہے کسے بلائیں گے آپ لوگ، آزمائش کا مرحلہ ہے، میں نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا، یہ خواہ مخواہ کا 'بکھیڑا' ہے۔ بے وقوف لوگوں کا ''بھلا'' کس میں ہے؟ مسلسل پہیلیاں بجھوانے میں؟؟ مشروط اور غیر مشروط کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ افسوس، غور و فکر کی کمیابی مجھے لے ڈوبی، وہ بیٹھا ہے مراسر، بازار میں چہل پہل ہے؟ آ سکتے ہو تو اوپر آؤ، سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ ویسے تو بہت خوش مزاج نظر آتے ہو لوگوں کو!! کیا یہ اس کیم تم نے صرف اپنے پیاروں کے لیے مخصوص کر رکھی ہے؟؟ اعلیٰ حکام کے علم میں لاؤں گا، میری درخواست پر نظریں جمی ہیں، بار بار قلم اٹھاتا ہے مگر دستخط نہیں کرتا، قلمزد کرنے کا ارادہ ہے؟ یہ کیا کر رہے ہو؟؟ واپس کر دو میری درخواست، مجھے آسان اقساط کی بنیاد پر قرض کی ''سہولت'' نہیں چاہیے، بار بار ضرورت کی وجہ پوچھتا ہے، زچ کر دیا ہے، قسم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتا ہوں ورنہ تم سے بعید تو نہیں ہے کہ آٹھویں مرتبہ بھی یہی سوال دہراؤ، کہہ دیا نا ضرورت ہے بس!!

ضرورت کی بھی وجہ ہوتی ہے؟؟ اس کے بارے میں تو کہا جاتا ہے یہ خود ایجاد کی ماں ہے، وجہ کی ضرورت نہیں پوچھو گے؟؟ یہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے، کاش میں یہاں نہ آتا!! ضرورت مند بن کر آیا ہوں، کچھ دیر کے لیے بیٹھنا ہی پڑے گا۔ تم نے کن لوگوں کو مشورے کے لیے بلایا ہے، یہ تو شروع دن سے ہی مجھے ناپسند کرتے ہیں، نیک مشورہ کہاں دیں گے؟؟ البتہ میری خستہ حالی سے آگاہی حاصل کریں گے اور پھر ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ دیکھو، ابھی سے مسکرا رہے ہیں!! بلاوجہ مسکرا رہے ہو؟؟ پہلے معلوم تو کرو آخر کیا افتاد آن پڑی ہے؟ اس آدمی نے قواعد کی خلاف ورزی کی ہے، مجھ سے مشورہ کیے بغیر آپ لوگوں کو یہاں بلوا لیا ہے، اب آپ لوگوں پر منحصر ہے، ذرا اس کی خبر لیں، ہمت کیونکر ہوئی؟ ہاں بھئی آج اگر میرے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیا جاتا ہے تو کل کسی دوسرے کی شامت بھی آ سکتی ہے، اختیارات سلب کر لیے جائیں، اس سے یہ دریافت کیا جائے کہ میرے مفادات کا نگہبان کب سے مقرر ہوا ہے؟ میری اچھائی کس میں ہے اور بھلائی کس میں ہے، میں بہتر طور پر جانتا ہوں یا یہ؟؟

خاموش کیوں ہو گئے؟؟ شور مچاؤ!! ورنہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا، کہیں یہ تم لوگوں کا پھٹو تو نہیں ہے؟ کسی کیس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، میری مدد اگر درکار ہے تو کھل کر بتائے، مجھے اعتماد میں کیوں نہیں لیتا؟ اس دفتر کے معاملات مجھ سے مخفی تو نہیں ہیں، کیس کی نوعیت کا پتہ چلے گا تبھی چھان بین کا آغاز کروں گا۔ یہاں تو ''مدعی ست، گواہ چست'' کا سلسلہ نظر آتا ہے۔

ملزم نمبر دو کا قتل رہ رہ کر یاد آتا ہے، کس قدر روح فرسا تھا وہ خیال!! مجھے کیا ہو گیا تھا؟ وہ دن اور آج کا دن، کسی کام میں جی نہیں لگتا، جہاں جاتا ہوں اک ذرا دیر میں لرزنے لگتا ہوں۔ کسی نہ کسی شکل میں اس کی نیم مردہ شخصیت میری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، دیکھو!! کتنی معصومیت ہے؟ ......

قبل از قتل اتنا تو سوچو!! بے قصور آدمی کی جان لو گے؟ بھولپن سے ہنسی مذاق کر رہا ہے، یہ ظالمانہ سلوک کا مستحق ہے؟؟ کیا چاہتے ہو؟؟ کیوں اسے قتل کرنے کے درپے ہو؟؟ حیران ہوں، میں اس سمت کیوں آنکلا؟؟

سن گن لینے کی کوشش کرتا ہوں مگر ناکام ہو جاتا ہوں، اگر لوگ پہلو تہی نہ کرتے تو ممکن ہے میں خود کو بھی اس ''قتل'' سے بے خبر رکھتا، سہمی ہوئی ''علیک سلیک'' نے خوفزدہ کر دیا ہے، لگتا ہے پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے۔ کسی بھی وقت با آسانی لوگوں کو میرے خلاف اکسایا جا سکتا ہے، ڈرتا ہوں زندگی اجیرن نہ ہو جائے، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میرا خیال ہے مجھے اپنے جرائم سے پردہ اٹھا دینا چاہیے۔ اعتراف گناہ بہرطور عذر گناہ سے بہتر ہے---

مجھے ملزم اور مجرم کے مابین موجود فرق روا رکھنا چاہیے تھا۔ حقیقی مجرم کا قتل خواب سنگین تو نہ کہلاتا!! لیکن یہاں اس جانب غور ہی نہیں کیا گیا، ایک بے گناہ انسان کو دن دہاڑے تیز دھار ہتھیار کی مدد سے قتل کر دیا گیا اور کہیں سے 'اف' تک کی آواز نہ آئی۔ بے حسی کا عالم یہ تھا کہ اکثر نفوس معمول کی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور بیشتر نے اچٹتی نگاہ ڈالنے پر اکتفا کیا، حد تو یہ ہے کہ شقی القلب قاتل خاصی دیر تک جائے واردات پر موجود رہا۔ کہدوں!! اس نے مقتول کے بارے میں اول فول کلمات بھی ادا کیے، گویا وہ لوگوں کا ردعمل معلوم کرنا چاہتا تھا!! خون آلود قمیص ہتھیار کی نوک پر لٹکائے ناچ رہے ہو؟؟ مخبوط الحواس انسانوں کا مذاق اڑا رہے ہو؟ یا جم غفیر کو مشتعل کرنا مقصود ہے، قریب المرگ آدمی کے بارے میں کون استفسار کرے گا؟؟ میں آؤں گا!! دیکھتا ہوں کیسے موقع واردات سے فرار ہوتے ہو؟؟ کامیابی نصیب نہیں ہوگی، کہاں چلا گیا؟؟ ابھی تو یہیں تھا!! زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ دوربین سے دیکھتا ہوں تم لوگ زمینی محاذ سنبھالو! بھاگنے نہ پائے، چارٹرڈ طیارہ رن وے پر موجود رہے!!

دماغی خول اتار دو!!

بحری جہاز کے عرشے پر بھی رہے نگاہ ناز!!

میں کہتا ہوں پانی کے اندر بھی کرو پرواز!!

یہ فریب آلود دھمکیاں نہیں ہیں، جب سے منہ زور ہوگیا ہےتو + خاصا کمزور ہوگیا ہوں میں۔ کہاں تک بھاگو گے؟؟ آرہا ہوں! سامنے ہی تو کھڑے ہو!!

پہلے تو وہ سورج کا حوالہ نظر آیا × پھر بھاگے ہوئے چاند کا ہالا نظر آیا
بس اتنا ہی سوچا تھا مکاں لگتا ہے آباد ÷ دروازے پہ اک وزنی سا تالہ نظر آیا
معمول کے کاموں میں سبھی لوگ تھے مشغول + یونہی مجھے کچھ دال میں کالا نظر آیا
اک شخص کو جی جاں سے تڑپتا ہوا پایا
پھر ہاتھ میں اپنے، مجھے بھالا نظر آیا

+ کہہ سکتا ہوں دن میں مجھے تارے نظر آئے
کہہ سکتا ہوں مَیں شب کو اجالا نظر آیا

- یہ بات بہت سادہ سہولت کے لیے ہے
کیوں آپ کو انداز نرالہ نظر آیا

...... کیوں آپ نے فرمایا خیال اچھا ہے صاحب!!
...... کیوں آپ کو یہ ، مال مسالہ نظر آیا!!

یہ گتھا گتھی نا قابلِ فہم ہے، کتنے شرکا مطلوب تھے؟ اضافی آوازیں کیوں آرہی ہیں؟ اس بھیڑ بھاڑ کو بھاڑ میں کیوں جھونکوں؟ جگہ کہاں ہے؟ مجھ سے مشورہ کیے بغیر بلوا لیا ہے، یہ تو پہلے سوچنا چاہیے تھا، اب یہ لوگ کہاں بیٹھیں گے؟ شامیانہ تو محدود ہے، فرمائشیں اس پر مستزاد ہیں، بصارت سے محروم نہیں ہوں، دیکھ سکتا ہوں جس کے منہ میں دانت نہیں ہیں وہ بھی آیا ہے اور جو چلنے پھرنے سے عاجز ہے وہ بھی آیا ہے، خواہ گود میں ہی اٹھا کر کیوں نہ لایا گیا ہو، آیا تو ہے؟؟ دیکھو!! دری پر بیٹھا آں آں کر رہا ہے، بڑھیا کیوں دہائی دے رہی ہے؟ ڈھنگ کا کھانا نہیں ملا؟

بچہ اپنے باپ کو سکون کا سانس نہیں لینے دیتا، اوٹ پٹانگ سوالات سوجھ رہے ہیں، حلیم اور نہاری کے درمیان فرق ہوتا ہے؟ کڑی اور کڑاہی گوشت میں کیا فرق ہے؟ بریانی پلاؤ کسے کہتے ہیں؟ اب پوچھ رہا ہے رائتہ پیئوں؟ یا سلاد کھلاؤں؟ لیجیے دولہا دلہن کے بارے میں مفروضات قائم کیے جا رہے ہیں!! کون ہیں یہ لوگ!! میرے والدین نے مدعو کیا تھا!! شادی کارڈ کی چھپائی پر کیا اخراجات آتے ہیں، مجھے اس سے کیا

مطلب؟ شور مچاؤ، بلا اطلاع آئے ہو، کس نے بھیجا ہے؟ خبریں جمع کرنے کی غرض سے تو نہیں آئے؟ صحافی ہو؟ صورت سے تو نہیں لگتے، تیز طرار آدمی دکھائی دیتے ہو تم سے کیا بات کروں، ادھر ایک بچی نے اودھم مچا رکھا ہے، ماں باپ سے بچھڑ گئی ہے، اس کی بلا بھیڑ میں کون تلاش کرے گا انھیں؟ ماں باپ تو ملتے بھی بہت مشکل سے ہیں، خداوند!! عمر رسیدہ آدمی کیوں بے چین نظر آ رہا ہے۔ کمزور دل خواتین کو حوصلہ دو!! رونے سے اسے مزید شہہ مل رہی ہے، کئی مرتبہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے پر مغز "اعلان" کا مشورہ دے چکا ہے، خود اعلان نہیں کرے گا، دوسروں کو سکھائے گا، کیسے کہوں خدا را اس درجہ ظلم مت کرنا، یہ آخری حد ہوتی ہے، کیا بذریعہ لاؤڈ اسپیکر میری رہائش گاہ کی نشاندہی کرو گے؟ ظاہر ہے گمشدہ لوگوں کا حلیہ بیان کیا جائے گا، پھر اتا پتا بتایا جائے گا اور آخر میں انعام وغیرہ کا لالچ دیا جائے گا، ہرگز نہیں میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا، بدمزگی پیدا کرنا چاہتے ہو؟ عموماً دیکھا گیا ہے اس نوع کا ضعیف النفس انسان اپنے علاوہ ہر شخص کو گمراہ کرنے کے درپے رہتا ہے۔ سادہ لوح لوگوں کو کسی مثبت فیصلے پر نہیں پہنچنے دیتا۔ نتیجا اچک لیتا ہے، مجھے اس پر بھروسہ نہیں ہے، ہاں کسی معمر فرد کی رائے معلوم کی جا سکتی ہے، وہ نہ صرف نیک مشورہ دے گا مل کر فریقین کی شکایات پر بھی مناسب دھیان دے گا، آپ ہی انھیں سمجھائیے، دیکھئے کرسیاں گھسیٹ گھسیٹ کر لے جا رہے ہیں، ترتیب بگاڑنے پر کمر بستہ ہیں، ایک گوشہ مخصوص کر رکھا ہے، گپ شپ کے واسطے یہی دن مقرر کیا تھا؟؟ ٹرانزسٹر (Transistor) کون لایا ہے؟ حیران ہوں جس آدمی پر مجھے کبھی اعتماد نہیں رہا، وہی یہ یقین دلا رہا ہے کہ "خاطر جمع رکھو" کچھ نہیں ہوگا۔

کیا نالنے کی غرض سے پھر ایک بار اس کی اوچھی حرکت پر ہنس دوں؟؟ مگر کیسے نظر انداز کروں؟ آج تو تمام حدود و قیود پھلانگ گیا ہے، دیکھو کس قدر تفکر اور ایقان کے ساتھ خبریں سننے میں محو ہے، دنیا ومافیہا سے بے خبر، مل کر اپنے ہمراہ دیگر نیم سنجیدہ افراد کو بھی بے خبر بنانے پر بضد ہے، اب سب لوگوں کی توجہ میڈم بینڈ پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے، میرا کیا کام ہے یہاں؟ ان کے لیے بی بی سی کی نشریات سننا نہایت ضروری ہے۔ اس کٹیا میں بیٹھ کر روس، چین کا جھگڑا نمٹائیں گے۔ دنگا، فساد کرنا اچھا نہیں لگتا، انسانی حقوق کی نمائندہ تنظیموں نے کیا بیانات جاری کیے ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بے جا گفتگو کو انسانی حقوق کے خلاف قرار نہیں دیا، اچھا ابھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، تو وہ جاری کردہ بیان ۔۔۔۔ موقع تو ٹھیک ہے، میں غلط ہوں، اچھا!! اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تیسرے روز بھی مباحثہ جاری رہا؟؟ میں خود سن رہا ہوں!! مجھے کیا بتاتے ہو؟ البتہ یہ ضرور بتاؤ کہ موضوع کیا تھا؟ خاصی دیر سے گردنیں تان کر سن رہے ہو؟ قرارداد کا کیا ذکر ہو رہا تھا؟ کس نے منظور کی ہے؟؟ ایریل درست نہیں ہے؟ ابھی درست کرتا ہوں!! شامیانے کا بانس ہاتھ میں نہیں آتا ورنہ میں قدرے مدد کرتا، آئندہ کے لیے قرارداد کی منظوری کس صورت میں ہوگی یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔

دھیمے لہجے میں کیوں بولوں؟ یہی تو چیخنے کا مقام ہے، آپ دیکھتے نہیں ہیں؟؟ حاضر میں غائب کی ملاوٹ ہی ہو رہی ہے؟ کیا یہ تکلیف دہ گفتگو نہیں ہے؟ جس تقریب میں بیٹھے ہیں اسے نظر انداز کر رہے ہیں، وہ بھی کس طریقے سے؟ غور تو کیجیے!! یہ شخص ماضی کی کسی یادگار تقریب کا قصہ لیے بیٹھا ہے، ربڑی کی رعایت سے چٹخارہ لیتا جاتا ہے اور مذکورہ تقریب کے انتظام و انصرام کی تعریف کرتا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں آج کی تقریب پھسپھسی ہے؟؟ اس سے قبل ایک بڑھیا بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکی ہے، میں سمجھا نہیں تھا، گویا باقاعدہ ایک قاعدہ وضع کیا گیا ہے جبھی ...... بس ...... سمجھ گیا۔ اس لیے وہ شخص جسے دیکھتے ہی میں نے منہ پھیر لیا تھا، خوشی کے موقع پر انتہائی شد و مد کے ساتھ کچھ مرحومین کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اب غائب ہو گیا ہے۔ اگر کوئی ذمہ دار شخص اس وقت فارغ ہوتا تو اسے جانے دیتا۔ گریبان سے پکڑ لیتا اور پوچھتا تم نے پہلے خداوند کریم کے چند برگزیدہ بندوں کے واقعات سنائے، بلاشبہ یہ قابل ستائش عمل ہے، لیکن اس کے بعد تم نہ صرف اپنے قرابت داروں کی اموات کا رونا رونے بیٹھ گئے، بل کہ تم نے اپنے دوستوں اور دیگر جان پہچان کے لوگوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ میری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو؟؟ یہاں ٹسوے بہانے آئے ہو؟ اور کوئی جگہ نہیں ملی؟ بارش کے آثار دکھائی دیتے ہیں!! ژالہ باری کا خدشہ ہے، فکر کی کوئی بات نہیں!!

عارضی کٹیا ڈھے جائے گی!!
بنی بنائی بہہ جائے گی

کمر جھک گئی ہے، بینائی کمزور ہو گئی ہے، اس عمر میں کون میرا سرپرست بننا گوارا کرے گا؟

تمھارے سرپرست سے ملنا چاہتا ہوں۔

خدا جانے اس پر کیا خبط سوار ہو گیا ہے، میرے گھریلو حالات جاننا چاہتا ہے؟ کس ٹوہ میں ہے؟ کیا کریدنا مقصود ہے، سمجھ نہیں پاتا، میں ناسمجھ بچہ نہیں کہ آپ مرے والد صاحب کو میری شرارتوں سے آگاہ کریں گے!!

اگر کوئی شکایت ہے تو براہِ راست مجھے بتائیے!! رفع کرنے کی کوشش کروں گا، منہ سے مت پھوٹو، لکھ کر ہی دے دو!! یوں بھی میرے والد صاحب اول فول باتوں پر دھیان نہیں دیتے، وہ یہاں کیوں آنے لگے۔

کسی کو لعن طعن کیا کروں، خود اپنا مذاق اڑاؤں، خجالت کا اعتراف کروں، سمجھوں گا کیوں نہیں؟ یہ سب ایک ہی سازش کی کڑیاں ہیں، اگر میں اس دعوت میں شرکت نہ کرتا تو شاید یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یقیناً مجھے اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے۔ چندہ ہی کیوں دیا تھا؟ کس گھمنڈ میں تھے؟ دل پسیج گیا تھا۔

مسکین صورت ٹولیاں گردش میں رہتی ہیں۔

کبھی یہاں تو کبھی وہاں،

ایک ٹولی ادھر کا رخ کر رہی ہے۔
بھاگنا ٹھیک نہیں ہے،
چغل خور چپڑاسی قریب ہی کھڑا ہے، مقابلہ کرنا چاہیے،
ہوں!! کیا بات ہے؟
کیوں دوں میں چندہ؟

افسروں کا آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ اگر میں اپنی محنت کی کمائی برباد کرنے پر تُل گیا تو بہت جلد کنگال ہو جاؤں گا، عنقریب میری شادی ہونے والی ہے، بجٹ کے لیے بے چین رہتا ہوں، مناسب رقم پس انداز ہو جائے تو شرمندگی سے بچ جاؤں، قناتوں کا کرایہ کہاں سے دوں گا، پلیٹیں، چمچے، دریاں اور پھول میری دسترس سے باہر ہیں۔ اضافی اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہاں مستقبل کی فکر لاحق ہے اور انھیں نئے نئے چونچلے سوجھتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں:

"باس کا تبادلہ ہو گیا ہے، نئے افسر کی آمد آمد ہے، ایک کو الوداع کہیں گے اور ایک کا استقبال کریں گے۔"

گویا بیک وقت یہ الوداعیہ بھی کہلائے گا اور استقبالیہ بھی؟ ایک پنتھ، دو کاج کا مقولہ مجھے نہیں بھاتا، کیا "عملہ عملہ" لگا رکھا ہے؟ مجھے عملے کا فریضہ یاد دلاؤ گے؟ افسروں کے اعزاز میں الوداعیہ اور استقبالیہ دینا ہی عملے کا فریضہ رہ گیا ہے۔ یہ عملہ نہیں ہے مٹی کا گملہ ہے۔ مجھے کسی کی آمد سے غرض ہے، نہ روانگی سے۔

سچ پوچھو تو میرے علم کے مطابق حساب بے باق ہونے میں قدرے تاخیر ہنوز باقی ہے، تمھارے پرانے باس کو بہت پہلے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔

'بتاؤ کس کونے کھدرے میں شکنجہ نصب کیا گیا ہے؟
بتاؤ وہ ڈی وائس (Device) کہاں ہے؟ وہی سیدھی طرح بتاؤ؟
کہاں سے مسائل گرفت میں لیے جا رہے ہیں اور کس حد تک لیے جا رہے ہیں؟
نمبر دو!! مسائل کو گرفت میں لے کر فرار تو نہیں ہو جاؤ گے؟

نمبر تین ...... دیکھا!! وہ میری دشمنی میں اندھے ہوتے جا رہے ہیں۔ جب ان کی بینائی کلی طور پر رخصت ہو جائے گی تو بار بار کلیاں کریں گے اور مجھے پھر ان کی حالت پر رحم آ جائے گا اور بحالی بینائی کے لیے مجھے ہی مختلف تدبیریں کرنا پڑیں گی۔ دو تدابیر انھیں دے دوں گا۔ اور ایک تدبیر اپنی مٹھی میں رکھوں گا۔ اس لیے کہ ...... اس لیے کہ ...... اس لیے ...... کہ نہیں بتاتا، یہ اسی وقت بتاؤں گا جب یہ ...... یہ بھی نہیں بتاتا ...... میں کیوں ایک اشارہ بھی دوں تا کہ انھیں آئندہ کی حکمت عملی کا "عندیہ" مل جائے گا؟

خدا کا شکر ہے میں وقت سے پہلے ہی محتاط ہو گیا۔

اتوار (Sunday)	انتہائی محتاط ہوں
بتیار (Beyond-day)	غیر محتاط ہو۔ یہ دن لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔
سوموار (Monday)	پھر احتیاط کی ضرورت ہے
منگل (Tuesday)	
بدھ (Wednesday)	اک سیرپ کے اثر نے دل مفلوج کیا۔
جمعرات (Thursday)	اک سیرپ نے دل کی دھڑکن جاری کی
جمعہ (Friday)	آدھی گولی: پوری رات کی بے چینی
ہفتہ (Saturday)	سالم گولی: نیم بے ہوشی طاری کی
اتوار (Sunday)	ایک انجکشن حلق کو دیتا ہے، تکلیف
بتیار (Beyond-day)	ایک انجکشن: سجھو گردن بھاری کی

یہ ستائیس صفحات الگ سے لکھ رہا ہوں۔ اصل میں یہ ایک صفحہ 10 صفحات پر مشتمل ہے اور دس صفحات پانچ اوراق پر مشتمل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق 270 صفحات پر وہ قیامت ٹوٹی کہ وہ صفر سے محروم ہو گئے۔ ان صفحات میں قیامت کی نوعیت کیا ہے کہ یہ کہنا قبل از وقت ہو گا۔

میں نے جرم اس لیے نہیں کیا کہ مجھے کہلوانے کا شوق تھا۔ میں نے یہ جرم شعوری طور پر کیا ہے۔ یہ جرم، مجرم کی ذہنی کیفیت سمجھنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اب میں مجرم کی ذہنی حالت کے قریب تر ہوں۔ شاید میں کہہ سکتا ہوں کہ میں مجرم ہوں اور اپنے جرم کی سزا بھگتنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں۔

دیکھیے! یہ وہ جرم نہیں ہے جو سرزد ہو جاتا ہے یہ وہ جرم ہے جس کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ میرا جرم .... جرم شعوری ہے یا شعوری جرم ہے۔ یہ جرم بد نیتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جرم تو بد نیتی کو جاننے کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ جرم تو بد نیتی کو سمجھنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اب یہ مجرم ایک سزا یافتہ شخص کی حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس سے یہ ہو گا کہ میں سمجھ سکوں گا کہ ایک سزا یافتہ قیدی کی ذہنی حالت کیا ہوتی ہے۔ شاید میں ایسا کر سکوں، ممکن ہے میں مجرمیت کی موجودہ حالت پر ہی قائم رہوں بہر حال مجھے ملزم مت کہیے، کیوں کہ ملزم کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے، وہ آزاد بھی ہو سکتا ہے اور پابند سلاسل بھی ہو سکتا ہے۔ جب کہ میں ان قیدیوں میں شمار کیا جا سکتا ہوں جو مقید ہیں اور اس طرح سے مجھے ملزم قیدی نہیں بل کہ مجرم قیدی کہا جا سکتا ہے۔ ایک مجرم قیدی کی حیثیت سے میں یہ کہنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ قاتلوں کو نہ تو حوالات میں ہاتھ لگایا جاتا ہے اور نہ ہی عدالت میں اور عداوت میں۔

اس کی چند وجوہات ہیں جو میں اس وقت بیان نہیں کرنا چاہتا۔

مختصراً آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان معمولی نوعیت کے الزامات کے سبب تشدد کا نشانہ بن سکتا ہے مگر اگر ....مگر ....پر اثر آئے تو بچ سکتا ہے ۔ اولاً تو اسے الزام کی نوعیت کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، فوراً مہر تصدیق ثبت کر دینا چاہیے تا کہ نہ صرف اپنا وقت بچایا جا سکے بل کہ اپنی جسمانی سلامتی بھی یقینی بنائی جا سکے ۔ دیکھیے بدنی اکائی کو منتشر مت ہونے دیجیے۔

اس کے علاوہ دیگر کمزور لوگوں کی توانائیاں بھی مت منتشر ہونے دیجیے۔

البتہ اگر یہ خدشہ ہو کہ معمولی نوعیت کے الزامات کی تصدیق آپ کو مزید پریشانیوں میں مبتلا کر سکتی ہے اور قانون کے محافظ آپ کو حقیر مجرم سمجھ کر تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہیں تو فوراً مرکزی مجرم ہونے کی تصدیق کر دیجیے۔ سمجھنے کی کوشش کیجیے ۔ ......اس سے اولاً میں بھول گیا، میں اولاً تو اولاً لکھ چکا ہوں ۔ اب یہاں دوئم آ جاتا ہے۔ تو اسے آپ دوئم سمجھ لیجیے۔ ذرا ٹھہریئے ۔ اسے اولاً ہی رہنے دیجیے، یہ مناسب مقام نہیں ہے۔ دوئم آپ وہاں لگا لیں جہاں بدنی اکائی کے انتشار کی بات کی گئی تھی ۔ یاد آیا، بل کہ وہی بات ......دوئم کا استعمال اس کے علاوہ کی جگہ پر کیجیے۔

اب رہی بات اس کے علاوہ کی ......تو اس کے علاوہ کے لیے آپ کو خالی جگہ پر کرنا ہو گی ......

زندگی کے کام ہیں بہت
بیچاری ایک زندگی، حجام ہیں بہت
دیکھو کہیں نہ قید میں رہ جائے یہ دماغ
اس بد دماغ آدمی کے نام ہیں بہت
یہ سوچنے کا جرم بہت سرسری سا ہے
اس کے علاوہ زیست پہ الزام ہیں بہت

آپ اس میں سے کوئی خاص بات نکالنا چاہتے ہیں۔ آپ اصل مسئلہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ بات نکل گئی ۔ اصل مسئلہ کیا ہے یہ آپ کو صفحہ نمبر ۲۶ پر معلوم ہوگا۔

صفحہ نمبر ۲۶

اس صفحے پر کوئی خاص بات نہیں ہے یہ صفحہ تو بنا ہی عام باتوں کے لیے ہے ....تو ثابت ہوا کہ صفحہ نمبر ۲ ۶ پر کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا، بل کہ اس صفحہ پر ۲۶ کو ۲ سے تقسیم کیا گیا ہے گویا صفحہ نمبر ۱۳ پر ان واقعات کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں، جو آپ کی الجھن کا سبب بن سکتے ہیں۔

اسے صفحہ نمبر 13 سمجھ لیں

آنکھوں دیکھی باتوں پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے ۔ اس صفحے کی ۲۰ سطریں ایک جنگ......کی نذر ہو گئیں ۔ ان ۲۰ سطروں کے ایک سو چھیانوے الفاظ امن کی بھینٹ چڑھ گئے ۔ شاید انھیں ذخیرہ کر دیا گیا ۔ یہ

وقتی قربانی ہے، ایک دن یہ الفاظ پھر زندہ ہو جائیں گے اور ان کے امیجز (images) سے رات کی روشنی جگمگا اٹھے گی یا روشنی کی رات یہ الفاظ جگمگا اٹھیں گے۔ فی الوقت تو مجھے یہ سمجھنا ہے کہ میں جسے خواب میں سربراہ مملکت بنتے ہوئے دیکھتا ہوں وہ مجھے اس مملکت سے ہی نکالنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ کیا وہ مجھے عام شہریت کے حصول سے دستبردار کر دے گا۔

میں عام شہری کی حیثیت سے بھی اپنے حقوق کا دفاع نہ کروں؟ اگر میں ملک بدر کر دیا جاتا ہوں تو ...... میری تو ہوائیاں اڑ جائیں گی۔ دیکھو، یہ سمجھنے کی کوشش کرو اور ملک میں میرے ایسٹس assets نہیں ہیں۔ میں تو اس ملک میں بھی کوئی جائیداد نہیں بنا سکا، میں assets سے زیادہ لائبلیٹیز liabilities پر یقین رکھتا ہوں۔ میں جن لوگوں کا مقروض ہوں وہ یقیناً تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ ان کا قرض دار، رات کی تنہائی میں اس ملک سے فرار ہو جائے۔

☆☆☆☆

زاہد حسن

درد مندوں کا دیس

ماں، بیوی اور مرنے والا شیر خوار بچہ۔ میں جنھیں ایک کُل کے طور پر دیکھتا ہوں۔ جن کے بارے میں زمانے کے بے پایاں و بے کنار تسلسل میں جز وقتی بیداری مجھے بہکاتی رہتی ہے، بچھڑنے اور بھول جانے کے حوالے سے خوف زدہ رکھتی ہے۔ ماضی جو مجھے نیندوں اور خوابوں کی اشرفیاں بانٹتا ہے اور مجھ سے میرے وجود کی ڈھلوانوں کو اپنی جھولی میں ذرہ ذرہ کر کے گرانے کا تمنائی رہتا ہے۔ موت جس کے لیے ایک ساعتِ سکون ہے۔ میں سوچتا ہوں، کیسے پرکھوں کا ماضی ہمارے لیے مستقبل کی روشن لکیر بن جاتا ہے۔ جب تک ہم ٹھوکر کھا کر درد کی کراہوں کو مٹھی میں بھینچ کر زمیں تھام کر بیٹھ نہیں جاتے، چلے جاتے ہیں۔ آگے اور آگے۔

کچھ لوگ ہیں جو غربت اور بے روزگاری میں یادوں کی محفوظ ریزگاری اور جمع پونجی پھونک دیتے ہیں۔ کس امید، کس آس پر۔ شاید تقدیر پر حد سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں، خزاں زدہ بہاروں پر قہقہے لگاتے ہیں۔ بہت برس تک جیے جانے کی خواہش میں بچھڑنے والوں سے پھر سے ملنے کا وعدہ کر کے گھر واپسی کے لیے مڑتے ہیں اور یہیں پر غلطی کھا جاتے ہیں۔ مڑتے ہوئے بے دھیانی میں تیز رفتار زندگی کی زد میں آ جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ الوداع کہہ کر جانے والا پلٹ کر دیکھے۔ آنکھیں مُند چکی ہوتی ہیں۔ پھر وقت کی بے رحم پھلسن سے عزیز ترین لوگوں کی باتوں میں سے ایسے اُدھک جاتے ہیں، جیسے کچے اور بُھربُھرے حصے چٹانوں سے جُدا ہوتے ہیں...... کہانیوں میں ان کا ذکر آتا ہے نہ ہی تاریخ کے صفحات پر۔ یہ راستوں کا چلن رہا ہے کہ تاریخ کے صفحات محدود رکھو، اس قدر محدود کہ ان پر اشرافیہ اور حکمران طبقوں کے شب و روز کے اندراج کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ حاشیوں میں ریاستی شعبدہ بازیوں کی کرامات اس قدر مقدس بنا کر بیان کرو کہ عوام الناس جب تمھاری عظمت اور فضیلت کے قصے بیان کرتے تو زیریں سطحوں پر تمھاری درویشی اور فقر و غنا کی کھیتی لہلہاتی نظر آئے اور انھیں اپنی بدحالی پر تفاخر کا احساس ہو۔

ماں کی موت کے صدمے نے مُجھ پر طبقات سے جڑے مقدس اعلامیوں کے یہ بھید بھاؤ کھول دیے تھے، میں رفتہ رفتہ ذات کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ موت میرے لیے جائے امان تھی۔ اپنی آسودہ آغوش وا کیے، زندگی مجھے آسائش اور آلائش پسندوں کی آماج گاہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس سے فرار چاہتا تھا۔ مجھے صوفی کی بات یاد آئی، میں اسے دہرانے لگا: ”اچھا ہوا گڑ مکھیوں نے کھایا، بھنبھناہٹ سے ہماری جان چھوٹی۔“ آگے جو اس نے بیان کیا تھا میرے اندر اسے بیان کرنے کی سکت نہ تھی۔

لاہور......بیماری کے ایام آلام

"اس کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر ابھرا، جیسے اس نے مجھے پہچان لیا ہو، پھر کروٹ بدل لی۔ میں سمجھا اس نے شدید درد کے کارن ایسا کیا ہو گا۔ لیکن وہ دیر تک دوسری طرف منہ کیے پڑی رہی، مجھے لگا سسکیاں لے رہی ہے۔ میں اس کے چہرے کے سامنے جانے کے لیے دوسری طرف مڑا۔ اب اجنبیت کی دھوپ اس کے چہرے پر ہویدا تھی۔ آہستہ آہستہ سانس لینے کے عمل کے دوران میں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ایک دوسری میں پھنسائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس نے ایک بار پھر نظر اٹھائی، میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ میرے اصل وجود کے ذریعے وہ میرے ماضی کے وجود کو بھالنے کی کوشش میں ہے، بیماری نے جب سے شدت اختیار کی تھی وہ ماضی کو کھدیڑنے میں لگی رہتی تھی۔ میرا ماضی جسے صرف وہی اپنے تحت الشعور میں بیدار کر سکتی تھی۔ خود وہ میرے لیے اجنبی ہوتی جا رہی تھی، میں نے یادوں اور اس کی فراموشی کو اور اس فراموشی میں سایوں کی طرح لرزتی اشیا کو اس کے توسط ہی سے کھو جا تھا، لیکن مجھے لگا کہ اس کے وجود کے ساتھ ساتھ میرا ماضی بھی زائل ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ غیر مانوس اور آسیب زدہ کھنڈرات ابھر رہے ہیں۔

اندر ہی اندر دور کہیں جب گہرا سناٹا ہوتا ہے میں انھیں دیکھتا ہوں۔ بے پروائی کے ساتھ نظریں نیچے کیے چلی آ رہی ہیں، کسی گہری سوچ میں گم توے پر روٹی ڈالتے ہوئے، پرانی یادوں کو دہراتے ہوئے، اپنی محرمیوں کو اور دکھوں کو اور ان میں اوندھے پڑے خالی دنوں کو یاد کرتے ہوئے، بولتے بولتے اچانک رک جاتیں یا پھر کسی پرانے لیکن انتہائی شدید صدمے کو یاد کرتے ہوئے آنسو بہا رہی ہوتیں۔

کچھ ایسا ہی جان پڑتا ہے، میں انھیں قبر میں اتارتے ہوئے اپنے وجود کا کچھ حصہ وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ کچھ ایسا ہی کہ جیسے مائیں پیدائش کے سمے بچوں کے احساسات و جذبات کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھ لیتی ہیں، ایسے ہی جیسے اپنے جانے کے باوجود، وہ اپنے وجود کا کچھ حصہ دانستہ ہمارے پاس چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ بیٹھے بیٹھے جسے میں محسوس کرتا ہوں، لکھ لیتا ہوں، بیان کرنے لگتا ہوں۔ بلانے کا بھاؤ ہونا چاہیے، آپ دور جانے والوں کو بھی اپنے پاس بلا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو اس زندگی میں نہیں رہ سکے اور جنھیں کسی نہایت مجبوری کے باعث آگے جانا پڑا۔ کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی، کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنے کے لیے انھیں اپنے پاس بلایا جا سکتا ہے۔ جیسے کوئی پلمبر پانی کے پائپ کو درست کرنے کے خیال سے پورا جوڑ کھول دے، ہاتھ کی انگلی پائپ کے اندر اور کناروں پر گھما کر اس کا زنگ اتارنے لگے۔ اس دوران میں کچھ دیر کے لیے پانی کا شعور سب آوازوں پر غالب آ جائے، لیکن پائپ کا جوڑ جڑتے ہی دوبارہ سے پانی کا اخراج معمول کے مطابق ہونے لگے۔ موت بھی ٹوٹے ہوئے پائپ میں زور سے بہنے والے پانی کے مانند ہم پر برسنے لگی تھی۔ ہماری طرف سے موت کو زندگی کے ساتھ جوڑنے کا جتن کیا جا رہا تھا۔ یہ ایسے ہی تھا کہ ہموار راستے پر جاتے ہوئے اچانک کوئی گہرا لامختتم گڑھا آ جائے۔ یہ وقت تھا، یہ وقت کا بندھن تھا، ہمارے اور ہمارے ماضی کے

بیچ۔ میرے اور ماں کے درمیان۔ اس بستی کے ساتھ۔ جس نے کبھی ہم سے ناتا استوار رکھا، کبھی توڑ لیا۔ بستی جس کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انسانی خواب کے وجود پر پورا اترتی تھی۔ روش روش پر پھولوں کے قطعے تھے، اس میں صاحب ذوق لوگ بستے تھے۔ وہ اہل علم اور اشرافیہ کی آماج گاہ تھی۔ ہاں یہ بستی تھی، زندگی سے بری طرح جھوجھتے عام انسانوں کی، جن کی پرورش اخلاقی بنیادوں پر کی گئی تھی نہ کہ جنگی بنیادوں پر۔ ظاہر ہے اس کا خمیازہ یہاں بسنے والے ہر انسان کو بھگتنا پڑا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تھا کہ اس بستی کے لوگ جب کسی سفر پر نکلتے تو اپنے بزرگوں کی اشیائے ضروریہ کے ساتھ جڑی ہوئی مہارتیں اور خواب سنبھالے ہوئے آگے بڑھتے۔ ان کی چال میں ڈھلتے ہوئے سورج کی لالی پر قدم دھرنے کا عزم نمایاں ہوتا، جیسا کہ شروع دنوں میں میرے اندر تھا۔ جو لاہور آنے کے بعد جولائی کی مسلسل اور غیر متوقع بارشوں سے ٹپکنے والی چھت کے نیچے ساٹھ وولٹ کے بلب میں مدھم پڑتا گیا۔ ایک کمرے اور ایک برآمدے والے گھر میں جہاں کھلونوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے پاؤں کے ٹوٹے ہوئے جوتے، حکومتی اداروں کے لیے لکھی گئی درجنوں درخواستوں کے ابتدائی ڈرافٹ پر مشتمل پھٹے پرانے کاغذات، شہر کی بے ہنگم سڑکوں پر کمائی کے لیے لگائی گئی ندامت سے بھری آوازیں، خوابوں سے خالی کھلتی بند ہوتی آنکھوں میں بے ترتیب تصویریں؛ آنکھیں، جو پوری نیند کے عالم میں بھی بہت کم بند ہوتیں۔ آٹے کی مٹی، پانی بھرنے کے لیے زنگ آلود لوہے کی بالٹی، چارپائیوں کے نیچے سردیوں، گرمیوں کے کپڑوں سے بھری گٹھڑیاں دھرنے کے بعد سونے کے لیے بہت کم جگہ بچ پاتی۔ پنکھا چلتا رہتا تیز شور اور آواز پیدا کرتے ہوئے اور ساٹھ وولٹ والا جالوں اور دھول سے اٹا بلب جلتا رہتا، جس کی مدھم روشنی میں خواب آنکھوں سے گر گر ٹوٹتے رہتے۔ چھپکلی کے انڈوں کی طرح فرش پر گرنے والے انڈوں کی آوازوں، جیسی آوازیں رکھنے والے خواب، ہم ان کے گرنے کی آوازیں سنتے اور سہم جاتے لیکن انسانی زندگی کا جشن منانے کے لیے طلوع ہونے والی ہر صبح کے جلوس میں اسی طرح شریک ہوتے، جیسے ہماری خالی زندگیوں سے دور جا رہے لوگ اس میں شریک ہوتے اور یہ سب بھی ہم نے ماں کی عظیم قناعت پسند ذات سے سیکھا تھا۔ اگرچہ بستی میں رہتے ہوئے بھی کتنے وہم کتنے اندیشے تھے آنے والے دنوں کے حوالے سے، کتنے خواب، کتنی خواہشیں اور کس قدر آرزوئیں تھیں، تاریک گپھاؤں میں پوشیدہ جن میں ساون کی بارشوں کے سمان قوس قزح کے رنگ بکھرتے اور سارے منظر پر محیط ہو جاتے۔ رنگ جو اگرچہ مدھم پڑ گئے ہیں پر آنکھوں میں آج بھی زندہ ہیں۔!

زندگی کا چلن بھی عجیب ہے کہ کوئی بھی رنگ لیے بغیر تمھارے پاس آن بیٹھتی ہے اور پھر یہ ضد کرتی ہے کہ مجھے یہ رنگ دو اور پھر وقت بے وقت اس کی ضد کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ عمر کی اس نکر پر کھڑے جیسے میں یہ طے نہیں کر پایا کہ میں اپنے آپ کو دائیں والوں میں شمار کروں یا بائیں والوں میں، اس لیے میں نے من ہی من میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک میرے دونوں بازو کام کرتے ہیں، دونوں سے کام نکالتا رہوں گا کہ

زندگی بھر کے تجربوں سے میں نے یہ سیکھا تھا کہ لوگ آپ کو جن چیزوں سے دور رہنے کا کہتے ہیں یہاں تک کہ پڑھانے لگتے ہیں کہ اگر تم ان لوگوں اور چیزوں کے قریب گئے تو تمھارا نظریہ اور عقیدہ گدلا جائے گا اور پھر تم انھیں وہیں کھڑا ہوا پاتے ہو۔ جہاں ان نظریہ سازوں نے تمھیں کھڑا ہونے سے منع کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ وہاں سے کچھ نہ کچھ وصول کر رہے ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ مادی فوائد ہوتے ہیں اور یہ ان کا رتبہ بڑھانے کے کام آتے ہیں اور تب تمھیں نیچے کھڑے ہوئے دیکھ کر وہ یہ یاد بھی نہیں کر پاتے کہ جہاں تم کھڑے ہو وہاں ان ہی کے کہنے پر کھڑے ہو۔ وہ تو یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ اس قدر نیچا کھڑے ہونے میں تمھارا اپنا ہی کوئی کردار رہا ہوگا ......سو ان وہموں اور خدشوں میں زندگی بسر کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان دونوں کے بیچ کھڑا، دونوں سمتوں میں کھڑے شعبدہ بازوں کا تماشا دیکھوں گا اور پھر حالات نے مجھے دکھایا کہ میں ابھی تک وہیں کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا ہوں لیکن حالات و واقعات کی گہری دلدل سے ایک انجانا احساس مجھے باہر نکال کر کھلی فضاؤں میں لا کھڑا کرتا ہے۔ پھر سوچتا ہوں ......ماں جو جنون کی حد تک مذہبی تھیں، عمر کی طویل بے سایہ دھوپ میں وہ روحانیت کے آسرے پر آگے بڑھتی رہیں، صبر و رضا اور توکل اس نے اسی روحانیت سے حاصل کیا تھا، دوسری طرف انقلاب اور تبدیلی کے یہ داعی تھے جو انسانی دکھوں کو گھٹا کر اس کی جگہ خوشیاں لانے کے لیے باتوں کا مارچ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

“جب گھر بن رہا تھا تو میں نے یہ تجویز دی تھی کہ ماں کے لیے بنائے جانے والے کمرے کو عقبی غسل خانے کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ ایک کموڈ بھی لگا لیا جائے۔ خاص طور پر سردیوں کی تاریک ٹھنڈی راتوں میں استعمال کرنے میں آسانی رہے گی لیکن اس وقت ماں اس کے حق میں نہیں تھیں بل کہ اس کے تصور سے ہی اسے وحشت ہونے لگی تھی۔ تب میں نے دوبارہ نہیں کہا، میں نے اپنی بات سے طویل خاموشی کا طلسم توڑتے ہوئے کہا۔

“......اور آخری دنوں میں ان دونوں چیزوں کے نہ ہونے سے انھیں کتنا بھگتنا پڑا۔” خالہ نے کہا۔

“کئی بار آپ آنے والے دنوں میں درپیش ضرورتوں کے بارے میں جان جاتے ہیں لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ زندگی کے بخیے ادھیڑ ادھیڑ کر انھیں پھر سے سینے کی عادت ہو جاتی ہے۔”

“لیکن پینتالیس برس کی زندگی ہمیں اگر سلی سلائی ملی تو ماں کی وجہ سے۔ اب اس کی تہوں میں میل پڑنے لگی ہے یا پھر جگہ جگہ سے ادھڑنے لگی ہے تو یہ ہمارے اپنے ہی کرموں کے سبب ہے۔” اپنی بیوی کی بات کے جواب میں، میں نے کہا۔

“غربت ڈھلتی عمر کے ساتھ ساتھ تمھارے وجود میں اپنا ظہور کرنے لگتی ہے!” خالہ کہنے لگی۔

“ہاں” اور کئی بار کسی نہ کسی بیماری کی صورت میں یہ بچپن، لڑکپن اور جوانی کے راستوں سے ہی تمھارے اعصاب تک پہنچتی ہے اور جب تم محسوس کرتے ہو کہ تمھاری ہڈیاں کڑکنے لگی ہیں تو اس میں یہ غربت

کے آسیب کی ہی آواز ہوتی ہے جو تمھارے وجود میں مستقل ٹھکانہ کرنے کے لیے تمھارے سرہانے آن بیٹھتی ہے اور رفتہ رفتہ تمھارے بستر تک پہنچ جاتی ہے، تمھارے ساتھ ہی سوتی، اٹھتی، بیٹھتی اور ٹہلتی...... یہ صوتِ غربت، سانپ کی وہ قسم ہے جو تمھیں اعتبار دلا کر تمھارے وجود میں اپنا زہر سرایت کردیتی ہے۔ میری باتوں کے جواب میں خالہ اور میری بیوی اثبات میں سر ہلا دیتیں اور جب مناسب سمجھتیں تو کوئی نہ کوئی بات بھی کرتیں۔

"ان کی موجودگی سے ایک بے خودی سرشاری رہا کرتی تھی۔ جب تک وہ تھیں یہ حقیقت ہے کہ سرشاری کی اس کیفیت میں اب کمی ہونے لگی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کمی کا احساس گہرا ہونے لگا ہے۔ میری بیوی یہ کہتے کہتے آنکھیں موندنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر جھڑتی پلکیں کانپتی محسوس ہونے لگیں۔"

"یہ حقیقت ہے کہ اس کے جانے سے گھر میں بہت سی جگہ خالی پڑ گئی ہے۔" خالہ نے میری بیوی کی ہی بات کو دوسرے لفظوں میں دہرایا۔

"رفتہ رفتہ ہمیں ایسا لگنے لگا ہے کہ تنہا اس کے چلے جانے سے کتنے گھروں، کتنی زندگیوں میں بہت سی جگہ خالی پڑ گئی ہے۔"

"المیہ یہ نہیں کہ بہت سی جگہیں خالی پڑ گئی ہیں بل کہ المیہ تو یہ ہے کہ اس کے بعد طویل خاموشی کا وقفہ بیچ میں آن پڑا۔ مجھے یوں لگا کہ روشن دان سے آنے والی مدھم پڑتی روشنی میں میری آواز تا دیر لرزتی رہی۔"

"آپ دونوں میں سے کبھی کسی نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی کبھی کبھار یہاں چلی آتی ہیں۔"

"کون؟" خالہ پوچھنے لگی۔ اس کی بوجھل آواز سے نیند بھری آواز کی کھڑکھڑاہٹ آنے لگی تھی۔

"ماں۔ مجھے لگتا ہے وہ اپنا کچھ حصہ یہاں چھوڑ گئی ہیں جو لازمی طور پر اس کی نہ ختم ہونے والی یادداشت کا حصہ ہے۔ جسے فراموشی کا کوئی کاری وار بھی ختم کرنے میں ناکام ہے۔"

"اب بھی"...... "شاید تمھارے خوابوں کے ذریعے"...... دونوں نے علاحدہ علاحدہ حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تم بعض دوسرے لوگوں کی طرح خوابوں کا عمل قرار دے سکتی ہو لیکن میں اسے خواب سے تشبیہ نہیں دوں گا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ کچھ اس طرح کی زندگی جینا چاہتی تھی۔ جو وہ جی نہیں سکی۔ شاید اس نہ جی سکی جانے والی زندگی کی خواہش میں بار بار پلٹ آتی ہو...... اسے کچھ برس اور جینا چاہیے تھا اور یہ برس جینے کے لیے اسے سیدھے سپاٹ طریقے سے جینا چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ شاید جس کے لیے وہ راضی نہ ہو پاتی۔ یہ مجھے یقین ہے نفرت اور حسد کی جنگ سے جھوجھتے جھوجھتے بالآخر اس نے ہجرت اختیار کی، اس کی

زندگی جلتے بلتے سورجوں کے نیچے گزری۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کی راہ میں محبت اور رواداری کا کوئی شجر سایہ دار نہیں آیا۔ جہاں وہ ٹھہر کر سستا سکتی۔ اسی باعث اس کی زندگی میں تلخی اور تناؤ آتا چلا گیا۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ذات کو ٹوٹنے اور ٹوٹ کر بکھرنے میں وقت لگا۔ اس کی موت پندرہ برس پہلے بھی ہو سکتی تھی۔ تب ہمارے لیے زندگی کے راستے کس قدر مدھم ہوتے۔ اس نے ہمارے لیے دشوار گزار راستوں کو ہموار کیا اور ہمیں روشن راہوں پہ چلتے دیکھ کر ایک موڑ مڑ گئی۔ وہ موڑ نہ جانے اسے لے کر کیسی گلی میں سے نکلے۔ ایسے جیسے کسی خواب کا سفر ہو جو اس نے طے کیا۔”

خالہ جو ماں کے حوالے سے وہموں، غیر حقیقی اور خیالی دنیا میں داخل ہو چکی تھی، ہزار حیلے بہانے تلاش کر رہی ہوتی کہ جیسے بھی ہو بات کا سرا اماں کے ذکر کے ساتھ جڑا رہے۔

“تمھارا مطلب ہے کہ گھر کی بریدہ دیواروں اور گھن کھائے دروازوں کی چھتوں میں سے وہ تمھارے پاس چلی آتی ہے۔ اپنے گزشتہ، مکمل خدوخال کے ساتھ؟”

“مکمل خدوخال تو وہ گاؤں میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ لاہور آنے کے بعد بے موسم مشقتوں، حبس زدہ تنہائیوں اور گرم لوؤں میں اس کا وجود کملا کر رہ گیا تھا۔ ایک بار جب سیہون شریف زیارت سے ہو کر آئی تو اس کے وجود کی سفیدی، سنولا چکی تھی۔ میں نے اس جانب توجہ دلائی تو غصے میں آ گئی اور روٹھ گئی، کہنے لگی: “ولیوں اور بزرگوں کے روشن مقبروں سے تمھارے لیے ہی تو فیض لینے جاتی ہوں، تم چاہتے ہو کہ وہاں بھی نہ جاؤں۔ سچ تو یہ ہے کہ تمھیں میرے ان روحانی سفروں سے چڑ ہے، تم چاہتے ہو کہ میں گھر میں ہی قید ہو کر رہ جاؤں، شاید تم نہیں جانتے لیکن آج تمھیں بتا دینا چاہتی ہوں۔ تمھارے بارے میں بہت فکر مند رہتی ہوں، جب تمھیں اعمال سے خالی، زندگی کے دکھوں کی کتاب کو ٹھپ کیے بے مقصد قہقہے لگاتے اور دینی معاملات سے بے پروا دیکھتی ہوں تو میرا دل لرز جاتا ہے۔ میں اپنی ساری عبادات کو محض تیری بخشش کی دعاؤں پر لا کر ختم کرتی ہوں۔ اس سے بڑھ کر کوئی صدمہ میرے لیے بھلا کیا ہوگا کہ میرا اپنا بیٹا......اس نے بات مکمل نہیں کی۔”...... “آخر آخر میں تو پوری طرح مذہب کی طرف رجوع کر گئی تھی۔ مذہب کے لبادے میں منافقت کرنے والوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سن سکتی۔ زندگی بھر کے تجربوں کے بعد کچھ لوگوں کے حوالے سے میری باتوں کی کسی حد تک قائل تو ہوئی، پھر بھی پوری طرح نہ تو ان کے بارے میں رائے تبدیل کی نہ ہی ان کے خلاف بات سننے کی روادار۔ اپنے معاملات میں اس قدر راسخ ہو چکی تھیں کہ جب میں نے کہا کہ مذہب ہمیں جھوٹ اور سچائی کے درمیان فاصلہ قائم کرنے کی تلقین کرتا ہے تو کہنے لگی......پھر؟” میں نے کہا: “آپ کو جاننا چاہیے کہ کتنی ہی ایسی سچائیاں ہیں جو جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی ہیں، جن میں سے کئی ایک کی نشان دہی محض دل اور ضمیر کو منصف بنا کر کی جا سکتی ہے! ....”

“اور وہ جو تم اس کے گھر میں آنے کو میرے خوابوں سے جوڑ رہی ہو؟” میں نے اس آخری بات کو

چھوڑ کر پہلے سے ہونے والی بات دوبارہ شروع کردی۔ ”میں تو اس کی باتیں کرنے کے دوران میں بھی اس کی موجودگی کو گہرے طور پر محسوس کرتا ہوں۔ ایسے جیسے یہ میں نہیں، خود وہ بیان کر رہی ہو اور جانتے بوجھتے ان باتوں اور واقعات کی جانب بار بار پلٹتا ہوں کہ میری باتوں میں تم اس کی موجودگی کو ڈھونڈ سکو اور میری باتوں میں موجود اس کی ذات کی سچائی کو پوری طرح کھوج لو۔“

”جیسے تم اس کے بارے میں جانتے ہو، اس کی باتیں کرتے ہو، ہم سب اسی طرح سے اسے جانتے اور سمجھتے بوجھتے ہیں۔“ خالہ نے کہا۔

مجھے خالہ کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی، خالہ کی ذات بھی مجھے اب کچھ کچھ ان لوگوں کی طرح محسوس ہونے لگی تھی جو آپ کے پاس مہمانوں کی طرح آتے ہیں اور پھر آپ کے گھر میں آپ سے بھی بڑھ کر آپ کو ان کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ سب آپ کے ان کے ساتھ موہ کی وجہ سے نہیں ہوتا بل کہ یہ کسی اور سبب سے ہی ہوتا ہے کہ آپ انھیں اپنے آس پاس رہنے بھی نہیں دینا چاہتے اور ان کی موجودگی جو اکثر آپ کو کھلتی ہے اس کو بھی محسوس کیے رکھنا چاہتے ہیں ......اس سے پہلے کہ میرے محسوسات بیوی کے بارے میں بھی کچھ ایسے ہی ہو جاتے۔ میں نے سوچا کہ ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ ہم نیندوں سے بھرے اپنے پپوٹوں کو نیندوں کے سپرد کردیں۔ امانت، امانت دار تک پہنچانا چاہیے۔ ہماری بیداری، ہماری نیندوں کی امانت تھی اور ہماری باتیں ہمارے خوابوں کی۔

باوجود اس کے کہ مجھے گھر کے در و دیوار ماں کی توصیف کرتے سنائی دیتے تھے اور خود اس کی ذات گھر کی ہر ایک شے میں چھپتی نظر آتی تھی۔ میں زمان و مکان کے کسی ایسے کنارے پر کھڑا وقت کا تماشا دیکھ رہا تھا، وقت جو میرے سامنے ساکت و جامد تھا۔ زندگی اور موت کے بیچ ایک ایسی باریک اور پیچیدہ گرہ تھی جس پر میرا ناخن کام کر رہا تھا۔ اس گرہ میں یہ بھید پوشیدہ تھا جو مجھ پر اور مجھ سمیت ہر انسان پر کھل سکتا تھا۔ شاید میری خالہ اور بیوی پر بھی۔ ان بے جان اور بے حس و حرکت در و دیوار پر بھی۔ اور جو مجھ پر کھل چکا تھا میں اسے اپنے آپ پر تو زیادہ واضح، زیادہ بہتر طور پر کھول سکتا تھا اور یہ جان سکتا تھا کہ موت زیادہ پیچیدہ اور سخت عمل ہے بہ نسبت زندگی کے۔ زندگی تو ایک ایسا سہل اور آرام دہ تختہ ہے جس پر بیٹھے بزدل سے بزدل انسان بھی پُرشور اور طغیانی سے بھری سمندری موجوں پر اٹکھیلیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

(۲)

زندگی اور موت کے بیچ موجود باریک اور پیچیدہ گرہ کو اپنے ناخن سے سلجھانے کی کوشش میں چھت پر جانے لگا۔ سیڑھیوں پر پڑنے والی پاؤں کی دھمک بھی وجود کی طرح السائی اور بے ضرر سی معلوم ہوتی تھی۔ میں اپنی بیوی اور خالہ سے یہ کہہ چلا آیا تھا کہ اب باتوں میں ربط برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہے، ہر دوسری بات پر سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ سونا چاہیے، باقی کل دیکھیں گے۔

اور وہ اپنی اپنی جگہ پر نیم دراز ٹانگیں سمٹائے، ہاتھ چہروں پر دھرے ''ہوں''، ''ہاں'' کرتے وہیں پڑی رہیں۔

پاؤں کے انگوٹھے اور ہیر سے جوتی کو کھرچتا، اپنے لباس کو درست کرتا، تنگ سی چھت پر ستاروں کے نیچے کھڑا رہا۔ ستارے اپنے برج بدلتے رہے۔ بدلتے برجوں کی آہٹ سے میں چونک پڑتا۔ میں نے ستاروں کی روشنی میں ہتھیلیوں کی گزرگاہ پر آرپار راستے بناتی لکیروں کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن ستاروں کی روشنی میں یہ ممکن نہ تھا...... مجھے ایسے لگا کہ نیچے کوئی جاگ گیا ہے۔ پھر پکارنے کی آواز آئی، یہ میری بچی تھی۔ میں نیچے آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ حیرت زدہ نظروں سے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے پانی کے بارے میں پوچھا، اس کے مانگنے پر جب پانی لے آیا تو وہ پانی پیتے پیتے ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

''میں سمجھ رہی تھی کہ کھڑکی کی جگہ دروازہ آ گیا ہے لیکن اب جب آپ آئے ہیں تو میرا وہم ختم ہوا ہے اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ یہ دروازہ ہی ہے۔ آپ کھڑکی میں سے تو اندر نہیں آ سکتے تھے ناں...... آپ چھت پر گئے تھے......؟''

''ہاں!'' میں نے جواب دیتے ہوئے اس کی عمر سے زیادہ ذہانت بھری باتوں کے بارے میں ایک بار پھر سوچا۔

''مجھے بھی اپنے ساتھ ہی چھت پر لے جاتے۔ مجھے تارے گننے تھے!''

ایسی ہی کچی پکی باتوں کے دوران میں وہ میرے ہاتھ کو سرہانہ بنائے ایک بار پھر سے گہری نیند میں چلی گئی۔

میں والدہ کے افسوس کے لیے آئے سین کی آمد کے بارے میں سوچنے لگا۔ پورے تین برس بیت گئے لیکن ایسا لگتا ہے کہ ابھی کل ہی کی بات ہو۔ وہ کم و بیش فوتیدگی کے پانچ دنوں کے بعد آیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے جن کے ساتھ میرا واسطہ بھی تھا اور وہ اظہارِ تعزیت کو فرض سمجھ کر آئے تھے۔ جو فاتحہ پڑھنے اور کچھ دیر پھوہڑی پر بیٹھنے کے بعد چلے گئے تھے۔ سین کے ساتھ میرے تعلقات دیگر دوستوں سے بڑھ کر تھے۔ آہستہ آہستہ وہ میرے اس حلقۂ احباب میں شامل ہونے لگا تھا جن کا آپ کے گھر آنا جانا ہوتا ہے۔ خاص طور پر ماں کی زندگی کے آخری ایام میں، یہ آخری ایام جن کے بارے میں سوچنا ہمیشہ تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ سین کا ہمارے گھر آنا جانا زیادہ ہو گیا تھا تاہم پھر بھی ہم گھریلو معاملات سے زیادہ ادبی معاملات پر بحث مباحثہ کرتے، گویا ہمارا سارے کا سارا سروکار ادب اور ادب سے وابستہ لوگوں کے ساتھ ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس سے ماں کے ساتھ بستی میں گزارے ہوئے دنوں کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

''وہ دن ایسے ہیں کہ برابر یا کبھی کبھار ان کے بارے میں سوچا جائے تو زندگی آسان اور آسان سے بھی بڑھ کر خوب صورت ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان دنوں کی روشنی ہماری سوچ کی بینائی کو خیرہ نہیں کرتی

مل کر ایک طرح کی آسودگی اور طراوت بخشتی ہے۔ میں ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں۔"

"تم اس بارے میں کچھ کہہ سکتے ہو کہ ماں کی ذات پر دنیا میں آنے والی تبدیلیاں خاص طور پر پاکستان میں دہشت گردی کے نتیجے میں مرتب ہونے والے نئے بیانیے کے کوئی اثرات مرتب ہوئے؟"

مجھے پتہ تھا کہ سین اپنی گفتگو میں اکثر جھلاہٹ کا شکار رہتا ہے...... اس نے ماں کی زندگی کو ادب کی کوئی صنف سمجھ کر مجھ سے تشریح کرنے کو کہا تھا۔

میں بہت دیر تک خاموش رہا۔ وہ بھی چپ تھا۔

"مستقبل کی جانب لپکتے ہوئے لمحے اور غربت سے کھدڑتا ہوا اس کا گھر...... شاید وہ زندگی سے اس کا جواب چاہتی تھی۔ شاید وہ اس جواب کی حسرت لیے چلی گئی۔"

"ٹھیک کہتے ہو!" اس نے کہا، جیسے اس کے سوال کا درست اور برملا جواب یہی ہو۔

"لیکن مجھے اس بات کا جواب آج تک نہیں ملا...... میں نے رک رک کر کہنا شروع کیا...... کہ ماں دنیا پر دیکھنے کیا آئی تھی؟"

وہ یہاں پر کس سیر کی خواہش میں آئی تھی اور پھر سیر کے بغیر ہی کس کا شکریہ ادا کر کے چلی گئی...... ہاں...... ہم یعنی اس کی اولاد اس کے شکر گزار ہیں۔ البتہ اور تو کوئی اس کی شکر گزاری کیا ادا کرے گا۔ وہ لوگ جن کی خاطر وہ اکثر ہماری ضرورتوں اور خواہشوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ شاید وہ لوگ بھی...... خیر وہ لوگ تو اب ہمارے پاس اس کی باتیں کرنے بھی نہیں آتے، تاکہ اس طرح کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی، وہ ہمارے آس پاس زندہ احساس کے ساتھ موجود رہے، پر جیسے میں آپ کو بتا چکا ہوں، وہ دن اس کی زندگی پر محیط دن، ہمارے احساس میں تروتازہ رہتے ہیں۔ ایک ابدی اور کبھی نہ ختم ہونے والے درد کے ساتھ۔ یوں لگتا ہے ساتھ ہی چارپائی پر لیٹے لیٹے اپنے سینے پر ہلکے ہلکے ہاتھ کو پلوستے ہوئے، جیسے درد اور پیڑا کو کم کرنے کے جتن میں لگی ہوں، احساس کی یہ تصویر تو جیسے میرے ذہن کے فریم میں کھد کر لگ چکی ہو، امر، امٹ۔"

"یہ کون سے لوگ تھے جن کے بارے میں تم سوچتے ہو۔" اس نے گویا کسی ساحل پر بیٹھے بٹھائے گنتی کرتے ہوئے پانی میں کنکر پھینکا ہو، بات نہ کی ہو۔

"بہت سے لوگ تھے، جن میں سے کچھ اب بھی جیتے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو دنیا میں نہیں رہ گئے، سبھی کے بارے میں تفصیل سے بات ہو سکتی ہے لیکن بوریت ہی ہوگی۔ لیکن میں ایک مجموعی بات کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے رویوں اور والدہ کے اپنے غربت کے دنوں میں ان پر اندھے اعتماد کے بارے میں مسلسل سوچنے ہی نے میرے اندر شک کا بیج بویا۔ یہ شک ہی ہے۔ شک کی خصلت جو مجھے اپنے آس پاس کے ہر انسان کو کھکھیڑنے پر مجبور کرتا رہتا ہے اور وہ جو تم مجھ سے اکثر پوچھتے رہتے ہو ہر عمر اور ہر صنف کے انسان سے بات کرتے ہوئے میں مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہتا ہوں۔ اس کے پیچھے بھی کوئی اور عمل نہیں، شک کی

بناپر سامنے والے لڑکو کھکھیڑ نے کی میری یہی عادت ہی تو ہے اور یہ ان محدود باتوں میں سے ایک بات ہے جسے میں نے ماں کی زندگی پر غور کرنے کے بعد سیکھا اور اپنا لیا۔ یوں کہ زندگی کا لازمی جزو بنا لیا۔ اب آپ یا کوئی اور جو مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ میں اسے مسلسل تاڑ رہا ہوں تو اس کے پیچھے شک کی یہی عادت ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ......!"

"یعنی ......تو ......اچھا تو یہ اس لیے ہے۔ میں بھی کہوں کہ ہمارے یہاں کوئی انسان عموماً ایسا نہیں کرتا، یہ ہمارے خطے کی تہذیب ہی نہیں۔"

اس نے باتوں ہی باتوں میں مجھے تہذیب سے عاری بھی قرار دے ڈالا۔

☆☆☆☆

محمد عاصم بٹ

مٹھوابلیین (عرف ٹیڈی بکری، عرف خام خلائی)

پہلی بار اندازہ ہوا کتنا مشکل ہوتا ہے خود کو ہیرو بننے سے روکنا۔ اور اس سے زیادہ کٹھن ہے، ہیرو بننے کی خواہش کو لگام دینا۔ کتنی عام سی خواہش ہے اور کتنا نایاب ہے اس کا بر آنا۔

اونچی اونچی دیواریں ہیں، سرخ اینٹوں سے بنی ہوئیں۔ نہ کوئی کھڑکی، نہ دروازہ، سیدھی سپاٹ، غیر جاذبِ نظر۔ آگے کوئی چالیس قدموں کے فاصلے پر ایک موڑ ہے، جہاں فٹ پاتھ گولائی میں بائیں طرف مڑ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سڑک ہے، لیکن سڑک صرف مڑتی نہیں ہے، تقسیم بھی ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک شاخ چلی جاتی ہے، ٹمپل روڈ کی طرف، ایک دائیں جانب کھسک جاتی ہے، مزنگ کی طرف، درمیان میں ایک کھلا چوک ہے جس کی کشادگی کا آپ کو دن میں صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ ٹریفک ہر طرف سے اس میں آ کر ٹھہری رہتی ہے جیسے استراحت فرما رہی ہو، کتنی دور سے چل کر یہاں صرف اسی مقصد کے لیے آئی ہو، لمبی دوڑ لگانے سے پہلے سانس درست کر رہی ہو۔ چوک سے ذرا ہی آگے نکلو تو چاروں سمتوں میں سڑکیں کافی کشادہ ہیں اور ٹریفک ان پر ہمہ وقت رواں دواں۔

آدھی رات تک سفر کرنے کے بعد چاند یہاں چوک کے اوپر قیام کرتا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے اطراف کے کھمبوں پر لگی لائٹیں روشن ہوں تو اجالا سارے میں بھر جاتا ہے، چوک کسی سٹیج کا مرکزی مقام بن جاتا ہے، جہاں سبھی روشنیاں مرتکز ہوں۔ گنگا رام ہسپتال کے گیٹ کے برابر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ایسے وقت میں چوک کو دیکھیں تو آپ تماشائی ہوں گے، تماشا شروع ہونے کے منتظر۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے۔ میں لمبا سفر کر کے، یہاں پہنچتا ہوں۔ ندیم کیمسٹ کے تھڑے پر بیٹھ کر سامنے برٹش کونسل کی اونچی دیوار کو تکتا ہوں جس کی منڈیر پر چاند ٹکا ہوتا ہے۔

دوپہر میں سفید آگ سے آنکھیں چندھیانے اور ماس جلنے لگتا ہے، تو اس سے بچاؤ کے لیے یہ چوک آخری پناہ گاہ تک پہنچنے کا واحد راستہ بن جاتا ہے۔ برٹش کونسل کی لائبریری کی عمارت تب سرخ نہیں سبز معلوم ہوتی ہے، اور اس کے اندر دل جیسا دھڑکتا ہوا ریڈنگ روم اپنی آغوش میں لینے کی بے چینی میں مبتلا، عمارت سے باہر نکل نکل پڑتا ہے۔ وہ آپ کو لوری سناتا ہے، مسکراتا، لبھاتا، آپ کو اپنا دیوانہ بنا لیتا ہے۔

بڑے بڑے صوفے ہیں، سامنے میزوں پر رنگوں اور تصویروں سے مزین انگریزی رسالے، اخبار، کتابیں، نقشے، کتابچے بکھرے پڑے ہیں۔ اردگرد کتابوں سے لدی پھندی الماریاں ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کی

عارضی ملکیت میں ہیں۔ انھیں دیکھئے، منتخب کیجیے، استعمال میں لائیے، نظر انداز کردیجیے، آپ ظالم حاکم ہیں اور یہ آپ کے مظلوم عوام۔

صوفوں اور کرسیوں کے برابر بڑے حجم کے لیمپ لگے ہیں، انھیں آن کرلیں، بٹن آپ کے ہاتھ کی رسائی میں ہیں، خود کو نیم دراز کرلیں۔ ہلکا ہلکا سرد ماحول ہے، استراحت فرمائیں، سب کچھ بھول جائیں۔

پڑھنا اصل مقصد نہیں ہے، کتابوں کے ساتھ رہنا، انھیں سامنے رکھ کر اپنے بارے میں سوچنا، کہیں کھو جانا، کچھ یاد کرنا، کسی غم کے بوجھ سے بھاری اور کسی خوشی کی یاد سے ہلکے پھلکے ہوجانا ہی اصل مطمح حیات ہے۔ ایک ان لکھا، ان کہا مقصد، ایسی کیفیتوں کی طرح جنھیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، لیکن بیان کرنا مشکل ہے۔ تو میں کوئی بھی کتاب یا رسالہ اٹھالیتا ہوں میز پر سے۔ جیسے یہی جیوگرافیکل سوسائٹی میگزین۔ واہ واہ، ساؤتھ ایسٹ ایشیا نمبر۔ سرورق پر دھندلے بادل، نیم تاریک آسمان اور بجلی کی کوند۔ عجیب سرورق ہے۔ میں اس کی ورق گردانی کرتا ہوں۔

مہابھارت، حقیقت یا افسانہ۔ عجیب عنوان ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ویاس، کرشن، ارجن، دھریودھن، اور دھروپدی۔ بھلے ہی ان کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ حقیقت سے کیا مراد ہے؟ جو کچھ کہ ممکن ہے، ممکن ہوسکتا ہے، سب حقیقت ہے۔

کرشن کی بھگوت گیتا، اور ویاس کی مہابھارت، حقیقت کی اعلیٰ صورتیں۔ ساڑھے چھ صفحوں کا مضمون، تین کالمی، باریک لکھائی۔ تصویریں بھی ہیں، ارجن اور کرشن ایک رتھ میں سوار، دھروپدی اپنے پانچ شوہروں کے ساتھ، کرشن اپنے وشوا روپ میں بارہ چہروں کے ہمراہ۔

حقیقت یا افسانہ، کیسی فضول بات ہے۔ افسانہ حقیقت ہے، اور حقیقت افسانہ۔

ٹیکسلا، ہڑپہ، موہنجو داڑو۔ قدیم تہذیبیں جن کا عجیب رسم الخط، پڑھا ہی نہیں جاسکا۔

رامائن اور لاہور۔ سیتا یہیں ماری ماری پھرتی رہی، مضمون ہمیں بتاتا ہے۔ آپ اپنے اردگرد دیکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، یہیں کہیں، بہت پہلے۔ سیتا نے دو بچوں کو جنم دیا، ایک کش، دوسرا لوہ، ایک کا نام قصور سے اور دوسرے کا لاہور سے جڑا ہوا ہے۔ والمیکی نے رامائن لکھی جو کبھی ایک ڈاکو تھا لیکن اس کی جی میں جانے کیا سمائی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ دنیا کو تیاگ کر جنگلوں میں آن ڈیرہ جمایا۔ یہیں لاہور کے آس پاس کے کسی جنگل میں۔ کویتائیں لکھتا تھا، کشکول ہاتھ میں لیے، بستیوں کی راہ لیتا، بھکشا لیتا اور لوٹ آتا۔ یونہی جیون سماپت ہوجاتا، اگر اسے ابھاگی سیتا نہ ملتی۔ اور تبھی وہ جان پایا کہ اس کے بستیوں سے دور اس جنگل میں آ بیٹھنے کے پیچھے اصل کہانی کیا تھا، جس سے وہ اب تک بے خبر تھا۔ یہی کہ وہ سیتا کو آتم ہتیا کرنے سے روک سکے اور اس کی بپتا کو قلم بند کرسکے، اسے پوری دنیا تک پہنچانے کے لیے، رامائن کی صورت میں۔

اس نے رسالہ بند کردیا، ایک دم سے جیسے رسالے سے بندھا کوئی تار ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے خود کو

صوفے کی نرم اور پرگداز پشت میں دھنسا لیا اور آنکھیں موند لیں۔ اب وہ سارے برٹش کونسل میں سیر کرسکتا تھا۔ یہ ایک دلچسپ کھیل تھا۔ بظاہر صوفے میں بیٹھا ہوا لیکن بباطن ہر سو سرگرداں۔

برٹش کونسل کی لال عمارت کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوں تو لوہے کی موٹی زنجیر راستے کے آر پار لیٹی ہوئی ہے، دونوں طرف سے دو پستہ قد کھمبوں کو تھامے ہوئے۔ کبھی یہ تنی ہوتی ہے، آپ کو پیر اٹھا کر اسے پھلانگنا پڑتا ہے۔ تو چاہے اسے بالکل ہی نہ چھوئیں۔ یہ جھنجھناتی ضرور ہے۔ ہر آنے والے کو 'جی آیاں نوں' کہتے ہوئے۔ چاہے لیٹی ہوئی ہو۔ اس کی جھنجھناہٹ سنائی نہ دے، محسوس ہوگی۔

اسے لال عمارت سے باہر لائیں تو سانپ بن جائے گی۔ لال عمارت کی دیوار اس کے گرد کھنچے دائرے پر استوار ہے۔ یہاں یہ کیلی گئی تھی۔ سانپ کی جون سے لوہے میں ڈھالی گئی تھی۔ یہ ہماری شام کی محفلوں کے شریک کار خام خلائی عرف مٹھو ٹیڈی بکری یا مٹھو ایلین کی ایک دُرفنطنی ہے۔ اس سے منسوب ایسی کتنی ہی درفنطنیاں اور بھی ہیں۔ لیکن میں نے اس کی ہر بات کو حقیقت سمجھ لینے کی خواہش محسوس کرتا ہوں اور اس زنجیر کو یونہی دیکھتا ہوں۔ اس میں ہر صورت میں دکھائی دینے کی اہلیت موجود ہے۔

خام خلائی کو آپ نہیں جانتے۔ اس کا اصل نام جو اس کے شناختی کارڈ میں لکھا ہے، اسے علاؤالدین عرف مٹھو قرار دیتا ہے۔ ہم اسے مٹھو پکارتے تھے، کوئی کوئی ٹیڈی بکری بھی کہتا جس کا وہ ہرگز برا نہ مانتا تھا۔ لیکن پھر جب سے اس نے سائنس اور فلکیات وغیرہ میں دلچسپی لینی شروع کی تھی، اسے پہلے خام خلائی اور پھر اتفاق رائے سے مٹھو ایلین پکارا جانے لگا۔ خام خلائی کے قلمی نام سے تو کچھ عرصہ اس نے ہمارے ہی اخبار میں کالم بھی لکھا تھا۔

ہماری شام کی ٹولی مزنگ کے کھبا ہوٹل میں بجتی تھی یا ٹمپل روڈ کے تھڑا ریسٹورنٹ پر، ہر دو جگہ وہ موجود ہوتا۔ مشتاق چھرا کہتا تھا کہ یہ ہر دو جگہ بیک وقت موجود ہوتا تھا۔ چاہے دوسری جگہ کوئی بندہ بھیج کر دیکھ لو۔ وہ اس کی ساری ایچی پیچی جانتا تھا۔ اسے قریب قریب ایک ایلین ہی ثابت کرنے پر مصر تھا۔ میں اس سے آخری اخبار الحمرا کو چھوڑ دینے سے کچھ دیر پہلے واقف ہوا تھا۔ مشتاق اس کی خبر لے کر آیا تھا۔

''ہاف پیج کی سٹوری ہے باواجی،'' مشتاق چھرا نے دعوۃ کہا تھا۔ پھر اطلاع دی کہ ''تمھارے پیچھے لگا دیا ہے، کہیں نہ کہیں ٹکر جائے گا۔'' یہ مجھ سے برٹش کونسل لائبریری میں آکر ملا۔

''ہیلیو لیبارٹری۔'' برٹش کونسل کی لال عمارت کے بارے میں مٹھو نے فوراً ہی انکشاف کیا۔ بقول اس کے یہ بات اس نے عمارت میں داخل ہونے سے بھی پہلے معلوم کرلی تھی، اتنے حساس تھے اس کے سنسر۔

'درختوں کے پتے ان کے کیمرے ہیں۔ گھاس مائیکروفون، اور اڑنے اور رینگنے والے حشرات الارض ان کی سراغ رساں مشینیں۔ کتابوں میں گمراہ کن معلومات اور تصاویر موجود ہیں، ریڈنگ روم کی ٹھنڈک میں بے ہوشی اور خوابیدگی کی دوا ملی ہوئی ہے، باہر مین گیٹ کی زنجیر، ایک سنسر ہے، اطلاع دیتا ہے، آنے والے

کے بیک گراؤنڈ، اس کے کردار کے بارے میں۔ پورا نفسیاتی تجزیہ کار۔ اندر دفتروں میں جہاں طلبا جوق در جوق جاتے ہیں کاؤنسلنگ کے لیے، اصل میں ان کی لیبارٹریز ہیں، جہاں دھڑا دھڑ انسانی ٹشوز اور سپرمز پر ریسرچ ہوتی ہے، آس پاس سب ایلینز ہیں۔ اس نے بازو گھما کر ساری عمارت کو اپنے احاطے میں لیا اور ایک ہی وار میں سب کا قصہ پاک۔

ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں تھا کہ ان معلومات تک رسائی پائے۔ سارا کمال اس عینک کا تھا۔ اس کی آنکھوں پر جمی ہوئی، سیاہ شیشوں والی عینک، جو اسے ایک خاص ترکیب سے کسی پٹھان بچے سے ملی تھی۔ وہ پٹھان بچہ یکبارگی کہیں سے نمودار ہوا تھا، اچھرا چوک میں، نہ کبھی پہلے وہ کہیں دکھائی دیا، نہ اس کے بعد۔ بس عینک اسے دی، اور غائب۔

عینک کیا تھی، کیمرہ تھا، سنسر تھا، ہائی کوالٹی کا۔ حتی کہ رات کو بھی اسے اس میں سے ہر شے بالکل واضح اور روشن دکھائی دیتی، گو بظاہر دھوپ کی عینک جیسی لگتی۔ اس نے عینک اتار کر اس کی کمانیوں میں ایک جگہ جہاں کسی کمپنی وغیرہ کا نام لکھا تھا، انگلی سے چھو کر بتایا کہ اس کے اندر چپ لگی ہوئی ہے۔ نظر نہیں آتی، یہی تو کمال ہے، جینئین ٹیکنالوجی۔ پورا کمپیوٹر ہے یہ عینک۔ چلتی پھرتی مشین۔ مائیکرو چپ جیسی ایکس رے مشینیں شیشوں کے اندر فٹ ہیں، بندے کے آر پار سب دیکھ لیتی ہیں۔ شناخت کر لیتی ہیں کہ کون ہیومن ہے، کون ڈیمن، اور کون ایلین۔

ہماری تو چائے حلق سے نیچے نہیں اترتی، شام کوئی اچھی نہیں گزرتی جب تک خام خلائی ایسی کسی دھانسو قسم کی چالو تھیوری کا تڑکہ نہ لگائے، دھونی نہ رمائے۔

تو ایلینز ہمیشہ سے یہاں ہیں۔ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی پہلے آئے تھے، انھیں ہم ڈائنوسارز کے طور پر جانتے ہیں۔ پھر انھوں نے زمین کو فراموش کر دیا۔ حادثہ بھی تو اتنا بڑا ہوا تھا۔ سارے ہی جو یہاں تھے، مارے گئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اصل میں کیا ہوا تھا۔ بس تباہی اور بربادی اس کا نتیجہ تھی۔ تو ان میں سے جو بچ گئے، وہ کبھی ادھر نہیں لوٹے۔

اب ان کی اگلی نسلیں پلٹ کر آئی ہیں۔ انسانوں کی ترقی نے ان کی آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ اس بار وہ کسی غلطی کو دہرانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں۔ ہر شے پر قبضہ جمانے کی نیت سے۔ جیسے کوئی ولایت گیا ہو، اور لوٹے تو اس کا حلیہ ہی بدل چکا ہو، خوب دولت سمیٹ کر لایا ہو۔ تو ایسے ہی یہ ایلینز ہیں، ان لاکھوں برسوں میں انھوں نے بھی خوب ترقی کی ہے۔ اتنی ترقی کہ اب وہ انسانوں کو اپنا مطیع بنانے کا گُر سیکھ گئے ہیں، اسی کو ہم پر آزمانے آئے ہیں۔ ان کی آوت جاوت انتہائی خفیہ ہے، سات پردوں میں چھپی ہوئی لیکن خام خلائی کی نظر سے کچھ چھپا نہیں رہ سکتا۔ اسے سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ ہر بات اس کے علم میں ہے۔ یہ ساری معلومات وہ جرعہ جرعہ ہم تک پہنچاتا ہے، ہماری حیرتوں کی انتہا تک ہمیں آزماتا

ہے۔

سبھی ایلینز ایک جیسے نہیں ہیں۔ جیسے سبھی انسان ایک جیسے اچھے یا برے، باخبر یا بے خبر نہیں ہیں۔ اچھے ایلینز بھی ہیں اور بدکار، بدخصلت ڈیلین بھی۔ اپنے اپنے سیاروں سے، جو ہمارے سیارے سے، تم لگا لو کہ اربوں سال کے سفر کی دوری پر ہیں، جب کہ یہ سفر تیز سے تیز رفتار جیٹ جہاز پر کیا جائے، تب کہیں جا کر اتنے وقت میں پورا ہو، تو ان سیاروں سے یا تو یہ بھاگے ہوئے مجرم ہیں، یا پھر انھیں سزا کے طور پر ان سیاروں سے نکال پھینکا گیا ہے۔ انھیں 'نیلے پانی' کی سزا دی گئی ہے۔ نیلا پانی یعنی ہماری زمین۔ یا پھر یہ کھوجی ہیں، سیاح، سفر کے شوقین، مہم پسند۔

ان میں کچھ تو بہت ہی نیک سیرت ہیں، حد سے زیادہ پاک نیت ایلینز۔ انھیں 'ویلینز' کہتے ہیں۔ جیسے ہمارے ولی اللہ ہوتے ہیں، یا پیر سنت۔ خدا سے لو لگائے ہوئے، کہ ان کا بھی کوئی خدا تو ہوگا۔ وہ یہاں قدم رنجہ فرماتے ہیں، ہم انسانوں کو گمراہی سے بچانے، راہ راست پر چلانے، ہدایت اور نیکی کی روشنی دکھانے، اپنے جیسا نیکوکار ایلین بنانے۔

خام خلائی گہرا سانس بھر کر بتاتا کہ مسلسل بڑھ رہی ہے، ان میں ہیومیلینز کی تعداد، جو اصل میں انسان ہی ہیں، لیکن انھیں ایلینز بنا لیا گیا۔ وہ ہم میں سے تھے، لیکن اب نہیں رہے۔

بظاہر ہم جیسے ہی لگتے ہیں، ہماری طرح چسکیاں لے کر چائے پیتے ہیں، فٹ پاتھوں پر بیٹھتے ہیں، جمائیاں لیتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں، لیکن اصل میں وہ انسان نہیں ہیں۔ اور کتنے افسوس کی بات ہے کہ ان میں سے بہت سوں کو خود بھی اس بات کا علم نہیں ہے کہ کیسا انقلاب ان کی شناختوں کو روندتا ہوا گزر گیا اور وہ کیا سے کیا بن گئے۔ افسوس صد افسوس، وہ اسی بے خبری میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ خام خلائی انھیں شناخت کرنے اور پھر انھیں اپنے بارے میں آگاہی دینے کی ترکیب جلد ہی منظر عام پر لایا چاہتا ہے۔

اس نے عینک اتار کر فضا میں لہرائی، جیسے سپاہی اپنا ہتھیار کسی طرح کی فتح کی خوشی میں لہراتا ہے، اور ازراہے عنایت کچھ دیر کے لیے وہ عینک مجھے مستعار دی۔

دھندلا دھندلا منظر دکھائی دیا۔ دوپہر کے بجائے سہ پہر معلوم ہوئی۔ لوگوں کے چہرے پھیکے، دھندلے اور پانی سے پھیلی ہوئی سیاہی والے حروف کی طرح مائل بہ فنا نقش معلوم ہوئے۔ مجھے تو نہ ایلین دکھائی دیے نہ ہیومن۔ منظر ہرگز وہ نہیں تھا، جیسا عینک کے بغیر دکھائی دیتا تھا، خام خلائی سچ کہتا تھا، یہ منظر دیگر تھا۔

''کوڈ ہوتے ہیں۔ بلُو جی۔ کوڈ۔'' وہ بتا رہا تھا، اس کا کوڈ الگ تھا، میرا الگ۔ اس کی عینک اس کے کوڈ سے، اور جو میری عینک ہوگی، وہ میرے کوڈ سے کام کرے گی۔ اس نے پھر سے عینک پہن لی اور مجھے غور سے دیکھا۔ میں اس سے نظریں چرانے لگا۔ اپنے کوڈ کے ساتھ دیکھ رہا تھا کیا پتہ کیا دیکھ رہا تھا۔

“چڑیلیں، ڈائنیں، جن بھوت۔ دماغوں میں گھسے ہوئے ہیں یہاں۔ دنیا کہاں کی کہاں پہنچ گئی استاد، اور یہ کنویں کے مینڈک۔ ٹرٹرٹر۔ وہ دیکھو۔۔”

اس نے ایک طرف اشارہ کیا، میں نے اس کی انگلی کی سمت میں دیکھا، کاؤنسلنگ آفس سے سٹوڈنٹس کا ایک ٹولہ باہر نکل رہا تھا، بیس بائیس سال کے لگ بھگ عمریں تھیں ان سب لڑکیوں لڑکوں کی۔ لڑکوں نے لمبی نیکریں، ٹی شرٹس لڑکیوں نے بیشتر ٹخنوں سے اوپر تک اٹھی ہوئی جینز اور بغیر بازو کے ٹی شرٹس پہنی ہوئی تھیں۔ کسی ایک ہی سکول کے معلوم ہوتے تھے۔ کسی بات پر جو ضرور اندر کاؤنسلنگ سنٹر میں ہوئی ہوگی، وہ سبھی ہنس رہے تھے۔

“ہیومیلینز۔۔۔ ہتھے چڑھ گئے۔ یورپ تو سارے کا سارا ہیومیلین بن گیا ہے۔ مشرق والے ذرا پسماندہ ہیں۔ ان کی باری اب آئی ہے۔ زیادہ محنت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہزار راستے ہیں ان کو جال میں پھنسانے کے۔ کیوں؟”

ایک ایلین نما بیرا جس کی بہت چھوٹی عمر میں بڑی عمر والوں کی طرح مونچھیں ہونٹوں کی اوپری کناروں پر ابھر رہی تھیں، ڈسپوزیبل گلاسوں میں چائے لایا، جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یہ آرڈر میں نے تو نہیں دیا تھا۔

اس نے بے دھیانی میں گلاس بیرے سے لیا اور فوراً ہی چسکیاں لینے لگا۔

جب تک کہ وہ جتھا درمیانی چوڑی روش سے ہوتا ہوا، عمارت کے خارجی دروازے سے باہر نہیں نکل گیا، باہر کی دنیا میں جہاں ان کا شکار وافر تعداد میں ان کا منتظر تھا، خام خلائی مسلسل بولتا اور انھی پر نظریں جمائے رہا۔ ہمارے ملاقات رات گہری ہونے تک جاری رہی۔ اس دوران میں ہم مال روڈ پر فورٹریس سٹیڈیم کے سٹاپ سے لے کر چیرنگ کراس تک پیدل گھومتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ تھک گیا اور الفلاح بلڈنگ کے عقب میں روپوش ہوگیا۔ میں انارکلی سٹاپ تک پھر سے پیدل آیا۔ یہیں بہت دنوں کے بعد پھر سے میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔

ایک پرانی انارکلی ہے، ایک نئی، حالاں کہ دونوں پرانی ہیں۔ نئی کو بھی سو سال تو ہو گئے، تعمیر ہوئے۔ کمرشل مارکیٹ انارکلی کا سب سے معروف اور مصروف بازار ہے، اس کے سرے پر ریفریشمنٹ سنٹر، اور برابر ہی فالسے، مالٹے، انناس وغیرہ کے جوس کا بڑا مرکز ہے جو بہت چلتا ہے۔ اس سے آگے چلڈرن پارک ہے، پھر چمن آئس کریم، گرمیوں کی خاص سوغات۔ لیکن سب سے زیادہ معروف ہے فالسے کا جوس۔ آپ کے ہونٹوں پر جامنی رنگ کی مہین تہہ جما دیتا ہے، گرمی سے بچنے کی آپ کو راہ سجھاتا ہے۔ آپ کہیں بھی جا رہے ہوں، اپنی خوشبو اور رنگت کے جادو سے اپنی طرف بلاتا ہے۔ رجھاتا ہے۔ جیب بھری ہو تو آپ اس کی طرف بڑھتے قدموں کے پیچھے چلے جاتے ہیں، خالی جیب والے دور سے قریب آ جاتے ہیں، اس کی دید ہی سے اپنی

پیاس بجھاتے ہیں۔ تو میں نے مٹھوا ایلین کو وہاں جوس پیتے دیکھا۔ الیاس اسے ایجنسیوں کا آدمی کہتا ہے۔ الیاس کی عادت ہے، ہر واقعے اور شخص، جو اسے پسند نہ ہو، کے ساتھ ایجنسیوں والی پخ لگا دیتا ہے۔

میرے وہاں پہنچنے تک وہ فالسے کے ایک مزید گلاس کا آرڈر دے چکا تھا۔ اس نے عینک بدستور پہنی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا اس سے ضرور پوچھوں گا کہ میں اس میں کیسا دکھائی دیتا ہوں۔ اور کیا کوئی ایسی بات بھی عینک سے معلوم کی جا سکتی ہے کہ کس میں کچھ اور بننے کے، یعنی ہیومیلین وغیرہ بننے کے، کتنے جراثیم ہیں، کسے پھنسانا آسان ہے، کسے کچھ مشکل۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی اس نے۔ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں جو ہم نے کمرشل مارکیٹ میں جانے کتنے ہی چکر لگانے، اور پھر کچھ دیر چلڈرن پارک کی گھاس پر بیٹھنے اور آخر میں رحمان آباد کے سٹاپ کا طواف کرنے میں صرف کیے، جہاں سے وہ بس میں بیٹھ کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا، وہ مجھے اپنے گرینڈ پلان کی تفصیلات بتاتا رہا جو اس نے ایلینز کے مذموم ارادوں کے سدباب کے لیے کئی راتوں کی بیداری و مغز ماری کے بعد تیار کیا تھا۔ کسی ایک جگہ کھڑے ہو کر اس موضوع پر بات کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دشمن کے جاسوس جن کی ہر جگہ موجودگی سو فیصد یقینی تھی، ضرور ہماری اور خاص کر اس کی تاک میں تھے۔ اس کے گرینڈ پلان سے متعلق خبر کیا دشمنوں تک نہیں پہنچ گئی ہو گی، جن کی حسیات کسی بھی انسان سے زیادہ تیز تھیں۔ درختوں کے پتے تک ان کے خبر رساں تھے۔

اپنی رہائش گاہ پر وہ ایک گرینڈ 'دشمن نقشہ' تیار کر چکا تھا کہ کہاں کہاں دشمن کتنی طاقت کے ساتھ موجود تھا۔ چند ایک ہتھیار بھی اس نے ڈیزائن کر لیے تھے۔ الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے اس نے پہلے تو ناصر باغ جانے کا ارادہ ظاہر کیا جہاں اس کی چرس نوش ٹولی اس کی منتظر تھی لیکن پھر کچھ سوچ کر فیصلہ بدلا کہ اسے گھر واپس جانا چاہیے۔ مجھ سے درخواست کی کہ بس سٹاپ تک اس کا ساتھ دوں، اور پھر جب تک بس چل نہ پڑے اور نظروں سے اوجھل نہ ہو، سٹاپ کے کیبن سے باہر نہ نکلوں۔ اپنا مورچہ نہ چھوڑوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

اسحاق ٹیلرز کے سامنے بائبل سوسائٹی ہے جس کی دیوار کے ساتھ ساتھ پرانے ملبوسات کی عارضی دکانیں قائم کی گئی ہیں۔ میں اپنے لیے جرابیں تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا، ایسی جرابیں جو لچک دار ہوں، زیادہ موٹی نہ ہوں، ریشمی تو بالکل نہ ہوں، پسینہ جذب کر لیں، اور بہتر ہے جالی دار ڈیزائن کی ہوں۔ مزید یہ کہ سستی بھی ہو۔ اتنی شرطوں کے ساتھ کسی بھی شے کی تلاش کتنی دشوار ہو سکتی ہے، یہ تو کوئی مشروط خریداری کرنے والا ہی جانے۔

مقصد میں ناکامی کے احساس سے بوجھل میں دکانوں کے جال سے باہر نکلا، گہرا سانس لیا، آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور یہ سوچ لینے کے دوران میں کہ مجھے جرابوں کی کوئی حاجت نہیں تھی، میں نے اسے یعنی

خام خلائی عرف ٹیڈی بکری عرف مٹھو ایلین کو اولڈ بک شاپس کی گلی سے باہر آتا دیکھا۔ وہ بہت پر جوش معلوم ہوتا تھا۔ سید حامیری طرف آیا اور قریب آ کر سانس ہموار کرنے میں کچھ وقت لیا۔

ایک پرچی چرمرکی ہوئی جیب میں سے نکال کر میری طرف بڑھائی، 'اسے چھپوا دو'۔ میرے لیے اس پر کھنچی لکیروں میں سے کوئی مفہوم اخذ کرنا دشوار تھا۔ اس نے پرچی مجھ سے چھینی اور پڑھنے لگا۔

"ایلینز، ہشیار باش۔
آس پاس،
میں ہوں ایلینز کلر، تمھاری موت۔
ایک دو تین چار پانچ چھ سات۔ دن نہیں ہیں اب زیادہ تمھارے پاس۔
تم جہاں کہیں بھی ہو، میں بھی وہیں ہوں۔
سایے کی طرح تمھارے پیچھے، کبھی اوپر کبھی نیچے۔
شیطانوں کا بےتاج بادشاہ، اس پر ہے میرا قبضہ۔
ہر جادو کا توڑ، مؤکلوں کا زور
میں ہوں کون؟ مؤکلوں کا امیر، 'امیر المؤکلون'
تمھاری گردنیں کاٹ کر، تمھارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے،
سوت کی بوریوں میں، پلاسٹک کے لفافوں میں بند کر دوں گا۔
پھر انھیں آگ لگا دوں گا، سمندر کے کنارے۔ جب ہواؤں کا رخ شمال کی طرف ہو گا۔
ایلینز ہوشیار، تمھاری موت کی پکار۔"

ایک سے زائد مرتبہ اس نے یہ اشتہار لہک لہک کر سنایا۔

میں نے وہ چرمر کیا ہوا کاغذ اس سے لے کر اپنی جیب میں رکھا اور پوچھا اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ اس کے مسائل جن میں ایلینز کا قلع قمع کرنا اہم ترین تھا، اس کی شادی نہ ہونے کے کالیے سے جڑے معلوم ہوتے تھے۔ اس کے سیاہی مائل گالوں میں سرخی کی مہین لہر دوڑ گئی۔ دیر تک مراقبے میں رہنے کے بعد اس نے سر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ اس کی قمیص کے اوپر کے دو بٹن سرے سے موجود ہی نہیں تھے، اور اس کے میلے کچیلے لباس میں سے بساند اٹھ رہی تھی۔ شاید مہینوں سے وہ نہایا نہیں تھا، اور سر کے بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی تھی۔

اس نے فٹ پاتھ کی نکڑ پر ایک بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا 'سپیلنگ ہی ٹھیک نہیں ہوتے۔ ان پر۔"

میں نے وہ بورڈ پڑھا، لکھا تھا "گلی کے اندر اور سڑک کے اوپر

گاڑی پارک کرنا منع ہے۔"

اس کی انگلی کی بدلتی ہوئی سمت میں دیکھا۔ بورڈ پر 'Rehman Resturent' لکھا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا "تو پھر شادی کیسے ہو؟"

آس پاس کتنے ہی بورڈ ہجوں اور زبان کی غلطیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

"دنیا جہان کی نائیاں' ایک دکان کے باہر بورڈ کی عبارت تھی۔

پھر ایسا دھیان ان بورڈوں کی طرف ہوا کہ ہٹائے نہیں ہٹتا تھا۔ مٹھو ایلین تیرا بیڑا غرق ہو، اپنی طرح اوروں کو بھی چکرا کر رکھ دیا ہے۔ اب کوئی بورڈ چاہے وہ کتنا چھپا ہوا ہی کیوں نہ ہو، میں نظر میں آئے بغیر جانے نہ دیتا تھا۔ پڑھتا ضرور تھا۔

'عورتوں سے لے کر مردوں تک سب کی سلائی ۔۔۔ چاہے تھوڑی کمائی، سستے ریٹ، کام گریٹ۔'

یہ بورڈ تو خوب چھپایا گیا ہے، لکھا ہے:

"ہمارا دعوی ۔۔

دنیا میں کوئی لڑکی ایسی نہیں جو پٹائی نہ جا سکے ---------
کوئی دیوار ایسی نہیں جو گرائی نہ جا سکے
کوئی دشمن ایسا نہیں جو مار بھگایا نہ جا سکے"

بس اتنا ہی بورڈ سڑک کی پرلی طرف پیپل کے پھیلے ہوئے درخت کے پیچھے سے پڑھا جاتا تھا۔

ٹریفک سڑک پر جیسے چڑھ دوڑی تھی۔

"سانپ کا ڈسا پانی مانگ سکتا ہے، ہمارا ڈسا نہیں۔" دائیں طرف جھک کر دیکھنے سے ایک سطر اور دکھائی دی۔ میں سڑک پار کرنے کا موقع ڈھونڈھتا رہا۔ پورا بورڈ پڑھ لینے کی پیاس سے حلق سوکھ کر کانٹا ہوا جاتا تھا۔ دیر تک انتظار کیا کہ ٹریفک کی دیوار سامنے سے ہٹے، میں سڑک فتح کر لوں۔ لیکن ٹریفک بھی جیسے پوری تیاری میں تھی۔ مجال ہے اس نے معمولی سا بھی موقع دیا ہو۔ مایوس ہو کر لوٹ آیا۔

دو مہینے بعد یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا ہوگا اس سے ملاقات ہوئے کہ جب خام خلائی کی اطلاع ملی کہ وہ میو ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں تھا۔ گلبرگ فوارہ چوک میں ایک موٹر سائیکل سے اس کی ٹکر ہوئی تھی۔ موٹر سائیکل سوار کو چوٹیں آئی تھیں لیکن خام خلائی، جو اس پر بھاگتا چلا آیا تھا، ٹکرا کر پرے جا گرا اور فوارے کی منڈیر سے جا ٹکرایا۔ جیسے ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا وہاں پہنچا ہو، ایسا سبھی چشم دید گواہوں نے دیکھا۔ موٹر سائیکل جہاں گری، اس مقام اور فوارے کی منڈیر کے درمیان کوئی پچاس قدموں کا فاصلہ تو ہوگا۔

مجھے بسم اللہ سٹور والے نجیب نے یہ خبر دی۔ اسے مشتاق چھرے نے فون کیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہسپتال والوں کو خام خلائی کی جیب سے مشتاق چھرے کا وزیٹنگ کارڈ ملا تھا۔

میں ایمرجنسی وارڈ پہنچا تو معلوم ہوا اسے گورا وارڈ میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ اس کی ٹانگ پر فریکچر تھا، ہڈی دو جگہ سے ٹوٹی تھی۔ گھٹنے کی چکی اپنی جگہ سے کھسک گئی تھی۔

خام خلائی کے پاس اسی کی شکل وصورت کا ایک ادھیڑ عمر شخص تیمارداری کے لیے بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا وہ اس کا پارٹنر تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے گھر میں رہتا تھا۔ خام خلائی مجھ سے پوچھتا رہا کہ اسے یہ چوٹیں کیسے لگی تھیں۔ وہ مسلسل ہوش میں رہنے میں ناکام رہتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جیسے ہوش میں آتا، اور حیران ہوتا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ ہسپتال کب آیا، کون اسے یہاں لایا، کیا ہوا تھا؟ وہ کسی پلازے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ بس اتنا اسے یاد تھا۔ اس کی یادداشت کی چپ میں سے حادثے سے متعلق ہر طرح کی یاد خارج کر دی گئی تھی۔

وہیں ہسپتال کے ٹیسٹوں سے معلوم ہوا کہ وہ ڈائیابیٹک بھی تھا، بلڈ پریشر کا مریض بھی۔ ٹانگ کا فریکچر ٹھیک ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کے لیے دوائیں لکھ دیں، اسے احتیاطیں بتا دیں اور ڈسچارج کر دیا۔ ”اس کا زخم قابل علاج نہیں تھا،“ ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔ وہ اس کے رشتہ داروں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کا پارٹنر ایک نہایت خاموش شخص تھا۔ کیا معلوم وہ اس کا بھائی ہو۔ ایک سی تو دونوں کی صورتیں تھیں۔ مشتاق بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

ادھر اُدھر کے ریکارڈز سے معلوم ہوا تھا کہ خام خلائی یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا۔ کسی بے اولاد خاندان نے اسے گود لیا لیکن جب گھر کا کفیل مر گیا تو مرحوم کے حقیقی بچوں نے اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ یا وہ خود ہی وہاں سے بھاگ نکلا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اس کے رشتہ داروں اور پچھوکڑ اور ایسی ہی بہت سی ضروری باتوں کے بارے میں بھی یادیں اس کی یادداشت میں کبھی ضرور ہوں گی، لیکن اب نہیں تھیں۔ وہ سب جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ایلینز کا کیا دھرا تھا۔ وہ اس پر قابو پانے میں ناکام رہتے تھے، اسی لیے طرح طرح سے اسے ستاتے، دق کرتے تھے۔ اس کی یادوں کو کہیں نہ کہیں تو محفوظ کیا گیا ہوگا، کسی اور کام کے لیے۔

ٹانگ کا فریکچر کچھ ذیابیطس اور کچھ اس کی اپنی بے احتیاطی سے خراب ہو گیا۔ اس میں پیپ بھر گئی۔ ٹانگ کا وہ حصہ گل سڑ رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے ٹانگ کاٹنے کا علاج بتایا۔ زخم کا زہر سارے جسم میں پھیل سکتا تھا۔ لیکن کٹی ہوئی ٹانگ کا زخم بھی مندمل ہو پائے گا، اس بارے میں بھی ڈاکٹر یقین دہانی نہیں کراتے تھے۔ مشتاق چھرا نے آپریشن سے پہلے سرٹیفکیٹ پر دستخط کیے۔ گھٹنے تک ٹانگ کاٹی گئی۔ پٹی کر کے کچھ دن بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اس نے ایک کٹڑی بابو محلّہ میں لے رکھی تھی۔ وہ نہیں یاد کر پاتا تھا کہ کب اور کیسے یہ کٹڑی اس نے خریدی تھی۔

مشتاق ہی نے ریڈ کراس نامی ایک غیر سرکاری تنظیم کے ذریعے اسے ماہانہ امداد جاری کروا رکھی تھی جس سے اس کی گزر اوقات ہوتی۔

مجھے اس کے بارے میں اگلی خبر اس کی موت کے بعد ملی جو اس کی ٹانگ کے زخم کے مزید خراب ہو جانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اسے اسی گھر کی ڈیوڑھی میں مردہ حالت میں پایا گیا تھا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اس کے قانونی ماں باپ کب کے فوت ہو چکے تھے۔ ایلینز ضرور اس کی موت پر جشن منا رہے ہوں گے۔

بڑا پان فروش نے کتھے سے بھری ڈنڈی پتوں پر پھیرنے کی مشغولیت میں معمولی سا فرق لائے بغیر مٹھو ایلین کی موت پر آب دیدہ ہوتے ہوئے کہا، ”عجیب آدمی تھا۔ کوئی عام انسان اتنا تیز چونا نہیں کھا سکتا، جتنا اسے شوق تھا۔ تیز چونا جتنا وہ کھاتا تھا، میں بھی نہیں کھاتا۔ سمجھایا اتنی تیزی الٹی پڑ جاتی ہے کملیا۔ پر اسے ہر بات کی جلدی تھی۔ اس کے پاس ٹائم تھوڑا تھا، باو یو۔“

اگلے دن وہ سب ڈونگے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مشتاق چھرا، مولوی بوکاٹا، اکرم صحافی، پھجا اوٹ پٹانگ۔ میں نان اور چکڑ چھولوں کے آخری لقمے لے رہا تھا، جب میں نے مشتاق کو پتلی گلی میں مڑتے دیکھا۔ یہ وقت اس ٹولے کے وہاں بیٹھنے کا نہیں تھا۔ لیکن یہ ایک خصوصی نشست تھی۔ وہ سبھی خام خلائی عرف ٹیڈی بکری عرف مٹھو ایلین کی یاد تازہ کرنے آئے تھے۔ یہ ڈونگا ہوٹل ہی تھا، جہاں مٹھو دن کا بیشتر حصہ بیٹھا ٹی وی دیکھتا رہتا۔ اس کے لیے ہوٹل والوں نے برتن دھونے والے کھرے کے برابر خصوصی کرسی ڈال رکھی تھی جہاں وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا رہتا۔

پھجا بتا رہا تھا۔ ”اسے گننے کی بیماری ہو گئی تھی۔ گنت ودیا۔ میں نے پوچھا کیا ہوتی ہے گنت ودیا تو وہ ہنسنے لگا۔ یہ اس کا وچن تھا، گنت ودیا۔ گنتے جاؤ، ایلین کا صفایا کرتے جاؤ۔ درختوں کے پتے، دیوار پہ چیونٹیاں، آسمان پر پتنگیں۔ یہ اس کا منتر تھا۔ آخری دنوں میں تو دماغ بالکل ہی الٹ گیا تھا بے چارے کا، آنکھیں بند کر کے کچھ بڑبڑ کرتا رہتا۔ پوچھو تو کہتا گن رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی۔ میں نے چائے کی آخری چسکی لی اور کچھ زور سے پیالی میز پر رکھ دی، جس سے کچھ آواز پیدا ہوئی۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، ایک ساتھ، بظاہر کسی بھی وجہ کے بغیر۔

☆☆☆☆

زیف سید

انخلا

غیر مطبوعہ ناول ’’لہو کی بو‘‘ کا ایک باب

26 مئی 1919

جنوبی وزیرستان سکاؤٹس کا حوالدار نیاز بین خان سولہ دوسرے مقامی افسروں کے ہمراہ وانا قلعے کے مشرقی دروازے کے قریب افسر میس کے باہر آسان باش کی پوزیشن میں کھڑا تھا۔ کمانڈانٹ میجر گائے رسل میس کی سیڑھیاں اتر کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آیا اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے چار انگریز افسر بھی تھے جو لان کے کنارے پر آ کر ہاتھ پشت پر باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

سورج مغرب میں مٹیالی پہاڑیوں کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب ہوا کسی قدر گوارا ہو گئی تھی۔ پچھلے ایک مہینے سے بارشیں نہیں ہوئی تھیں اس لیے آج بھی گرمی خاصی سخت تھی۔

نیاز بین کو احساس تھا کہ کوئی انہونی ہو گئی ہے یا ہونے والی ہے۔ کیا؟ اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اپنی پانچ سالہ نوکری میں اس نے انگریز افسروں کو کبھی اس قدر سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ میجر رسل کے علاوہ صرف کیپٹن ڈیل پشتو بول سکتا تھا، لیکن حیرت انگیز طور پر وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔

پانچوں انگریزوں میں صرف میجر رسل نے وردی پہن رکھی تھی۔ لیفٹیننٹ بارکر اور لیفٹیننٹ ہنٹ نیکر اور آدھی آستینوں والی قمیصوں میں ملبوس تھے۔ آدھا گھنٹہ پہلے نیاز بین نے انھیں میس کے پیچھے ٹینس کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔

میجر رسل کے ہاتھ میں پائپ تھا، اس نے ایک بھرپور کش لیا اور مقامی افسروں کی قطار کے آگے ٹہلنے لگا۔ پھر وہ وسط میں آ کر رک گیا اور قطار پر ایک بھرپور نظر ڈال کر دھیمی آواز میں اپنی مخصوص لہجے والی وزیری پشتو میں کہنا شروع کیا:

’وفادار ساتھیو اور دوستو، میں ایک ایسی خبر سنانے جا رہا ہوں جس پر شاید آپ کو شروع میں یقین نہیں آئے گا، لیکن میں تمام تر سنجیدگی سے یہ بات بتانے جا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی اسے اتنی ہی سنجیدگی سے لیں۔ مجھے اب سے تھوڑی دیر پہلے حکم ملا ہے کہ ہمیں وانا کا قلعہ چھوڑ کر جنوب میں سینڈی مین قلعے تک جانا ہے۔ ہمیں یہاں سے ہر چیز نکال کر ساتھ لے جانی ہے، جو کچھ ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا، اسے ضائع کر کے جانا ہے، چاہے وہ اسلحہ ہے، ساز و سامان ہے، خوراک ہے، یا جانور۔’

نیاز بین منھ کھولے ہوئے یہ سب کچھ سنتا رہا۔ اس نے کچھ افواہیں تو سنی تھیں کہ افغان فوجیں ہندوستان میں داخل ہو رہی ہیں، اور شمال کی طرف پشاور کے قریب انگریزوں اور امیر افغانستان کی فوج میں جنگ ہو رہی ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سلطنتِ برطانیہ کے سامنے امیر کی حیثیت وہی ہے جو ہاتھی کے سامنے چیونٹی کی ہوتی ہے۔ وہی سلطنتِ برطانیہ جس نے ابھی تازہ تازہ جرمنوں، ترکوں اور اطالویوں کو شکستِ فاش دی تھی، جس کا رسوخ دنیا کے سارے براعظموں میں تھا، اس کے سامنے بھلا کابل کی کیا وقعت؟ اس لیے اس نے کابل کے ہندوستان پر حملے کی خبروں کو معمولی سرحدی جھڑپوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن میجر رسل کی تڑختی ہوئی آواز، اس کے سپاٹ لہجے اور ستے ہوئے چہرے سے اندازہ ہونے لگا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گمبھیر ہو چلا ہے۔

افغان فوج کے چودہ ڈویژن جنرل نادر خان کی قیادت میں دریائے کاتو عبور کر کے وزیرستان میں داخل ہو گئے ہیں اور ہم سے صرف پچیس میل دور موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہاتھیوں پر لدی ہوئی اڑتالیس بھاری توپیں ہیں۔ خدشہ یہ ہے کہ یہ خبر سن کر قبائلی بغاوت کا جھنڈا اٹھا لیں گے اور ہم اپنے اس قلعے میں بری طرح محصور ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ قلعہ اکا دکا قبائلی جتھوں کی سرکوبی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا، کسی باقاعدہ فوج سے لڑنے اور بھاری آرٹلری کا مقابلہ کرنے کی غرض سے نہیں۔ قلعے کی مٹی کی دیواریں افغان توپوں کی پہلی باڑ بھی نہیں سہار سکیں گی اور مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جائیں گی۔

اس لیے ہمارے پاس انخلا کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کو پہلے ہی سے خبردار کر رہا ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا، اور مجھے نہیں معلوم کہ جتنے لوگ اس وقت یہاں کھڑے ہیں ان میں سے کتنے منزل تک کامیابی سے پہنچ پائیں گے۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس قلعے کے علاوہ ہماری کل چھ ذیلی چوکیاں بھی ہیں، جہاں مختلف تعداد میں دستے تعینات ہیں۔ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم انھیں بھی بہ حفاظت نکال کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ دو مشرقی چوکیوں، نیلی کچھ اور سروکئی، کو پہلے ہی انخلا کر کے براہِ راست مرتضیٰ گیریژن پہنچنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ جہاں تک مغربی چوکیوں، توئی کھلا، خراب کوٹ، تنئی، اور کھجوری کچھ کا سوال ہے تو انھیں ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔‘

نیاز بین شروع ہی سے میجر رسل کے تیز ذہن اور منصفانہ مزاج کا قائل تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کو نوکر کے بجائے رفقائے کار سمجھتا تھا اور تمام قبائلی افسران اس کی دل سے عزت کرتے تھے۔ میجر نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ’میری شادی تو فوج سے ہو گئی ہے اور ویسے بھی وزیرستان میں تو افسروں کی بیگمات کو آنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے میں یہاں ہوتا اور میری بیوی کہیں مری یا شملہ میں بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتی اور ایک دن مجھے چھوڑ کر چلی جاتی۔“

’ہم آج رات گیارہ بجے یہاں سے نکلیں گے، اور سیدھا توئی کھلا چوکی کا رخ کریں گے، وہاں

موجود تمام دستوں کو ساتھ لے کر ژوب ملیشیا کے مغل کوٹ قلعے کی طرف مارچ کریں گے، اور وہاں موجود سپاہیوں کے ہمراہ وزیرستان سے نکل کر بلوچستان کے علاقے میر علی خیل تک پہنچ جائیں گے۔ کیپٹن ٹریل ساٹھ پیادہ جوانوں اور دس سواروں کو لے کر آدھا گھنٹہ پہلے یہاں سے خراب کوٹ کی طرف روانہ ہو گئے ہیں، جہاں سے وہ چوکی پر مامور عملے کو لے کر توئی کھلا میں ہمارا انتظار کریں گے، جب کہ لیفٹیننٹ بارکر کھجوری کچھ چوکی میں تعینات عملے کا انخلا کر کے انھیں اپنے ساتھ مغل کوٹ لے آئیں گے، جہاں سے ہم سب مل کر میر علی خیل کی طرف بڑھیں گے۔ وہاں اگر حالات ٹھیک ہوئے تو ہم مزید احکامات کا انتظار کریں گے، ورنہ فورٹ سینڈی مین وہاں سے صرف چودہ میل دور ہے۔ لیکن یہ سب آپ کی مدد اور تعاون کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ آپ ابھی اپنی پلٹنوں میں جائیں اور جوانوں کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر کے سفر کی تیاری کریں۔ اگر کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہے تو ابھی پوچھنے کا اچھا موقع ہے۔'

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ سلطنتِ برطانیہ عظمیٰ کا قبائلی علاقوں سے انخلا ایسی خبر تھی جسے ہضم کرنا آسان نہیں تھا۔ میجر رسل نے دوبارہ کہا، 'کم آن، مجھے پتہ ہے کہ آپ کے پاس بہت سے سوال ہوں گے۔'

صوبیدار میجر نذیر خٹک نے گلا صاف کیا: ''میجر صیب، ہم نے آپ کی ساری بات توجہ سے سنی ہے۔ لیکن آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جب ہم یوں سر جھکا کر بھاگیں گے تو مقامی قبائلیوں پر اس بات کا بہت غلط تاثر جائے گا۔ وہ یہ سمجھیں گے کہ افغان فوج کے آنے سے پہلے ہی ہم بزدلوں کی طرح مقابلہ کیے بغیر یہاں سے فرار ہو رہے ہیں۔ بھاگتے ہوئے خوفزدہ دشمن کو نشانہ بنانا دنیا کا آسان ترین کام ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہمیں آسانی سے اس علاقے سے نہیں نکلنے دیں گے۔ مجھے ہر طرف شدید خطرہ نظر آرہا ہے۔''

میجر رسل نے کہا، 'صوبیدار خٹک، میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں، اس لیے میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ یہ کام مشکل اور خطرناک ہے، لیکن یہ انا اور ناموس کا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے پولیٹیکل ایجنٹ میجر کروستھویٹ او بی ای کی جانب سے ہدایات موصول ہوئی ہیں، جنھیں پشاور میں آنریبل چیف کمشنر سر جارج روز کیپل نے براہِ راست انخلا کا حکم دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک گھنٹہ پہلے بنوں میں میرے کمانڈنگ افسر ساتویں بریگیڈ کے جنرل ای جی لوکس کی جانب سے بھی تار ملا ہے، انھوں نے بھی فوری انخلا کا حکم دیا ہے، اس سے سرتابی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

نیاز بین کے دماغ میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔ میجر رسل نے خاصی مزاحیہ طبیعت پائی تھی اور وہ کوئی چٹکلہ چھوڑنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ کہیں یہ سب کچھ کسی منظم عملی مذاق کا حصہ تو نہیں؟ اس نے ہاتھ اٹھایا۔ میجر رسل نے کہا: ''حوالدار نیاز بین تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

نیاز بین ایک قدم آگے بڑھ آیا: ”میجر صیب، مجھے صوبیدار صاحب کی بات سے اتفاق ہے، لیکن بیرونی خطرے کے علاوہ مجھے شدید اندرونی خطرات کا بھی اندیشہ ہے، اور وہ یہ کہ ہمارے سکاوٹوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ پہلے ہی اس سال ہمارے سترہ جوان اپنے اسلحے سمیت بھگوڑا ہو چکے ہیں۔ ماضی میں بھگوڑوں کے اسلحے کی قیمت ان کے قبیلے سے وصول کی جاتی رہی ہے، لیکن جب ہم سب کچھ اس طرح چھوڑ چھاڑ کر جا رہے ہیں تو اکثر لوگ سمجھیں گے کہ انگریز اس علاقے سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہے۔ اس لیے جوانوں پر قابو رکھنا آسان نہیں ہوگا۔ مجھے ڈر ہے کہ بہت سے سپاہی ہمارے انخلا کی خبر سن کر نہ صرف بھاگ جائیں گے، بل کہ وہ دشمنوں کے بہکاوے میں آ کر ہمارے خلاف ہتھیار بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے میں بھی صوبیدار میجر صاب کی طرح یہی کہوں گا کہ ہمیں ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ بھاگنے سے ہم سب مارے جائیں گے۔“

میجر رسل نے کہا: ”نیاز بین خان، مجھے آپ اپنے پر اور اپنے بہادر جوانوں پر پورا پورا بھروسہ ہے، مجھے یقین ہے کہ ہم افغانوں کا بھرپور مقابلہ کر سکتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے یہ وقت بہت نازک ہے۔ افغانوں نے یہ موقع جان بوجھ کر چنا ہے۔ انھیں علم ہے کہ لام ابھی ابھی ختم ہوئی ہے، برطانوی فوج انسانی تاریخ کی سب سے بڑی اور سب سے خوں ریز جنگ جیتی ضرور ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر لڑے جانے والی جنگ میں فاتح بعض اوقات مفتوح سے زیادہ زخم خوردہ ہوتا ہے۔ برٹش انڈین آرمی کے بیشتر یونٹ ابھی ہندوستان واپس پہنچے ہی نہیں۔ اگر کوئی ڈویژن واپس آیا ہے تو اس کا سامان راستے میں ہے، بہت سے سپاہی زخمی ہیں، یا سالہا سال محاذ پر رہنے کے بعد چھٹیوں پر چلے گئے ہیں۔ مغربی سرحد پر جو بچی کھچی فوج تھی وہ سب کی سب خیبر ایجنسی میں افغان فوج سے لڑنے میں مصروف ہے۔ اوپر ٹل میں ایک اور محاذ کھلا ہوا ہے، اس لیے ہماری مدد کو کہیں سے ایک سپاہی اور کمک کے لیے ایک گولی بھی نہیں آئے گی۔“

”دوسری طرف ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ سات دنوں کا راشن ہے، اس کے بعد کیا ہوگا؟ مجھے معلوم ہے کہ انخلا کے دوران راستے میں ہمیں مشکلات پیش آئیں گی، لیکن ہم کسی صورت اس قلعے میں نہیں رہ سکتے۔ بہادری صرف مرنے مارنے کا نام نہیں ہے، بل کہ میرے نزدیک ناموافق حالات کے پیشِ نظر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانیں بچانا زیادہ بڑا کارنامہ ہے۔ اس وقت میرے کندھوں پر ایک ہزار سے زیادہ جوانوں کی زندگیوں کی بھاری ذمہ داری آ پڑی ہے۔ مجھے ہر حال میں کوشش کرنی ہے کہ ان میں سے زیادہ سے زیادہ کو بچا کر لے جاؤں۔ یہاں رہنے کی صورت میں ان میں سے کسی کے بچنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ان ساری باتوں سے قطعِ نظر فیصلہ پہلے ہی سے ہو چکا ہے، اور جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، یہ فیصلہ میں نے نہیں بل کہ مجھ سے کہیں سینئر افسروں اور اعلیٰ حکام نے کیا ہے، جس کی حکم عدولی کا صرف ایک ہی مطلب ہے، تاجِ برطانیہ سے غداری، اور مجھے آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ غداری کی سزا کیا ہوتی ہے۔“

تمام مقامی افسر پشتوں پہ ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ میجر رسل نے کہا: ”مجھے ساٹھ جوانوں کی

ضرورت ہے جو صوبیدار میجر نذیر خٹک کی قیادت میں فالتو ایمونیشن اور دیگر سامان کو ٹھکانے لگائیں گے۔ ہمارے پاس اسلحہ خانے میں چھ لاکھ گولیاں ہیں، لیکن فی جوان ایک سو راؤنڈ چھوڑ کر ہمیں باقی سارا ذخیرہ تباہ کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ خزانے میں چاندی کے ساٹھ ہزار روپے پڑے ہیں، وہ اونٹوں پر لاد کر ساتھ لے جانا ہوں گے۔ حوالدار مسعود یوسفزئی، آپ یہ دیکھیں کہ کھانے پینے کے لیے کیا کچھ ساتھ لے جایا جا سکتا ہے، حوالدار نیاز بین، آپ کو تیس منٹ کے اندر اندر اصطبل کی رپورٹ پیش کرنی ہے، کتنے اونٹ اور خچر ساتھ لے جانے ہوں گے اور کتنوں کو یہیں پر ختم کر کے جانا ہے، باقی تمام حضرات اپنے اپنے متعلقہ یونٹوں کو روانگی کے لیے تیار کریں۔"

بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ سب جے سی او اپنی اپنی پلٹنوں کی طرف چل پڑے۔ عصر کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور کچھ ہی دیر میں سورج دور مغرب میں کٹے پھٹے سرمئی پہاڑی سلسلے کے پیچھے غائب ہونے والا تھا۔ نیاز بین کا اگر بس چلتا تو وہ سورج کی حرکت روک دیتا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ آج کی رات بہت بھاری ہے۔

وہ اپنے ذہن میں پلٹنوں کا حساب رکھتے ہوئے اپنے یونٹ کی جانب چل دیا۔ قلعے میں مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے جنوبی وزیرستان سکاؤٹس کے 1065 جوان تھے، جن کی ترتیب کچھ یوں تھی:

آفریدی:	480	خٹک:	150
وزیر:	130	یوسفزئی:	90
گدون:	90	شیرانی:	90
اورکزئی:	45	بھٹانی:	40

سوچتے سوچتے اسے پکا یقین ہونے لگا تھا کہ افغان فوج کی وزیرستان آمد اور انگریز فوج کے یوں رات کی تاریکی میں فرار کی وجہ سے پورے علاقے میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ سب سے بڑا خطرہ محسودوں سے تھا جن کی شوریدہ سری کی وجہ سے انھیں کسی پلٹن میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ وہ پچھلے ستر برسوں کا حساب بیباق کرنے کے لیے کسی صورت میں بھی انھیں یوں نہیں نکلنے دیں گے۔ لیکن اسے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس صورتِ حال میں اپنے وزیری جوانوں کو کس طرح ساتھ رہنے پر آمادہ کر پائے گا۔

وہ جب پریڈ کا وسیع و عریض میدان عبور کر کے وزیر سکاؤٹس کی بارک میں پہنچا تو سورج کی آخری کرنیں بڑی تیزی سے قلعے کے میدان سے رخصت ہو رہی تھیں۔ انخلا کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور پوری بارک میں زبردست ہیجان کا عالم تھا۔ جوان ٹولیوں کی صورت میں ادھر ادھر کھڑے زور زور سے بول رہے تھے۔ نیاز بین کے پہنچنے سے ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی لیکن اس کے بعد انھوں نے پھر زور و شور سے بحث شروع کر دی۔ نیاز بین نے ہاتھ اٹھا کر انھیں خاموش کروانے کی کوشش کی لیکن ایک ٹولی خاموش ہوتی

تھی تو دوسری میں سے کوئی بولنا شروع کر دیتا تھا۔ اس شور شرابے میں نیاز بین کے کانوں میں جو آوازیں پڑیں وہ یہ تھیں کہ ”ہم بے غیرت نہیں ہیں کہ رات کی تاریکی میں پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں۔ انگریز نے وزیرستان امیر کو لکھ کر دے دیا ہے، اب یہاں امیر کا سکہ چلے گا، اور انگریز بھاگتا ہے تو بھاگے، یہ ہمارا وطن ہے، ہم کیوں گیدڑوں کی طرح بھاگیں؟“ اتنے میں باہر سے تڑاتڑ گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں، پھر ایک ہینڈ گرینیڈ کا دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی تمام وزیری پلٹن بندوقیں اٹھائے ہوئے بارک سے باہر نکل آئی۔ نیاز بین ایک کونے میں کھڑا انھیں روکنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔

☆☆

آدھے گھنٹے بعد ایک خٹک سپاہی آیا۔ ”میجر رسل بلا رہے ہیں۔“ نیاز بین آہستگی سے چلتا ہوا میجر کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے کمرے کی دیوار سے تصویریں اتار کر بیگ میں ڈال رہا تھا۔

نیاز بین خاموشی سے میجر کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ”نیاز بین، رپورٹ؟“

”سر، وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔“

”کتنے؟“

”ایک سو تیں، سر۔“

”ایک سو تیں کے ایک سو تیں؟“ میجر رسل نے پوچھا۔

نیاز بین سر ہلا کر رہ گیا۔

”ہوں ں ں۔“ میجر رسل نے میز کی دراز کھول کر اس میں سے خطوں کا ایک پلندہ اٹھایا اور اسے بھی بیگ میں ڈال دیا۔ ”اور اصطبل کی کیا پوزیشن ہے؟“

”سر، اصطبل کی طرف فی الحال کسی کا دھیان نہیں گیا۔ میں نے دس خٹک وہاں پہرے پر لگا دیے ہیں۔ اس وقت وہاں گیارہ اونٹ اور چوالیس خچر موجود ہیں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہمیں اس وقت ان میں سے صرف آدھے جانوروں کی ضرورت پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے، بقایا جانوروں کو تلف کرنا ہوگا۔ لیکن ان حالات میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آخر میں کتنے لوگ ہمارے ساتھ جائیں گے۔“

”یقین جانیں سر، میں نے انھیں روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ میں نے انھیں باپ کی طرح پالا تھا، لیکن اسلحہ خانے پر آفریدیوں کے حملے کے بعد ان میں سے ایک بھی نہیں رکا، اور وہ سب کے سب مجھے دھمکیاں دیتے ہوئے اور انگریزوں کا غلام کہتے ہوئے قلعے کی دیواریں پھلانگ کر بھاگ گئے اور اپنی بندوقیں بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ محسود اور وزیر چاروں طرف سے اکٹھے ہو رہے ہیں، وہ سب کو ذبح کر دیں گے۔“ نیاز بین نے کہا۔

لیفٹیننٹ ہنٹ اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی صوبیدار میجر نذیر خٹک بھی آ گیا۔

اسی دوران میں مغربی دیوار کی طرف سے ایک زبردست دھماکے کی آواز آئی۔ میجر رسل کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ نیاز بین بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ دھماکے کی آواز سٹور کی طرف سے آئی تھی جس کے ایک کونے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ ویری لائٹ کے کارتوس آتش بازی کے گولوں کی طرح وانہ کے سرخی مائل آسمان میں سبز، سرخ اور زرد قوسیں بناتے ہوئے غائب ہو رہے تھے۔ یہ کارتوس رات کے وقت دور دراز کی چوکیوں کو سگنل دینے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے، لیکن اب ان کی طرف سے بھیجے جانے والے پیغامات دیوانے کے خیالات کے طرح بے ربط تھے۔

”سر، قلعے کے باہر قبائلی جتھے جمع ہو رہے ہیں۔“ لیفٹیننٹ ہنٹ نے کہا۔ نیاز بین انگریزی بول تو نہیں سکتا تھا لیکن انگریزوں کے ساتھ رہتے رہتے بات کا مفہوم کسی حد تک سمجھ لیتا تھا۔ ”ابھی میں نے مغرب کی طرف پہاڑی پر خاصی بڑی نقل و حرکت دیکھی ہے، اندھیرا اچھیل گیا ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ افغان فوج ہے یا قبائلی لشکر، لیکن دونوں صورتوں میں ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو، قلعے سے نکلنا ہو گا۔ گیارہ بجے تک کا انتظار کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”صوبیدار میجر، آپ کی کیا رپورٹ ہے؟“

”سر بہت بری خبر ہے۔“ گرگ باراں دیدہ نذیر خٹک نے کہا۔ ”صوبیدار مالک دین خیل آفریدی نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مرکزی سٹور پر قبضہ کر لیا ہے اور اب سارا اسلحہ، خزانہ، راشن، سب کچھ اس کے قبضے میں چلا گیا ہے، اس سے بھی بری بات یہ ہے سٹور کے ساتھ والے کنوئیں پر بھی اس کے آدمیوں نے قبضہ جما لیا ہے اور وہ اس طرف کسی کو نہیں آنے دے رہے۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ میرے سپاہی اپنے ہی ساتھیوں سے لڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں نے مالک دین سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے میرے اوپر فائر کھول دیا، گولیاں میرے کندھے کے اوپر سے گزر کر گئی ہیں۔ ہمارا پندرہ برس کا ساتھ رہا ہے، اس کی طرف سے مجھ پر فائر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے سر۔“

نیاز بین نے میجر رسل کو ہمیشہ بہت پرسکون دیکھا تھا۔ گذشتہ برسوں میں کئی بار مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن میجر ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا، لیکن اس وقت اس کا تمتماتا ہوا سرخ چہرہ اس قدر پیلا پڑ گیا تھا جیسے اس میں سے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ ”ٹھیک ہے نذیر، تم جاؤ۔ اب منظم انخلا تو نہیں ہو سکتا، بس سپاہیوں کو اکٹھا کر کے جیسے تیسے نکلنے کی تیاری کرو۔“

دو گھنٹے بعد وانا قلعے سے پچیس خچروں اور پانچ اونٹوں پر مشتمل قافلہ جب نکلا تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے، پتھریلے پہاڑ دن بھر سورج کی گرمی جذب کرنے کے بعد اب تپش چھوڑ رہے تھے اور قافلے

کے ساتھ جنوبی وزیرستان سکاؤٹس کے دس سو پینسٹھ میں سے صرف دو سو نوے جوان بچے تھے۔ صرف یوسف زئی اور خٹک پلٹنیں ایسی تھیں، جن میں سے کسی نے بغاوت نہیں کی، ورنہ آفریدی اور وزیر تمام کے تمام فرار ہو گئے، جب کہ دوسری قوموں سے تعلق رکھنے والے اکثر سپاہی بھی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ڈیڑھ سو سویلین ملازم بھی تھے جن میں کلرک، منشی، دھوبی، موچی، دکان دار اور ماشکی شامل تھے۔ یہ الگ بات کہ کنویں پر باغیوں کے قبضے کی وجہ سے ماشکیوں کو مشکوں بھرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور وہ ان کے کندھوں پر بے جان لوتھڑوں کی طرح لٹک رہی تھیں۔

میجر رسل نے مڑ کر دیکھا۔ وانا قلعے کے مختلف حصوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ نیاز بین کو معلوم تھا کہ میجر کو کس بات کی تشویش ہے۔ اسلحہ خانے کے برج پر آفریدیوں کا قبضہ ہو جانے کے باعث اسے تباہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ جو ایمونیشن دوسری جگہوں پر پڑا تھا اسے افسر میس میں اکٹھا کر کے اس پر کمبل ڈال کر مٹی کا تیل چھڑک دیا گیا تھا۔ لیکن ابھی تک کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ آگ بجھ گئی ہے یا بجھا دی گئی ہے۔

زیادہ مسئلہ دو وِکرز مشین گنوں کا تھا، جو بھاری ہونے کی وجہ سے ساتھ نہیں لائی جا سکی تھیں۔ سپاہیوں نے ہتھوڑا مار کر ان کے سکرو خراب کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن جلدی میں ہونے کی وجہ سے یہ کام تسلی بخش طریقے سے نہیں ہو سکا تھا اور یہ مہلک مشین گنیں بہت آسانی سے دوبارہ کارآمد بنائی جا سکتی تھیں اور اگر وہ دشمن، خاص طور پر تربیت یافتہ باغیوں کے ہاتھ لگ جاتیں تو فرار ہوتے ہوئے سکاؤٹوں کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی تھیں۔ دور سے قبائلیوں کے جتھوں کی نقل و حرکت آوازیں آ رہی تھیں لیکن ان کی سمت اور فاصلے کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ فائر بھی سنائی دے جاتا تھا۔

وہ اس وقت قلعے سے کئی فرلانگ دور نکل آئے تھے۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا لیکن تاروں کی روشنی اس قدر تھی کہ راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ وزیرستان سکاؤٹس کے بچے کھچے دستے خاموشی سے وانا کے میدان میں چلے جا رہے تھے۔ جلد ہی یہ چوڑا راستہ تنگ ہو کر جنوبی پہاڑیوں پر چڑھنا شروع ہو جائے گا اور اس وقت سب کو اندھیرے میں مشکل پیش آئے گی۔

نیاز بین میجر رسل کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ میجر نے مڑ کر اسے دیکھا، پھر اپنی رفتار آہستہ کر کے اس کے برابر آ گیا۔

''نیاز بین، میں خاصی دیر سے ایک بات سوچ رہا ہوں، تمام کے تمام وزیر فرار ہو گئے ہیں، تم بھی تو وزیر ہو، تم ان کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟''

''میجر صیب، میں وزیر ضرور ہوں لیکن میں نے تاجِ برطانیہ کا نمک کھایا ہے، خود اپنے قبیلے میں بدنامی اور رسوائی مول لی ہے، اب میں کیسے ایک واقعے کے بعد گرگٹ کی طرح رنگ بدل دوں اور اگلا پچھلا

سب بھلا دوں؟"

میجر ٹھہر گیا۔ نیاز بین بھی ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا تا کہ ان کے پیچھے آنے والے سپاہیوں کو جانوروں کو گزرنے کی جگہ مل جائے۔ "وہ تو ٹھیک ہے، نیاز بین۔" میجر نے کہا: "لیکن میں سو فیصد یقین سے کیسے کہوں کہ اس وقت تمھاری وفاداریاں کہاں ہیں، مجھے کیا پتہ کہ تم کس نیت سے پیچھے رک گئے ہو۔ اس لیے مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تم سے مجبوراً اسلحہ لینا پڑے گا۔ تم اسی وقت اپنا پستول اور رائفل لیفٹیننٹ ہنٹ کے حوالے کر دو۔" لیفٹیننٹ پاس سے گزر رہا تھا، وہ میجر کی بات سن کر رک گیا۔

"میجر صیب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" نیاز بین ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آپ کے ساتھ آیا ہوں، مجھے بھی پتہ ہے اور آپ کو بھی پتہ ہے کہ سینڈی مین قلعے تک پہنچنے کے لیے آگ کے سمندر سے گزرنا پڑے گا، لیکن آپ مجھ سے میرا اسلحہ بھی لے رہے ہیں، سپاہی بغیر اسلحے کے اندھا بھی ہوتا ہے اور اپاہج بھی تو میں یہ سفر کیسے کاٹوں گا؟"

"دیکھو نیاز بین، یہ ذاتیات یا انا کا مسئلہ نہیں ہے۔ صوبیدار مالک دین خیل تم سے کہیں زیادہ سینئر سپاہی ہے اور اس نے کئی معرکوں پر میرے ساتھ مل کر زبردست شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے اور اب وہی مالک دین باغی ہو کر میرے لیے سب سے بڑا دردِ سر بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر کا بھیدی ہونے کی وجہ سے وہ ہمیں جنرل نادر سے کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بطور کمانڈنگ افسر میرے سر پر جو ذمہ داری ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں تمھیں نہتا کر دوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم میرے نقطۂ نظر سے دیکھو تو تم بھی یہی فیصلہ کرو گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم فورٹ سینڈی مین تک ہمارے ساتھ رہے تو میں تم سے تحریری معافی مانگ لوں گا اور حکام سے تمھارے لیے بہادری اور وفاداری کے تمغے کی سفارش کروں گا لیکن اس وقت تم سے اسلحہ لیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"لیفٹیننٹ؟" میجر نے لیفٹیننٹ ہنٹ کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نیاز بین کے کندھے سے بندوق اتار لی اور اس کے بغل میں سے پستول کا ہولسٹر بھی اتار کر اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے بیگ میں ڈال دیا۔

نیاز بین خاصی دیر بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ سپاہی اور جانور اس کے پاس سے ہو گزرتے رہے۔ جب آخری خچر گزرے ہوئے بھی دیر ہو گئی تو وہ مرے مرے قدموں سے لشکر کے پیچھے چل پڑا۔

☆☆☆☆

آغا سلیم
سندھی سے ترجمہ: بنگر چنا

روشنی کی تلاش

اپریل کا مہینہ ہے۔

اپریل میں اونچے، سبز اور گھنے درخت اپنی جوگیوں والی پیلی پوشاک اتار کر پھینک دیتے اور سبز چادریں پہننا شروع کر دیتے ہیں۔ ہواؤں کے جھونکے خوشبو اور مہک میں مست ہو کر یوں کِھل اُٹھتے ہیں، جیسے جوانی کے نشے میں چُور جوانیاں۔ چاند آسمان پر یوں جگمگا اُٹھتا ہے، جیسے کوئی جوان مُٹیار بے کراں نیلی جھیل میں نہا رہی ہو لیکن یہاں کراچی میں چاند یوں پیلا، مرجھایا ہوا اور دھواں دھواں سا ہے کہ جیسے کسی کارخانے کے مزدور کا چہرہ۔ ہواؤں کے جھونکے کچھ اس طرح لگ رہے ہیں جیسے کوئی تپ دق کا مریض سانس لے رہا ہو۔ ہر طرف شور و غل اور بھاگ دوڑ مچی ہوئی ہے۔ ہر کوئی موٹروں، رکشاؤں اور بسوں والی رفتار سے زندگی گزار رہا ہے، ہر کوئی وال کلاک کی سوئیوں کے بیچ قید ہے..... پورے دو برس میں نے کراچی کی سڑکوں پر دھکے کھائے ہیں۔ اب جا کر کہیں ایک فرم میں اچھی تنخواہ پر ملازمت ملی ہے اور میں اپنی گذشتہ مفلسی سے انتقام لینے کے لیے یہاں ہاؤسنگ سوسائٹی میں ڈیڑھ سَو رُپے ماہانہ کرایہ کے فلیٹ میں آ کر رہنے لگا ہوں اور تمام تر ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر پوری تنخواہ ظاہری نام و نمود اور اپنی زندگی کو بڑھیا بنانے میں خرچ کرنے پر لگا ہوا ہوں۔ انسان کے اندر کچھ ایسے تخریبی رجحانات بھی ہوتے ہیں جن کے آگے اس کے ضمیر کا پہاڑ تنکے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ میں جب بھی کسی محفل میں شریک ہوتا ہوں، کسی نہ کسی بہانے، بالواسطہ یا بلا واسطہ، ہاؤسنگ سوسائٹی کے اس فلیٹ اور اس کے ڈیڑھ سَو رُوپے ماہانہ کرایہ کا ذکر ضرور کرتا ہوں۔ میں نے فلیٹ کے ایک کمرے میں سستا لیکن دلکش غالیچہ لا رکھا ہے۔ کباڑی کی دکان سے ایک نیم استعمال شدہ صوفہ سیٹ بھی لے آیا ہوں۔ فلیٹ کی دیواروں پر بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی تصاویر ٹانگ رکھی ہیں۔ سامنے پڑے شوکیس میں ان کی کتابیں لا کر رکھیں ہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی یوں لگتا ہے جیسے یہاں کوئی بڑا آرٹسٹ رہائش پذیر ہو۔ میں نے تمام ادبا اور ان کی مشہور کتابوں کے نام یاد کر رکھے ہیں۔ رہی بات کتاب پڑھنے کی تو کون پڑھتا ہے؟ اس مشینی دور میں اتنی فرصت ہی کسے ہے!!

میرے فلیٹ کے بالکل سامنے، سڑک کے اُس پار، ایک فلیٹ ہے، جس میں ایک موسیقار نے موسیقی اور رقص کی تربیت کے لیے سکول کھول رکھا ہے۔ شام ہوتے ہی سوسائٹی میں رہائش پذیر متمول

گھرانوں کی گل بدنیاں، اپنا تن بدن سنوار کر وہاں رقص اور موسیقی سیکھنے آتی ہیں۔ مجھے موسیقی کی کوئی شد بد نہیں (موسیقی کا علم سے تعلق بھی کیا! میں بنگالی نہیں جانتا لیکن میں نے ایک مرتبہ بنگالی گیت سُنا تو رو پڑا تھا)، اس لیے میں اس موسیقی کے سکول کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ شام کو جب ساز بجتے ہیں اور لڑکوں اور لڑکیوں کی جوان آوازیں گونجتی ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہزاروں افراد ہسٹریائی کیفیت میں چلا رہے ہوں۔ اس سکول میں آنے والی ہر لڑکی اپنی پلکوں میں اس وقت کے خواب سجا کر آتی ہے جب وہ فلمی دنیا کے آسمان کا ستارہ بن کر چمکے گی اور ہزاروں دل اس کے سینڈل کی لمبی ایڑی کی ٹھوکر پہ ہوں گے۔

شام پڑتے ہی میں تن تنہا سڑکوں کی سیر کو نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ اس وقت سوسائٹی کی سڑکوں پہ جوان، وجیہہ، گدرائے اجسام پر کسی چُست پوشاکوں والی لڑکیاں گذرتی ہیں۔ ان کا جوبن ان کے کپڑوں کی رکاوٹیں توڑنے کے لیے اتھل پتھل ہو رہا ہوتا ہے، یوں لگتا ہے کہ ان کے لباسوں کے تمام بخیے آن کی آن میں اُدھڑ جائیں گے اور ان کے اجسام کی قوس وقزح اپنے سات رنگوں کے ساتھ جگ مگا اُٹھے گی۔ کبھی ان کی کمر کمان کی طرح مُڑتی ہے تو کبھی تیر کی طرح سیدھی ہو جاتی ہے اور ان سے ایسی خوشبو آتی ہے جیسے ہر جسم ایک چلتا پھرتا گلستاں ہو۔ میرا دل اس گھڑی فریاد کرنے لگتا ہے۔ موٹروں کا شور وغل غائب ہو جاتا ہے۔ صرف روح کی چیخیں ہی سننے میں آتی ہیں۔

میرے فلیٹ کے ساتھ دو اور فلیٹ بھی ہیں، ایک میں ایک مرد اور عورت رہتے ہیں۔ مرد کی عمر چالیس کے قریب ہے۔ اُس پر دو مرتبہ فالج کا حملہ ہوا ہے۔ ایک بار اس کی ٹانگ اور بازوؤں پر اور دوسری بار زبان پر۔ وہ چل پھر سکتا ہے نہ ہی بات کر سکتا ہے۔ پورا دن پہیوں والی کرسی میں بیٹھا ایک سے دوسرے کمرے میں چکر لگاتا اور چلاتا رہتا ہے۔ آج صبح میں نے اُسے دیکھا، وہ اپنی پہیہ دار کرسی میں فلیٹ کے سامنے والی گیلری میں بیٹھا ہوا تھا۔ رنگ سُرخ وسپید، گھنگھریالے بال، پُرکشش نقوش۔ اُس کی آنکھیں بڑی اداس تھیں، جیسے کسی قبرستان میں دو چراغ جل رہے ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں اداسی کے ساتھ ایسی وحشت تھی کہ جیسے وہ ایک ہی جھٹکے میں قدرت کی وہ تمام کڑیاں توڑ ڈالے گا، جنھوں نے اُسے کرسی میں قید کر رکھا تھا۔ اُس نے آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا تو پتہ نہیں کیوں میں اُس کی وحشت ناک آنکھیں دیکھ کر لرز گیا۔

عورت کی عمر تیس کے قریب ہے۔ اُس نے اپنے حُسن کی یوں حفاظت کی ہے کہ وقت اور حوادث اُس پر اپنی قباحت کا کوئی نشان چھوڑ نہیں پائے ہیں۔ اُس کی شکل وشباہت اور ٹیپ ٹاپ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ابھی ابھی جوانی میں قدم رکھا ہو اور اُس کے جوبن کا غنچہ شبنم کی چُسکیاں لے کر بھنوروں کو منڈلانے کی دعوت دینے کو ابھی ابھی کھلا ہو۔ وہ اکثر وبیشتر گھر سے باہر رہتی اور رات گئے لوٹتی ہے۔ اُس وقت اس کا شوہر سویا ہوتا ہے اور اگر جاگ رہا ہوتا ہے تو اُسے دیکھ کر چیخنے چلانے لگتا ہے۔ اپنے مجذوب شوہر کے

چلانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہر رات ایک بجے کے قریب ایک کار آ کر کھڑی ہوتی ہے، جس سے وہ اُترتی، اونچی ایڑی والا سینڈل ٹک ٹکاتی، میرے دروازے کے سامنے سے گذرتی، اپنے فلیٹ میں چلی جاتی ہے۔

دوسرے فلیٹ میں ایک ادیب رہتا ہے۔ وہ کوتاہ قد ہے اور اس کا بدن اتنا کمزور اور پتلا ہے کہ اُس کے بدن کے لباس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے کسی نے کپڑے دھو کر الگنی پر لٹکا دیے ہوں۔ اُس کے منہ پر ہر وقت ایسی مظلومیت چھائی رہتی ہے کہ دوسرے آدمی کو خواہ مخواہ اس کے ساتھ ہمدردی ہو جائے۔ اُس کا نام احسان ہے۔ وہ یہاں ایک سندھی میگزین کا سب ایڈیٹر ہے۔ وہ بھی میری طرح نچلے متوسط طبقہ کا فرد ہے اور میری طرح ہی نمائشی زندگی گزارنے کے لیے یہاں آ کر رہنے لگا ہے۔ اُس کو ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری کی شکایت رہتی ہے اور اس کی گفتگو میں بھی کسی نہ کسی بیماری کا ذکر ضرور موجود رہتا ہے۔ دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے انسان بھی کیا کیا نہیں کرتا۔

جب سے کراچی سندھ سے الگ ہوا ہے، تب سے سندھی، کراچی میں یوں نظر آتے ہیں جیسے گوتم بُدھ کے پیرو ہندوستان میں۔ اس پوری بلڈنگ میں احسان اور میں، دو ہی سندھی ہیں اور شاید اسی کارن ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہیں۔ احسان سندھ کا بڑا افسانہ نگار ہے۔ اُسے زندگی میں جو شہرت ملی ہے، وہ کسی اور ادیب کو نصیب نہیں ہو پائی ہے۔ میں ابتدا میں تو اس کی شہرت سے بہت متاثر ہوا لیکن جب بعد میں اس کے افسانے پڑھے تو مجھے اس کے ساتھ ہمدردی سی ہو گئی۔ وہ اکثر و بیشتر ڈاکوؤں اور جیب کتروں کے افسانے تحریر کرتا ہے، کراچی میں رہ کر صحرائے تھر کے افسانے لکھتا ہے..... کچھ عرصہ قبل ہمارے سندھی ادب میں ایک لہر ابھری تھی، جس میں ڈاکوؤں کے افسانے لکھنے والے آسمان پر اُڑ رہے تھے۔ یہ لہر ایک دن ضرور لوٹے گی اور مجھے یقین ہے کہ احسان گمنامی کے بھنور میں غرق ہو جائے گا۔ اس لیے کہ دوام صرف فن کو حاصل ہے اور مجھے اس میں فن کی کوئی مشعل جلتی نظر نہیں آتی۔

احسان کی دوستی شہر کے بڑے بڑے لوگوں سے ہے۔ جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ بڑے لوگوں کی دعوتیں کرتا اور ان کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس کے آفس جاتا ہوں تو مجھے دیکھ کر وہ بہانے بہانے سے بڑے بڑے لوگوں کو فون کرتا ہے اور ان کے ساتھ یوں گفتگو کرتا ہے کہ جیسے وہ سب اس کے انتہائی قریبی اور گہرے دوست ہوں۔ آج جب میں نے اُسے فون پر کسی بڑے آدمی کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا تو مجھے پتہ نہیں کیوں یقین ہو گیا کہ فون پر دوسری طرف کوئی نہیں تھا۔

احسان اس بلڈنگ میں رہائش پذیر ہر شخص کے حالاتِ زندگی اور اس کے راز ہائے دروں کے متعلق جانتا ہے۔ حالاں کہ اُسے یہاں رہائش اختیار کیے کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا۔ آج میں نے احسان سے اپنے پڑوس میں آباد مجذوب مرد اور عورت کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے مجھے بتایا:

"اُس کا نام حمید ہے اور جوان عورت کا نام شمیم۔ آج سے چار پانچ سال قبل جب، حمید پر ابھی فالج

کا حملہ نہیں ہوا تھا، وہ بڑی کامیاب زندگی گذار رہا تھا۔ اُس نے قدم قدم پر زندگی کو جیتا تھا (ہم نے تو قدم قدم پر مات کھائی ہے.....!) وہ یہاں ایک بڑی فرم میں نوکری کرتا اور اس کے احباب کا حلقہ بہت ہی وسیع تھا۔ کچھ لوگوں میں قدرتی طور پر ایسی کشش ہوا کرتی ہے کہ ہر ایک اُن کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ حمید بھی انھی لوگوں میں سے تھا۔ اس کے پاس آدھی آدھی رات تک دوستوں کی محفل جمی رہتی تھی جس میں اُس کی شخصیت کھِلتی اور کھِلتی رہتی۔ وہ جب ہنستا تو یوں لگتا کہ جیسے دوسری بیمار، بے جان، مُردہ اور غموں کی ماری ارواح میں زندگی پھونک رہا ہو۔ جیسے وہ زندگی کے چوراہے پر کھڑا زندگی کے غموں کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ نوجوان لڑکیاں تو کھنچ کر اُس کے پلنگ پر جا گرتیں، لیکن اُس کی آنکھ کسی پر بھی نہیں ٹکتی تھی۔ حمید جس فرم میں ملازمت کرتا تھا، اُسی فرم میں نسیم بھی کام کرتی تھی۔ نسیم اُن دنوں آج سے زیادہ پُرکشش ہوتی تھی۔ وہ اپنے حسن میں اتنی ڈوبی رہتی کہ کبھی کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اور آرزوؤں بھرے دل اُس کے پیروں میں پامال ہوتے رہتے۔ حُسن کی آگہی بڑی ستم گر ہوا کرتی ہے..... بالآخر نسیم کی اس آگہی نے حمید کے ہاتھوں مات کھائی۔ (اس کی مات بھی کیا حَسین مات تھی!) دونوں نے ایک دوسرے کے لیے ایک دوسرے کو چُنا، یا یوں کہا جائے کہ انھوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ ہے بھی تو آنکھ مچولی کا کھیل۔ قدرت ہماری آنکھیں بند کر کے ہمیں اس دنیا میں بھیجتی ہے تاکہ ہم اُس ہستی کو ڈھونڈ نکالیں جو اس جہان میں آ کر چھپ گئی ہے۔ نسیم نے حمید کو پہچانا اور حمید نے نسیم کو۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے وعدے کیے اور شادی کر لی۔ اُن کی جوڑی بھی کیا جوڑی تھی! دوست اُن پر رشک کیا کرتے۔ وقت گزرتا گیا اور وہ پل پل کے دامن سے خوشیاں لُوٹتے رہے۔

ہر ایک انسان کے لیے سانسوں کی ساعتوں کی طرح خوشی کی ساعتیں بھی مقرر شدہ ہیں۔ کچھ ان ساعتوں کو کنجوسی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تو کچھ اسراف کے ساتھ۔ حمید نے ان ساعتوں کو کچھ اس طرح اُڑایا کہ جلد ہی اس کی جمع پونجی ختم ہو گئی۔ اُس پر فالج کا حملہ ہوا جس میں اُس کا بازو اور ٹانگ بیکار ہو گئے، کمپنی کی طرف سے ملازمت سے برطرفی نامہ ملا اور دوست احباب نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اُس پر فالج کا ایک اور حملہ ہوا، جس میں اُس کی زبان بیکار ہو گئی اور وہ گونگا بن کر رہ گیا۔ حمید کی یہ حالت دیکھ کر نسیم کا تمام تر پیار اُمڈ آیا۔ وہ اُس کی یوں نگہداشت کرنے لگی جیسے کوئی ماں اپنے بیمار بچے کا خیال کرتی ہے۔ ویسے بھی عورت بنیادی طور پر ماں ہی ہے۔ وہ جب چھوٹی ہوتی ہے تو گڑیوں کا کھیل رچاتی ہے، بے زبان جانور پالتی ہے اور جب جوان ہوتی ہے تو اپنی تمام تر ممتا اپنے بچوں پر نچھاور کرتی ہے۔ نسیم کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے اُس نے اپنی پوری ممتا اپنے بے بس اور لاچار شوہر کے قدموں میں لا کر انڈیل دی۔

عورت جذبوں اور جبلتوں کا رنگا رنگ گلدان ہے۔ ممتا اُس گلدان میں ایک بڑا اور پُرکشش پھول تو ہو سکتی ہے لیکن پورا گلدان نہیں ہو سکتی۔ نسیم آہستہ آہستہ ایسی رفتار کے ساتھ کہ جس کا اُسے بھی کوئی احساس

نہیں تھا، حمید سے دور ہوتی چلی گئی۔ اُس دوری کے دو اسباب ہیں۔ ایک، اُس کی تنخواہ پوری نہیں پڑتی تھی اور اُسے زندگی گزارنے کے لیے وسائل ڈھونڈنے تھے، اور دوسرا، اُسے اپنے جذبوں اور جبلتوں کا احترام کرنا تھا۔ وہ ریس کورس میں جانے لگی جہاں ایک خوبصورت نوجوان گھڑسوار کے ساتھ اُس کے تعلقات استوار ہو گئے۔ اُس کے سبب وہ شرط بدنے اور جیتنے لگی۔ اب وہ اُس گھڑسوار کی رکھیل ہے۔ وہ روزانہ نیم شب اُسے گاڑی میں چھوڑ جاتا ہے۔ بے چارہ حمید چیخنے چلانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔''

احسان نے آہستگی سے سگریٹ نکال کر جلایا اور خاموشی سے گہرے کش لینے لگا۔ پھر یک دم پوچھنے لگا: ''نعیم! کیا تم نسیم کو مجرم سمجھتے ہو؟''

''احسان!'' میں نے کہا، ''تمھارے سوال کا جواب ہیوگو کا یہ قول ہے کہ زندگی دینے کے لیے ہے، لینے کے نہیں۔''

''غلط۔۔۔'' اُس نے جوش سے کہا۔ ''بالکل غلط۔۔۔ میرے سوال کا جواب ہیوگو کا قول نہیں ہو سکتا۔ ایک دور کے مصنف کے اقوال دوسرے دور میں اُٹھے سوالوں کے جواب نہیں ہوتے۔ ہیوگو جاگیردارانہ نظام میں پیدا ہوا تھا، جس میں غلام، آقا کے لیے قربان ہو جاتا۔ مثالی دوست پیدا ہوتے اور مثالی عشاق۔ لیکن ہمارا دور جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے ناجائز تعلقات سے پیدا شدہ حرامی بچہ ہے، جس نے انسانی خلوص، ہمدردی اور پیار کو کانچ کے کھلونوں کی طرح توڑ پھوڑ کر پھینک دیا ہے۔ میں نسیم کو مجرم نہیں سمجھتا بلکہ اُس کے دور کو دوش دیتا ہوں۔''

احسان خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر یونہی چپ بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر چلا گیا۔ وہ جاتے وقت بہت اداس لگ رہا تھا اور میں اب یہ روزنامچہ لکھ رہا ہوں تو میرا دل بھی بہت اداس ہے۔

میں جس بلڈنگ میں رہتا ہوں، اُس کے نچلے بنگلہ میں ایک عورت بیگم مجید رہتی ہے۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا ہے، لیکن میں نے کبھی بیگم مجید کو نہیں دیکھا اور نہ ہی احسان سے اُس کے متعلق پوچھ گچھ کی ہے۔ میں اُس کے نام کے سوا اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ اُس کے نام کے بارے میں بھی مجھے تب پتا چلا جب میں نے بنگلے کے دروازے پر اُس کے نام کی تختی لگی دیکھی۔ آج میں بیگم مجید اور اُس کے خاندان والوں سے مل آیا ہوں۔

میں پورا دن گھر میں تنہا بیٹھا رہتا ہوں۔ کبھی کبھار اکیلا یا احسان کے ساتھ شہر کا چکر لگا آتا ہوں۔ دوستی کے معاملہ میں، میں بہت ناکام ثابت ہوا ہوں۔ زندگی کی دیگر ناکامیوں کی طرح اس ناکامی کا احساس بھی ہر لحہ میری روح کو ڈستا رہتا ہے۔ پتا نہیں مجھ میں کون سی ایسی برائیاں ہیں جنھوں نے مجھے دوستوں میں مقبول بنانے سے محروم کر رکھا ہے۔ شاید میں کبھی اتنا میٹھا ہو جاتا ہوں کہ دوست مجھے نگل جاتے ہیں اور کبھی کبھار ایسا کڑوا کہ اُگل دیتے ہیں۔

کل اتوار کا دن تھا۔ احسان صبح سویرے کسی بڑے آدمی سے ملنے چلا گیا۔ میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ نوجوان تیس کے پیٹے میں تھا۔ متناسب قد، مضبوط اور کسرتی بدن، صاف شفاف کپڑے، بات کرتے وقت اُس کے ہونٹوں کے ساتھ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے اور ہاتھ بھی حرکت کر رہے تھے۔ اُس نے بڑے پیار سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ''میرا نام شہاب ہے۔ میں آپ کا پڑوسی ہوں، ساتھ والے بنگلے میں رہتا ہوں، آپ ہمارے نئے پڑوسی ہیں۔ میرا فرض تھا کہ آپ سے ملاقات کروں۔''

''آپ کی بڑی مہربانی۔''

''اس میں مہربانی کی کیا بات ہے، انسان بنیادی طور پر دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے والا جانور ہے۔ ارسطو نے یہی کہا ہے کہ جو آدمی تنہا رہ سکتا ہے وہ دیوتا ہے یا پھر پاگل۔ پاگل آدمی تو تنہا رہ سکتا ہے لیکن دیوتا تنہا نہیں رہ سکتا۔ آپ قدیم اساطیر کا مطالعہ کریں، آپ کو ہر دیوتا کے ساتھ کوئی نہ کوئی دیوی یا دیوتا ضرور دکھائی دے گا۔ یہ انسان کی دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی جبلت کا اظہار ہے۔''

وہ بڑی دیر تک بولتا رہا۔ اُس کی گفتگو کا انداز اور آنکھوں، بھنوؤں اور ہاتھوں کے اشارے بہت عجیب تھے۔ وہ بڑی نرمی اور عاجزی کے ساتھ یوں بات سے بات نکالتا چلا گیا کہ اُس کی گفتگو میں عجیب ربط اور روانی پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے دنیا کی سیاست، ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی، شہر کے بڑے بڑے اور فیشن ایبل ہوٹلوں، دنیا کے مشہور کرکٹ کھلاڑیوں، ہولی ووڈ اور انڈیا کے فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے قصے سنا ڈالے۔ میں اُس کی شخصیت سے بہت مرعوب ہوا اور سچ مچ اپنے آپ کو اُس کے سامنے ہیچ محسوس کرنے لگا۔ اُس نے اُٹھتے وقت مجھے اپنے ہاں شام کی چائے پینے کی دعوت دی۔

شام کو وہ مجھے لینے آ گیا۔ ہم جب بنگلے میں داخل ہوئے تو بیگم مجید نے آگے بڑھ کر دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا۔ بیگم مجید، شہاب کی ماں تھی، اُس کی عمر پچاس کے قریب تھی (sic) لیکن اُس کا لباس جوان لڑکیوں کے لباس سے بھی زیادہ پُرکشش تھا۔ اُس کی قمیص کا گلا اتنا کھلا ہوا تھا کہ عریانی کا احساس ہوتا تھا۔ اُس کی گردن اور سینے کی جلد دیکھ کر ذہن میں کسی باسی چیز کا احساس ابھرتا تھا۔ اُس کے چہرے پر وقت نے جو نشانات چھوڑے تھے انھیں اُس نے پاؤڈر سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے نیچے ایسے سیاہ حلقے تھے کہ جنھیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے اُس نے زندگی کے بنگلے کی تیسری منزل پر کھڑے ہو کر بڑی بے دردی کے ساتھ اپنی جوانی نیچے کھڑے بھوکوں کے ہجوم میں دونوں ہاتھوں سے لٹائی تھی۔ اُس کے ہونٹ لپ سٹک کی سرخی میں باسی گوشت کے ٹکڑوں کی طرح لگ رہے تھے۔ بات کرتے وقت ہونٹ یوں ہلا رہی تھی جیسے برف کے ٹکڑے چوس رہی ہو۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک دلربا مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی کہ جیسے لپ سٹک کی طرح مسکراہٹ کا بھی لیپ کر رکھا ہو۔ انھوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ کچھ ہی دیر

گزری ہوگی کہ کمرے میں ایک جوان لڑکی داخل ہوئی۔ میں نے نظریں اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ہلکے سانولے رنگ کی تھی کہ جیسے شاہ لطیف کے سُر سارنگ نے انسانی شکل اختیار کرلی ہو، یا جیسے ساون کی کوئی سانولی با نوری بدلی کمرے میں چلی آئی ہو، یا جیسے بنگال کی شام نے اپنا جلوہ دکھایا ہو۔ اُس کا انگ انگ آہنگ تھا اور جسم جلترنگ۔ اُس کی لمبی گھنی پلکیں دیکھ کر مجھے ٹیگور کی تشبیہہ یاد آ گئی کہ:

”تیری پلکیں ندی کنارے کھڑے درختوں کی قطار کے مانند ہیں۔“ شہاب نے ہمارا تعارف کرایا۔ اُس کا نام شمیم تھا اور وہ شہاب کی چھوٹی بہن تھی۔ میں نے اُسے سلام کیا۔ وہ سر کی ہلکی جنبش سے میرے سلام کا جواب دے کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں زندگی میں پہلی بار عورتوں کی مجلس میں بیٹھا تھا، اس لیے میری پیشانی پر رہ رہ کر پسینے کے قطرے اُمڈے چلے آرہے تھے۔ میں شمیم کی طرف دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ بیگم مجید سے بات کرتے وقت آنکھیں جھکا لیتا۔ (شاید یہ دکھانے کے لیے کہ میں کتنا با حیا ہوں) میں تمام وقت شہاب کے ساتھ باتیں کرتا رہا یا یہ کہنا چاہیے کہ شہاب کی باتیں سُنتا رہا۔ اُس دوران میں میں، میں نے دیکھا کہ شمیم کی آنکھیں مجھ پر گڑی ہوئی ہیں۔ ہمارے جیسے لوگوں کے لیے عورت کی غلط نظر بھی ہزاروں خواب بُن لیا کرتی ہے۔ اب جو میں نے شمیم کو اپنی طرف دیکھتا پایا تو میرے دل کی رفتار بگڑ گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے مختلف النوع نقطے پھرنے لگے۔ میں کبھی گلا صاف کر رہا تھا تو کبھی کرسی پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس دوران میں کافی وقت گزر گیا تھا۔ شہاب نے بات سے بات نکالی:

”نعیم صاحب! آپ بیمہ پالیسی کے قائل ہیں؟“

میں انشورنس کا قائل ہوں یا نہیں، یہ ایک الگ بات ہے لیکن انشورنس والوں کے ساتھ مفت کا بیر رکھتا ہوں۔ میں نے فوراً کہا:

”کیوں نہیں... میرے خیال میں ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو بیمہ کا قائل ہونا چاہیے۔“

”میں ایک یوروپین بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہوں۔ ہماری کمپنی کئی قسم کی سہولیات دیتی ہے، مثلاً ---“

معلوم نہیں وہ کتنی سہولیات گنواتا چلا گیا لیکن میں نے کچھ نہیں سُنا۔ شمیم کی آنکھیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں اور میرے خیالات بَل کھا کر آپس میں اُلجھتے جاتے تھے۔ میں اُٹھتے وقت شہاب سے دس ہزار کی پالیسی خرید کر گھر لوٹ آیا۔

شمیم سے ملنے کے بعد میری حالت صحرائے تھر میں بھٹکتے اُس مسافر کی طرح ہے جسے کچھ دوری پر کھجوروں کے جھنڈ میں چھپی دو جھیلیں نظر آ گئی ہوں۔ میری روح کی چوٹیوں پر ہلکا ہلکا نُور چھاتا جا رہا ہے۔ کیا مجھے شمیم کے ساتھ محبت ہوگئی ہے!! وہ مثالی محبت جو پہلی نظر میں ہو جایا کرتی ہے۔ جب نگاہوں کی کرنیں سوئی روح کی پیشانی پر پھیل جاتی ہیں اور روح انگڑائی لے کر، خوابیدہ آنکھیں اٹھا کر چہار طرف دیکھتی ہے۔ میں

زندگی میں کئی جوان لڑکیوں سے ملا ہوں، لیکن ان کی صورت یوں بھلا بیٹھا ہوں جیسے صابن کے اشتہار پر چھپی کسی دلکش اور حسین عورت کو آدمی پل بھر کے بعد فراموش کر بیٹھتا ہے۔ شمیم کی صورت میری روح پر نقش ہو گئی ہے۔ شاید مجھے شمیم کے ساتھ محبت ہو گئی ہے۔

میں نے احسان سے شمیم کے متعلق پوچھنا چاہا لیکن پتا نہیں کیوں ہچکچاہٹ سی محسوس کی۔ آج وہ آیا تو میں نے شمیم کی بات نکالنے کے لیے تمہید باندھنا شروع کی:

“نسیم کا کیا حال ہے؟”

“وہ اپنے گھڑ سوار دوست کے ساتھ بہت خوش ہے۔”

“اور حمید۔۔۔؟”

“حمید بچارے کا کیا پوچھتے ہو؟ اُس کا تو ایک ایک پل صلیب ہے، جس پر اُسے لٹکایا جاتا ہے۔ سقراط تو زہر کا پیالہ پی کر مر گیا لیکن یہ بچارہ تو پل پل کے پیالے سے زہر پیتا ہے لیکن مر بھی نہیں پاتا۔”

“تم حمید سے پوچھ کر دیکھو۔” میں نے کہا۔ “وہ اس حال میں بھی جینا چاہے گا۔ اُس کے اندر ہم دونوں سے بھی زیادہ جینے کی ہوس ہوگی۔”

“ہاں، تم سچ کہتے ہو کہ اس حال میں بھی اُس میں جینے کی ہوس ہوگی۔ یہی تو انسان کی عظمت ہے۔ یہی ہوس تو زندگی کی مانگ کا سندور ہے۔”

ہم خاموش ہو گئے۔ بالآخر میں نے اُس سے پوچھا:

“تم شہاب کو جانتے ہو؟”

وہ شہاب کا نام سن کر چونک اُٹھا۔ اُس نے یک دم پوچھا:

“شہاب تم سے ملا کیا؟”

“ہاں۔۔” میں نے جیسے کسی جرم کا اعتراف کر لیا ہو۔ میری بات سن کر اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ “تم بھی اُس کا شکار ہو گئے۔ اِس بلڈنگ میں رہنے والے ہر ایک شخص کو شہاب نے انشور کیا ہے۔ وہ ہر ایک کو چائے کی دعوت دے کر گھر لے جاتا ہے اور اُسے انشور کر لیتا ہے۔ شہاب اتنا خطرناک آدمی نہیں ہے۔ خطرناک ہونے کے لیے غیر معمولی ذہانت کی ضرورت ہے، جو اُس میں نہیں ہے۔ آدمی اُس کی چوٹ سہار سکتا ہے لیکن بیگم مجید اور شمیم کی چوٹ کوئی نہیں سہار سکتا۔ دونوں ناگنیں ہیں۔ بیگم مجید تو اب تک اپنا تمام زہر انڈیل چکی ہے۔ رہ گئی شمیم تو وہ دو، سروں والی ناگن ہے۔ اُس کا کاٹا بہ مشکل ہی بچ پاتا ہے۔ میں بھی اُس کا ڈسا ہوا ہوں۔”

بعد ازاں اُس نے مجھے بیگم مجید کی گذشتہ زندگی کے متعلق بے شمار باتیں بتائیں۔

شہاب اور شمیم ابھی بچے ہی تھے اور بیگم مجید جوان، تب سے وہ اس بنگلہ میں رہ رہی ہے۔ بیگم مجید

کے شوہر مجید کے متعلق کسی کو کچھ پتا نہیں۔ اُس نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ اُس کا شوہر مر چکا ہے۔ لیکن لوگ کہتے تھے کہ اُس کے شوہر نے اُسے طلاق دے دی تھی۔ اصل حقیقت کیا تھی یہ خدا ہی جانتا ہے۔ اتنا تو سبھی جانتے تھے کہ بیگم مجید کسی اعلیٰ گھرانے کی عورت ہے۔ اُس کی آمدنی کے ذرائع کے متعلق کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ شاید اُس کا شوہر بڑی جاگیر چھوڑ گیا ہو یا حقِ مہر میں اچھی خاصی رقم ملی ہو کہ وہ یوں ٹھاٹھ کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ بیٹھ کر کھانے سے تو کنویں بھی کم پڑ جاتے ہیں، معلوم نہیں اس کے پاس کیسے کنویں تھے کہ خشک ہی نہیں ہو پاتے تھے! اُس کا اٹھنا بیٹھنا اعلیٰ سوسائٹی میں تھا اور اُس کے تعلقات شہر کے بڑے بڑے افسروں اور تاجروں سے تھے۔ روزانہ اُس کے دروازے پر تین چار گاڑیاں ضرور آتی تھیں۔ وہ ہفتے میں ایک بار احباب کی دعوت ضرور کرتی تھی۔ اُس دن اُس کے دروازے پر کاروں کی قطاریں لگ جاتیں۔ چوں کہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے احباب کے ساتھ گزارتی اس لیے اُس نے بچوں کی پرورش کے لیے ایک کرستان آیا رکھی ہوئی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ اُس کے بچے جوان ہوتے گئے۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ شہاب کو اچھی تعلیم دلا کر کسی بڑے منصب تک پہنچائے گی۔ شہاب نے بی اے کرنے کے بعد تین مرتبہ سی. ایس. پی کا امتحان دیا لیکن ہر بار ناکام ہوا۔ چناں چہ اُس نے افسری کا خیال چھوڑ کر ایکٹر بننے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اُسے یقین تھا کہ اس میں کامیاب ایکٹر بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔ اُس نے پورے دو برس فلم سٹوڈیوز کے دھکے کھائے اور پھر مایوس ہو کر لوٹ آیا اور اپنی ماں کی واقفیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے انشورنس کا کام شروع کر دیا۔ اب وہ ایک کامیاب انشورنس ایجنٹ ہے۔

شمیم اپنی ماں اور بھائی تو کیا پورے جہان سے مختلف تھی۔ وہ بچپن ہی سے چلبلی اور شرارتی تھی۔ جوان ہوئی تو اُس کی شخصیت میں چلبلے پن اور شرارت کے کچھ عناصر باقی رہ گئے۔ وہ کبھی بچوں کی طرح نٹ کھٹ بن جاتی تو کبھی بوڑھیوں کی طرح سنجیدہ اور باوقار۔ پھولوں کے ساتھ اُسے بڑی محبت تھی، لیکن پھولوں کی خوشبو سونگھتے ہی اُسے قے ہو جاتی۔ کبھی بڑے چاؤ کے ساتھ پھولوں کا پودا لگاتی اور پودا ابھی غنچے ہی نکال پاتا کہ اُسے جڑ سے اکھاڑ پھینکتی۔ کبھی دوستوں کے ساتھ یوں پیش آتی کہ انھیں غلط فہمیاں ہو جاتیں اور کبھی ایسا برتاؤ کرتی کہ جیسے انھیں جانتی تک نہ ہو۔ مرد کو مات کرنا تو کوئی اُس سے سیکھے۔ اگر کوئی مرد اُسے نظر انداز کرتا تو وہ زخمی ناگن اور بپھرے شیر کی طرح اُس پر حملہ آور ہوتی اور تب تک آرام نہ کرتی جب تک اُس مرد کو زیر نہ کر لیتی۔ اُس کا سچا پیار دنیا میں کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ اُس نے صرف ایک وحشی کتا پال رکھا تھا جسے پیار کرتی تھی۔ اُس کتے کے ساتھ اُس کے پیار کا سبب بھی عجب قسم کا ہے، ایک دن یہی کتا اُس پر حملہ آور ہوا اور اُس کی ٹانگ زخمی کر دی۔ وہ خوف زدہ ہونے یا غصہ کرنے کے بجائے پاگلوں کی طرح اُس کتے کے دیے زخم کو چومنے لگی۔ اُس دن کے بعد وہ کتا اُس کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ کتا مر گیا۔ وہ پورا ایک مہینہ اُس کتے کے لیے روتی رہی۔ آج بھی اگر اُسے وہ کتا یاد آ جائے تو دھاڑیں مار کر رونے لگتی ہے۔

میرے ذہن میں شمیم کی جو تصویر نقش تھی، اُس کے ارد گرد احسان کی باتوں نے طلسمی ماحول سا پیدا کر دیا۔ وہ مجھے یوں افسانوی دھند میں لپٹی نظر آئی جیسے اساطیر کی دیویاں نظر آتی ہیں۔ وہ مجھے طلسمی کاک محل میں بیٹھی مومل محسوس ہوئی اور میری روح کا رانا اُس کاک سے مخمور ہونے کے لیے تڑپنے لگا۔ احسان نے کہا:

''شمیم مجھ سے بھی پیار کرتی ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ تجھے یقین نہ آئے تو اُس کے خط لا کر دکھاؤں۔'' اتنا کہہ کر وہ خط لانے چلا گیا اور میں شمیم کے خیالات میں غرق ہو گیا۔ وہ لوٹ آیا اور اُس نے دو تین خط لے آ کر میرے سامنے رکھ دیے۔ میں نے ایک ایک کر کے سب خط پڑھ لیے۔ ہر خط کی ابتدا کسی گھٹیا فلمی شعر سے ہوتی اور لکھنے والے نے جیسے لفظ لفظ میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا۔ خط پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ میں احسان کے افسانے پڑھ رہا ہوں۔ وہی لہجہ کا تصنع، سلیس الفاظ استعمال کرنے کی شعوری کوشش اور گہرے انسانی جذبات کا اظہار۔ میں نے وہ خطوط مسکرا کر احسان کو لوٹا دیے۔ اُس نے خطوط لیتے وقت پتا نہیں کیوں میری مسکراہٹ کو شک کی نظر سے دیکھا۔

شمیم کو حاصل کرنے کی مجھے ایک ہی صورت نظر آئی کہ میں اُسے نفسیاتی شکست دوں، اُس کی خود پرستی پر چوٹ لگاؤں اور اُس کی انا کو مجروح کروں۔ میں تین دن قبل شہاب سے ملنے اُس کے بنگلے پر گیا تو شمیم اور شہاب باہر لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ شہاب مجھے دیکھ کر کاروباری مسکراہٹ اور خلوص کے ساتھ آگے بڑھ کر ملا۔ لیکن شمیم بیٹھی رہی۔ اُس نے میرا استقبال نہیں کیا۔ شمیم کو دیکھ کر میرے دل کی رفتار بگڑنے لگی۔ میرا پورا وجود موم کی طرح پگھلنے لگا۔ میں شہاب کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ ہم بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں میں، میں نے شمیم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے اُسے بالکل نظر انداز کر دیا۔ شہاب پل بھر کے لیے اٹھ کر اندر گیا، تب بھی میں نے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالا، خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بھی خاموش تھی۔ شہاب آیا تو ہم نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ہم جب اٹھ کر جانے لگے تب میں نے چور نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی پیشانی پر بَل پڑا ہوا تھا۔ وہ بَل شاید میرے وار کا گھاؤ تھا۔

فلم اچھی تھی یا نہیں.... مجھے اُس کا کچھ پتہ نہیں، میری آنکھوں کے سامنے صرف شمیم کی پیشانی پر آیا بَل گھوم رہا تھا۔ شہاب تمام وقت اپنے ہونٹوں، آنکھوں، بھنوؤں اور ہاتھوں سے یوں گفتگو کرتا رہا کہ جیسے میں اُس کا دوست نہیں بلکہ فلم ڈائریکٹر تھا جس کے سامنے وہ اپنی ایکٹر بننے والی تمام تر صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے اُس کی صحبت میں بڑی کوفت اٹھانی پڑی، لیکن شمیم کی پیشانی کے بَل کو یاد کر کے، میرے دل میں خوشی کی ایک ایسی لہر اٹھتی جو ہر چیز کو ایک حُسن بخش دیتی۔ میں آج بہت خوش ہوں۔

میرا حملہ کامیاب ہوا.... کل شام میں باہر چکر لگانے کے لیے نکلا تو شمیم اپنے بنگلے کے دروازے پر ملی۔ اُس نے مجھے دیکھ کر کہا:

’’کہاں جا رہے ہو.....؟‘‘

میں نے پہلی بار اُس کی آواز سنی تھی۔ اُس کی آواز میں ایک عجیب سی روشنی اور شیرینی تھی جیسے اُس کے گلے سے نُور کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ اُس کے حلق سے شہد ٹپک رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ مجھ سے کچھ اس طرح مخاطب تھی جیسے ہم بڑے عرصے سے ایک دوسرے کے دوست ہوں۔

’’کہیں بھی نہیں، یونہی بس چکر لگانے نکلا ہوں۔‘‘

’’چلو، میں بھی چلتی ہوں...‘‘

خوشی کے مارے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

’’چلو، کوئی فلم دیکھنے چلتے ہیں۔‘‘

تھوڑا آگے چل کر میں نے ایک ٹیکسی پکڑ لی۔

’’کون سی فلم دیکھنے چلیں؟‘‘ میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’جو تمھاری مرضی۔‘‘ اُس نے مختصر جواب دیا۔

ٹیکسی چل پڑی اور ہم دونوں خاموش رہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شمیم میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ زندگی میں انسان کی تمناؤں کا اتنا قتلِ عام ہوتا ہے کہ اگر کوئی تمنا بچ بھی جائے اور شرمندۂ تعبیر ہونے کے قریب پہنچے تو اعتبار ہی نہیں آتا۔ میں ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ شہر کی عمارتیں عقب میں رہتی جاتیں، ہم دھرتی پر کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگتے انسانی ہجوم کو پیچھے چھوڑ کر آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

ہم ٹکٹیں لے کر ہال میں داخل ہوئے اور ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ شمیم میرے قریب بیٹھی تھی، اتنا قریب کہ کبھی کبھی اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ کو چھو جاتا اور میرے پورے وجود میں بجلیاں کوند جاتیں۔ سامنے سینما ہال کے پردے پر دوڑتی تصاویر اور ہال میں بیٹھے لوگوں کی نیم تاریک شبیہیں آپس میں الجھتی، صاف ہوتی شمیم کی صورت اختیار کر لیتیں۔ کبھی یوں لگتا کہ جیسے سورج اپنی جگہ چھوڑ کر زمین کے قریب آ گیا ہو اور اُس کی کرنوں میں ہر چیز پگھلتی، تیز چبھنے والی روشنی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ پتا نہیں کس وقت انٹرویل ہوا۔

’’کہو فلم پسند آئی...؟‘‘ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’جی... ہاں... ٹھیک ہے...‘‘ میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

’’مجھے تو اچھی نہیں لگی...‘‘

’’واقعی اچھی نہیں ہے۔‘‘

وہ میری بات سن کر مسکرا اٹھی۔

’’چلو، واپس چلتے ہیں۔‘‘

"چلو..." میں نے فرمانبرداری کے ساتھ کہا۔ اُس نے باہر نکل کر کہا:

"اب کہاں چلیں...؟"

"جہاں آپ کی مرضی ہو..."

"مجھے 'آپ' مت کہا کرو۔" اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا، "'آپ' سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے سر کے تمام بال سفید ہو گئے ہوں اور چہرے پہ ہزاروں جھریاں پڑ گئیں ہوں.... ہاں، اب بتاؤ کہ کدھر چلیں...."

"کلفٹن چلیں..."

"چلو..."

کلفٹن میں لوگوں کا اژدہام تھا۔ ہم ٹیکسی سے اترے اور سمندر کنارے چہل قدمی کرنے لگے۔ ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ اندھیرے میں سمندر بھی انسان کے اندر کی طرح پر اُسرار لگ رہا تھا۔ ہواؤں کے جھونکے شمیم کے جسم کو چھو کر، بدمست شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتے، آگے بڑھتے چلے جاتے۔ شہر کی روشنیاں یوں جل رہی تھیں جیسے تنہائی میں یادوں کے دیپ جل اٹھتے ہیں۔ دور، اندھیرے میں ملفوف عمارتیں یوں لگ رہی تھیں کہ جیسے بچھڑے دوستوں کے بھولے ہوئے چہروں کے دھندلے نقوش! ہم دونوں خاموش تھے اور نرم نرم ریت پر یوں چل رہے تھے کہ جیسے خواب میں سفر کر رہے ہوں۔

"تم کیا کرتے ہو...؟" اُس نے اچانک پوچھا۔

"یہاں ایک فرم میں ملازمت کرتا ہوں۔"

"تنخواہ کیا ملتی ہے...؟"

کہتے ہیں کہ عورت عمر اور مرد اپنی تنخواہ بتاتے وقت کبھی سچ نہیں بولتے۔ اس لیے میں نے بھی جھوٹ بتا دیا۔

"یہی کوئی آٹھ نو سو رُپے مل جاتے ہیں۔"

"شادی کی ہے...؟" اُس کے سوال کی نوعیت اور پوچھنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ کوئی بزرگ عورت ہو۔

"نہیں۔ ابھی نہیں کی ہے..." میں نے جواب دیا... "دراصل میں ایک ایسی ہستی ڈھونڈتا پھر رہا ہوں جسے دیکھ کر میری روح کی پیاس بجھ جائے۔" میری بات سن کر اُس نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر سمندر کی اُن لہروں کو دیکھنے لگی، جن میں بے چینی تھی۔ تڑپ تھی۔ جیسے سمندر کے سینہ میں آگ کے بھانبڑ جل اٹھے ہوں۔ رہ رہ کر کوئی لہر اٹھتی اور دور کنارے تک بڑھ کر پھیلتی اور فنا ہو جاتی تھی۔

"ذرا دیکھیے تو لہروں میں کس قدر بے چینی ہے۔" میں نے کہا۔ "کنارے کی طرف یوں جا رہی

ہیں کہ جیسے کسی گم شدہ چیز کو کھوج رہی ہوں۔ میرے خیال میں انسان بھی اسی طرح پوری زندگی کسی ہستی کی تلاش میں تڑپتا رہتا ہے۔ ہر ایک انسان زندگی کے اس بے کنار سمندر میں موج کی طرح اٹھتا اور کسی ہستی کی کھوج میں کنارے کی طرف بڑھ بڑھ کر فنا ہو جاتا ہے...'' وہ چپ چاپ سمندر کی طرف دیکھتی رہی اور میں بولتا رہا، ''میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس دنیا میں کسی تاریک جگہ سے نہیں بل کہ روشنی کی کسی رنگین وادی سے آئے ہیں۔ ہماری آنکھیں اُس روشنی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ دھنک کے رنگوں کو دیکھ کر انسانی روح کا کھنچ جانا، دلربا صورت کو دیکھ کر دل کا تڑپ اٹھنا، یہ سب کیا ہے! یہ سب ایک ایسی ہستی کی تلاش ہے جو اُس روشنی کا حقیقی روپ ہو، ہماری زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ پہلے تو ہم اُس ہستی کو ڈھونڈ نہیں پاتے اور اگر ڈھونڈ بھی لیتے ہیں تو وہ پھر کسی اور ہستی کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہے۔''

وہ یوں ہی خاموش سمندر کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اچانک کہنے لگی:

''آؤ، لوٹ چلیں...'' اُس کی آواز بہت اداس تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے آ کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ہم پورا راستہ چپ چاپ بیٹھے، اپنی اپنی کھڑکیوں کی طرف سے انسانوں اور مشینوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھتے رہے۔ ٹیکسی آ کر اُس کے گھر کے سامنے رکی اور وہ بغیر کچھ کہے بنگلے میں چلی گئی اور میں اپنے گھر لوٹ آیا۔

مجھے خوشی ہے کہ میری روح نے زندگی کی گزرتی ان بے رونق، بے رنگ اور بدصورت گھڑیوں کے ہجوم میں کچھ ایسی گھڑیاں بھی گزاری ہیں کہ جنھیں شمیم کے عکس نے چمکا دیا ہے، جو زندگی کے اردگرد پھیلے اندھیروں میں جگنوؤں اور ستاروں کی طرح جگمگ کر کے میری پوری ہستی کو جگمگا رہی ہیں۔ میں نے سمندر پہلے بھی دیکھا تھا، سمندر کی بے چین، بے آرام لہریں دیکھی تھیں، لیکن تب ان میں حُسن کی پرچھائیں تک نہیں تھی۔ اُس دن شمیم نے ہر چیز کو دلکشی بخش دی تھی۔ وہ خوبصورت لمحات! وہ روشن اور چمکتی گھڑیاں! میرے جینے کا جواز ہیں، زندگی کی آخری جمع پُونجی ہیں۔ میں اُس جمع پُونجی کو دنیا سے چھپا کر اپنی روح کی گہرائیوں میں دفن کر دوں گا اور خود سانپ بن کر اُس کی حفاظت کروں گا۔

کل رات اُس بلڈنگ میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ جس نے ہر طرف ہراس پھیلا دیا ہے۔ اُس واقعہ کا مجھ پر جو ردِ عمل ہوا ہے، اُسے سمجھنے کے لیے اپنے دل میں جھانکتا ہوں تو مجھے ہر طرف پھیلے ہراس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو یا جیسے اپنے ہی لاشعور میں دفن شدہ کوئی خواہش یک دم نکل کر شعور میں گھس آئی ہو اور میں اُس کی خوف ناک شکل دیکھ کر سہم گیا ہوں۔

کل رات میں اپنے فلیٹ میں سویا ہوا تھا۔ آدھی رات کے قریب کسی نے دروازے پر زور سے دستک دی۔ میں نیند سے چونک اٹھا اور بھاگ کر دروازے پر پہنچا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے احسان کھڑا تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا:

’’کیا بات ہے ...؟‘‘ میں نے اُس سے پوچھا۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ اندر چلا آیا اور سہمی ہوئی آواز میں کہنے لگا:

’’دروازہ بند کرو تو بتاتا ہوں۔‘‘ میں نے دروازہ بند کیا۔ دو تین آدمی نسیم کے فلیٹ کے باہر جمع تھے۔

’’خو... خون ہو گیا ہے...‘‘ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

’’خون... کس کا خون؟‘‘

’’بتاتا ہوں... پہلے میرے حواس تو بحال ہونے دے۔‘‘ اُس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک گہرا کش لے کر کہنے لگا:

’’نسیم کو اُس کے شوہر نے قتل کر دیا ہے۔‘‘

’’یعنی کہ نسیم کو حمید نے مار دیا۔‘‘

’’ہاں...‘‘ اُس نے مختصر جواب دیا۔

’’لیکن کیسے... کھل کر کیوں نہیں بتاتے۔‘‘

’’تُو تو جانتا ہے کہ نسیم کے ایک گھڑ سوار کے ساتھ تعلقات تھے۔ حمید کو ان تعلقات کا پتا تھا لیکن وہ بے چارہ چیخ پکار کے علاوہ کچھ کر نہیں پاتا تھا۔ آج رات نسیم آئی تو حمید جاگ رہا تھا۔ اُس نے چیخنے چلانے کے بجائے مسکرا کر اُس کا اُستقبال کیا جیسے اُس نے حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہو اور نسیم کو اجازت دے دی ہو کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارے۔ نسیم اپنے شوہر کے اس رویہ سے بہت خوش ہوئی اور کافی دیر تک بیٹھی حمید کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ وہ بھی ہنس ہنس کر نسیم کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ آخر کار نسیم سو گئی اور حمید کرسی میں بیٹھا کتاب پڑھتا رہا۔ اُس نے پہلے ہی ایک بڑا چاقو اپنے پاس چھپا رکھا تھا۔ جب نسیم کو نیند نے آگھیرا تو اُس نے آہستگی کے ساتھ اپنی کرسی لا کر پلنگ کے قریب کھڑی کی اور چاقو نکال کر نسیم کے عین دل پر وار کیا اور تب تک وار کرتا رہا جب تک اُس کا جسم ٹھنڈا نہیں پڑ گیا۔ چاقو کے پہلے وار پر نسیم نے اتنی زور کی چیخ ماری کہ میں جاگ اٹھا اور ان کے فلیٹ کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ حمید پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھ پر ایسی دہشت طاری ہو گئی کہ میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ مجھے لگا جیسے کسی نے میرے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ میرا جی چاہا کہ زور سے چلاؤں لیکن میری آواز حلق میں ہی پھنسی رہ گئی۔ میں بڑی دیر تک یوں بے جان بُت بنا کھڑا رہا پھر بھاگ کر اپنے کمرے میں آچھپا۔ اب جب میں نے دیکھا کہ دو تین آدمی جمع ہو گئے ہیں تب میں کمرے سے نکل کر تیرے پاس پہنچا ہوں۔‘‘

میں اُٹھ کر باہر جانے لگا تو اُس نے چلا کر کہا:

’’کہاں جا رہے ہو؟ خواہ مخواہ گواہوں میں آجاؤ گے۔‘‘ میں اُس کی بات سنی ان سنی کر کے چلا گیا۔ حمید کے دروازے پر ابھی تک تین چار آدمی کھڑے تھے، جو نسیم کے قتل کے عجیب و غریب اسباب بیان کر رہے

تھے۔ پولیس بھی پہنچ چکی تھی۔ پلنگ پر نسیم کی لاش سفید چادر میں ڈھکی پڑی تھی اور پلنگ کے قریب حمید اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے کپڑے خون آلود تھے۔ اُس نے اپنا سر کرسی پر ڈھلکا دیا تھا۔ اُس کے قریب تھانہ دار بیٹھا تھا، جو کاغذات پر قلم چلا رہا تھا۔ حمید نے تحریری بیان دیا تھا کہ قتل اُس نے کیا ہے۔ میں بڑی دیر تک حمید کے چہرے کو تکتا رہا جہاں مختلف جذبات کی پرچھائیوں کا ہجوم تھا۔ بڑی دیر کے بعد اُس نے آنکھیں کھولیں تو لگا کہ جیسے اس کی روح کے پٹ کھل گئے ہوں۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سوائے قتل کی وحشت کے سب کچھ تھا۔

اس واقعہ کو ہفتہ بھر گزر چکا ہے۔ میں اُس سلسلہ میں مزید پیش آچکے واقعات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا لکھتا ہوں کہ میرے دل و دماغ پر چھایا ہراس اب ختم ہو چکا ہے اور میں جذباتی طور پر اُس واقعہ کو قبول کر چکا ہوں۔

میں گذشتہ آٹھ دس دنوں سے شمیم سے نہیں مل پایا تھا۔ آج شام شمیم نے ایک آدمی کے ذریعے مجھے بلا بھیجا۔ میں اُسی وقت اُس سے ملنے چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا کمرہ بڑا بے ترتیب تھا، سارا سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ چاروں طرف کتابیں منتشر پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے کی حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ مسافروں کی طرح اُس کمرے میں رہ رہی ہے اور چاروں طرف بکھری کتابوں اور دوسرے سامان سے اُس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھی ہوا اور ٹرین کا انتظار کر رہی ہو، جو اُسے اپنی منزل تک لے جائے گی۔ لیکن اُس کی منزل کیا تھی!

"تم اتنے دنوں تک مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟" اُس نے کہا۔ "تم مجھ سے یوں دور دور کیوں رہتے ہو! کیا تم مجھے اچھا نہیں سمجھتے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "دو چار دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے تمھارے ہاں نہیں آسکا۔"

"تم مجھ سے محبت نہیں کرتے...؟ مجھ سے محبت کرنا بھی نہیں۔ محبت کا میرے اندر مادہ ہی نہیں ہے۔ جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں ان کے اور میرے درمیان وہ رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو ڈُکاندار اور گاہک کے درمیان ہوتا ہے۔ آؤ کہ ہم دونوں ڈُکاندار اور گاہک کے بجائے دوست بن کر ایک دوسرے سے ملیں۔ وعدہ کرو کہ تم مجھے ہمیشہ دوست سمجھو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں..."

"اب میں تمھیں اپنا سمجھوں گی، جتنی عزت تم نے مجھے دی ہے، اتنی آج تک کسی بھی مرد نے نہیں دی۔ ویسے بھی مرد عزت کے لائق نہیں ہوتا۔ جو مرد مجھ سے محبت کرتے ہیں میں انھیں ٹھوکریں مارتی ہوں اور وہ میرے تلوے چاٹتے ہیں۔ میں انھیں کٹھ پتلی کی طرح نچا کر، ان کی بے بسی، لاچارگی اور اپنی قوت پر قہقہے

لگایا کرتی ہوں۔ میرے اندر محبت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اس مشینی دور میں کسی بھی انسان کے اندر محبت کا مادہ نہیں ہے۔ سب مشین کی طرح محبت سے خالی ہیں۔"

"آپ.... میرا مطلب ہے تم محبت کے وجود سے انکار نہیں کر سکتیں۔ اس دنیا کا وجود ہی محبت کے وجود کی دلیل ہے۔ اگر محبت کا وجود نہ ہو تو شاید دھرتی کا گولا قلابازیاں کھا کر، کسی سیارے سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔" میں نے جوش وخروش سے کہا۔

وہ میری بات سن کر مسکرا اٹھی۔

"درمیانے طبقے کے تمام افراد محبت اور اخلاق کے حوالے تیری طرح انتہاپسند ہوتے ہیں۔ تم نے یونانی دیومالا کا مطالعہ کیا ہے.... یونانی اساطیر کی ایک کہانی ہے کہ دیوتاؤں نے جب دنیا کی تخلیق کی تب دھرتی پر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پھر ایک دیوتا پرومیتھیس نے آسمان سے آگ چرا کر انسانوں کو دی۔ دھرتی سے تاریکی چھٹ گئی اور ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ آج کی یہ تمام تر سائنسی اور علمی ترقی دیوتاؤں سے چرائی گئی اُس آگ کی وجہ سے ہے.... میں شاید دیوتاؤں کو وہ آگ لوٹا دوں لیکن ایک شرط پر کہ وہ مجھے وہ انسانی محبت واپس کر دیں جو اُس آگ میں جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ جسے ان مشینوں نے کچل کر رکھ دیا ہے۔" اُس نے بڑے جوش سے کہا۔ اُس کے چہرے پر درد کی پرچھائیاں لہرانے لگیں اور وہ کھڑکی سے نظر آنے والے آسمان کو دیکھنے لگی۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ تھوڑی دیر میں بیگم مجید کمرے میں داخل ہوئی.... وہی رنگ برنگی لباس اور پاؤڈر اور لپ سٹک کی تہیں! اُس نے مجھے دیکھ کر اپنی مخصوص مسکراہٹ اور سر کی جنبش سے ہلکا سا سلام کیا اور شمیم کے قریب آ کر کہنے لگی:

"کیوں شمیم! آج سیر کے لیے باہر نہیں گئی ہو؟"

"بس آج کل طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"پھر تو تمھیں سیر کے لیے ضرور جانا چاہیے تھا۔ شام کے وقت اس کمرے میں بیٹھنے سے تو طبیعت اور بھی خراب ہو جائے گی۔ اٹھو، اٹھ کر تیار ہو جاؤ، مسٹر سعید تم سے ملنے آئے ہیں۔ اُس کے ساتھ مل کر کلفٹن کا چکر لگا آؤ گی تو تیرا دل بھی بہل جائے گا اور طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"کون مسٹر سعید؟"

"وہی انجینئر، جو جمیل کے ساتھ آیا تھا... وہ دو تین مرتبہ تم سے مل بھی چکا ہے۔"

"ماں!.... ماں! آج میں باہر نہیں جاؤں گی اور کسی سے نہیں ملوں گی۔ تم مسٹر سعید سے کہہ دو کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"لیکن، بیٹی! یہ تو آداب کے خلاف ہے کہ کوئی مہمان گھر آئے اور میزبان اُس کے ساتھ ملے بھی نہیں۔"

‘‘میرا کوئی مہمان نہیں ہے اور میں کسی کی بھی میزبان نہیں ہوں۔’’ اُس نے غصے سے کہا۔

‘‘میں نے کہا ناں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں کسی سے نہیں ملوں گی۔’’

شمیم کے غصے بھرے لہجے سے بیگم مجید سہم کر رہ گئی، اُس نے فوراً کہا:

‘‘اچھا، بیٹی!.... تم آرام کرو۔ میں اُسے سمجھا دیتی ہوں...’’ اتنا کہہ کر وہ پیچھے مڑی اور پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ اور سر کی جنبش سے مجھے سلام کر کے باہر چلی گئی۔ بیگم مجید کے جانے کے بعد کمرے میں بڑی ناخوشگوار خاموشی چھا گئی۔ شمیم کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ کہتے ہیں کہ انسان غصے اور مزاح کے وقت سچ اگل دیتا ہے۔ اُس لیے میں نے فوراً شمیم سے پوچھا:

‘‘میں نے سنا ہے کہ تم احسان سے محبت کرتی ہو۔’’

میری بات سن کر اُس کا قہقہہ چھوٹ گیا اور اُس نے ہنستے ہنستے کہا:

‘‘تم مرد عورت کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہو۔ تم عورت کو جانتے ہی نہیں ہو۔ عورت مرد کی ان خوبیوں سے پیار کرتی ہے جو اُس کی حفاظت کر سکیں۔ عورت کی فطرت میں کچھ ایسے رجحانات ہوتے ہیں جن کا رخ ہمیشہ تباہیوں کی طرف ہوتا ہے۔ جابر مرد اُس کے ان رجحانات کا رخ موڑ دیا کرتا ہے۔ عورت صرف ایسے مرد کی عزت کیا کرتی ہے۔ اُس کی ایسی خوبیوں کی عزت کیا کرتی ہے۔ احسان کے ہڈیالے جسم، نسوانی حُسن اور کمزور شخصیت کو دیکھ کر میری محبت نہیں بل کہ ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ اور سچ مچ میرے دل میں یہ خیال اٹھتا ہے کہ میں ماں کی طرح اُس کی حفاظت کروں۔’’ ہم پھر خاموش ہو گئے۔ وہ پھر سنجیدہ ہو گئی اور کھڑکی سے نظر آنے والے آسمان کو دیکھنے لگی اور میں اُس کے چہرے کو۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر آسمان کو دیکھنے لگی اور میں اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے کچھ دیر کے بعد آسمان سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

‘‘تم خدا کو مانتے ہو....؟’’

‘‘اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں تمھیں ایک بات بتاتا ہوں۔’’ میں نے کہا۔

‘‘ایک مرتبہ ایک تتیا نے میرے کمرے میں اپنا گھر بنایا اور اُس میں انڈے دیے۔ جب انڈوں سے بچے نکل آئے تب ایک دن ایک بچہ اُس کے گھروندے سے نیچے گر پڑا۔ وہ بچے کو منہ میں اٹھا کر اپنے گھروندے میں اندر رکھنے کے لیے تڑپنے لگی۔ لیکن تتیا کے گھر کا منہ اتنا چھوٹا تھا کہ وہ اپنا بچہ اندر رکھ نہ سکی، بل کہ باوجود اُس کے تڑپتی رہی۔ تتیا کے اُس جذبہ کا وسیع ترین تصور خدا ہے.... ہاں، میں خدا کو مانتا ہوں...’’

‘‘تجھے خدا کی ممتا پسند ہے اور مجھے اُس کی قہاریت... میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اس دنیا کو تج کر میراں بائی کی طرح خدا کو ڈھونڈنا شروع کر دوں۔’’ وہ پھر آسمان کو دیکھنے لگی۔ باہر رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا، آسمان پر ستارے ظاہر ہو چکے تھے۔ وہ ہر گھڑی آسمان پر پتہ نہیں کیا ڈھونڈ رہی تھی!

‘‘تم نے نسیم کے قتل کا تو سنا ہوگا...’’ میں نے اُس کی توجہ ہٹانے کے لیے بات چھیڑی۔

''ہاں....'' اُس نے مختصر جواب دیا کہ جیسے یہ بات اُس کے لیے معمولی سی تھی۔

''تیرا اُس بارے میں کیا خیال ہے۔''

''نسیم یا حمید کے متعلق؟''

''دونوں کے بارے میں....''

''دراصل حمید کی جن ظاہری خوبیوں کے ساتھ نسیم نے پیار کیا تھا، وہ جب حمید میں نہیں رہیں تو نسیم کا پیار بھی ختم ہو گیا۔ نسیم کو پتہ نہیں تھا کہ حمید میں ایک پوشیدہ خوبی بھی ہے جسے مردانگی کہتے ہیں اور جس خوبی کے سبب وہ اُس کا خون بھی کر سکتا ہے۔ اگر نسیم کو حمید کی اُس خوبی کا پتہ ہوتا تو وہ واقعی اُس کے مجذوب جسم کی پوجا کرتی۔''

''واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت پہیلی ہے۔''

''عورت پہیلی نہیں ہے۔ عورت تم مردوں سے زیادہ سلجھی ہوئی ہے، لیکن تم مردوں نے اُسے پہیلی بنا دیا ہے۔''

ہم ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ اُس نے کہا:

''چلو، چل کر باہر کا ایک چکر لگا آتے ہیں۔''

''چلو....'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

باہر سڑکوں پر روشنیوں اور آوازوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ بسوں، رکشاؤں، کاروں اور رنگ برنگی کپڑے پہنے (لڑکیوں) آٹو رکشاؤں کی آمدورفت لگی ہوئی تھی۔ سڑک کنارے ملباری ہوٹل میں بیٹھے لوگ اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے اور بڑے بڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ ہوٹل کے قریب ایک رکشا ڈرائیور رکشا ٹھیک کرنے میں لگا ہوا تھا اور رکشے میں بیٹھا آدمی اُسے دیر کرنے پر گالیاں دے رہا تھا۔ پان فروش کے کیبن میں ریڈیو پر سہگل کا پرانا رکارڈ چل رہا تھا:

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں۔

ہم بنجارے بچارے اُس بھرے بازار سے کیا خریدنے آئے ہیں....؟ خوشیوں کے چند لمحات...! مسکراہٹوں کے دو چار پل...! لیکن ہم میں سے کون یہ خریداری کر سکا ہے... وہ رکشا والا، میں یا شمیم.....؟

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں۔

رات کے تین بجے ہیں۔ ہر طرف قبرستان ایسی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ کبھی کبھار سڑک پر کوئی رکشا کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح چلاتا گزر جاتا ہے.... آج شمیم کا برتھ ڈے تھا۔ میں ابھی اُس کی برتھ ڈے پارٹی سے لوٹا ہوں اور اب ڈائری لکھنے بیٹھا ہوں۔

میں آج شام بن سنور کر شمیم کے بنگلے کی طرف گیا۔ بنگلے کے باہر سڑک کنارے نئے نئے ماڈل کی

کاروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ دروازے کے قریب شہاب اور بیگم مجید زرق برق لباس پہن کر مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر شہاب ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھا تو اتنے میں ایک کار بھی دروازے پر آٹھہری، جس سے ایک پختہ عمر کا شخص اترا۔ شہاب مجھ سے مصافحہ کیے بغیر آگے بڑھ کر اُس آدمی سے ملا۔ میں اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ دل نے کہا کہ یہیں سے لوٹ جاؤ، لیکن شمیم کو دیکھنے اور اُس سے بات کرنے کی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگے بڑھ گیا۔

بنگلے کے صحن میں میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ درختوں کی شاخوں میں رنگین قمقمے لگائے گئے تھے۔ ہوا کے لطیف جھونکوں کے ساتھ ہی پتوں کی پرچھائیاں اور رنگین روشنیاں مل کر آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ ہر طرف چہرے ہی چہرے نظر آ رہے تھے۔ جوان، بے فکر اور بے سبب مسکراتے چہرے، خوبصورت، ڈسنے والے اور فریبی چہرے، مرجھائے ہوئے اور تاریک چہرے! کہیں دو چار بڑی عمر کی عورتیں، جوان بننے کی تمنا میں پاؤڈر اور لپ سٹک کی تہیں جما کر نوجوان لڑکوں کی طرف لالچی نگاہوں سے دیکھتی، ان ایام کی یادوں میں گم ہو جاتی تھیں، جو ایام پردیسی پنچھیوں کی طرح گھونسلے خالی کر کے اڑ گئے اور پھر واپس نہیں آئیں گے۔ دو تین جوان لڑکیاں نوجوانوں کی طرف دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں اور پھر یوں مسکرا رہی تھیں جیسے غنچے کھل اٹھتے ہیں۔ کچھ دور ایک درخت کے سائے تلے، شمیم دو چار مردوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کرسیوں کی قطار میں لڑکیوں کے قریب احسان بیٹھا تھا.... ہر ایک اپنے آپ میں گم تھا، اپنی اپنی خوشیوں کے تعاقب میں تھا۔ کوئی بھی آنکھ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں لوگوں کے اُس ہجوم میں کتنا اجنبی تھا۔ میرے اور ان کے درمیان کتنے فاصلے تھے.... میں کون ہوں.... یہ سب کون ہیں.... میں بھٹک کر کس محفل میں آ گیا ہوں...(میں اجنبی، میں بے نشاں، میں پابہ گل)

ہر ایک اپنی شخصیت میں مگن تھا اور میں اپنی بے نشانی میں گم! مجھے اتنی بھی خبر نہ رہی کہ میرے ارد گرد کیا بیت رہی ہے۔ اس قدر کہ تحائف دیتے وقت مجھے اپنا تحفہ بھی یاد نہ رہا۔ جب تمام مہمان اٹھ کر جانے لگے تب میں بھی جانے کے لیے اٹھا اور دروازے تک پہنچا تو عقب سے شمیم نے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟ تھوڑی دیر بیٹھو، تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

میں لوٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مہمانوں، خوشبوؤں اور رنگوں کے قافلے کو جاتے دیکھتا رہا۔ تمام مہمان چلے گئے، صرف میں اور دیگر تین چار آدمی رہ گئے۔ شہاب اُس پختہ عمر شخص کے ساتھ چلا گیا تھا اور احسان کسی بڑے آدمی کے ساتھ! میں کرسی پر تنہا اور خاموش بیٹھا تھا۔

شمیم میرے قریب آئی اور کہا:

”تم نے مجھے تحفہ نہیں دیا۔“

میں نے جیب سے طلائی انگوٹھی نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا:

"دراصل میں اپنا تحفہ تیرے لائق نہیں سمجھ رہا تھا۔"

"ارے پاگل! تحفہ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔" اُس نے انگوٹھی انگلی میں پہنتے ہوئے کہا: "واقعی بہت اچھی انگوٹھی ہے... یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہو، چلو دوستوں کے ساتھ تیرا تعارف کراتی ہوں۔"

"یہ مسٹر رحیم ہیں، فلاں محکمہ میں بڑے افسر ہیں۔ یہ مسٹر محمود ہیں، یہ بھی فلاں محکمہ میں بڑے افسر ہیں۔ یہ مسٹر وحید ہیں، ٹیکسٹائل ملز کے مالک اور یہ مسٹر حامد ہیں، اُس کے زیادہ تر شہر کے تمام کارخانوں میں شیئرز ہیں۔" (میں اجنبی، میں بے نشاں، میں پابہ گل)

"یہ میرے پیارے دوست نعیم ہیں۔" اُس نے "پیارے" لفظ پر اتنا زور دیا کہ ان چاروں نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مجھے پہلی مرتبہ اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔

"آپ کو پتہ ہے کہ آج مجھے جو بھی تحائف ملے ہیں، ان سب میں مجھے کون سا زیادہ پسند ہے؟"

وہ چاروں مجسم سوال بن کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ انگوٹھی...! مجھے سب تحائف میں یہ نعیم کی طرف سے دیا گیا تحفہ پسند ہے۔"

"اس انگوٹھی سے خلوص کی جو خوشبو آ رہی ہے وہ کسی اور تحفہ سے نہیں آ رہی ہے..."

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تحائف خلوص کے ساتھ نہیں دیے۔" ایک نے احتجاج کیا۔

"میں یہ نہیں کہتی.... میں صرف اتنا کہتی ہوں کہ مجھے خلوص کی خوشبو صرف اس انگوٹھی سے آ رہی ہے ..چھوڑو ان باتوں کو، آؤ تاش کھیلتے ہیں.... اچھا، کون سا کھیل کھیلیں؟ آیئے چور بادشاہ کھیلتے ہیں۔" (کتنی چھوٹی تھیں خوشیاں اُس کی۔)

اُس نے تاش منگوائی اور ہم نے کھیل شروع کر دیا۔ وہ تین مرتبہ بادشاہ بنی (حُسن سے قسمت بھی مات کھا جاتی ہے)، ایک بار رحیم چور بنا۔ اُس نے رحیم کو سزا دی کہ وہ دودھ اور چینی کے بغیر کافی کے تین کپ پی جائے۔ رحیم کڑوی کافی کے گھونٹ بھرتا اور عجیب شکل بناتا رہا۔ اُس کی حالت دیکھ کر وہ چھوٹے بچے کی طرح قہقہے لگانے لگی۔ وہ بے چارہ کڑوی کافی پیتا رہا اور شمیم ہنستی رہی۔

دوسری بار حامد چور بنا۔ اُس نے حامد کو سزا سنائی کہ وہ پانی سے بھرا ہوا جگ پی جائے۔ وہ دو گلاس تو بڑے آرام سے پی گیا۔ تیسرا گلاس پیتے وقت ایک ایک گھونٹ اُس کے حلق میں اٹکتا سا رہا، لیکن وہ زور لگا کر پیتا رہا اور شمیم قہقہے لگاتی رہی۔ آخرکار جب پانی حامد کی باچھوں سے بہنے لگا تب اُس نے اُسے معاف کیا۔

تیسری مرتبہ میں چور بنا۔ اُس نے مجھے کوئی سزا نہیں دی اور معاف کر دیا۔ سب نے احتجاج کیا۔ اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "آپ کو بادشاہ کے کاموں میں دست اندازی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔" سب خاموش ہو گئے، صرف حامد اور رحیم جھنجھناتے رہے۔

آخر میں رحیم بادشاہ بنا اور حامد چور۔ رحیم نے کہا: "میں اپنے شاہی اختیارات شمیم کے حوالہ

کرتا ہوں۔ ‘‘

’’میں ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے رحیم کو یہ سزا دیتی ہوں کہ وہ اٹھ کر چور کو سلام کرے۔ ‘‘

’’میں تو بادشاہ ہوں۔ ‘‘ رحیم چیخ اٹھا، ’’سزا تو چور کو ملنی چاہیے۔ ‘‘

’’نا اہل بادشاہ، چور سے زیادہ مجرم ہوتا ہے۔ ہمارے حکم کی فوراً تعمیل کی جائے، نہیں تو ہمیں سخت سزا کا حکم دینا پڑے گا۔ ‘‘ شمیم نے رانیوں کے سے وقار کے ساتھ جواب دیا۔

رحیم نے فوراً اٹھ کر حامد کو سلام کیا۔ شمیم کی سنجیدگی یک دم غائب ہو گئی اور وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

’’اب اس کھیل کو چھوڑو، آؤ پیسوں پر رمی کھیلتے ہیں۔ ‘‘ شمیم نے کہا۔

’’میں رمی کھیلنا نہیں جانتا۔ ‘‘ میں نے جان چھڑانی چاہی۔ ’’اس لیے مجھے معاف رکھا جائے۔ ‘‘ وہ رمی کھیلنے بیٹھ گئے۔ شمیم بازی پر بازی جیتتی چلی گئی اور اُس کے آگے سو سو کے نوٹوں کا ڈھیر بنتا چلا گیا۔ پتہ نہیں قسمت اُس کے حُسن سے شکست کھا کر اُس کے پاؤں پڑی تھی کہ وہ ہر کھیل میں جیت رہی تھی یا پھر وہ سب شمیم کی جیت کی بہار دیکھنے کے لیے خوامخواہ ہارے چلے جا رہے تھے۔ جب رات کے تین بجنے کو ہوئے اور شمیم کو جماہیاں آنے لگیں تب کھیل بند کیا گیا... میں ابھی وہاں سے آیا ہوں اور اب ڈائری لکھنے بیٹھا ہوں۔

آج شمیم نے جس طرح مجھے دوسرے دوستوں پر فوقیت دی ہے اور مجھ سے محبت (شفقت زیادہ مناسب لفظ ہے) کا اظہار کیا، اُسے یاد کر کے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ سب جھوٹ اور نمائش تھا۔ یہ دیگر دوستوں کے دلوں میں حسد پیدا کر کے ان کی محبت کو مضبوط بنانے کا طریقہ تھا۔

آج دو ماہ بعد میں اپنی ڈائری کے یہ پریشان اور بے ترتیب اوراق پڑھنے بیٹھا ہوں.... وہ وقت جو گزر گیا اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔ لمحات کی وہ لہریں جو وقتِ عدم کنار کے ساگر میں ابھرا اور ہم پر سے گزر کر، عدم کے کنارے سے ٹکرا کر فنا ہو گئیں۔ میں نے اس وقت، ان لمحات کو پکڑ کر ان اوراق میں بٹھا دیا ہے۔ الفاظ کی کڑیوں سے بنی سطروں کی زنجیروں سے میں نے ان گھڑیوں کو ان اوراق میں قید کر لیا ہے۔ کون کہتا ہے کہ ہر چیز فانی ہے۔ ہم لافانی ہیں۔ ہمارے گزشتہ غم اور خوشیاں، الفاظ و رنگوں کی صورت قائم رہتے ہیں۔ وقت ہمیں کچل کر قبر میں پھینک دیتا ہے تو ہم سایہ دار درخت کی صورت قبر سے ابھر آتے ہیں۔ ہم صورتیں بدل کر وقت سے لڑتے رہتے ہیں۔

میں آج اپنی ڈائری پڑھتے وقت سوچتا ہوں کہ میں یہ سب کیوں لکھ رہا ہوں۔ کون سی قوت مجھ سے یہ سب کچھ تحریر کروا رہی ہے۔ اپنے دکھوں اور سُکھوں کو دوام بخشنے کی تمنا یا اپنے آپ سے ہٹ کر، اپنے آپ کو دیکھنے کی خواہش، یا پھر ذوقِ نمو! وہ ذوقِ نمو جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر عورت درد کی منازل پار کر کے ایک نئی زندگی کو جنم دیا کرتی ہے، جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر حُسنِ ازل کا بند غنچہ کھل کر یہ جہان بن گیا.... شاید وہ

ذوقِ نموہی مجھ سے یہ سب لکھوا رہا ہے۔

دو ماہ گزر گئے ہیں، میں نے شمیم کو نہیں دیکھا۔ شمیم کی زندگی میں بھی عجیب انقلاب آ گیا ہے۔ اُس نے ان تمام خواہشات کو، جن کے تعاقب میں وہ بھٹکتی رہتی تھی، اپنے اوپر حرام کر دیا ہے۔ اُس نے جسم کے تمام دروازے بند کر کے روح کے کواڑ اُکھیڑ دیے ہیں اور سب کچھ تج کر گوشہ نشین ہو گئی ہے۔ وہ پورا دن اپنے کمرے میں بند رہتی اور عبادت کرتی رہتی ہے۔ اُس نے پورے دو ماہ روزے رکھے ہیں۔ وہ تمام رات جاگتی ہے۔ اُس نے فرش سے تمام ناتے توڑ کر عرش سے استوار کر لیے ہیں اور وہ راہ اختیار کی ہے جو ستاروں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی ہوئی عرش کی چوکھٹ پر ختم ہوتی ہے۔ شمیم کی ماں بہت پریشان ہے۔ اگر شمیم کی یہی حالت رہی تو اُس کے خاندانی وقار کا کیا ہوگا! وہ شمیم کو اُس دھرتی پر لوٹ آنے کے لیے منتیں کر رہی ہے، جس پر اُس کی ماں ہے، جس کے تمام تر ہتھیار کند ہو چکے ہیں، اُس کا بھائی ہے، جس میں کوئی صلاحیت نہیں ہے..... شمیم کے تمام دوست پریشان ہیں۔ میری اپنی حالت کیا ہے ..... وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کون ہے جو الفاظ کا سہارا لے کر انسانی روح کا درد ظاہر کر سکے۔ انسان کے اندر رنج و غم کے دریا اُبھرتے ہیں، ہم ان سے الفاظ کے کٹورے بھر کر باہر لے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی روح اُلٹ کر رکھ دی ہے۔

آج شام کو میں اکیلا بیٹھا تھا کہ احسان آیا۔ وہ آج بہت تھکا ہوا اور اداس لگ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں۔ اُس نے آتے ہی وہ کتابیں میز پر پھینکیں اور اپنے آپ کو ایزی چیئر پر گرا دیا۔ میں نے اُسے اداس دیکھ کر پوچھا:

’’احسان! آج بہت اداس نظر آ رہے ہو۔‘‘

’’بھائی! اداس کیوں نہ ہوں، جینے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔‘‘

’’جس آدمی کو زندگی میں محبت میسر ہو اُسے جینے کا اور کیا جواز چاہیے۔‘‘

’’محبت.....!‘‘ اُس نے غمگین مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ’’بھائی! اس دنیا میں محبت کسی کو بھی میسر نہیں۔ ہر ایک محبت سے محروم اور تنہا ہے۔ محبت، ہمدردی اور خلوص ..... یہ سب کھوٹے سکے ہیں، جنھیں ہم صاف کر کے، چمکا کر دوسروں کو بھی فریب دیتے ہیں اور خود بھی فریب کھاتے ہیں۔ ہر ایک تنہا ہے اور تنہا ہی زندگی کی صلیب اٹھا کر پھانسی گھاٹ کی طرف جا رہا ہے۔ ہم اپنے وجود کے قلعہ میں تنہا قید ہیں اور آنکھوں کے جھروکوں سے زندگی کے اُس بے مقصد ہنگامے کو دیکھ رہے ہیں۔ کوئی بھی کسی کا نہیں ہے، ہر ایک اکیلا ہے۔‘‘

’’تم محبت کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کم از کم ممتا کی سچائی سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔‘‘

’’انسان نے ہمیشہ پیار کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ممتا کی مثال دی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ممتا میں بھی سچائی نہیں ہے۔ ممتا، خود پرستی اور انانیت کا بہروپ ہے۔ عورت جب بچے سے پیار کرتی ہے تب وہ

بالواسطہ اپنے آپ سے پیار کرتی ہے۔ اُس کے اس مقدس اور بے غرض پیار کا سبب یہ احساس ہے کہ ''یہ میرا پیار ہے...'' یہ اُسی کی انا کی ہی بدلی ہوئی شکل ہے۔ انسان کے پاس صرف ایک ہی حقیقی جذبہ ہے اور وہ جذبہ ہے خودپرستی کا۔ میں اس جذبے کی سچائی کے علاوہ باقی تمام جذبات کی سچائی سے انکار کرتا ہوں۔'' وہ خاموش ہوگیا۔ اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور چپ چاپ کش لگانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگا:

''بھائی! ہم سب آج کی اس تہذیب اور ترقی کے شہید ہیں۔ ہم جس جلتی صدی کے مسافر ہیں، اس میں پیار اور محبت ہے ہی نہیں۔ میں ایک مرتبہ ایک لڑکی کے ساتھ پیار کر رہا تھا۔ پیار کرتے کرتے میں رو پڑا، پتا نہیں اُس کے پیار کرتے جسم کے اُس پار، خیالات اور جذبات کی دنیا میں کون بس رہا تھا! اس لیے، بھائی! پیار، محبت اور ہمدردی سب کے سب سراب کے رُوپ ہیں...''

''لیکن سراب کے اس فریب کے بغیر بھی تو جینا محال ہے۔''

''واقعی ان فریبوں کے سوا بھی جینا محال ہے۔''

ہم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ میں نے بات بدلنے کے لیے پوچھا:

''شمیم کا کچھ اتا پتا...''

شمیم کا نام سن کر اُس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں اور بھی گہری ہوگئیں۔ اُس نے بڑی اذیّت ناک آواز میں کہا:

''بھائی! انسان کی زندگی میں کبھی کبھی وہ گھڑی بھی آتی ہے کہ جب وہ خودفریبی کے تمام پردے چاک کرکے، عریاں ہوکر، اپنے چھپے زخموں اور ناسوروں پر نظر ڈالتا ہے۔ آج مجھ سے شمیم کی بات مت کر۔ آج میں اپنے ہی غموں میں اپنا سکھ ڈھونڈتا ہوں۔''

وہ یک دم اٹھا اور کتابیں بغل میں داب کر جانے لگا:

''کہاں جا رہے ہو... بیٹھو... چائے تو پی کر جاؤ۔''

''نہیں، میں چلتا ہوں۔ آج میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔''

رات کے دو بجے ہیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ پورا دن ڈیزل میں جلتی زندگی، تاریک دلوں کو بند کرکے، سپنوں کی چھاؤں میں سوگئی ہے۔ لیکن سپنوں میں بھی چھایا نہیں ہے۔ سپنوں میں بھی مشینوں کی آوازیں ہیں، دیوار گیر گھڑیوں کی ٹک ٹک کی گونج ہے، چہرے ہیں نہ چاند۔

میں اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوں۔ سامنے والی جگہیں کھڑکیوں کے پپوٹے بند کرکے اور ان کے رہائشی دماغ کی کھڑکیاں بند کرکے سو چکے ہیں۔ لیکن میں ابھی تک جاگ رہا ہوں۔ آسمان میں ستارے جاگ رہے ہیں اور سڑکوں کے کناروں پر ایستادہ بجلی کے کھمبے بھی۔

شمیم اپنی روحانی زندگی کو تج کر پھر حواسوں کی زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے۔ اُس نے اپنا جسم خواہشوں کے حوالے کر دیا ہے اور ان خواہشات میں اُس کی ہستی طوفانی سمندر کی لہروں میں ڈگمگاتی کشتی کی مثال بن گئی ہے۔ ساری ساری رات اُس کے گھر میں دوستوں کی محفل جمی رہتی ہے اور اُس کے قہقہوں کی گونج خاموشی کا سینہ چیر کر میرے کانوں سے آ ٹکراتی ہے۔ اس وقت پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ قہقہے اُس کی روح کی آہ و بکا ہیں۔ وہ زندگی میں کیا چاہتی ہے؟ اُس کی روح کن خواہشوں کے تعاقب میں دوڑتی رہتی ہے! میں فوراً اٹھ کر فلیٹ کی تمام کھڑکیاں بند کر لیا کرتا ہوں یا پھر کانوں میں انگلیاں دے دیا کرتا ہوں تا کہ اُس کی روح کی چیخیں نہ سن پاؤں۔

آج شام بڑے عرصے کے بعد میں نے اُسے دیکھا۔ میں شام کی سیر کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ اُس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کار سے اپنے ایک نئے دوست کے ساتھ اتری، مجھے دیکھ کر پل بھر کو رُکی اور پھر سر جھٹک، اپنے دوست کے بازو میں بازو ڈال کر، قہقہے لگاتی بنگلے میں چلی گئی۔ میں سر جھکائے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ یوں گھر آیا جیسے زندگی کا جنازہ میرے کندھوں پر رکھا ہوا ہو۔

اب رات کے دو بجے ہیں اور میں اکیلا بیٹھا ہوں۔ ہر طرف ایسی ویرانی چھائی ہوئی ہے کہ پل پل پر لحد کا گماں ہوتا ہے۔ پل پل جیسے درد کا کوئی دیو ہے جو اپنے ہاتھوں میں، زہر میں بجھا برچھا لے کر، بدن پر مٹی کا لیپ کر کے، وقت کے سمندر سے نکلتا ہے اور زہر میں بجھا برچھا میرے سینہ میں اتار کر غائب ہو جاتا ہے۔ میں درد کے مارے چلا کر آسمان کی طرف دیکھتا ہوں۔ آسمان میں ہزاروں ستارے چمک رہے ہیں، یوں لگ رہا ہے جیسے آسمان کے سینہ کے تمام پوشیدہ زخم عیاں ہو چکے ہوں۔

کل شمیم نے مجھے بلایا۔ میں نے کئی دنوں کے بعد اُسے دیکھا۔ اُس کا چہرہ کچھ مرجھایا ہوا اور اداس اداس سا لگا۔ اُس کا کمرہ پہلے سے زیادہ بے ترتیب تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم آ گئے.... میرا خیال تھا کہ تم مجھ سے ناراض ہو گے اور ملنے نہیں آؤ گے۔“

”میں بھلا تم سے ناراض کیوں ہونے لگا۔“

”اس لیے کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے تم سے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ میں بڑی خراب عورت ہوں۔ تم مجھ سے نفرت کیوں نہیں کرتے۔ میں تمھارے ساتھ ایسا برتاؤ کرتی آئی اور جب آدمی بھیجا تو تم چلے آئے۔ بتاؤ، تم مجھ سے نفرت کیوں نہیں کرتے؟“

”تم میری دوست ہو نا اس لیے۔“

”ہاں.... تم میرے دوست ہو۔“ اُس نے کچھ اس طرح کہا کہ جیسے اپنے آپ کو یقین دلا رہی ہو۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ باہر سڑکوں پر دوڑتی مشینوں کا شور کمرے میں گونجنے لگا۔

”آج تم فارغ ہو؟“ اُس نے یک دم پوچھا۔

’’ہاں… کیوں…؟‘‘

’’آج مجھے کسی کھلی اور پُرسکون جگہ لے چلو۔ اس شوروغل میں میری روح گھُٹتی ہے۔‘‘

’’یہاں سے پچاس ساٹھ میل دور مکلی کی پہاڑی ہے۔ چلو، وہاں کا چکر لگا آتے ہیں۔‘‘

’’چلو…‘‘

’’میں ٹیکسی کا بندوبست کر کے آؤں۔‘‘

’’میری کار جو کھڑی ہے، اُس میں چلتے ہیں۔‘‘

ہم اُسی وقت مکلی کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر کی زندگی کا شوروغل اپنی وسعت میں پھیلتا اور کم ہوتا چلا گیا۔ اب ہماری کار خاموشی سے لیٹی ہوئی سڑک کے سینہ پر دوڑ رہی تھی۔ ہم شہر کی وہ تمام آوازیں، جن میں اپنی آواز بھی سننے میں نہیں آتی ہے، پیچھے چھوڑ آئے اور اب ایک دوسرے کے دلوں کے دھڑکنیں بھی سن رہے تھے۔ ہر طرف کسی دیہاتی کے دل کی طرح کشادہ میدان پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کسی شجر کے نیچے کوئی دیہاتی پتھر پر سر رکھے، اوپر اجرک ڈالے سوتا نظر آیا تو کہیں کوئی چرواہا بھینسیں ہانکتا دکھائی دیا۔ کچھ آگے گئے تو راہ میں بیل گاڑیوں کی قطار نظر آئی۔ ایک بیل گاڑی کے چوگرد اجرک کا پردہ نظر آیا، جس میں شاید دلہن بیٹھی ہوئی تھی اور دوسری گاڑی میں پانچ سات عورتیں ڈھول کی تال پر گیت گا رہی تھیں:

پیپل تیرے پتے رے!
میں نے سب طلائی بنوائے
خوش آمدید
میرا لاڈلا اپنی لاڈلی کے ساتھ اپنے گھر آیا۔

شمیم نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ خود اُتری اور کار سے ٹیک لگا کر بارات دیکھنے لگی۔ بیل گاڑیوں کی چی چوں، ڈھول کی تھاپ اور ان عورتوں کے گیت سے، جو دولہا اور دلہن کے ملاپ پر پیپل کے پتے پتے کو سونے کا ملمع چڑھا رہی تھیں، تمام فضا عجب رنگ میں رنگ گئی۔ بیل گاڑیاں آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئیں اور شمیم خاموشی کے ساتھ وہ آواز سنتی رہی۔ میں نے اُسے اُس گیت کا ترجمہ کر کے سنانا چاہا تو اُس نے کہا:

’’یہ روح کی پکار ہے، فطرت کا راگ ہے۔ مجھے اُس کا ترجمہ مت سنا۔ میں یہ راگ دماغ کے بجائے دل سے سننا چاہتی ہوں۔‘‘

ہم کار میں بیٹھے اور گاڑی چل پڑی۔

’’ہم کراچی سے تیس چالیس میل ہی دور آئے ہوں گے، لیکن لگتا ہے کہ وقت کی صدیاں لتاڑ کر اُس زمانہ میں پہنچ گئے ہیں جہاں زندگی فطرت کے جھولے میں ہلکورے کھا رہی ہے۔ جہاں فطرت انسان کی آواز میں آواز ملا کر گیت گا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر چیز نیند میں ہے اور نیند کی دعوت دے رہی ہے۔‘‘ میں

نے کہا۔

"تم نے یولیسس کا سمندری سفر تو پڑھا ہوگا۔ یولیسس سفر کرتے کرتے ایک ایسے جزیرے پر آ پہنچا جہاں ہواؤں میں مستی تھی اور جہاں کنول کے ایسے پھول تھے کہ جن کے کھانے سے نیند آ جاتی تھی اور آدمی سپنوں میں گم ہو جایا کرتے تھے.... یہ وہی کنول کے پھولوں والا جزیرہ ہے، یہاں کے باشندے کنول کے پھول کھا کر سپنوں میں گم ہیں اور ان دیووں اور راکھشسوں کو نہیں دیکھ پاتے جو انھیں کھا کر ہضم کرنے کے لیے دانت چبا رہے ہیں...."

"مجھے یہاں کے متعلق کچھ اور بتا۔"

"یہ ٹھٹا نگر ہے، نُوری موہانی کا ملک۔"

"نُوری کون تھی؟"

"نُوری ملاحوں میں سے تھی، گندری تھی، لیکن شاہ صاحب نے کہا ہے کہ:

اُس کو گندری (ملاح) کہنا گناہ ہے، جس کی گود میں چاند اُتر آیا۔

"یہاں ایک کینجھر نام کی جھیل ہے، جس کے کنارے کنول ہوتے ہیں اور جب شمال کی ہوا کے مست جھونکے لگتے ہیں تو پوری کینجھر مشک عنبر بن جاتی ہے۔ اس کے کنارے پر جام تماچی اور نُوری کے مَن میں محبت کے کنول کھلے تھے اور ان کی روح مشک عنبر بن گئی تھی.... ٹھٹا نگر شاہ سائیں کا ئسر کا موڑ ہے، جس میں شاہ سائیں کے ابیات ایسی جھیلیں ہیں اور گھاٹ گھاٹ پر نُوریوں کے ہجوم ہیں۔"

اب ہم مکلی پر پہنچ گئے تھے۔

میں نے اُسے لا کر مکلی کی اترائی پر کھڑا کیا۔ اترائی میں پتھر کی ناتراشیدہ چٹانیں پڑی ہوئی تھیں، ایک طرف قبروں کی قطاریں تھیں اور مکلی کے قدموں میں جھیل! جھیل کے آخری سرے پر کھجوروں کے درخت درویشوں کی طرح خاموش کھڑے تھے، جنھوں نے سائے کی رلیاں کندھوں سے اُتار کر دھرتی پر بچھا دی تھیں اور خودگیان میں ڈوب گئے تھے۔ ہوا کے جھونکوں پر کھجوروں کی چوٹیاں یوں جھوم رہی تھیں جیسے جوگیوں کی جٹائیں! تھوڑی دور ٹھٹا شہر کی جگہیں نظر آ رہی تھیں، جن کے اوپر بنے بادگیر یوں نظر آ رہے تھے جیسے محبت کی ماری ہوئی مہندری رانیاں اپنے راناؤں کی راہ دیکھنے کے لیے چھتوں پر سر اُٹھا کر کھڑی ہوں۔ شمیم کبھی جھیل کی طرف دیکھتی، کبھی کھجوروں کی طرف، کبھی بادگیروں کی طرف تو کبھی دور افق کی طرف۔ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں پر نیند کا خمار چھانے لگا اور وہ آنکھیں بند کر کے ایک پتھر پر بیٹھ گئی.... وہ بڑی دیر تک اُسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی اور پھر اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُس نے یک دم آنکھیں کھول کر میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا:

"مجھے یہاں سے واپس لے چل.... مجھے اس خاموشی اور سناٹے سے وحشت ہوتی ہے۔ میں اس

خاموشی میں تنہائی کی چیخیں سن رہی ہوں۔ یہ چیخیں مجھے پاگل بنا دیں گی۔ مجھے یہاں سے لے چلو ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا.... مجھے شوروغل میں لے چل، جہاں میں تنہائی کی چیخیں نہ سن پاؤں۔ ''اُس کے چہرے، آواز اور آنکھوں سے یوں لگ رہا تھا کہ اُس پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ میں پریشان ہوگیا اور اُسے بازو سے پکڑ کر گاڑی تک لایا اور بٹھا دیا۔ اُس نے اپنا سر گاڑی کی سیٹ پر ٹکالیا۔ کار چل پڑی اور ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

''مجھ سے بات کرو، ورنہ یہ خاموشی مجھے کھا جائے گی۔''

''میں تجھ سے کیا باتیں کروں۔'' میں نے لاچارگی دکھاتے ہوئے کہا۔

''میری باتوں کا بُرا مت منایا کر۔ میں ایک بیمار عورت ہوں۔ ہم سب روحانی اور ذہنی طور پر بیمار ہیں۔ ہم میں سے صحت مند انسان صرف وہ دیہاتی ہے جو درخت کے سائے تلے، سر کے نیچے پتھر رکھ کر، اجرک اوڑھے سو رہا تھا۔ ہم دراصل جب بچے کی پرورش کرتے ہیں، تب اُسے الگ الگ قسم کا اسلحہ دیتے ہیں، جس کے ساتھ وہ زندگی کے میدان میں جا کر حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔ میں ٹوٹے پھوٹے اور کند ہتھیار لے کر میدان میں آئی ہوں اور اپنی خواہشات اور خیالات کے ہاتھوں شہید ہوگئی ہوں۔ لیکن میں نے ابھی تک شکست قبول نہیں کی ہے.....''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''یہ روز و شب کا سلسلہ آخر کب تک مجھے یوں آزماتا رہے گا!! پہلے میں نے مذہب کا راستہ اختیار کیا۔ میں پورے دو ماہ تک کمرے میں بند رہ کر خدا کو اپنے آپ میں ڈھونڈتی رہی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ساتھ کوئی نہ کوئی غیر معمولی حادثہ ضرور پیش آئے گا، ایسا حادثہ جس میں میری پوری ہستی زیر و زبر ہو جائے گی۔ آسمان سے کوئی طاقت اترے گی اور مجھے بانھوں میں بھر کر اپنے آپ میں جذب کر ڈالے گی۔ میں دن رات اُس قوت کا انتظار کرتی رہی، لیکن نہ اُس طاقت نے نیچے اتر کر مجھے اپنی بانھوں میں بھرا اور نہ ہی کوئی حادثہ پیش آیا۔ صرف میرے باطنی جہان پر سناٹا چھا گیا، جہاں تنہائی کی چیخوں کی گونجیں ابھرنے لگیں۔ میں گھبرا کر، بند کمرے کے کواڑ کھول کر زندگی کے شور میں چلی آئی۔ اب میں نے ایک راہ ڈھونڈ نکالی ہے۔''

''کون سی.....؟''

وہ میرا سوال سُنا اَن سُنا کر کے پھر اپنے خیالات میں گم ہوگئی۔ اُس نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا:

''تم نے کبھی موت کے بارے میں سوچا ہے؟''

''میں نے تو کبھی زندگی کے بارے میں بھی سنجیدگی سے نہیں سوچا ہے۔''

''زندگی اتنی اہم ہی نہیں ہے کہ اُس کے متعلق سنجیدگی سے سوچا جائے۔ زندگی عورت کی طرح ہے۔ تم جتنا اُسے ٹھوکریں مارو گے، اتنا وہ تیرے قدموں میں گرے گی اور جوں ہی تم اُس کے پیروں میں

گرو گے تو یں ہی وہ تجھے ٹھوکریں مارے گی۔ ہاں، موت ایسی چیز ہے کہ جس کے بارے میں سوچا جائے۔ میرے ذہن میں موت کا تصور ہمیشہ ایک پُراسرار، مغرور اور جابر مرد کی صورت میں ابھرتا ہے۔ ایک ایسے مثالی مرد کی صورت، جس نے زیر ہونا سیکھا ہی نہیں ہے، جس نے ہر قوت پر فتح پائی ہے...

....میں نے موت کا تجربہ کیا ہے۔ میں ابھی چھوٹی تھی کہ ایک مرتبہ تالاب میں گر پڑی۔ جب میرا دم گھٹنے لگا تب مجھے یوں لگا جیسے کوئی جابر مرد مجھے فتح کرنے کے لیے، میرے منہ پہ ہاتھ دے کر میری سانس نکال رہا ہے۔"

کار اب بیچ شہر سے گزر رہی تھی اور ہم دونوں ایک دوسرے کی آواز بہ مشکل سن رہے تھے۔ وہ باتیں کرتی رہی، عجیب وغریب باتیں اور میں سنتا رہا، گاڑی بالآخر اُس کے بنگلے کے دروازے پر آ کر ٹھہر گئی اور میں اُس سے رخصت لے کر گھر آ گیا۔

"شمیم نے خودکشی کر لی ہے۔"

زندگی کا اتنا عظیم المناک واقعہ، میں نے کس طرح دو چار الفاظ میں بیان کر دیا۔ یہ الفاظ، الفاظ نہیں بلکہ شیش ناگ ہیں جنھوں نے اپنا تمام زہر میرے اندر انڈیل دیا ہے اور خود نڈھال ہو کر گر پڑے ہیں۔ میری روح اُس زہر کے سبب کلبلا رہی ہے....

آج میری سب تمنائیں اور خواب، زندگی کے رنگ اور روشنیاں، جل کر راکھ ہو گئے ہیں اور میں اُس راکھ میں اپنا بدن مل کر، سر جھکائے، سیاہ کاغذ پہ یہ الفاظ لکھ رہا ہوں۔

پتہ نہیں کتنے دنوں پہلے کی بات ہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ احسان دوڑتا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا: "شمیم نے زہر کھا لیا ہے۔"

"کیا....؟ کیا کہہ رہے ہو!؟" میرا پورا وجود لرز کر رہ گیا۔

"شمیم نے زہر کھا لیا ہے۔"

"نہیں، نہیں...ایسا نہیں ہو سکتا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ میں نے یوں محسوس کیا کہ تمام اشیا گردش کرتی، آپس میں ٹکراتی، ریزہ ریزہ ہوتی جا رہی ہیں۔ دل ایک آتش فشاں ہے، جس سے جوالا مکھی اُبل کر میری رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔ میں نے پاگلوں کی طرح دوڑ لگائی اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا شمیم کے بنگلے میں جا پہنچا۔ احسان بھی میرے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ بنگلے کے صحن میں بیگم مجید پریشان حال اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ آج اُس کا تمام تر سنگھار لُٹ چکا تھا۔ اُس نے اپنی چیخیں روکنے کے لیے چادر کا پلو منہ میں دیا ہوا تھا، لیکن باوجود اس کے کوئی دبی دبی چیخ اُس کے منہ سے نکل جاتی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو تھے کہ چھاجوں برس رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی درد کے ہاتھوں مجبور ہو کر بال نوچنے لگتی۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے چیخ ماری۔

''ڈاکٹر آیا.... ڈاکٹر ابھی تک نہیں آیا۔ احسان! تم ہی ڈاکٹر کا بندوبست کرو۔ ارے! کچھ بھی کرو، میری بیٹی کو بچاؤ، ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گی۔''

وہ اتنا کہہ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ احسان ڈاکٹر کو لینے چلا گیا اور میں دوڑتا ہوا شمیم کے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں ایک ماتمی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دیوار کے قریب پلنگ پڑا ہوا تھا، جس پر موگرے اور گلاب کے پھول پھیلے ہوئے تھے اور اُن پھولوں پر شمیم لیٹی ہوئی تھی۔ آج اُس کا اَنگ اَنگ سنورا ہوا تھا۔ اُس کے ہلکے سانولے جسم پر سرخ جوڑا تجلیاں دے رہا تھا اور اُس کے ہاتھوں پیروں پر مہندی کی شمعیں روشن تھیں۔ اُس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا، آنکھیں بند اور مٹھیاں پلنگ کے بازوؤں میں کسی ہوئی تھیں۔ پورا کمرہ خوشبوؤں میں رچا ہوا تھا۔ اُس نے میرے قدموں کی آہٹ سن کر آنکھیں کھولیں، جیسے دو زخموں کے منہ کھل گئے ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی اور موت کے سائے کے ساتھ عجیب سا اطمینان جھلک رہا تھا۔

''تم نے یہ کیا کر دیا؟ شمیم!'' میں نے پلنگ کے قریب بیٹھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

''تم آ گئے... اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں جانے سے پہلے تم سے ملنا چاہتی تھی۔ پتہ ہے آج میں اپنے دولہا سے ملنے والی ہوں۔ دیکھو، میں نے کس طرح اپنے آپ کو سجایا ہے۔ آج موت سے میرا نکاح ہونے والا ہے.... وہ سنو... عرش پر میری شادی کی شہنائیاں بجائی جا رہی ہیں۔ اب میرا دولہا گھر آئے گا اور میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مجھے شبستانِ عرش لے جائے گا۔''

اُس کی باتیں سن کر میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مجھے روتا ہوا دیکھ کر اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اُس نے غصے سے کہا:

''روتے کیوں ہو...؟ کیا تم مجھے بے بس اور لاچار سمجھ کر مجھ پر رحم کھا رہے ہو؟ مجھ پر رحم مت کھاؤ! میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں، لیکن رحم کھانا برداشت نہیں کر سکتی۔ میں لاچار اور بے بس نہیں ہوں! میں نے زندگی پر فتح حاصل کی اور آج موت کو بھی فتح کر رہی ہوں۔ کون کہتا ہے کہ انسان کا جینا اور مرنا قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ میں فاتح ہوں۔ پھر تم مجھ پر رحم کیوں کھا رہے ہو؟'' ابھی اُس نے بات ختم ہی کی تھی کہ اُس کا پورا بدن اَکڑ گیا۔ اُس نے پلنگ کے بازو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیے۔ اُس کے دیدے باہر نکل آئے اور اُس کی سانس رکنے لگی۔ میں پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا، اتنے میں اُس کے منہ سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ اُس کا پورا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور وہ اپنی اصلی حالت میں آ گئی۔ میں جیب سے رومال نکال کر خون صاف کرنے کے لیے آگے بڑھا تو اُس نے میرا ہاتھ روک دیا۔

''یہ خون کے چھینٹے میرے دولہا کے مہندی رنگے پیروں کے نشان ہیں۔ یہ آثار تم کیوں مٹاتے ہو! یاد ہے، اُس دن میں نے تمھیں کہا تھا کہ موت کا تصور ایک جابر اور پُراَسرار مرد کی صورت ابھرتا ہے۔ آج وہ جابر مرد آسمان لتاڑ کر میرے پاس آ رہا ہے۔ دیکھ! وہ کس ستمگری کے ساتھ مجھ پر چھاتا جا رہا ہے.... میری

انتڑیوں اور کلیجہ میں خنجر چل رہے ہیں... میری آنکھوں کا نور بھی ختم ہوتا جا رہا ہے...'' اُس پر ایک بار پھر تشنج کا دورہ پڑا۔ اب کی بار یہ پہلے سے شدید تر تھا۔ اُس کی آنکھیں ٹھہری سی گئیں اور منہ سے خون بہنے لگا... تھوڑی دیر تک اُس پر یہ حالت طاری رہی پھر اُس کا اکڑا ہوا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس نے تھکی آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بڑی نحیف آواز میں کہا: ''ماں... ! میری ماں کو بلاؤ۔''

میں دوڑتا ہوا باہر گیا اور پریشان حال بیگم مجید سے کہا کہ شمیم آپ کو بلا رہی ہے۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''میں اپنی بچی کی یہ حالت کیسے دیکھ پاؤں گی۔ میں اندر نہیں جاؤں گی....'' وہ چلا کر رونے لگی۔

''ارے ڈاکٹر کیوں نہیں آیا.... میری بچی کا پتہ نہیں کیا ہوگا۔ میں اندر نہیں جاؤں گی... میں اپنی بچی کو اس حال میں نہیں دیکھوں گی...''

میں کمرے میں لوٹ آیا۔ شمیم کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

''ماں کہاں ہے؟''

''وہ اِدھر نہیں آنا چاہتی، کہتی ہے، میں اپنی بچی کی حالت دیکھ نہیں پاؤں گی۔''

میری بات سن کر اُس کے ہونٹوں پر ایک غمگین مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ماں تو بالکل پگلی ہے... پوری زندگی پرچھائیوں کے پیچھے دوڑتی رہی ہے اور اب جب سچ میری موت کی صورت اُس کے سامنے ننگا ہو کر کھڑا ہو گیا ہے تو اُس کا سامنا نہیں کر سکتی۔ نعیم! تم اپنے آنسو سنبھال کر رکھو اور جب میں مر جاؤں، تب یہ آنسو میری ماں کے لیے بہانا۔'' الفاظ اُس کے حلق میں اٹکنے لگے اور ایک بار پھر اُسے دورہ پڑ گیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے کہا:

''پانی... مجھے پانی پلاؤ...''

میں دوڑ کر باہر سے پانی لے آیا تو شمیم کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ میں ابھی پانی کا گلاس ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا کہ اتنے میں ڈاکٹر، احسان اور شہاب کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے اُس کی نبض دیکھی، پپوٹے الٹ کر آنکھوں میں بیٹری کی روشنی ڈال کر زندگی کی علامات کو ڈھونڈا اور پھر سر جھکا کر سامان سمیٹنے لگا۔ میں نے جھپٹ کر اُس کا کالر پکڑ لیا:

''ڈاکٹر! کیا بات ہے؟''

''زہر اپنا اثر دکھا چکا ہے۔ مریض ایک دو ثانیوں کا مہمان ہے۔''

ڈاکٹر کے الفاظ بجلی بن کر میرے دل و دماغ پر گرے۔ میرا دماغ جھنجھنانے لگا۔ میرے دل نے دھڑکنا بند کر دیا مجھ میں سکت نہیں رہی۔ آہستہ آہستہ میرا ہاتھ ڈاکٹر کے کالر سے چھوٹ گیا اور میری آنکھیں شمیم کے چہرے پر گڑ گئیں۔ میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو تمناؤں کے سرابوں کے تعاقب میں پیاسے

ہرنوں کی طرح دوڑ دوڑ کر تھک چکی اور اب تڑپ تڑپ کر مر رہی تھیں۔ میں نے اُس کے ہونٹوں کی طرف دیکھا، جو پیار کی پیاس میں ترس ترس کر اب خشک ہو کر بنجر ہو رہے تھے۔ میں نے اُس کے مہندی لگے قدموں کی طرف دیکھا، جو وقت کی ریت اور کسی نقشِ پا کی تلاش میں بھٹک بھٹک کر، تھک ہار کر لہولہان ہو چکے تھے۔ پتہ نہیں میں کتنی دیر تک یوں ہی بے جان بُت بنا شمیم کی طرف دیکھتا رہا۔ شمیم کے پورے بدن سے زندگی کوچ کر کے حلق میں اٹک گئی تھی۔ بڑی دیر تک زندگی اور موت کی جنگ جاری رہی اور پھر یک دم اُس کے بے جان بدن میں جان سی پڑ گئی۔ اُس نے آہستگی کے ساتھ اپنا سر تکیہ سے اوپر اُٹھایا اور دونوں ہاتھ بڑھا کر یوں اُٹھنے لگی، جیسے کسی کو گلے لگانے کے لیے آگے بڑھ رہی ہو اور پھر فوراً اُس کا سر پتھر کی طرح سرہانے پر گرا اور ایک طرف لڑھک گیا... کمرے میں حشر بپا ہو گیا۔ میری آنکھوں سے ایک آنسو تک نہیں ٹپکا۔ میں آنکھیں پھاڑ کر اُس کے مردہ چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر فوراً کمرے سے نکل آیا اور شہر کی سڑکوں پہ چلنے لگا۔ ہر طرف خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ شہر کی سڑکیں ایک دوسرے سے ملتی اور بچھڑتی، اپنی ہی تلاش میں گم ہوتی رہیں۔ ستاروں کی مشعلیں بجھ چکیں، چاند کی شکل بے نُور ہو گئی، زندگی کی آوازوں کو سناٹے کی دلدل نگل چکی تھی اور دھرتی کا گولا جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔

آج پتا نہیں میں کتنے دنوں کے بعد گھر لوٹ آیا ہوں۔

لوٹتے وقت جب میں شمیم کے بنگلے کے قریب پہنچا تو وہیں کھڑا رہ گیا۔ بنگلے میں ہر طرف موت ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صحن میں کھڑے درختوں کے خشک پتے، ہوا کے جھونکوں کے گزرنے پر جھڑ رہے تھے۔ بنگلے کی سنگی دیواریں ہزاروں راز سنبھالے خاموش کھڑی تھیں۔ اس خاموشی میں اچانک شمیم کے قہقہے ابھرنے لگے۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”کہیں بھی نہیں... یوں ہی تھوڑا سا ٹہلنے نکلا ہوں۔“

”چلو، میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں....“

”شمیم....!“ میں نے ایک دل دوز چیخ ماری۔ سڑک پہ جاتے لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھنے لگے اور میں کانوں میں ہاتھ دیے، دوڑتا اپنے فلیٹ پہ پہنچا اور پلنگ پر گر کر، تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگا....اب میں رو رو کر تھک چکا ہوں۔ میرے آنسو ختم ہو چکے ہیں اور آنکھیں موسمِ سرما کی جھیلوں کے کناروں کی طرح خشک ہو چکی ہیں اور میں پلنگ سے اٹھ کر ڈائری لکھنے بیٹھا ہوں۔

بیگم مجید اور شہاب بنگلہ چھوڑ کر پتا نہیں کہاں نقل مکانی کر گئے ہیں۔ احسان بھی اپنا فلیٹ چھوڑ کر کہیں اور جا بسا ہے۔ نسیم اور حمید کے فلیٹ میں نئے کرایہ دار آ گئے ہیں۔ میں اب لکھنا بند کرتا ہوں کہ مجھے بھی اپنا سامان سمیٹنا ہے۔

اوسنگ ۔ ون

کورین سے ترجمہ: اطہر قیوم

بے وفائی

لوگوں کا ہجوم جلدی جلدی اس خبر کو پڑھتا اور یک دم ان کے چہروں کا رنگ زرد ہو جاتا اور وہ فوراً شک بھری اور پریشان نظروں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتے ۔ ضمیموں اور چھوٹے چھوٹے دستی بلوں پر بہت بڑے بڑے حروف میں چھپی ہوئی یہ خبر ناقابل یقین سرعت کے ساتھ گلیوں میں گشت کر رہی تھی ۔

یہ سیول کی عقبی گلیوں میں سے ایک میں پینے پلانے کی جگہ تھی ۔ گھر کی بیرونی دیوار مستقل طور پر پیشاب سے گیلی تھی اور اس کی سخت بدبو ساری گلی میں پھیلی تھی ۔ یہ سب کیا دھرا ان بدمست شرابیوں کا تھا جو یہاں اس جگہ کے باہر قطار اندر قطار اکٹھے ہوتے تھے ۔ لیکن اس وقت یہ جگہ قریب قریب خالی تھی ۔ شاید ابھی (لوگوں کے آنے) کا وقت نہیں ہوا تھا ۔ ابھی صرف تیس سال سے اوپر کی عمر کے دو افراد ایک میز پر بیٹھے خاموشی سے پی اور آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے ۔ لگتا تھا کہ وہ سیاست پر بات کر رہے تھے کیوں کہ وقتاً فوقتاً کچھ مشہور سیاسی شخصیات کے نام ان کی گفتگو میں سنے جا سکتے تھے (ان کے علاوہ) ایک پچیس چھبیس سال کا نوجوان گاہک ایک کونے میں میز پر تنہا بیٹھا شراب پی رہا تھا ۔ جس انداز سے وہ حلق سے شراب انڈیلتے ہوئے دوسرے لوگوں کی گفتگو سن رہا تھا اس سے کسی نہ کسی طور پر اس کی بے چینی کا تاثر مل رہا تھا ۔ وقتاً فوقتاً اس کی آنکھوں میں پریشانی کا ایک سایہ سا جھلک اٹھتا ۔

”۳۸ متوازی لکیر کے خاتمے کے لیے قومی سطح پر تحریک چلائی جانی چاہیے ۔“ گفتگو میں مصروف دو آدمیوں میں سے طویل قامت اور مضبوط جسم کے مالک نے اپنے ترلبوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے کہا ۔

”لیکن ہمیں ایک چیز کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ۔ وہ لوگ جو اس وقت بڑے زور شور سے (اس لکیر کے) خاتمے کی تحریک کے حق میں بول رہے ہیں انھیں نہیں ہونا چاہیے ۔“

”میرا مطلب ہے جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اسے ہمیشہ من وعن تسلیم نہیں کیا جانا چاہیے ۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اس کے باوجود کہ وہ کیا کہتے ہیں ، ان میں سے کچھ ، دل ہی دل میں ، ۳۸ متوازی لائن کی حیثیت کو قائم رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ چلو کم از کم وقتی طور پر ہی سہی ۔ یہ رجحان خاص طور پر بائیں بازو کے لوگوں میں پایا جاتا ہے ۔ وہ اپنی طاقت کی بنیاد فراہم کرنے کے لیے کافی وقت حاصل کرنا چاہتے ہیں“ دوسرے شخص

نے نحیف اور نرم آواز میں خیال ظاہر کیا، جو اس کے مضبوط گول چہرے سے میل نہیں کھاتی تھی بالکل اسی طرح جیسے اس کی غیر متوقع طور پر چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کے چہرے کے خاکے سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔

''انھوں موقع آنے پر ایک ایک کر کے برخاست کیا جا سکتا ہے، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' پہلے شخص نے کہا۔

اس پر تنگ آنکھوں والا بالکل واضح طور پر ناراض نظر آیا۔ ''دہشت گردی ہی سیاست کا اول و آخر نہیں ہے۔ اپنی بہترین صورت میں بھی یہ صرف ایک واحد ناگزیر جز ہو سکتا ہے اور وہ بھی صرف ایک مجبوری کی صورت میں۔''

اُسی لمحے کونے کی میز پر بیٹھے ہوئے نوجوان تنہا شرابی نے ان دونوں پر ایک تیز نظر ڈالی۔ کسی وجہ سے نوجوان آدمی کا چہرہ بہت گھمبیر ہو گیا۔ عین اس وقت اس جگہ کام کرنے والا ایک نوجوان لڑکا اپنے ہاتھ میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا چوکور ٹکڑا اٹھائے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''سنو، کیا آپ نے یہ خبر سنی ہے؟ سارا قصبہ الٹ پلٹ کر رہ گیا ہے۔'' اس نے چلا کر کہا۔ اس جگہ کے مالک نے، جو ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا، ہچکچاتے ہوئے وہ کاغذ کا ٹکڑا لے لیا۔ تمیں سے اوپر کے دونوں افراد نے جو اکٹھے پی رہے تھے، مالک کی طرف دیکھا۔ ادھیڑ عمر شخص نے اپنی عینک کی مدد سے اس کاغذ کو پڑھنا شروع کیا لیکن ایک گہری سانس کے ساتھ وہ رک گیا۔ تنگ آنکھوں والے شخص نے جو اس ادھیڑ عمر شخص کو پڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس سے وہ کاغذ لے لیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ لمبا مضبوط شخص بھی (پڑھنے میں) شامل ہو گیا۔ جوں ہی انھوں نے پڑھنا ختم کیا تو انھوں نے نفرت سے اس کاغذ کو تو ڑ مروڑ دیا۔

''ایک اور عظیم آدمی مارا گیا۔''

کچھ دیر تک انھوں نے کچھ نہیں کہا لیکن وہ چوکنے اور دباؤ میں لگ رہے تھے۔

''اسے کس نے گولی ماری ہو گی؟''

''مخالف کیمپ کے کسی شخص نے، اور کون ہو سکتا ہے؟ یقیناً یہ وہی ہوں گے۔'' مضبوط آدمی نے کہا

کچھ دیر تک تنگ آنکھوں والے نے غور کیا۔

لیکن ہم فوراً اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کہ یہ مخالف کیمپ والوں کا ہی کیا دھرا ہے۔ قتل ہمیشہ سیاسی مخالفین ہی نہیں کرتے۔ یہ قریب ترین سیاسی حلیفوں کا کام بھی ہو سکتا ہے۔ انھوں یہ فائدہ ہے۔ میرا مطلب ہے جو کسی کو قتل کر کے اس کی موت پر سب سے زیادہ غمگین بھی نظر آ سکتے ہیں۔ یہ تو صرف عوام ہیں جنھیں دھوکا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تو سیاست کام کرتی ہے؟ جب وہ بات کر رہا تھا تو اس کے چہرے پر گھمبیرتا چھائی جا رہی تھی۔

اسی لمحے شراب پیتے ہوئے نوجوان نے دوبارہ اوپر نظر اٹھاتے ہوئے دونوں افراد پر اچٹتی نظر

ڈالی۔ جب ان کی نظریں ملیں تو توانا شخص اٹھ کھڑا ہوا اور نوجوان آدمی کی میز پر آ گیا۔ مڑے تڑے کاغذ کی تہیں درست کر کے اس نے یہ کاغذ نوجوان آدمی کے پڑھنے کے لیے میز پر رکھ دیا اور پوچھا ”کیا تم اسے پڑھنا چاہتے ہو۔“

نوجوان آدمی نے بغیر اس کاغذ پر زیادہ نظر ڈالے، اپنا مشروب ختم کیا، اطمینان سے ادائیگی کی اور اپنا منہ پھیر کر چل دیا۔

یہ میزوں اور کرسیوں سے اٹا ہوا نیم روشن دفتر تھا۔ جس انداز سے گلی کے ملے جلے شور کی آوازیں آ رہی تھیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی بڑی بڑی گلیوں سے دور دراز الگ تھلگ جگہ ہے۔

”آؤ جام تجویز کریں، وہ جلد ہی یہاں آئے گا۔“ کمرے میں موجود دو آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔ شفاف محلول سے لبالب گلاسوں کے ٹکرانے کی خوشگوار آواز بلند ہوئی۔ اس سے زیادہ مکروہ پیشہ ور شخص میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ میں پریشانی کے عالم میں تقریباً آپے سے باہر ہو رہا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ الجھا کر نہ رکھ دے لیکن ابھی میں نے سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ میں نے دو گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں۔ میں نے اپنے پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے اسے تمباکو کی دکان کے باہر گھومتے دیکھا تھا۔ یہ بجلی کے کوندے کی طرح تیز ہے……

بس یہی ہے……لیکن میں حیران ہوں کہ اتنی دیر گئے اسے کس چیز نے روکا ہوا ہے؟ جس شخص نے یہ کہا اس کا چہرہ لمبوترا اور آنکھیں ترچھی تھیں جو تیزی و طراری کے بجائے ناراضگی اور نفرت کا تاثر دے رہی تھیں۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔

عین اس وقت فلیٹ ہیٹ پہنے ایک شخص نے دروزاہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اپنے ہیٹ کے سرے کو ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے دونوں اشخاص کو سر ہلا کر (سلام کیا) اور ان کی طرف اخبارات کا بنڈل (گٹھا) پھینک دیا۔

”یہ اخبارات پڑھو، لگتا ہے کہ ہر چیز بڑی اچھی طرح تکمیل پذیر ہوئی ہے۔“ نئے آنے والے نے کہا۔ اس بار اس نے خود ہی سر ہلایا۔ دوسرے دو نے تیز تیز اخبارات پر نظر دوڑائی۔

”قاتل ایک بے روزگار جوان آدمی ہے۔“ اس منصوبہ بندی کرنے والوں کے بارے میں تفتیش میں ابھی کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی کیوں کہ مجرم تا حال ہوش میں نہیں آیا۔ ایک گرے ہوئے بے ہوش نوجوان کی تصویر بھی چھپی تھی جس کا تمام چہرہ زخموں سے بگڑ چکا تھا۔ تیزی سے شہ سرخیاں اور تصویروں کے عنوان پڑھتے ہوئے لمبوترے چہرے والے کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”ہم نے یہ ایک بار پھر کر لیا۔“ اس نے کہا۔ ”بہتر ہو گا کہ تم اگلے اخبار پڑھو۔“ فلیٹ ہیٹ والے نے اپنی پیشانی سکیڑتے ہوئے اسے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ لیکن لمبوترے چہرے سے عجیب سی مسکراہٹ غائب نہ ہوئی۔ اس کے ساتھی نے دوسرا اخبار

کو کھولا ۔

"گرفتار کیا گیا مشکوک آدمی ہو سکتا ہے اصل مجرم نہ ہو ۔ پھر اصل مجرم کون ہے؟ اپنے رومال میں منہ چھپائے سسکیاں بھرتی ہوئی ایک لڑکی کی تصویر چھپی تھی جسے مشکوک شخص کی بہن کے طور پر شناخت کیا گیا تھا ۔ ایک اور تصویر مشکوک شخص کی ماں کی تھی جو اپنے بیٹے کی گرفتاری کی خبر سن کر بے ہوش ہو گئی تھی ۔"

"اس میں کیا لکھا ہے؟"

"بہن کے بقول ملزم قصبے میں عرصے سے بیمار ماں کے علاج کے لیے رقم ادھار لینے گیا تھا ۔ میرا بھائی ایسا کام کبھی کر ہی نہیں سکتا ۔ میں خدا کی قسم اٹھاتی ہوں کہ وہ مجرم نہیں ہے ۔" اس کے بعد لکھا تھا کہ لڑکی نامہ نگار کے مزید سوالوں کے جوابات دینے کے قابل نہیں رہی تھی ۔ لمبوترے چہرے والے کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ اسی اخبار کی رپورٹ سننے کے دوران میں بھی پھیلی رہی تھی ۔ پھر اس نے کہا ۔

"کچھ بھی ہو یہ کیس بند ہو گیا ہے" اور یہی اہم بات ہے ۔ ہمیں کسی بھی اور چیز سے پریشان ہونے یا تعلق رکھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ کم تم بھی ایک جام لو ۔"

فلیٹ ہیٹ والے نے ایک جام اٹھایا اور لمبوترے چہرے والے نے اس میں شراب انڈیلی ۔ پھر اپنے ساتھی پر نظر ڈالتے ہوئے جو ابھی تک اخبارات دیکھ رہا تھا، لمبوترے چہرے والے نے اس سے اخبارات چھینے اور انھوں ترتیب سے تہہ کیا اور انھوں اپنے ساتھی کی جیب میں گھسیڑتے ہوئے اس نے کہا ۔" جب ہمارا لڑکا یہاں آئے گا تو اس (خبر) کو پڑھنے سے اس پر برا اثر پڑ سکتا ہے ۔ اسے گھر لے جاؤ اور اگر اسے پڑھنا چاہتے ہو تو وہیں پڑھو" پھر وہ فلیٹ ہیٹ والے شخص کی جانب مڑا اور اسے مخاطب کیا ۔

"کم!"

کم نے پہلے اپنی شراب ختم کی اور خالی گلاس میز پر الٹا رکھتے ہوئے اس نے لمبوترے چہرے والے کی جانب نظر کی ۔

"کیا آپ نے مسٹر چنگ سے بات نہیں کر لی؟ کیا ہر چیز تیار ہے؟"

فلیٹ ہیٹ والے شخص نے اثبات میں سر ہلایا ۔

"کیا لڑکی بھی تیار ہے؟ کوئی خوبصورت لڑکی؟"

فلیٹ ہیٹ والے نے مثبت جواب کے انداز میں برا سا منہ بنایا ۔ اسے دیکھتے ہوئے لمبوترے چہرے والے نے بھی برا سا منہ بنایا ۔ مگر فوراً ہی اس کے چہرے پر کھنچی لکیروں کی جگہ ایک بے نام سے سائے نے لے لی ۔ "کیا تمھیں محسوس نہیں ہوا کہ کچھ عرصے سے ہمارے لڑکے کا رویہ کچھ عجیب سا ہو گیا ہے؟" اس نے پوچھا ۔

دبلے پتلے تشویش زدہ نظر آنے والے شخص نے اپنی جیب سے تہہ کیے ہوئے اخبار کو باہر نکالتے

ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''بالکل اپنی ماں کی وفات کے بعد سے کچھ اداس لگتا ہے۔''

لمبوترے چہرے والے نے نفرت سے فرش پر تھوکتے ہوئے پوچھا: ''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے مشن (مقصد) کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہونا شروع ہو گیا ہو۔'' لیکن اس نے تیزی سے بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ دروازے کو باہر کی جانب سے کھولا جا رہا تھا۔ کمرے میں ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا پھیل گیا۔

''خوش آمدید! تمھیں اتنی دیر کیوں ہو گئی؟ خیر۔ بہت مبارک ہو۔'' لمبوترے چہرے والے نے اپنا گلاس نئے آنے والے کی طرف اٹھا کر کہا۔

لیکن ابھی ابھی داخل ہونے والا شخص ایک لمحے کے لیے دوسروں پر نظر ڈالتے ہوئے آہستہ آہستہ میز کی جانب بڑھا۔ اس نے بغیر ان کی جانب کوئی توجہ دیے بوتل اٹھائی اور پینی شروع کر دی۔ یہ وہی نوجوان تھا جو کچھ دیر پہلے عقبی گلی کے شراب خانے میں اکیلا بیٹھا پی رہا تھا۔

اگرچہ شراب نوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی گہرا کالا بادل نظر آ رہا تھا۔ اس کے بھیگے ہوئے سرخ ہونٹ اس کی دھندلائی آنکھوں سے بالکل متضاد تھے۔

''تم پہلے ہی کہیں اور چند گلاس پی چکے ہو؟'' ہم تو یہ سارا وقت تمھارا انتظار کرتے رہے کہ ہم مل کر جشن منائیں گے؟ لمبوترے چہرے والے نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے نوجوان کو ایک خالی گلاس پیش کیا۔

لیکن نوجوان نے خالی گلاس قبول کرنے کی کوئی علامت ظاہر نہیں کی بلکہ وہ گلاس اور پھر لمبوترے چہرے والے کو دیکھتا رہا۔ ''ایک اور جام لو اور پھر جہاں لڑکی ہے وہاں چلتے ہیں۔ اس سے تم بہت بہتر محسوس کرو گے۔ تمھارے لیے ہر چیز تیار ہے۔ بشمول لڑکی کے اور تمھیں معلوم ہے کہ کسی خاتون کو زیادہ دیر انتظار کرانا اخلاقاً کوئی اچھی بات نہیں ہے'' لمبوترے چہرے والے نے کہا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ رہنے والی عجیب سی مسکراہٹ پھیلی تھی اور اس نے اپنے تحکمانہ لہجے میں بات کی جس سے لگتا تھا کہ اسے دوسرے شخص کے محسوسات پر بھی مکمل اختیار حاصل تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ کسی انتہائی پُرتشدد لمحے کے بعد آدمی کتنی گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کس طرح محسوسات پر گھمبیر سیاہ بادل چھا جاتے ہیں۔ کسی آدمی کو قتل کرنے کے بعد یہ ہمیشہ ہوتا ہے اور اس کا بہترین علاج ایک لڑکی ہے۔ آدمی اپنے بچے کھچے جذبات لڑکی کے جسم میں ڈھیر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد تم سکون کی نیند سو سکتے ہو اور سب کچھ دوبارہ نارمل ہو جائے گا۔'' ایسا کہتے ہوئے لمبوترے چہرے والا نوجوان کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ نوجوان کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سیاہ ہو گیا۔

''ایک اور جام لو اور لڑکی کے پاس چلے جاؤ۔ اس کا نرم جسم تمھارا انتظار کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے

ناں؟“ لمبوترے چہرے والے نے اسے قائل کرنے کے لیے کہا۔ نوجوان نے دوسرے شخص کی آنکھوں میں تیز آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”لڑکی کو واپس بھیج دو۔“

لمبوترے چہرے والے کے ہونٹ ایک استہزائیہ مسکراہٹ سے بھینچ گئے ”پھر تم کہاں جانا چاہتے ہو؟“

”گھر۔“

”گھر؟“

متجسس آنکھیں، اور سیاہ، پریشان آنکھیں خاموشی سے آپس میں چار ہوئیں۔ ”اسے بھول جاؤ۔ کون سا گھر؟“

ایک بار پھر یوں لگا کہ ایک کالا سایہ نوجوان کی آنکھوں سے گزر گیا۔

”میرا گھر ......“ وہ خود سے بڑبڑایا، اور پھر سر اٹھا کر دوسرے شخص کے چہرے کو دیکھا۔ لمبوترے چہرے والے نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھپکائیں اور ایک آہ کو دبا لیا۔

اس کے بعد انھوں نے الفاظ کا کوئی تبادلہ نہیں کیا۔ نوجوان نے ایک جام انڈیلا، اسے غٹاغٹ پیا اور کمرے سے چلا گیا۔ لمبوترے چہرے والا کچھ دیر بند دروازے کو گہری خاموشی سے بغور دیکھتا رہا پھر بوتل پر جھپٹتے ہوئے اسے گلاس میں انڈیلے بغیر براہ راست اس سے شراب پینے لگا۔

شراب کی ایک لکیر سی اس کی ٹھوڑی اور گردن سے بہنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے وہ اپنا سانس درست کرنے کے لیے رکا اور پھر دوبارہ پینی شروع کر دی۔ جب آخر کار بوتل ختم ہو گئی تو اس نے اسے نفرت سے کمرے کے کونے میں پھینک دیا جیسے وہ غصہ نکال رہا ہو۔

اندھیرے سرد آسمان پر ستارے یوں ٹمٹما رہے تھے جیسے برف پر بہت سے موتی جڑے ہوں۔ جب بھی تیز ہوا کا جھونکا آتا، گلی کے دونوں اطراف کے درختوں کی شاخوں میں سے گزرتا تو سوکھے ہوئے پتے اس کے قدموں کے قریب فٹ پاتھ پر برف کی طرح گرنے لگتے۔ نوجوان ایک درخت کا سہارا لے کر آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک وہ اپنے دل کے بوجھل پن سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب سے اخبار کے ایک مڑے تڑے تراشے کو نکالا۔ ایک لمحے کے لیے تصویری سرخی ”مشتبہ شخص کی ماں جو اپنے بیٹے کی گرفتاری کی خبر پر بے ہوش ہو گئی۔“ کے اوپر لگی بوڑھی عورت کی تصویر پر اس کے ذہن کی آنکھ میں اس کی اپنی ماں کی شبیہہ چھا گئی۔ ایک تصوراتی آواز اس کے دماغ میں گونجنے لگی۔ ”یہ سب مادر وطن کے لیے ہے۔“ یہ آواز جاری رہی۔

”ہم سب نے اپنی مادر وطن پر جان نچھاور کرنے کی قسم کھائی ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ

ہمیں کیسے محسوس کرنا ہے لیکن زندگی میں ارفع مقاصد کے حصول کے لیے کچھ چیزیں ضرور قربان کرنی پڑتی ہیں۔ ''

یہ سب کچھ دو ماہ پہلے شروع ہوا تھا۔ زیر زمین انجمن نے، جس سے وہ تعلق رکھتا تھا، تقریباً اسی وقت ایک اہم سیاسی شخصیت کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ نوجوان کا اس مقصد کے لیے ایک بندوق بردار کے طور پر انتخاب کیا گیا تھا لیکن جس رات کو یہ قتل کیا جانا تھا۔ عین اسی رات نوجوان کی اپنی والدہ ایک طویل علالت کے بعد اپنی آخری گھڑیوں پر تھی۔

اس رات، پہلے سے طے شدہ وقت سے ٹھیک نصف گھنٹہ پہلے اس کے گھر کے باہر ایک کار کے ہارن کی تیز آواز گونجی۔ اس کی روشن گھڑی کی دوسری سوئی ڈائل پر صحیح صحیح گھوم رہی تھی۔ ایک دفعہ پھر ہارن کی مختصر سی آواز گونجی۔ اس نے اندھیرے کا خاموشی سے مقابلہ کیا۔

'' اسے ملتوی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف یہی سوچو کہ ہم نے اس کام کے لیے اب تک کتنی محنت اور وقت صرف کیا ہے...... اس کے علاوہ، اگر ہم آج ناکام ہو گئے تو ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ اس کا مطلب ہوگا کہ ہمیں سب کچھ از سرنو ابتدا سے شروع کرنا پڑے گا۔ یہ سارا کچھ (کیوں) جب کہ کامیابی تقریباً ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اپنی ماں کے بارے میں پریشان مت ہو۔ ہم ان کا خیال رکھیں گے۔ کیا ہم نے اپنی مادر وطن کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا حلف نہیں اٹھایا؟''

یہ سب کچھ ایک دھیمے مگر تشویش سے لبریز لہجے میں کہا گیا۔ اس نے خاموشی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔ اپنی والدہ کے کراہنے کی آواز باہر بھی اس کا تعاقب کرتی رہی۔

۱۹۴۵ء میں آزادی کے بعد ملک میں عجلت میں بنائی گئی سیاسی جماعتوں کا طوفان آ گیا تھا اور بے ترتیب جھگڑے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نظریاتی بدنظمی نے ملک کی جوان پود میں ایسا سیاسی شعور بیدار کر دیا تھا جس نے انھیں باہم متصادم سیاسی جماعتوں میں دھکیل دیا۔

ہر ایک کا مادر وطن سے وفاداری کا دعویٰ تھا۔ اس نوجوان کو ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی فرم میں ملازمت مل گئی تھی اور اسے بھی لمبوترے چہرے والے نے جو اسی سکول سے فارغ التحصیل تھا زیر زمین سوسائٹی میں شمولیت کے لیے آمادہ کیا۔ مادر وطن کی بدنام اور تباہ حال تاریخ غیر محبّ وطن غداروں کے ہاتھوں میں رہی تھی اور اب بھی تھی اور زیر زمین تنظیم کا یہ نصب العین تھا کہ ان سب کی ایک ایک کر کے نشاندہی کی جائے اور اس سے پہلے کہ وہ (ملک کو) دوبارہ کوئی خطرناک نقصان پہنچائیں، انھیں راستے سے ہٹا دیا جائے، جنھیں ہر قیمت پر ہٹایا جانا ہے۔ انھیں مادر وطن کے وقار اور عزت کے نام پر ہٹانا ہے۔ اس نے بندوق چلانی سیکھی۔ ایک بہترین طور پر منظم شخص کی حیثیت سے وہ جلد ہی نشانہ بازی میں تقریباً بامِ عروج تک جا پہنچا۔ نشانہ بازی کی عملی تربیت کے دوران میں جب مٹی کی بوتلیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ایک ایک کر کے گرتیں

تو اسے اپنے اندر فخر و انبساط اور جوش و جذبے کا طوفان سا اٹھتا محسوس ہوتا۔ پھر شبینہ بحث مباحثے ہوتے تھے۔ قابض امریکی فوج کے کمانڈر کو کوریا کے حالات کے بارے میں بہت کم معلوم تھا۔ تب وہ کون آدمی تھا جو اپنے فائدے کے لیے غلط ملط اطلاعات کمانڈر کو فراہم کر رہا تھا؟

تب وہ کون شخص تھا جو کمانڈر کو غلط ملط اطلاعات فراہم کر کے حالات کو اپنے مفاد میں استوار کر رہا تھا۔ ان کی بحثوں میں ایک نام عموماً زیر بحث آتا تھا۔ احتیاط کے ساتھ منصوبہ سازی ہوتی۔ روز بروز نوجوان کے دل سے گھر کا خیال دور سے دور ہوتا چلا گیا اور جب یہ سب وقوع پذیر ہو رہا تھا اسی وقت اس کی والدہ کی علالت شدید ہوتی جا رہی تھی۔ غدار کو قتل کرنے کے لیے مقررہ دن سے پہلے والی شام وہ بہت دنوں کے بعد ماں سے ملنے گھر گیا تھا۔

بستر سے لگی اس کی ماں نے پورا دروازہ کھلنے کی آواز پر آنکھیں کھولیں۔ نچلی چھت والا کمرہ تاریک اور گھٹن زدہ تھا۔ وہ خاموشی سے ماں کے سامنے جھکا۔

مٹی کے تیل کے مدہم چراغ کا عکس، اس کی ماں کی خاموشی سے سوالیہ انداز میں اپنے بیٹے کا جائزہ لیتی ہوئی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بجھتے ہوئے انگاروں جیسی نظر آ رہی تھی۔

’’ماں۔‘‘

ایسے لگا کہ بوڑھی خاتون نے بہت دھیمے انداز میں یوں سر ہلایا ہو کہ جیسے اس نے اپنے بیٹے کو پہچان لیا ہو۔

’’ماں۔‘‘ کیا ڈاکٹر یہاں آتا رہا ہے؟‘‘

لیکن بوڑھی خاتون نے کوئی ایسی علامت ظاہر نہ کی جس سے پتہ چلتا کہ اس نے اس کی بات سن لی ہے۔ یہ سوچ کر کہ اس نے اس کی بات نہیں سنی، اس بار اس نے اس کے کانوں کے قریب جھک کر ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ پھر اس نے اس کے تاثرات کا گہرا جائزہ لیا۔ اس کے جھریوں بھرے لب بہت ہلکے سے ہلے، لگا کہ اس کے ہاتھ کچھ پکڑنے کی جستجو میں ہیں۔

اپنا ایک ہاتھ ماں کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے اس نے کہا۔

’’ماں، تمھیں کیا چاہیے؟‘‘

اس نے کوئی جواب نہ دیا، صرف کمزور سی گرفت میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر وہ اس کا ہاتھ اپنے گالوں تک لے گئی۔ آہستہ سے وہ اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں تک لے گئی اور اسے سختی سے دبایا جیسے بیٹے کے ہاتھ کو صرف دیکھنا اور چھونا کافی نہ ہو۔

اس نے اپنے حلق میں جیسے کچھ پھنستا ہوا محسوس کیا۔ اسے وہ مختصر گفتگو یاد آئی جو اس نے کافی دن پہلے آخری بار گھر سے جاتے ہوئے ماں سے کی تھی۔

”تم کب واپس آؤ گے؟“، ”میں آج واپس نہیں آ سکوں گا میں نے ہمسائے میں رہنے والی خاتون سے کہا ہے کہ وہ آ کر تمھارا خیال رکھے۔ پریشان مت ہو، میں نے اسے کچھ رقم بھی دے دی ہے۔ شام کو ڈاکٹر تمھیں دوبارہ دیکھنے آئے گا۔“

”اچھا۔“ پھر کافی دیر تک بے مقصد چھت کو گھورنے کے بعد اس کی ماں جیسے اپنے آپ سے بڑبڑائی: بیٹا ماں کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں اور بھی زیادہ...... لیکن میرا خیال ہے اس کا الٹ ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا (یعنی ماں بیٹے کے لیے سب کچھ ہوتی ہے) بیٹے کو اور بھی اہم کاموں کو نمٹانا ہوتا ہے۔ اس کا دل درد سے بھر آیا جب اس نے ماں سے یہ سنا، (کیوں کہ اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ماں سے جدا ہونا ہی تھا۔)

اور اب اس منظر کو یاد کرتے ہوئے، اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ اپنی ماں کو اپنا ہاتھ سہلاتے اور اپنے ہونٹوں کے ساتھ دباتے ہوئے دیکھ سکتا ہو۔ اس کی ماں کے ہاتھوں کی کمزور حرکت کچھ دیر بعد بالکل ساکت ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ماں کی ہڈیوں بھری کمزور انگلیوں سے ہٹا کر اس کی آنکھوں پر مرکوز کیا۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں بیٹے پر مرکوز ہوئیں پھر بیٹے پر مرکوز آنکھیں مٹی میں پڑے ہوئے چمک دمک سے محروم شیشے کے بٹنوں جیسی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اس نے پریشانی سے سوچا کہ شاید وہ اسے بالکل دیکھ ہی نہیں سکتی تھی بل کہ صرف اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتی تھی۔

اگلے دن وہ گھر پر ہی رہا اور ملنے کی مقررہ جگہ نہیں گیا۔ تقریباً دوپہر کا وقت تھا۔ ایک کار کی چیختی ہوئی بریکوں کے ساتھ گھر کے باہر رکنے کی آواز آئی۔

”من، کیا بات ہے؟“ انجمن کے ایک ساتھی کی احتجاج بھری آواز آئی۔ من، نوجوان شخص نے اپنے ساتھی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسے باہر لے آیا۔

جب وہ صورت حال کی مکمل وضاحت کر چکا تو اس کے دوست کی پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے میں یہاں صورت حال کو سنبھالتا ہوں لیکن تمھیں ابھی اور اسی وقت ملنے کی جگہ جانا ہو گا۔ ہر ایک وہاں تمھارا انتظار کر رہا ہے۔“ اس نے کہا ”انھیں جا کر بتا دو کہ میں ان سے ملنے کے بجائے براہ راست اصل جگہ پہنچ جاؤں گا۔“

اس جواب پر اس کے دوست کا چہرہ پھر سیاہ پڑ گیا۔

”کیوں؟“ اس نے سوال کیا۔ لگتا تھا کہ اسے پریشانی تھی کہ عین آخری لمحے میں من اپنا ذہن تبدیل نہ کر دے اور اس نے من کے چہرے پر ایک گہری متلاشی نظر ڈالی۔

”میں صرف چاہتا ہوں ......“

”تم صرف کیا چاہتے ہو؟“

”میں صرف جتنا ہو سکے اپنی ماں کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔“

اس نے دبی دبی آواز میں کہا۔

”لیکن۔“

”مجھے معلوم ہے مجھ سے توقع کی جاتی ہے کہ میں اپنے نصب العین پر ہر چیز قربان کر دوں۔“

اس نے اپنی ماں کا بستر نہ چھوڑا۔ شام تک ڈاکٹر نے دو تین دورے کیے۔ جب ساتھ کے گھر کی اونچی دیوار پر سورج ڈوبا تو اس کا چھوٹا سا گھر فوراً سرمئی سایوں میں ڈوب گیا۔ جب بیمار کے کمرے میں کھڑکیوں کے راستے رات کی تاریکی نے حملہ کیا تو لگتا تھا کہ ماں بے ہوشی میں چلی گئی ہے۔ ڈاکٹر، جس کا سیاہ بیگ جو اس کے گاؤن سے بالکل ہی مختلف رنگ کا تھا، بوڑھی خاتون کے پاس خاموشی اور گہری سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا اس کی لحہ بہ لحہ کمزور ہوتی ہوئی نبض محسوس کر رہا تھا۔ باہر ایک کار کا ہارن بجا۔ لیکن وہ ذرا نہ ہلا۔ اس کی ماں کی آنکھوں کے پپوٹوں کے گرد موت کا سایہ گردش کر رہا تھا۔ ہارن کے ایک بار پھر تیز اور مسلسل بجنے سے باہر خاموشی بکھر گئی۔ اسے جانا ہی تھا، اپنی دم توڑتی ماں کو اپنے دوست کے سپرد کر کے، اسے جانا پڑا۔

اسی رات بعد میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کا ذہن اب اس کا نام پکارتے ہوئے مری ہوئی ماں کی تصویر بنا سکتا تھا۔ آخری لمحات کی تفصیل جو اس کے دوست نے بعد ازاں اسے بتائی، وہ کبھی بھی بھول نہیں سکتا تھا۔ سسکیاں بھرتے، لٹے پٹے بیٹے کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کے اس کے دوست نے بتایا تھا۔

”مجھے افسوس ہے۔ مگر اتنا غم نہ کرو۔ مرتے وقت تمھاری ماں مطمئن نظر آتی تھی۔ آخری وقت میں وہ تمھارا نام پکارتی رہی چناں چہ میں نے تمھارا کردار ادا کیا۔ جب وہ کسی چیز کو پکڑنا چاہتی تھی تو میں نے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر وہ دیر تک اسے چومتی رہی۔ پھر وہ فوت ہو گئی۔ اگر چہ تم وہاں نہیں تھے مگر وہ اس یقین کے ساتھ فوت ہوئی کہ تم وہیں ہو۔ ٹھیک ہے کہ تم وہاں نہیں تھے مگر اس کے لیے اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ میرا خیال ہے اس سے تمھارے ضمیر پر پڑے بوجھ میں کمی ہو جانی چاہیے۔ اب بس بھی ......“

اب سرد رات میں ٹمٹماتے ستاروں تلے وہ یہ سب کچھ یاد کر رہا تھا۔ اپنی جیب میں پڑے مڑے تڑے اخبار کو محسوس کرتے ہوئے اس نے جلتے ہوئے سگریٹ کے نیچے زمین پر پڑے ٹکڑے کو دیکھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے آدمی کے طور پر تصور کیا جو ان دلوں کو پارہ پارہ کر دینے والے مناظر کی یاد کے جالے سے اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”امی۔“ وہ جیسے اپنے آپ میں کراہا۔ اخبار میں چھپی بوڑھی عورت کی تصویر نے جو اپنے بیٹے کی گرفتاری کی خبر سن کر بے ہوش ہو گئی تھی، ایک بار پھر جیسے اس کی اپنی ماں کے چہرے کی جگہ لے لی تھی۔

یہ ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے کوند گئی۔ اسی لمحے اس نے تقریباً لاشعوری طور پر اپنی

جیب سے اخبار نکالا۔ قریب ہی ایک گلی کا بلب دیکھ کر وہ اس کے نیچے چلا گیا۔ روشنی میں اس نے اخبار کا مقامی خبروں کا صفحہ کھولا اور تیزی سے خبر پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے اپنی دلچسپی کے ایک نکتے کو نوٹ کیا۔

”ٹیکسی“ اس نے آواز دی۔ ٹیکسی میں داخل ہونے کے بعد اس نے پرسکون طور پر ٹیکسی کے ڈرائیور کو ”ہن دریا بلیورڈ“ جانے کو کہا۔ جب ٹیکسی نے ایک یوٹرن لیا اور رفتار پکڑ لی تو ایک بار پھر وہ بوجھل یاد میں کھو گیا۔

اپنی ماں کی وفات کے وقت سے لے کر اس کے ذہن میں آہستگی سے ایک شک در آیا تھا۔ اسے نظر آنے لگا تھا کہ اس کے اعمال سے جہاں ایک نصب العین کی تکمیل ہوتی تھی وہیں ایک دوسرے نصب العین کی نفی بھی ہوتی تھی۔

ملک کی سیاسی صورت حال روز بروز بے یقینی اور بدنظمی کے دلدل میں مزید دھنستی چلی جا رہی تھی۔

سیاسی رہنماؤں میں رقابت اور منافرت، سیاسی جلسوں میں کھلے اور واضح الفاظ میں ایک دوسرے کی مذمت اور جسمانی تشدد اور پیچیدہ قسم کی سازشوں اور بغاوتوں کی بھرمار جس نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جس کی کہیں کوئی انتہا نہیں تھی۔

اس کی ماں کے انتقال کے کم و بیش ایک ماہ بعد یہ ایک برساتی شام تھی۔ من دفتر میں داخل ہوا اور اسے فوراً ہی کمرے کی فضا پر چھائی ہوئی شدید کشیدگی کا احساس ہوا۔ لمبوترے چہرے والے کی آنکھیں زہر آلود تھیں مگر اس کی ہمیشہ رہنے والی عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

سیلر کی جانب کھلنے والے تنگ دروازے میں سے ایک شخص اپنے ہاتھوں کو کپڑے کے ایک ٹکڑے سے صاف کرتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کی انگلیوں پر خون کے دھبے تھے۔

”کوئی تبدیلی؟“ لمبوترے چہرے والے نے سوال کیا۔ جو شخص ابھی ابھی آیا تھا اس نے جواب میں صرف منہ بنایا۔

من احتیاط کے ساتھ سیلر کی جانب اترتی ہوئی تنگ سیڑھی سے اپنا سر جھکا کر نیچے اترتا گیا۔

زمین کی سطح پر ایک آہنی مستطیل کھڑکی کھلتی تھی اور اس کھڑکی سے آتی ہوئی مدھم روشنی میں من فرش پر پڑے ہوئے ایک نوجوان کو دیکھ سکتا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ مر چکا ہو۔

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد من نوجوان کے پاس پہنچ گیا۔ قدموں کی چاپ سن کر نوجوان نے باغیانہ انداز میں اپنا سر اٹھایا۔ نوجوان کے لبوں میں ارتعاش پیدا ہوا اور اس کے لبوں کے درمیان سے خون کی ایک دھار نیچے گرنے لگی۔ اس کی آنکھیں لعنت و ملامت اور مزاحمت سے جل رہی تھیں۔ من نے خاموشی سے اس پر نظر ڈالی۔ اس کے بائیں کان کے نیچے بالوں کی لٹیں خون سے چپک گئی تھیں اور اس کی گردن پر بھی خون کے دھبے تھے۔

”تم بھی مجھ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہو؟“

”تم لوگ سیدھا مجھے قتل کر کے اس قصے کو ختم کیوں نہیں کر دیتے؟“ نوجوان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ جب اس نے یہ کہا تو اور زیادہ خون اس کے منہ سے نیچے گرا۔ من کچھ دیر تک خاموشی سے نوجوان کو دیکھتا رہا اور پھر اپنے خالی ہاتھ اس کے سامنے کر دیے۔

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

من نے کچھ دیر اپنا سانس روکے رکھا۔ من کے لیے اس خون میں لت پت نوجوان کو دیکھنا، جس نے کچھ دیر میں، باہر کی دنیا کی روشنی دوبارہ دیکھے بغیر مر جانا تھا، نا قابل برداشت تھا۔ وہ واپس مڑا اور سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھایا۔ سیڑھی پر پہلا قدم رکھتے ہی وہ رک گیا۔ جب ان کی آنکھیں چار ہوئیں تو فرش پر پڑا نوجوان کچھ بڑبڑایا، اس کے منہ سے اب بھی خون جاری تھا۔

”تم ....تم بھی یہ سوچتے ہو کہ میں نے وفاداریاں بدل لی ہیں؟“ نوجوان نے فرش پر بیٹھے ہوئے کہا۔ من نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

فرش پر بیٹھے نوجوان کی پریشان اور چبھتی ہوئی تیز آنکھوں پر ایک بار پھر گہرا اندھیرا سا چھا گیا۔

”یہ صحیح ہے کہ میں کئی مخالف جماعتوں کے آدمیوں سے ملا اور ان سے بات چیت کی۔‘ فرش پر بیٹھے نوجوان نے کہا۔ ”لیکن اس کا مقصد صرف اپنے آپ کو بہت بہتر طور پر سمجھنا اور جاننا تھا۔ یہ اپنی از سر نو شناخت کا ایک طریقہ تھا۔ لیکن اب تم لوگ مجھ پر اپنی جماعت کے رازوں کو افشا کرنے کا الزام عاید کرتے ہو، لعنت ہے!“ اس کی آنکھوں سے لعنت و ملامت اور شدید غصے کی ملی جلی کیفیت جھلکنے لگی۔ اپنے خون رستے ہوئے ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

”ہماری تنظیم کا سیاسی پلیٹ فارم اول درجے کا نظر آتا تھا اسی لیے میں نے اس میں شمولیت اختیار کی۔ ہو سکتا ہے صرف میں نے تنہا ہی ایسا نہ کیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے سارے نوجوانوں نے بھی اسی وجہ سے اس میں شمولیت اختیار کی ہو اور اس سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے ہم سب کتنے سادہ لوح تھے۔ ہمارے پاس کوئی قابل ذکر سیاسی تجربہ یا تربیت نہیں تھی۔ ہمارے لبوں کو سب سے مرغوب لفظ مادر وطن تھا لیکن حقیقت میں ہمارا اس کے بارے میں کوئی واضح تصور نہیں تھا (کہ یہ کیا ہے) صرف ایک اندھا اور نا پختہ جذبہ۔ اور اسی کا سیاست دانوں نے فائدہ اٹھایا۔ شروع میں مجھے اس کا احساس نہیں ہوا لیکن جلد ہی میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ کیوں کہ مجھے پتہ چلا کہ ہر ایک سیاسی جماعت کا پلیٹ فارم بھی اتنا ہی اول درجہ کا ہے۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں مخالف جماعتوں کے اشخاص سے زیادہ تر کس موضوع پر بات کرتا تھا؟“

یہاں اس نے بڑے بڑے ناموں کی ایک فہرست گنوا دی، اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہاں تو یہ سارے کے سارے ماضی میں ”محبّ وطن“ تھے۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون کون آنے والے

سالوں میں بھی سچے محبّ وطن ہوں گے۔ کیا تم ان سب کو علا حدہ علا حدہ بتا سکتے ہو؟"

اپنے لوگ جن کے نقش قدم پر ہم چلیں، اگر ضرورت پڑے تو زندگی کی قیمت پر بھی؟"

"یہ سیاست دان، یہ صحیح ہے کہ یہ جاپانی سامراج کے خلاف لڑے، لیکن یہ سب اب اس واحد سیاسی اثاثے کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی جماعت کے ممبران کی تعداد میں اضافہ کر کے اقتدار پر قابض ہونا چاہتا ہے لیکن ہم نوجوانوں نے سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا۔ شاید ہم سادہ لوح تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارا اپنے مادرِ وطن کی تعمیرِ نو کے لیے جذبہ، جسے ایک طویل غلامی کے بعد دوبارہ حاصل کیا گیا تھا، بالکل خالص تھا۔ لیکن سیاسی رہنماؤں کی ہوس کی کوئی حد نہیں ہے۔

ذرا سیاسی جماعتوں کے بے ترتیب اور جھاڑ جھنکار کی طرح پھیلنے پر نظر ڈالیں یا ان کے طرزِ عمل کو دیکھیں ہم اس میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور ان (سیاسی لیڈروں اور جماعتوں) کی جانب سے ہمارا استحصال کیا جا رہا ہے۔ مادرِ وطن کے لیے ہمارا خالص پیار ان کی ہوس کی وجہ سے داغدار ہو رہا ہے۔ نوجوانوں کی تنظیموں کے مابین ہنگامہ آرائی پر ایک نظر ڈالو۔ اس سے بہتر کیا دلیل پیش کی جا سکتی ہے؟" اس ہنگامہ آرائی کے پس پشت کارفرما مکار اور پیچیدہ قوتوں کے بارے میں غور و کرو۔" اس نے جما ہوا خون فرش پر تھوکا اور اپنی بات جاری رکھی۔

"آپ لوگ آج صبح انتہائی ہوشیاری سے مجھے بہلا پھسلا کر یہاں لے آئے لیکن جب میں سب کچھ، بشمول سیاست، چھوڑ چھاڑ کر گھر جانا چاہتا تھا تو آپ نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔ ایسا کرنے کی میری واحد وجہ یہ تھی کہ میں اس غلیظ کھیل میں مزید اپنے جذبات کا زیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، اور مجھے اس کا حق بھی حاصل ہے، کہ میں اپنی نسل کے کسی نوجوان سے بات کروں، بس اتنی سی بات ہے، لیکن آپ لوگوں کی نظر میں یہ بے وفائی ہے۔" نوجوان نے توقف کیا اور اچانک کھانس کر خون کی حیران کن حد تک زیادہ مقدار تھوک دی۔ پھر اپنی جلتی ہوئی آنکھوں اور زرد چہرے پر شدید نفرت لیے ہوئے وہ فرش پر گر پڑا اور بے حس و حرکت وہاں پڑا رہا۔

من کو اس خوفناک منظر سے اپنی نظریں ہٹانا پڑیں۔

سیاسی فساد کی شدت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا اور یہ روز بہ روز زیادہ متشدد اور طوفانی ہوتے گئے۔ تمام سیاسی تقسیم اور ٹکراؤ اور مناقشات کے پیچھے ہمیشہ بے وفائیاں کارفرما ہوتی تھیں۔

جلد ہی اس کی تنظیم کے لوگوں نے کسی ایک یا دوسرے سیاسی رہنما کو راستے سے ہٹا دینے کی ضرورت کے بارے میں بات شروع کر دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ گو "الف" بظاہر ان کے ساتھ تھا، مگر وہ خفیہ طور پر مخالف جماعت کے رہنما "ب" کے ساتھ ساز باز میں مصروف تھا۔ جب اس طرح کی بات بڑھتے بڑھتے اٹل پڑنے کے مقام پر پہنچ جاتی تو تنظیم "الف" کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیتی اور اس سلسلے میں

ایک منصوبہ تیار کرلیا جاتا۔ لیکن اس بار من کو چھوڑ دیا گیا تھا کیوں کہ تنظیم کے رہنماؤں نے اس کے حالیہ کام کی وجہ سے اسے آرام کا موقع دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے بجائے نشانہ بازی حیثیت سے ایک اور نوجوان کو منتخب کرلیا گیا تھا۔ لیکن اقدام قتل ناکام ہوگیا کیوں کہ ناتجربہ کار بندوق بردار اہم ترین لمحے پر بدحواس ہوگیا تھا۔

ایک نیا منصوبہ تیار کیا گیا اور اس بار من کو بندوق بردار کے طور پر منتخب کرلیا گیا۔

"تم دوبارہ یہ کام کروگے۔ میرا مطلب ہے تم اسے آسانی سے کر سکتے ہو، جیسا کہ تم نے پچھلی بار کیا تھا۔" لمبوترے چہرے والے نے اس سے کہا۔

من کے چہرے پر ہچکچاہٹ نمودار ہوئی۔

"کیا بات ہے؟"

"میں اس کام کی ضرورت کا قائل نہیں ہوں۔"

شک اور غصے سے بھری آنکھیں فوراً اس پر ڈالی گئیں لیکن اس نے اپنی شخصیت کا رکھ رکھاؤ برقرار رکھا اور جلد ہی اس کے دوست کی آنکھوں میں نرمی درآئی۔

"مجھے معلوم ہے تم ابھی تک اپنی والدہ کے بارے میں سوچ رہے ہو لیکن تمھیں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ ہمارے لیے ہمارا نصب العین ہر شے سے اہم ہے۔"

"بہت ہوگیا۔" من نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "تم مجھے صرف گولی مارنے کے لیے کہو اور میں گولی ماردوں گا۔ برائے مہربانی مزید تبلیغ سے پرہیز کرو۔"

لیکن منصوبے پر عمل درآمد انتہائی مشکل تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مقررہ وقت دن دیہاڑے دوپہر کے چار بجے تھا۔ گولی چلانے کا عمل آسان تھا لیکن اصل مسئلہ وہاں سے بھاگ نکلنا تھا۔ صرف ایک اچھی بات تھی کہ وہاں کوئی بھی راہ گیر نہیں ہوتا تھا چناں چہ ایک محتاط اور ذہانت پر مبنی منصوبہ تیار کیا گیا۔ من اور ایک اور شخص نے اس گھر کے سامنے دوسری طرف تمباکو کی دوکان کے سامنے تقریباً بیس منٹ تک مٹرگشت کرنی تھی جس گھر سے مسٹر "الف" نے باہر آنا تھا۔ من نے اس گھر کی جانب پشت کرنی تھی جب کہ اس کے ساتھی نے گھر کے داخلہ گیٹ پر نظر رکھنی تھی۔ اگر اسے "الف" نظر آگیا تو من کو اشارہ دینے کے بعد اس نے گلی عبور کرنی تھی۔ پھر من نے اس کے پیچھے پیچھے گلی عبور کرنے کے بعد اس کے پیچھے چھپتے ہوئے مسٹر "الف" پر گولی چلانی تھی۔

جب من نے ایک عقبی گلی کے ذریعے وہاں سے بھاگنا تھا تو پہلے سے موجود اس کے بہت سے ساتھیوں نے مجرم کے تعاقب کے بہانے اس کے پیچھے بھاگنا تھا۔ اگر خوش قسمتی سے اس تعاقب کے دوران میں اس جعلی تعاقب کرنے والی جماعت کو راستے میں کوئی نوجوان ہاتھ لگ گیا تو وہ اسے پکڑ کر مارنا شروع کر دیں جیسے کہ انھوں نے اصل مجرم پکڑ لیا ہو۔ انھیں پولیس کی تفتیش میں تاخیر پیدا کرنے کے لیے اس بات کو یقینی

بنانا تھا کہ وہ شخص تشدد سے بے ہوش ہو جائے۔ اگر بد قسمتی سے کوئی راہگیر ہاتھ نہ لگا تو پھر انھیں کوئی نیا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا تا کہ من نکل بھاگ سکے جب کہ ایسا لگے کہ وہ سارے تعاقب میں مدد دے رہے ہیں۔

اسی منصوبے پر عمل کیا گیا اور یہ کامیاب ہو گیا۔ خوش قسمتی سے عین اسی وقت ایک نوجوان راہگیر وہاں سے گزر رہا تھا جسے بندوق بردار کی حیثیت سے پکڑ لیا گیا۔ اخبارات نے یہی اطلاع دی تھی۔ وہاں سے نکل بھاگنے کے بعد من ایک ساتھی کے گھر چھپ گیا جہاں اس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے۔ کچھ دیر بعد ذہنی دباؤ کو کم کرنے کے لیے وہ عقبی گلی میں ایک پینے کی جگہ گیا اور وہاں تنہا بیٹھ کر شراب پی۔ وہاں سے نکل کر اس نے ایک اخبار خریدا۔

ٹیکسی چیختی بریکوں کے ساتھ رک گئی۔ من اپنی سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے ٹیکسی کے رکنے کا احساس تک نہ ہوا۔ ”یہ ہن دریا بلیوارڈ ہے۔“ ڈرائیور کو اسے یاد دلانا پڑا۔

وہ ٹیکسی سے باہر آ گیا اور دیر تک گلی میں خالی الذہن کھڑا رہا جیسے وہ گم ہو گیا ہو۔ پھر اس نے اخبار میں دیے گئے ایک پتے کی دوبارہ تصدیق کی اور ایک چھوٹے سے اسٹور سے اس پتے کے بارے میں معلومات حاصل کیں لیکن اس علاقے میں اس پتے کو ڈھونڈھ لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد وہ آخر کار ریل کی پٹڑی کے پاس ایک ٹوٹے پھوٹے کچے مکان تک پہنچا جس کے دروازوں پر پرانے اخبار لگائے گئے تھے۔ جس لڑکی نے دروازہ کھولا وہ یقیناً اس گرفتار شدہ ملزم کی بہن تھی جس کی تصویر اخبارات میں چھپی تھی۔

”کیا تمھارا تعلق پولیس سے ہے؟“ ڈری ہوئی لڑکی نے پوچھا۔

”..........“ اس نے کچھ نہ کہا۔ اس نے بس اپنا سر جھکا دیا۔

”میرا بھائی ......“ اس نے کہنا شروع کیا لیکن سسکی کی وجہ سے اس کی آواز بھرا گئی۔ میرا بھائی جرائم پیشہ نہیں ہے۔ وہ اس طرح کا شخص نہیں ہے۔ کیا آپ برائے مہربانی اسے چھوڑ نہیں سکتے۔“

”مجھے افسوس ہے لیکن میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔“ من نے کہا۔

”پھر تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ ہوں، ہوں، تم یقیناً کسی اخبار سے تعلق رکھتے ہو۔“ وہ کراہ اٹھی اور آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

”مہربانی کر کے لکھو کہ میرا بھائی مجرم نہیں ہے۔ کچھ وقت گزرنے پر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ نہیں ہے۔ آپ کی صرف ایک سطر ہی کافی ہو گی۔ میری بد قسمت ماں ...... میرا بھائی بیمار ماں کے لیے دوائی خریدنے کی خاطر ادھار لینے باہر نکلا تھا۔ وہ جلد ہی مر جائے گی اور میں اس خیال کو ہی برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ اس وقت فوت ہو جائے جب اس کے بیٹے پر ایک جھوٹا اور غیر منصفانہ الزام ہو۔“

وہ سسکیاں بھرنے لگی لیکن جب اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اجنبی کی

آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

من نے اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں تا کہ لڑکی اس کی آنکھوں میں آئے آنسو نہ دیکھ سکے۔

''کیا تمھاری ماں کو دیکھنے ڈاکٹر آتا ہے؟''

لڑکی نے صرف غور سے من کو دیکھا۔ واقعات کی اس تبدیلی کو ذہنی گرفت میں لانے سے قاصر من نے بینک نوٹوں کا ایک بنڈل اس کے ہاتھوں پر رکھا اور وہ وہاں حیران و ششدر چپ چاپ کھڑی رہی اور کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہ پاتے ہوئے وہ مڑا۔

''مجھے کم از کم یہ پتہ تو چلے کہ آپ ....'' لڑکی بڑبڑائی۔

من ایک ساعت کے لیے لڑکی کی طرف مڑا۔

''تمھارا بھائی جلد گھر آ جائے گا۔ اس کے بارے میں فکر مت کرو۔ صرف اپنی ماں کی دیکھ بھال کرو۔ ٹھیک ہے ہاں؟'' اور ہلکی سی سر کی جنبش سے وہ مڑا اور چلا گیا۔ لڑکی نے پھر رونا شروع کر دیا۔

اگلے دن من تنظیم کے دفتر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ماحول خاصا کشیدہ تھا۔

''پھر؟'' لمبوترے چہرے والے شخص نے کہا۔

''آئیں، ایک چیز یہاں واضح کر لیں۔'' من نے دوسرے شخص کی آنکھوں میں اطمینان سے دیکھتے ہوئے کہا ''میں یہاں کسی تفتیش سے گزرنے کے لیے نہیں آیا۔'' لمبوترے چہرے والے کے لبوں پر معمول کی عجیب مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے خود کو بہت تھکا لیا ہے۔ لیکن تم ایسے بے وقوف نہیں ہو کہ آخری لمحے میں ہر چیز کو آپس میں گڈمڈ کر لو۔''

لیکن من نے یوں اپنی بات جاری رکھی جیسے اس نے اُس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

''میری بات سنو، میرا سادہ سا فلسفۂ نظر یہ ہے۔ میں اب جتنا بھی ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ عام، سادہ لوگوں سے محبت کرنا چاہتا ہوں۔ میں اب عام لوگوں کی سیدھی سادی زندگی کو ان بڑی بڑی کامیابیوں پر ترجیح دیتا ہوں جن کے ہم خواب دیکھتے ہیں۔''

''تم ابھی تک نہیں سمجھتے کہ تاریخ کیا ہے۔''

''مجھے تمھاری قسم کی تاریخ کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی قسم کی جو قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔''

''تو کیا تم اب ہمارے نصب العین کے بھی منکر ہو''؟

''میں اب ایسی زندگی کو ترجیح دیتا ہوں جس میں نصب العین وغیرہ پر بحث و تمحیص کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''کیا اس کا مطلب بے وفائی ہے؟''

''تمھاری جو مرضی ہے وہی سمجھ لو، بہر حال میں جا رہا ہوں۔''

’’کہاں؟‘‘

’’گھر۔‘‘

’’گھر؟‘‘ لمبوترے چہرے پر ایک حقارت آمیز گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔

’’کیا تم اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟‘‘

’’میں اتنا احمق نہیں ہوں۔‘‘ مِن نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے دوست نے اسی وقت پستول نکال لی۔

فضا میں ایک کشیدہ سنسنی پھیل گئی۔ لیکن مِن مڑا اور بغیر کسی پریشانی کے دروازے کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ اس نے جیسے ہی گزرنا شروع کیا گولی چلنے کا دھماکہ ہوا۔ مِن جم گیا، اُسے ایسا لگا جیسے اُس کا سر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا ہے اور اس کی جگہ ایک سفید، کاغذ جیسی خالی جگہ نے لے لی ہے۔ ایک ہی لمحہ بعد، تاہم اسے یوں لگا کہ بکھرے ہوئے ٹکڑے، گولی کی آواز کی دور سے دور ہوتی ہوئی تہہ در تہہ بازگشت کے ساتھ ہی دوبارہ اپنی اپنی جگہ پر آ گئے ہیں۔ وہ دروازے سے یوں باہر نکل گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ دوسرے ساتھی مِن کی جانب اور پھر فرش پر گولی کے بنائے ہوئے سوراخ کو گھورتے رہے۔ ’’میرا نہیں خیال کہ اس طرح کا خطرہ یا دھمکی اُسے روک سکتی تھی۔‘‘ لمبوترے چہرے والے نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ مِن جچے تلے قدموں سے آہستہ آہستہ گلی میں چلتا گیا۔ اُس کے دماغ کی آنکھ میں لڑکی، اُس کی دم توڑتی ہوئی ماں اور اُس کی اپنی مری ہوئی ماں کے چہرے آپس میں گڈمڈ اور ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔ اُسے اب محسوس ہوا کہ وہ ایک بہت ہی طویل مدت بعد واقعی پہلی بار اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔

☆☆☆☆

طاہر بن جلّون
انگریزی سے ترجمہ: نجم الدّین احمد

آگ

قبرستان سے، جہاں اُس نے اپنے باپ کی تدفین کی تھی، لوٹ کر محمد کو اپنے کندھوں کا بوجھ بڑھا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کا رُعب نکل گیا اور عمر بڑھ گئی تھی۔ وہ سست رَوی سے چلتا تھا حالاں کہ وہ ابھی محض تیس برس کا ہوا تھا۔ اُس نے کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی۔ ایک ہی جیسے ماہ و سال بیتتے چلے گئے تھے۔ مفلسی محرومی اور دائمی مایوسی نے اُس کی زندگی میں اُداسی بھر دی تھی جو دھیرے دھیرے فطری لگنے لگی تھی۔ وہ بھی اپنے باپ کے مانند کبھی شکوہ کناں نہیں ہوا تھا۔ وہ تقدیر مانتا تھا نہ بہت مذہبی تھا۔

لیکن باپ کی موت نے اُس کی زندگی تلپٹ کر کے رکھ دی تھی۔ وہ سب سے بڑا تھا اور اب خاندان کی ذمہ داری اُس کے کاندھوں پر تھی۔ تین بھائی، دو بہنیں اور زیابیطس کی مریضہ ماں جو ابھی اپاہج نہیں ہوئی تھی۔ محمد کی نوکری کی تازہ کوشش، پچھلی کوششوں کے مانند، بارآور ثابت نہیں ہوئی تھی اور اب وہ اعصاب زدگی کا شکار تھا۔ یہ خُوش قسمتی یا بدنصیبی کا سوال نہیں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اِس سے بڑھ کر یہ ناانصافی کا مسئلہ ہے جو غریب پیدا ہونے کی بدقسمتی سے جُڑا ہوا ہے۔ اُس کا بے روزگاری پر وزارتِ خزانہ کے سامنے مزید احتجاج کرنے کا کوئی قصد نہیں تھا۔ اُس سے پہلے جنھوں نے گریجوایٹ کیا تھا اُن میں سے چند ایک کو ملازمت مل گئی تھی لیکن وہ اُن میں شامل نہیں تھا۔ اُس کی تاریخ میں ڈگری سے کسی کو دِلچسپی نہیں تھی۔ وہ تعلیم دے سکتا تھا لیکن وزارتِ تعلیم بھرتیاں نہیں کر رہی تھی۔

اُس نے جستی الماری میں سنبھال کر رکھا ہوا اپنا پُرانا سکول بیگ ڈھونڈ نکالا اور اُسے اپنے ڈپلومے سمیت تمام کاغذات اور اسناد سے خالی کر کے سنک میں ایک چھوٹا سا ڈھیر لگایا اور اُنھیں آگ لگا دی۔ وہ شعلوں کو الفاظ چٹ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اتفاق سے آگ نے اُس کے نام اور تاریخ پیدائش کے سوا سب کچھ جلا ڈالا۔ اُس نے لکڑی کا ایک ٹکڑا لے کر آگ کو کریدا یہاں تک کہ سب کچھ جل کر راکھ بن گیا۔ بُو پر اُس کی ماں چونکی اور دوڑتی ہوئی اندر آئی۔

”تم پاگل ہو گئے ہو! کیا تم اپنے ڈپلومے کو آگ میں جھونکنے سے معاملات سدھار لو گے؟ اب تم استاذ کی نوکری کے لیے درخواست کیسے دو گے؟ تین سال دھویں میں اُڑ گئے!“

ایک لفظ بھی ادا کیے بغیر اُس نے راکھ اکٹھی کر کے کوڑے دان میں ڈالی، سنک صاف کیا اور اپنے

ہاتھ دھوئے۔ وہ مطمئن تھا۔ وہ اپنے فعل پر کچھ کہنا یا اُس کے حق میں کوئی دلائل نہیں دینا چاہتا تھا۔ کاغذ کے ایک بے کار ٹکڑے پر آخر لٹکتے رہنے سے حاصل ہی کیا تھا؟ اُس کا چہرہ سپاٹ رہا۔ اُس کی ماں نے اُسے یاد دِلایا کہ اُس کی دوا لا دے۔ اُس نے کہا کہ طبیب اُسے اُدھار دے دے گا۔

بعد میں وہ بینچ پر بیٹھ گیا اور زمین پر چیونٹیوں کی قطار کو دیکھنے لگا۔ اُس نے کُھلی سگریٹیں بیچنے والے لڑکے سے ایک سگریٹ لے کر سلگائی اور دھیرے دھیرے کش لگانے لگا۔ چیونٹیوں نے اپنا ذخیرہ جمع کر لیا تھا اور واپسی کے سفر پر تھیں۔

وہ فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنے باپ کا ٹھیلا استعمال کرے گا۔ خوانچہ بُری حالت میں تھا۔ اُسے پہیوں کی مرمت کرنا، دیمک خوردہ تختے بدلنا ترازو درست کرنا اور پھل سبزیوں کے دلال بوشعیب سے رابطہ کرنا تھا۔

اُسے پیسے کہاں سے ملیں گے؟ جب اُس کا باپ بیمار پڑا تو اُس کی ماں نے اپنا سارا زیور بیچ ڈالا تھا اور اب اُس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ محمد نے ”چھوٹے قرضوں“ کے بارے میں سُن رکھا تھا۔ اُس نے قرض لینے کے بارے میں سوچا تو دستاویزات کا ایک پلندہ پُر کرنے کے لیے اُس کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ اُس تمام کاغذی کارروائی کو دیکھتے ہی اُوب گیا۔ اُسے اپنے ڈپلومے کو آگ لگانے پر افسوس ہوا۔

محمد نے شعبۂ فن وادبیات سے، جہاں وہ متعلم تھا قرعہ اندازی میں مکّہ کے سفر کا ٹکٹ جیتا تھا۔ وہ واحد لمحہ تھا جب خوش نصیبی نے اُس کا ساتھ دیا تھا لیکن وہ اُس ٹکٹ سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جہاز کے ٹکٹ کا کرتا بھی کیا؟ اُس کی عمرہ کرنے مکّہ جانے کی نیت تھی نہ رسومات کی ادائی کے اُس کے پاس رقم۔ وہ چاہتا تھا کہ ایئر لائن اُسے ٹکٹ کی رقم ادا کر دے لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ اُس کے پاس واحد راستہ یہی تھا کہ ٹکٹ کسی زائر کو بیچ ڈالے۔ اُسے کل قیمت کا تیسرا حصہ ملا اور اُس پر طرّہ کہ اِس حصے میں سے بھی سفری دلال کو ٹکٹ سے نام کے تبدیلی کے لیے رشوت دینا پڑی۔ بچ رہنے والی معمولی سے رقم سے اُس نے ٹھیلے کی مرمت کروائی اور بالآخر مالٹے اور سیب بیچنے لگا۔

محمد کو معلوم تھا کہ بوشعیب ایک بدلحاظ اور بے ایمان شخص ہے۔ اُس کے باپ نے یہ بات اکثر اُسے بتائی تھی۔ اُس نے چھوٹتے ہی دعوی کیا کہ اُس کا باپ اُس کا مقروض ہے اور اُس نے پچھلے دو بل ادا نہیں کیے تھے۔ محمد کے پاس اِس دعوے کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اُسے اُس کی بات ماننا پڑی کیوں کہ بوشعیب ہی وہ واحد فرد تھا جو دس پندرہ فیصد فالتو پیسے لے کر اُدھار پر مال دیتا تھا۔ محمد نے بحث و تمحیص سے گریز کرتے ہوئے اُسے سنگتروں کے دو اور سیب کے ایک کریٹ کی ادائی کی۔ اُس نے سٹرابریوں کی بھی کچھ ٹوکریاں لیں۔

بوشعیب اُسے ایک طرف لے گیا اور سرگوشیانہ لہجے میں اُس کی چھوٹی بہن کے بارے میں

دریافت کیا۔ محمد نے بتایا کہ وہ اچھی ہے اور کالج میں داخلے کے امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔

"تمھیں پتا ہے، تمھارے والد نے اُس کا مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" بوشعیب بولا۔ "میں شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں شراکت دار بن سکتے ہیں۔ تم خوانچہ فروشی سے زیادہ نہیں کما سکتے۔ مقابلہ سخت ہے اور ٹھیک جگہ کے لیے تمھیں پولیس سے بھی اچھے تعلقات رکھنے پڑیں گے۔"

محمد نے اُسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

اُسے واقعی معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنا خوانچہ کہاں جمائے۔ کچھ ٹھیلوں والے اِدھر اُدھر چلے گئے، کچھ نے چوراہوں یا ٹریفک کے گول چکّروں کے قریب کاروباری مقامات تلاش کر لیے تھے۔ اُسے جلد ہی پتا چل گیا کہ بہترین جگہوں پر قبضہ ہو گیا ہے۔ اُس نے پھیری لگانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے سنتروں اور سیبوں کی بلند ہانکیں لگانے لگا لیکن ہارنوں کے شور میں اُس کی پکار کوئی نہیں سُن رہا تھا۔ جب وہ ایک کریانے والے ٹھیے کے پاس کچھ دیر کے لیے ٹھیرا تو اُس نے چلّاتے ہوئے اُسے چلتا کیا۔ "تم پاگل ہو؟ تمھارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ میں نے لائسنس خریدا ہے اور میں محصول ادا کرتا ہوں۔ اگر تم میرے سامنے جم کر کھڑے ہو گئے تو میں اپنی روزی کیسے کماؤں گا؟ چلو، دفع ہو جاؤ۔"

پہلے روز محمد ایک سے دُوسری سڑک کے پھیرے لگاتا رہا۔ اِس کے باوجود وہ اپنا آدھا سے زیادہ مال فروخت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسے ادراک ہوا کہ اگر وہ دُوسروں کے آنے سے پہلے موقع کی جگہ پانا چاہتا ہے تو اُسے علی الصبح اُٹھنا ہو گا۔

اُس شب کھانے پر اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھ کر اُسے بوشعیب کے بازوؤں میں تصور کیا تو اُسے شرمساری محسوس ہوئی۔ ایک نوجوان اور معصوم لڑکی جانگلی کے بازوؤں میں، کبھی نہیں۔

کھانے کے بعد اُس نے ماں کو بتایا کہ بوشعیب نے اُس سے رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ "تمھارا باپ قرض لینا پسند نہیں کرتا تھا۔" وہ بولی۔ "جتنا جلد ہوتا وہ چُکتا کر دیتا تھا۔ بوشعیب مکار شخص ہے۔ اُس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اِس بات کو بُھول جاؤ۔ کیا تمھیں میری دوا لانا یاد رہی ہے؟ میری پاس صرف ایک گولی بچی ہے۔"

محمد نے کتابوں سے بھرا اُیک بکسا نکالا اور گھر کے سامنے کتابیں سجا کر بیچنے لگا۔ تاریخ کی کتابیں، باریک گتے کی جلد والے ناول اور چمڑے کی جلد والی انگریزی میں "موبی ڈِک" کا ایک نسخہ — جس پر اُسے ہائی سکول میں اپنی انگریزی کی جماعت کے آخری سال اوّل آنے پر انعام ملا تھا۔ اُس نے تین کتابیں بیچ کر بمشکل اِتنی رقم حاصل کر لی کہ دوا لا سکے۔ کسی کو "موبی ڈِک" کی ضرورت نہیں تھی۔ پس اُسے اُس نے خُود رکھ لیا۔ اُس شب اُس نے اُس کے چند اوراق کی ورق گردانی کی تو اُسے پتا چلا کہ اُس کی انگریزی کم زور تھی۔ وہ سونے سے قبل زینب کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس سے اُس کا معاشقہ دو برس سے چل رہا تھا۔ لیکن خالی

جیب اور بے روزگاری کے ساتھ اپنے گھر کی عدم موجودگی میں اُس کے لیے شادی کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ زود رنجی کا شکار تھا۔ جب اُس کے پاس اُسے دینے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں تو وہ اُس سے کیا عہد و پیمان کرتا؟ البتہ ابھی تو اُس کی اپنی ترجیحات تھیں۔ تاہم اُسے احساس تھا کہ اگر وہ ایک خاص مدت میں معاملات سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے تو زینب اُس کا انتظار کر لے گی۔

زینب ایک ڈاکٹر کے دفتر میں سیکرٹری کے طور پر کام کرتی تھی۔ چوں کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی پس اُس نے مشورہ دیا کہ وہ دونوں شادی کر کے اُس کے میکے رہ لیں۔ لیکن محمد خوددار تھا۔ اُسے یہ سوچنا بھی گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنی بیوی کی کمائی پر پلے اور سسرال میں رہے۔

عام طور پر وہ اور زینب ایک کیفے میں ملا کرتے تھے۔ وہ خُوب باتیں اور اٹکھیلیاں کرتے اور اکثر قہقہے لگا کر ہنستے۔ اُنھیں مجامعت کیے ہوئے تین ماہ سے زاید کا عرصہ بیت گیا تھا۔ آخری بار اُنھیں زینب کی عم زاد نے اپنا چھوٹا سا اپارٹمنٹ اُس وقت اُدھار دیا تھا جب اُس کی ہم نشین سیاحت کے لیے گئی ہوئی تھی۔

"ایک روز۔" زینب بولی۔ "ہم اِس سُرنگ کے پار پہنچ ہی جائیں گے۔ میرا تم سے وعدہ ہے۔ مجھے پتا ہے۔ مجھے اِس کا ادراک ہے۔ تمھیں اچھی نوکری ملے گی۔ میں اِس بداخلاق ڈاکٹر کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دوں گی اور ہم اپنی زندگی شروع کریں گے۔ دیکھ لینا تم۔"

"ہاں، ایک روز۔ لیکن تمھیں پتا ہے کہ میں کسی ناجائز کشتی پر سوار ہو کر غیر قانونی باشندہ نہیں بنوں گا۔ مجھے تمھارے منصوبے کا علم ہے۔ کینیڈا! ہم سب کینیڈا اور بہشت میں جائیں گے۔ یہ بات لکھی جا چکی ہے۔ لیکن ابھی تو مجھے ایک بڑے خاندان کی کفالت کرنا ہے، اپنی ماں کا خیال رکھنا ہے اور اپنے ٹھیلے کے لیے اچھی جگہ حاصل کرنے کے لیے جدّ وجہد کرنا ہے۔"

زینب نے اُس کے ہاتھ تھام کر اُنھیں چُوما اور اُس نے بھی اُس کے ہاتھ تھام کر یہی فعل دُہرایا۔

محمد چھے بجے اُٹھ گیا۔ اُس نے حتّی الامکان کم سے کم شور کرنے کی سعی کی تا کہ اُس کے بھائیوں کی نیند خراب نہ ہو جو اُس کے ساتھ کمرہ بٹاتے تھے۔ بیس سالہ نبیل، ایک غیر لائسنس یافتہ ٹور گائیڈ، جس کا اکثر پولیس کے ساتھ جھگڑا رہتا تھا۔ اٹھارہ سالہ نورالدّین، ہائی سکول کا متعلم، جو جمعہ کی شام سے پیر کی صبح تک ایک بیکری میں کام کرتا تھا۔ اور پندرہ سالہ یٰسین جو فطین لیکن کاہل، وجیہ اور رُوحانیت پرست تھا۔ اُس نے ماں سے عہد کیا تھا کہ وہ لکھ پتی بن کر اُسے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کروانے لے کر جائے گا۔

محمد نہایا، روٹی کا ایک ٹکڑا نگلا اور اپنا ٹھیلا نکالا۔ تنگ گلی کے موڑ پر اُسے ایک پولیس افسر نے روک لیا۔

"یہ تمھارے بُوڑھے باپ کا ٹھیلا ہے۔ وہ کہاں ہے؟"

"فوت ہو گیا ہے۔"

"اور تم اِسے یُوں لیے جا رہے ہو جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو؟"

"مسئلہ کیا ہے؟ کیا میرے لیے رزقِ حلال کمانا بھی ممنوع ہے؟"

"بدتمیزی مت کرو۔ تمھارے کاغذات؟"

محمد نے اپنے تمام کاغذات اُس کے حوالے کر دیے۔

"انشورنس نہیں ہے۔ کیا تمھیں خیال ہے؟ اگر تم ٹھیلا کسی بچے پر چڑھا دو تو ادائیگی کون کرے گا؟ تم؟"

"پھلوں کے ٹھیلے کے لیے انشورنس کب سے لازمی ہوئی ہے؟ یہ نئی بات ہے۔"

شُرطے نے ایک نوٹ بُک نکالی اور کچھ لکھتے ہوئے محمد کو کن اَکھیوں سے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ "تم احمقانہ حرکت کر رہے ہو — حیلہ سازی کر رہے ہو کہ تم سمجھ نہیں رہے۔"

"میں کچھ نہیں کر رہا۔ سب کچھ تم ہی کر رہے ہو تا کہ میں کام نہ کر سکوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو لیکن انشورنس کے بارے میں غور کرنا۔ میں تمھارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔"

پھر شُرطے نے اُس کی نارنگیوں اور سیبوں پر اپنے ہاتھ صاف کیے۔ وہ ایک سیب دانت دانتوں سے کاٹ کر بھرے ہوئے مُنھ سے بولا۔ "اب جاؤ۔"

صبح سویرے کا وقت تھا۔ محمد کو ایک اچھی جگہ مل گئی۔ اُس نے ٹھیلا کھڑا کیا اور انتظار کرنے لگا۔ ایک کار آ کر رُکی۔ ڈرائیور نے کھڑکی کا شیشہ گرایا اور حکم دیا۔ "دونوں ایک ایک کلو۔ اچھے اچھے دینا۔" اگلے گاہکوں کو زیادہ جلدی نہیں تھی۔ وہ اپنی گاڑی سے اُترے، پھلوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا، قیمت پُوچھی، بھاؤ تاؤ کیا اور چند سنترے خریدے۔

ایک گھنٹے بعد ایک اور خوانچہ فروش اپنے سجے ہوئے ٹھیلے پر بہتر، زیادہ پُرکشش انتخاب والے، کچھ مہنگے اور متنوع اقسام کے نایاب پھلوں سمیت آ پہنچا۔ اُسے کے پاس پکّے گاہک تھے۔ نگاہوں اور سر سے اُس نے محمد کو وہ جگہ چھوڑنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے بلا احتجاج حکم کی تعمیل کی۔ وہ ایک بار پھر سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا۔ اُس کا صبح کا وقت اچھا رہا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اگلی بار وہ زیادہ قسموں کے پھل رکھے گا۔

دِن ختم ہونے تک اُس نے سارا پھل بیچ لیا۔ وہ اپنا ٹھیلا بھرنے کے لیے واپس بوشعیب کے پاس چلا گیا۔

گو وہ تھکا ہوا تھا لیکن اُس شام وہ زینب سے ملنے اُس کے والدین کے گھر گیا۔ وہ اُسے پسند کرتے تھے۔ اُس نے زینب کو اپنی دِن بھر کی کارگزاری بتائی اور گھر جانے سے قبل کچھ crepes (pancake) کھائے۔

اِسی دوران میں سادہ لباس والا ایک شُرطہ محمد کی ماں کے پاس سے ہو گیا تھا۔ جس نے اُس سے محمد کے بارے میں دریافت کیا تھا اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ محمد نے "بے روزگار گریجوایٹ" میں جانا کیوں چھوڑ دیا

ہے۔ بے چاری عورت جتنا جواب دے سکتی تھی جھجکتے جھجکتے اور ڈرتے ڈرتے دے دیا۔ شُرطے نے اُسے طلبی نامہ دیا جس کے مطابق اُس شام اُس کے بیٹے نے پولیس کے محکمے میں حاضری دینا تھی۔ وہ رونے پیٹنے لگی کیوں کہ وہ آگاہ تھی کہ پولیس کبھی اچھی خبر نہیں لاتی۔ اُس نے افسر کو یہ بتانا مناسب خیال کیا۔ ”میرے بیٹے کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ جواب دیے بغیر چلا گیا۔

”اِن لوگوں کو ہمارے لیے مسائل پیدا کرنے کا مشاہرہ دیا جاتا ہے۔ تُکلے بھی ہر طرح سے ہمارے جیسے مفلس خاندانوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں لیکن آپ جانتی تو ہیں کہ غریب ہی غریب کا بیری ہوتا ہے۔“

محمد کو محکمہ پولیس میں ایک بینچ پر بیٹھ کر بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔ وہ وقفے وقفے سے اُٹھتا اور معلوم کرنے کی سعی کرتا کہ اُسے کیوں طلب کیا گیا ہے۔ لیکن کسی کو نہیں پتا تھا۔ اُسے شک گُزرا کہ طلبی کا مقصد محض اُسے دھمکانا ہے۔ اِسی قسم کا طلبی نامہ اُسے تب بھی ملا تھا جب اُس نے پہلی بار بے روزگار گریجوایٹوں کے احتجاج میں شرکت کی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا تھا جس کی ظاہری حالت چیخ چیخ کر اُس کی افلاس زدہ حالتِ زار بیان کر رہی تھی۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی اور وہ سویا ہوا دِکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھنے کی ہمت کون کرتا کہ وہ کھانس اور تُھوک رہا تھا؟ اُسے تو ہسپتال میں ہونا چاہیے تھا۔ محمد اُس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اُسے تپ دِق ہو جانے سے ڈر لگتا تھا۔

وہاں جُبہ پہنے ایک عورت بھی موجود تھی۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پیتے ہوئے زندگی دھوئیں میں اُڑا رہی تھی۔ ”میں اپنے گاؤں میں ناخوش تھی۔ میرے خدا، جس نے مجھے چھوڑ دیا ہے میں نے اُس سے شادی کی ہی کیوں؟“

اُس نے محمد کو گواہ بنایا۔ ”مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں ایک کسبی ہوں۔ لیکن دیکھنا ایک دِن یہ سب بدل جائے گا۔ مجھے پتا ہے۔ یہ نہیں چل سکتا ......“

آدھی رات کے قریب ایک شخص نے محمد کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

شناختی تصدیق۔

روایتی تفتیش۔

پولیس افسر کو اُس میں سازش کی بُو آئی کہ محمد کا اب اپنے انقلابی ساتھیوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اُس نے دریافت کیا کہ کیا اِسلامیوں نے اُس سے رابطہ کیا ہے۔

”نہیں، میرے والد کی وفات نے ہر شے بدل کر رکھ دی ہے۔ میں نے اُس کا ٹھیلا سنبھال لیا ہے جو ہماری بقاء کا واحد وسیلہ ہے۔“

”ہاں، مجھے علم ہے۔ کام کیسا جا رہا ہے؟“

”میں نے حال ہی میں شروع کیا ہے۔“

"تمھیں پتا ہے کہ معجزے نہیں ہوتے۔ وہ لوگ بھی ہیں جو راستہ نکالتے ہیں اور اچھی خاصی کمائی کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی — جو نگلے جاتے ہیں، خسارے میں رہنے والے۔ اب انتخاب تمھارا اپنا ہے۔"

محمد کو پولیس افسر کی پیشکش سمجھنے میں کچھ وقت لگا: مخبر بن جائے اور منافع بخش جگہ حاصل کرلے یا انکار کر کے اپنے کاروبار کو خیرباد کہہ دے۔

"اِس پر اچھی طرح غور کرنا۔ میں کل ٹریفک کے آزادی چکر پر ملوں گا۔ اب گھر جاؤ۔"

محمد جانتا تھا کہ اگر اگلے روز وہ متعینہ مقام پر گیا تو گویا اُس نے شرطے کی پیشکش قبول کرلی۔

صبح سویرے اُس نے اپنا ٹھیلا لیا اور ٹریفک کے اُس معروف چکر سے بہت دُور مزدوروں کے ایک علاقے میں چلا گیا۔

اُس کی ماں کی ذیابیطس قابو سے باہر ہوگئی تھی۔ اُسے دوبارہ ڈاکٹر کے پاس جا کر نیا نسخہ لینے کی ضرورت تھی۔ محمد نے حساب کتاب لگایا۔ اِس غیر متوقع خرچ کے لیے رقم ناکافی تھی۔ اُس نے اُسے سرکاری ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اُس کی سترہ سالہ بہن بھی ہم راہ گئی۔ محمد نے اُنھیں ہسپتال کے داخلے پر چھوڑا اور خود اپنا سودا بیچنے لگا۔ اُسے پتا چلا کہ وہ ایک بہترین جگہ تھی۔ ہسپتال جانے والے لوگ مریضوں کے لیے پھل خریدتے تھے۔ ایک گھنٹے بعد دو پولیس افسر، جن میں سے ایک خاتون تھی، اُس کے سامنے نمودار ہوئے۔

"تمھارے کاغذات؟"

اُس نے اُنھیں کاغذات دیے۔

"یہ تمھارا علاقہ نہیں ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں اپنی ماں کو ہسپتال لایا تھا۔ اُسے بلند فشارِ خون لاحق ہے۔"

"تم پر رحم ہو! اچھا کیا جو تم اُسے یہاں لے آئے لیکن تم پر زیادہ رحم ہوگا اگر تم یہاں سے نکل لو۔ اِس بار ہم تمھیں جرمانہ نہیں کر رہے ہیں البتہ تنبیہ کی جا رہی ہے کہ دوبارہ یہاں مت آنا۔ سمجھ گئے؟"

"لیکن اِس طرح تو میں اپنی روزی کماتا ہوں۔"

"خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔"

محمد جواب دینا چاہتا تھا کہ لگتا ہے خدا غریبوں کو ناپسند کرتا ہے اور زمین صرف وسائل والوں کے لیے وسیع ہے۔ لیکن اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ نامناسب بات ہے۔ اِس سے معاملہ اور بگڑ جائے گا۔ وہ لادینیت کو بنیاد بنا کر اُسے گرفتار کرلیں گے۔"

شاید وہ لادین نہیں تھا لیکن چُوں کہ اب جگہ جگہ اِسلامی تھے پس اُس نے خود کو مذہب سے فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ اُس کا باپ اُسے کہا کرتا تھا۔ "ایمان والے کی تقدیر میں دُکھ لکھا ہوتا ہے۔ اُسے خدا آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اِس لیے میرے بیٹے، صابر رہو!"

محمد روانہ ہونے ہی والا تھا کہ اُس کے سامنے ایک کار آ کر رُکی۔ ڈرائیور نے، جو عجلت میں دِکھائی دیتا تھا، اُسے تمام پھل تول کر اپنے ہاتھ میں تھامی ایک بڑی ٹوکری میں ڈالنے کو کہا۔ ”میں سارے پھل خریدنا چاہتا ہوں کیوں کہ آج میرے بیٹے نے ہائی سکول سے گریجوایٹ کیا ہے۔ کیا تم یقین کر سکتے ہو؟ میں اُسے مزید تعلیم کے لیے امریکا بھیج رہا ہوں۔ ہاں، امریکا کیوں کہ تم دِن رات پڑھ پڑھ کر مر جاتے ہو لیکن کام نہیں ملتا لیکن اگر تمھارے پاس امریکی ڈگری ہو تو فوراً ملازمت مل جاتی ہے۔ میں خُوش ہوں کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ میری بیٹیاں تو کسی شمار میں ہی نہیں ہیں — میں اُنھیں بیاہ بھی نہیں سکتا کہ کسی کو اُن کا رشتہ درکار نہیں ہے...... خیر جلدی کرو، جلدی، جلدی! کتنے ہو گئے؟ جلدی سے حساب لگاؤ۔ کہو تو میں تمھاری مدد کروں؟“ اُس نے اپنا سیل فون نکالا اور محمد کے بتائے ہوئے اعداد شمار کرنے لگا۔ ”خوب، یہ ہو گئے دو سو پچاس ریال۔“ اُس شخص نے تین سو ریال کے نوٹ نکال کر محمد کے حوالے کیے۔ ”تم اِس کے حق دار ہو۔ لگتا ہے — تم اچھے لڑکے ہو۔“

محمد اپنا ٹھیلا تھوک کی مارکیٹ کی جانب ٹھیلنے لگا۔ اُس نے دوبارہ کبھی بوشعیب کے پاس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ نقد ادائی کرے گا۔

سہ پہر ختم ہونے پر اُس نے اپنا خوانچہ کھڑا کیا اور زینب کے دفتر کے داخلی دروازے پر جا کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ قُرب و جوار میں مصروف نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ کس طرح نئے نئے اطوار سے وہ اپنی روزی کما رہے تھے بھُرتی سے کاریں دھو کر، بیرانہ سال لوگوں کی مدد کر کے، سوڈے کے دھاتی ڈبوں سے کھلونے بنا کر یا پھر کُھلی امریکی سگریٹیں، ہاتھ کے بنے ہوئے کارڈ، نقشے یا مائیکل جیکسن اور بین ہارپر کی تصاویر فروخت کر کے۔ سُرخ لباس پہنے مداری کرتب دِکھا رہے تھے، بندروں اور طوطوں والے، سمگل شدہ ڈی وی ڈیوں والے جن میں ہر طرح کی فلمیں ہوتی تھیں — ہندوستانی، تازہ ترین امریکی، کلاسیک، رُوسی اور فرانسیسی فلمیں؛ اپنی جیکٹوں سے مائیکروفون ٹانگے ہوئے قصہ گو۔ صرف سپیرے، نجومی، جادوگر اور ٹھگ موجود نہیں تھے۔

پھر یکایک وہاں افراتفری مچ گئی۔ تمام چھابڑی فروشوں کی دوڑیں لگ گئیں — شُرطے اُن کے تعاقب میں تھے۔ شُرطے دو افراد کو رگیدتے ہوئے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے — ایک طوطے والا اور دُوسرا ڈی وی ڈی بیچنے والا۔ مار پیٹ، گالم گلوچ۔ طوطا چلّا رہا تھا۔ ڈی وی ڈیاں زمیں پر ٹُوٹی پڑی تھیں۔ ”سپارٹاکس“ پر فلمی ستارے کرک ڈگلس کی تصویر سے صرف اُس کی آستین بچی تھی۔ دونوں خوانچہ فروشوں کو اُٹھا کر نیشنل سیکورٹی کی وَین میں پھینکا گیا۔ محمد کا چیخنے چلّانے کو دِل چاہا لیکن اُسے اپنی ماں اور سارے خاندان کا خیال آ گیا۔ اُس نے غصہ پیا اور اپنے آپ سے کہا۔ ”مجھے زینب سے ملنا ہے۔“

اُسے اُس سے مل کر خوشی ہوئی۔ اُس نے اُس سے دِن بھر کے بارے میں باتیں کیں اور شروع میں ٹھیلے والوں پر شُرطوں کی یلغار کے بارے میں بتانے سے اجتناب برتا۔ اُس نے تجویز دی کہ وہ معروف

ساحلی ریستوران میں جا کر مچھلی کھائیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بہار کے پُرفضا مرغزار میں کھیلتے بچّوں کے مانند کھلکھلا کر قہقہے لگا رہے تھے۔ اُس نے اُسے کہا۔ ’’مُلّوں نے ’’سپارٹا کس‘‘ کو شکست دے دی! اُسے اپنی وین کے ٹائروں تلے کچل ڈالا۔‘‘

وہ پیدل گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اُنھوں نے کچھ بچّوں کو سینکنے کے لیے آگ جلاتے دیکھا۔ اُن میں سے ایک بچّے نے سگریٹ مانگی۔ ’’میں سگریٹ نہیں پیتا۔‘‘ محمد بولا۔ ’’لیکن یہ لو اور کھانے کے لیے کچھ خرید لو۔‘‘

پولیس کی گاڑیاں خاموشی سے اُن کے دونوں اطراف آ گئیں۔ کسبیوں سے اُن کے کاغذات کے بارے میں دریافت کیا جانے لگا۔ زینب نے ایک لڑکی کو ایک شُرطے کی جیب میں نوٹ ڈالتے دیکھا۔ یہ معمول کی بات تھی۔ معاملات کچھ یُوں ہی چلتے تھے۔

وہ دوبارہ اپنی شادی کی بات چیت کرنے لگے۔

’’ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے حال ہی میں کام شروع کیا ہے۔ مجھے پہلے کچھ بڑے معاملات نپٹانا ہیں۔‘‘

’’کیا مطلب ہے تمھارا؟‘‘

’’فکر مت کرو۔ میں کسی کو لُوٹنے نہیں جا رہا! البتہ میں مارکیٹ میں ایک دُکان کھولنا چاہتا ہوں۔ ہمارا ایک ہمسایہ بیمار ہے۔ اُس کی مین مارکیٹ میں ایک اچھی دُکان ہے۔ یہ بڑی بات ہوگی اگر وہ دُکان مجھے دے دے۔ میں تھوڑی تھوڑی کر کے ادائیگی کر دوں گا۔ میں نے دُکان کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اُس کے بچّے کاروبار چلانا نہیں چاہتے۔ وہ انجینئر اور ٹیکنیشن ہیں۔ اِس لیے اُنھیں ملازمت کا تو مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ تاہم یہ میرے مسئلے کا بہترین حل ہے۔ میری ماں اُس شخص سے بات کرنے جائے گی۔‘‘

’’تم ٹھیک کہتے ہو۔‘‘ زینب بولی۔ ’’لیکن میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ ہمارے پاس اپنا گھر ہونا چاہیے۔ چاہے جھونپڑی ہی کیوں نہ ہو یا کوئی گُھڈّا کوئی چھپر ہی ہو۔‘‘

وہ گھر پہنچا تو پُرانے ٹی وی پر صدر کے تیس سالہ دورِ حکمرانی کے جشن کی تقریب دِکھائی جا رہی تھی۔ صدر اپنی اہلیہ کے ہم راہ نمودار ہوا جو خُوب فربہ ہو چکی تھی۔ دونوں نے میک اَپ ٹھونسا اور بہترین لباس زیب تن کیا ہوا تھا — خُوب عمدہ لباس، بے حد صاف ستھرا جس کا کوئی رُوں تک نہیں کھڑا تھا۔ اُن کے چہروں پر آسودگی اور طمانیت بھری مُسکراہٹیں تھیں۔ کیمرہ اُن کے محلات، ترتیب سے لگے باغیچوں، تراش خراش کیے ہوئے درختوں اور خُودکار فواروں میں اُن کے تعاقب میں تھا۔ صدر کی اہلیہ فرما رہی تھی۔ ’’میرا خاوند اِس قدر محنت کرتا ہے کہ مجھے اُسے آرام کے لیے مجبور کرنا پڑتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وطن ترقی کر رہا ہے۔ عوام متشکر ہیں۔ وہ روزانہ ہمیں اپنی حمایت کا مظاہرہ دِکھاتے ہیں کیوں کہ اُنھیں احساس ہے کہ وطن خُوش حالی اور ترقی کی

راہ پر گامزن ہے۔''

صدر نے اپنا ہاتھ یوں ہلایا گویا کسی بچے کو بہلا رہا ہو۔

اُن کے پس منظر میں بجتی ہوئی خوش گوار دُھن محمد کے اعصاب کو ناگوار گزر رہی تھی۔ اُس کی ماں اُونگھ رہی تھی۔ اُس کی بہنیں اور بھائی اپنے اپنے بستروں پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یٰسین نے محمد کو اپنی رپورٹ کا کارڈ دِکھایا۔ ہر جماعت میں کم وبیش یہی لکھا ہوتا تھا: ''ذہین وفطین لڑکا، باصلاحیت طالب علم لیکن کاہل تاہم بہتری پیدا کر سکتا ہے۔'' یٰسین ہنس کر بولا۔ ''میں پڑھ پڑھ کر اُکتا گیا ہوں اور ویسے بھی تعلیم کا حاصل کیا ہے؟ آپ اپنے آپ ہی کو دیکھ لیں۔ آپ نے جنونی بن کر تعلیم حاصل کی اور پھر کوئی ملازمت نہیں ملی۔ اب آپ نے ابا جی ٹھیلا سنبھال لیا ہے۔''

محمد نے اپنے بھائی کو آس دِلانے کی سعی کی لیکن یہ کارِ مشکل تھا۔ ملک میں ناانصافی، عدم مساوات اور تذلیل وتضحیک اپنے عروج پر تھیں۔

یٰسین نے بتایا کہ سکول سے واپسی پر اُس نے ایک آدمی کو شُرطوں سے پٹتے دیکھا۔ وہ شخص بُری طرح چیخ وپکار کرنے لگا تو ٹلوں نے مار پیٹ بند کر دی لیکن کسی شخص نے مداخلت نہیں کی۔ ''میں اُس شخص کو پہچانتا تھا۔ وہ شیشے والی اُس عمارت کا دربان تھا۔ وہی عمارت جو محلے کی دُوسری سمت واقع ہے۔ اُسے گولی مار دی گئی۔ کسی کو نہیں پتا کہ کیوں۔ آج اُس نے ایک مُرغی چُرائی تھی۔ وہ چلا رہا تھا اور مُرغی بھی لیکن وہ اُسے چھوڑ نہیں رہا تھا۔''

اگلے روز محمد پھل خریدنے مُنھ اندھیرے نکلا۔ اِس بار اُس نے انواع واقسام کے پھل لیے۔

مارکیٹ سے باہر نکلتے ہوئے اُسے اپنا ایک سابقہ انقلابی ساتھی مل گیا جو اَب بلدیہ ہال میں نوکری کر رہا تھا۔

''میں وہاں کوئی کام نہیں کرتا۔ میرے ساتھ دفتر میں چار کلرک اور ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اُن میں سے کچھ کے پاس کام کرنے کے لیے فائلیں ہیں لیکن میرے پاس نہیں ہیں۔ میں تنگ آ گیا ہوں۔ پھر یہ بھی کہ چھے ماہ گزر گئے ہیں لیکن مجھے اب تک تنخواہ بھی نہیں دی گئی۔ میں قرض پر جی رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے جامعہ سے گریجوایٹ کرنے والے ہم لوگوں کو محض زبان بندی کے لیے بھرتی کیا ہے جب کہ حقیقتاً اُنھیں ہماری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم کیا کر رہے ہو؟''

''جو تم دیکھ رہے ہو۔''

اُنھوں نے ایک دُوسرے کو الوداع کہا اور جدا ہو گئے۔ دس منٹ بعد جب محمد سُرخ بتی پر انتظار کر رہا تھا وہ سادہ لباس والے شُرطے اُسے کھینچ کر ایک طرف لے گئے۔

''تم اور تمھارا دوست کیا باتیں کر رہے تھے؟''

''کچھ نہیں۔''

پہلے تھپڑ نے محمد کو چکرا دیا۔ وہ دھاڑا تو اُس کے پیٹ میں گھونسا پڑا۔

”بکنا بند کرو۔ بتاؤ، تمھارے دوست کا نام کیا ہے؟“

”میں اُس کا نام بھول گیا ہوں۔“

ایک اور تھپڑ۔ کچھ راہ گیر ٹھہر گئے۔ ایک شُرطے نے اُنھیں دھمکایا۔ ”دفع ہو جاؤ۔ یہ ایک چور ہے۔ ہم تمھاری حفاظت کے لیے یہ سب کر رہے ہیں۔ ہمیں ہمارا کام کرنے دو۔“

محمد چیخا۔ ”یہ جھوٹ ہے! میں چور نہیں ہوں!“

ہجوم کو قریب آتے دیکھ کر کر شُرطوں نے ٹھیلے کو ٹھوکر ماری اور تمام پھل نیچے گرا کر محمد کو چھوڑ گئے۔

لوگوں نے اُسے تسلّی دی، پھل اُٹھانے میں اُس کی مدد کی لیکن بہت سی سٹرابریاں کچلی گئی تھیں۔

کچھ لوگ کہنے لگے۔ ”یہ گھناؤنی حرکت ہے! بے حد باعثِ شرم! ایک بے چارے خوانچہ فروش پر حملہ!“ ”وہ اِس طرح سلوک کرتے ہیں جیسے فلموں میں مجرم۔ یہ تمام حرامی اپنا حصہ چاہتے ہیں!“ ”یہ نہیں چل سکتا! ایک دِن خدا سچ سامنے لائے گا!“ ”خدا بھی امیروں کے ساتھ ہے!“

دلیلیں چلتی رہیں۔

”شیطان! کافر! خدا سب کے ساتھ ہے! خدا ہر جگہ ہے!“

لوگوں نے مل کر محمد کے پھل خریدنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے کچلی ہوئی سٹرابریاں پھینک دیں۔

اُس کا مزید کام کرنے کو دِل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو نڈھال محسوس کر رہا تھا۔

اُس نے گھر لوٹ کر ٹھیلا کھڑا کیا اور بھائی کی عدم موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے سونے اور اپنے آپ کو تھوڑا سا بحال کرنے کا ارادہ کیا۔

اُس نے خواب میں دیکھا کہ مکمل طور پر سفید لبادے میں ملبوس اُس کا باپ اُسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ وہ کچھ کہہ بھی رہا تھا لیکن محمد سُن نہیں پایا۔ وہ مُردے کی ہم رکابی نہیں چاہتا تھا۔ اچانک اُس کی ماں نمودار ہوئی اور بولی۔ ”یہ تمھیں جو کرنے کے لیے کہہ رہا ہے اُس پر دھیان مت دو۔ یہ خدا کے پاس ہے، شاید جنت میں۔“

محمد کی بے چینی سے آنکھ کھل گئی۔ خواب حقیقت کے بے حد قریب تھا۔

اچھے وقتوں میں محمد اور زینب نے سیل فون لے لیے جنھیں اُس نے مین مارکیٹ سے خریدا تھا۔ فون سادہ تھے۔ جن کا کوئی ماہانہ خرچ نہیں تھا، بس ایک بار ریچارج ہونے والی سم تھی جس رقم ختم ہونے کے بعد بھی وہ کال وصول کر سکتے تھے۔

محمد نے اپنے پھلوں والے ٹھیلے کو بہتر بنانے کا قصد کیا۔ ایک طرف اُس نے جُوس نکالنے والی دستی مشین نصب کی اور دُوسری طرف زیادہ دِل لبھانے والے انداز میں مختلف پھل ترتیب دینے لگا۔ اُس نے

قیمتوں کے اندراج والا تختہ بھی لگایا۔ اُس نے مغنیہ اُمِ کلثوم کی تصویر بھی لگا دی تا کہ ٹھیلا زیادہ خُوب صُورت دِکھائی دے۔ یہاں تک کہ اُس نے مکھیاں مارنے والی ایک پھٹی بھی خرید لی۔

لگتا تھا کہ محمد کے نصیب میں گلی گلی پھیری لگانا ہی لکھا ہے کیوں کہ شُرطوں سے تعاون کرنے والوں نے تمام اچھے مقامات پر قبضہ جما رکھا تھا۔ لیکن ایک روز اُس نے ہسپتال والے علاقے میں جانے کا تہیہ کر لیا جہاں کاروبار بہتر تھا۔

جلد ہی دو پولیس افسروں نے اُسے آ گھیرا۔

“اُمِ کلثوم! تمھیں اُس کی آواز پسند ہے؟ ہمیں بھی ہے۔ لیکن تم نے ایک بُوڑھی گایکا کی تصویر کیوں لگائی جسے مرے ہوئے ایک طویل عرصہ گُزر گیا، ہمارے محبوب صدر کی کیوں نہیں لگائی؟ خدا اُسے عمرِ خضر اور خُوش حالی عطا کرے!”

“مجھے اِس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اگر تم چاہتے ہو تو میں مغنیہ کی تصویر ہٹا دیتا ہوں۔”

“نہیں، اِسے لگائے رکھو لیکن ہمارے پیارے صدر کی بھی ایک تصویر اِس کے اُوپر لگاؤ اور اُمِ کلثوم کی تصویر سے بڑی۔ ٹھیک ہے؟”

“جی بہتر۔”

افسر چلے گئے۔ محمد کو ٹھنڈے پسینے چُھوٹ گئے۔ اُسے روزانہ کی ہراس زدگی کی کافی خوراک مل گئی تھی۔ اُس نے زینب کو فون کر کے اِس حادثے کے بارے میں بتایا۔

“وہ تمھیں شکست دینا چاہتے ہیں۔ یہ غلیظ ذہنیت کے لوگ ہیں، گردن تک بدعنوانی میں دھنسے ہوئے۔ اِن کے سامنے ڈٹے رہنے پر میں تمھاری تحسین کرتی ہوں۔”

“کیا میرے پاس کوئی اور رَاستہ ہے؟”

“اچھا یہ بتاؤ، شام کو ہماری ملاقات ہوگی؟”

“ہاں، رات کو ملوں گا۔”

اُس نے ایک پُرانا اخبار ڈھونڈا جس کے پُورے صفحے پر صدر کی تصویر چھپی تھی اور اُسے اپنے ٹھیلے پر ٹانگ لیا۔ لیکن کاغذ بار بار گر جاتا۔ اُس نے اُسے تہہ کر کے ایک کریٹ تلے دبا دیا۔ اگر وہ اُسے دوبارہ کہتے تو وہ اُسے نکال کر لگا لیتا۔

جب محمد ایک مصروف شاہراہ پر گاہکوں کا منتظر تھا تو ایک اخبار فروش نے رُک کر اُسے عربی کا ایک اخبار پکڑایا۔ پہلے صفحے پر خبر تھی: “سکینڈل: اکثریتی جماعت کے ایک رُکن پارلیمان نے بے روزگار گریجوایٹس کو کینیڈا بھجوانے کا جھانسہ دے کر رقم بٹور لی۔ فی فائل ۵۰۰ ریال اینٹھ لیے۔ ۲۵۲ شکار ہوئے۔ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔”

محمد اِس ٹھگی کے بارے میں جانتا تھا اور اگر وہ کسی طور "فائل فیس" کی رقم کا انتظام کر لیتا تو — وہ بھی ایک شکار ہوتا۔

اخبار فروش نے اُسے کہا۔ "دیکھا تم نے، چاہے ہم ہر چیز کے بارے میں لکھتے رہیں، ہر معاملے پر گلے پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہیں لیکن اس سے کچھ بھی نہیں بدلنے والا۔ وہ حرام زادہ اب بھی رُکنِ پارلیمان ہے۔ اُس نے بہت بڑی رقم ہڑپ کی ہے اور حکام نے اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔"

"تمھیں پتا ہے کہ اگر کسی روز کوئی ستم رسیدہ اُس کر گردن دبوچ لے گا تو بھی مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔ تنگ آ کر لوگ انصاف اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔"

اچانک افراتفری مچ گئی۔

محمد نے قیاس لگایا کہ شُرطے گھیراؤ کر رہے ہیں۔ وہ چھپنے کے لیے پُھرتی سے اپنا ٹھیلا ایک تنگ گلی میں لے گیا۔ کچھ بلّیاں کوڑے میں پڑے ایک چپٹے جستی ڈبے پر لڑ اور بچے پلاسٹک کی بندوقوں سے کھیل رہے تھے۔

اُس نے ایک گہرا سانس بھرا اور زمین پر بیٹھ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہر شے پھینکے اور زندگی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دے۔ لیکن تبھی اُسے اپنی ماں کا خیال آیا، زینب کا چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا، اُس کے بھائی، بہنیں ...... وہ اُٹھا اور دوبارہ شاہراہ کی سمت ہو لیا۔

بے شمار رُکاوٹوں کے باوجود محمد کو کام کرتے ہوئے ایک ماہ بیت گیا تھا۔ لیکن ایک صبح اُس وقت اُس کی طبیعت مکدر ہو گئی جب وہ اپنا ٹھیلا نکال رہا تھا کہ ایک پہیہ نیچے جا گرا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ حادثہ ہے یا تخریب کاری کا نتیجہ۔ اُس کا اپنے کچھ پڑوسیوں کے ساتھ جھگڑا تھا جو اُس کی حکومت پر تنقید کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک روز ساتھ والے گھر کے مرد نے اُسے کہا تھا۔ "اگر تم حکومت کے خلاف بولتے رہے تو تم ہم سب کے لیے مصیبت کھڑی کر دو گے۔ تم کیوں سب کچھ برباد کرنے پر تُلے ہو؟ تم چاہتے ہو کہ ہر شخص دولت مند ہو جائے؟ تم کمیونسٹ ہو، نہیں ہو؟ تمھارے لیے بہتر ہے کہ اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھو کیوں تمھیں بالکل نہیں پتا کہ اِس ملک میں جب پولیس کسی شخص کو اُٹھا کر لے جاتی ہے تو وہ اُسے کس حالت میں واپس کرتی ہے۔"

"دیکھو — تم خُود بھی تو حکومت پر تنقید کر رہے ہو۔"

"نہیں، میں صرف حقائق بتا رہا ہوں۔ میں خُوش ہوں۔ زندگی اچھی بسر ہو رہی ہے۔" پھر وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّانے لگا۔ "صدر سدا سلامت رہے! خاتونِ اوّل سدا سلامت رہے!"

محمد پہیے کی مرمت کرنے لگا۔ بچے اُس کے گرد کھڑے رہے۔ وہ اُس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ ٹھیلا جلد ہی ٹھیک ہو گیا اور وہ روانہ ہو گیا۔

پہلے چوراہے پر ہی اُسے ایک شُرطے نے روک لیا۔

''تم اِس حالت میں کہاں جا رہے ہو؟''

''کام پر جا رہا ہوں۔''

''تمھارا کام کا اجازت نامہ؟''

''تمھیں اچھی طرح علم ہے کہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''ہاں، مجھے پتا ہے۔ لیکن یہ دُوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتا ہے۔''

محمد نے نہ سمجھنے کی حیلہ سازی کی۔

پولیس افسر بولا۔ ''بہت بُرا ہو گا تمھارے ساتھ۔ تمھیں اِس روّیے کی بھاری قیمت چکانا پڑ سکتی ہے۔ تم سے تو میں بعد میں نبٹوں گا۔''

محمد مُڑے بغیر چل دیا۔ اُس نے ایک جنازہ دیکھا جس میں بہت سے لوگ شریک تھے اور حیرت انگیز طور پر وہ قومی پرچم اُٹھائے ہوئے تھے۔

محمد نے پُوچھا کہ کون فوت ہوا ہے۔ ''ایک غریب شخص، میرے اور تمھارے جیسا۔ کوئی ٹھیک سے نہیں جانتا کہ کیسے مرا ہے۔ اِسے پچھلے ہفتے پولیس اِس الزام پر اُٹھا کر لے گئی تھی کہ اِس نے انٹرنیٹ پر کچھ کیا ہے اور پھر کل اِس کے ماں باپ کو اِس کی لاش اپنے دروازے پر پڑی ملی۔''

''پولیس نے قتل کیا ہے؟''

''صاف ظاہر ہے لیکن اِس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' وہ شخص دِھیمی آواز میں بولا۔ ''یہ ایک عمدہ شخص تھا۔ دِن کو ایک کیفے میں کام کرتا اور شام کو انٹرنیٹ چلایا کرتا تھا۔''

محمد اپنے ٹھیلے کو ٹھیلتا ہوا جنازے کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ سادہ لباس والے شُرطے تصاویر لے رہے تھے۔

تدفین کے بعد وہ تھوک کی مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

یلغار اچانک تھی کہ اُسے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وردی والے دو شُرطوں نے، ایک مرد اور ایک عورت، اُسے زمین پر گرایا اور ٹھیلے پر قبضہ کر لیا۔

''ضبط کیا جاتا ہے۔''

''تمھیں غیر قانونی کاروبار کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمھارے پاس کام کا اجازت نامہ ہے نہ لائسنس۔ تم کوئی محصول بھی ادا نہیں کرتے۔ تم ریاست کی چوری کرتے ہو۔ اِس لیے تمھارا کھیل ختم۔ تمھارا ٹھیلا ضبط کیا جاتا ہے۔''

خاتون افسر بولی۔ ''اب دفع ہو جاؤ۔ تمھیں عدالت میں حاضری کا طلبی نامہ مل جائے گا۔ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے!''

لیکن محمد زمین پر پڑا رہا کیوں کہ دُوسرا افسر اُسے ٹھُڈوں پر رکھے ہوئے تھا۔

راہ گیر تماشا دیکھنے کے لیے رُک گئے۔ اُن میں سے کچھ نے احتجاج کیا۔ شُرطوں نے اُنھیں دھمکایا۔ ایک جیپ نمودار ہوئی اور اُس سے ایک افسر اُترا۔ جب شُرطوں نے اُسے صُورتِ حال بتائی تو وہ واپس جیپ میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔

پھر پولیس کی ایک اور گاڑی آئی۔ جس سے دو اور شُرطے اُترے اور ٹھیلے سے گرے ہوئے پھل سمیٹنے لگے۔ اُن میں سے ایک اُٹھایا ہوا سیب کھانے لگا۔

بے بس و بے کس محمد کچھ نہیں بولا۔ وہ سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ وہ بدحواس تھا کہ یہ کیا ہو گیا اور کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے لاچار رہا۔ سوچے سمجھے ہی اُس کے قدموں نے اُسے بلدیہ ہال پہنچا دیا۔ اُس نے میئر سے ملاقات کے لیے کہا۔ استقبالیہ پر بیٹھے شخص نے اپنی شہادت کی اُنگلی سے اپنی کنپٹی کے گرد دائرے بنائے کہ محمد ہلا ہوا ہے۔

"تمھارا خیال ہے کہ تم محض اِس طرح میئر سے مل سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں مل سکتا؟ مجھے اُن سے بات کرنی ہے۔"

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟ کیا تم امیر کبیر ہو؟ کیا تم کوئی اہم شخصیت ہو؟ اب نکلو یہاں سے اور مجھے سکون سے چائے پینے دو۔"

محمد نے اصرار کیا۔ "شاید نائب میئر ......"

"سب باہر گئے ہوئے ہیں۔ گورنر ایک نئی مسجد کا افتتاح کر رہا ہے۔"

"اور کل؟"

"میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں: یہ خیال چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے، لیکن جانے سے پہلے میں تمھیں بتا دوں کہ میں میئر سے کیوں ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"پولیس نے میری وہ چیز ضبط کر لی ہے جس سے میں اپنی روزی کماتا تھا۔ وہ ٹھیلا جس پر میں پھل بیچتا تھا۔ وہی میری روزی کا واحد وسیلہ تھا۔"

"اور تمھارا خیال ہے کہ تمھاری خُوب صُورت آنکھوں کی خاطر میئر پولیس کو حکم دے گا۔"

"انصاف کی خاطر۔"

"خُوب، تم خاص نہیں ہو! تمھارا تعلق کہاں سے ہے؟" اُس شخص نے اپنی آواز مدھم کرتے ہوئے پُوچھا۔ "تم نے اِس ملک میں انصاف کہاں دیکھا ہے؟" پھر وہ ایک لمحے کے لیے باہر گیا اور موٹے سرے والے ڈنڈے سے لیس واپس آیا۔ "اب دفع ہو جاؤ۔ ورنہ میں تمھارا حسین مُنھ توڑ ڈالوں گا۔"

محمد نے مزید اصرار نہیں کیا۔

اُس شام وہ زینب سے ملا جس نے مشورہ دیا کہ وہ بھی اُس کے ہم راہ بلدیہ ہال چلے گی۔ اُس نے ایک اور تجویز بھی دی۔

"کیوں نہ ہم سیدھے پولیس ہی کے پاس چلے جائیں؟"

"کیوں نہیں۔"

وہ پولیس ہیڈکوارٹر چلے گئے۔

وہاں موجود افسروں میں سے کوئی بھی محمد کے حالات سے آگاہ نہیں تھا۔ زینب نے بات چیت کا آغاز کیا۔

"خوب، اِس صُورت میں ہم چوری کا الزام عاید کرتے ہیں!"

"تم پولیس کے خلاف مقدمہ درج کروا رہے ہو؟ تمھارے خیال میں تم کہاں ہو؟ سویڈن میں؟ افسر نے شیطانی مُسکراہٹ سے دریافت کیا۔

"ہمیں صرف اپنا تھیلا واپس چاہیے۔"

"سمجھ گیا۔ مجھے اپنے شناختی کارڈ دے دو تا کہ میں فوٹو کاپیاں کروا لوں اور جیسے ہی مجھے کچھ پتا چلا میں تم لوگوں سے رابطہ کرلوں گا۔"

زینب کو اُس پر اعتبار نہ آیا۔ اُس نے انکار کر دیا محمد کو بازو سے پکڑ کر کھینچا اور وہ وہاں سے چلے گئے۔

وہ ہاتھ تھامے یا ایک دُوسرے کی کمر میں بازو ڈالے دیر تک گلیوں میں مٹرگشت کرتے رہے۔ ایک کار اُن کے پاس آ کر رُکی۔ سادہ لباس والے دو شُرطے اُترے۔

"تمھارے کاغذات ......لیکن تم دونوں شادی شدہ نہیں ہو۔ رات کے اِس پہر سنسان گلیوں میں پھرنا غیر قانونی ہے۔"

زینب نے اپنے حسن کے تیر چلائے اور افسر سے استدعا کی کہ وہ رپورٹ نہ کرے۔

"میرے باپ بہت غصّے والا ہے۔ براہِ مہربانی، ہمیں جانے دو! ہم گھر جائیں گے۔ ہم کوئی غلط کام نہیں کر رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے، جاؤ۔ اِس بار تمھیں چھوڑ رہا ہوں۔"

وہ دونوں سیدھے گھر گئے۔

محمد کی وہ رات بہت بے قراری میں گُزری۔ اُس نے اپنی ماں کو بھی نہیں بتایا کہ کیا ہوا ہے۔ اُس کے باپ نے بتایا تھا کہ پریشانی اور دباؤ سے اُس کی ماں کے خُون کی شکر بڑھ جاتی ہے۔

اگلے روز صبح سویرے محمد نے غسل کیا اور پھر اُس نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد پہلی مرتبہ نماز ادا

کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے سرتاپا سفید لباس پہنا۔ اُس کی ماں سو رہی تھی۔ اُس کی نیند خراب کیے بغیر اُس نے اُس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اپنے سوئے ہوئے بھائی اور بہنوں کو دیکھا۔ پھر دوڑتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔ اپنے بھائی کی پُرانی موٹر بائیک لی، گیس سٹیشن پر رُکا اور پلاسٹک کی پانی والی بوتل گیسولین سے بھروائی۔ بوتل کو ایک چھوٹے تھیلے میں رکھا اور بلدیہ ہال کا رُخ کیا۔

وہاں اُس نے کسی اہلکار سے ملنے کا مطالبہ کیا۔

کوئی بھی اُسے ملنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اُس مقام پر لوٹا جہاں پولیس نے اُس کا ٹھیلا ضبط کیا تھا۔

وہ دوبارہ وہاں موجود تھے۔ پاس ہی ٹھیلا بھی موجود تھا لیکن خالی۔

محمد اُن کے پاس گیا اور اُس نے اُن سے اپنی شے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

مرد شُرطے نے اُسے زوردار تھپڑ رسید کیا اور چلّایا۔ ”دیکھو، غلیظ چُوہے، اِس سے پہلے کہ میں مار مار کر تمھارا بھرکس نکال دوں یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔“

محمد نے اپنے دفاع کی کوشش کی۔ اِس مرتبہ خاتون شُرطے نے اپنی باری نبھاتے ہوئے تھپڑ مارتے ہوئے اُس کے مُنھ پر تُھوک دیا۔ ”کیڑے، تم ہمارا ناشتہ حرام کر رہے ہو! تمھیں تمیز تک نہیں۔ تمھاری اوقات کیا ہے!“

محمد جھک گیا۔ وہ بولا نہ اُس نے حرکت کی۔ اُس کا چہرہ سپاٹ، آنکھیں سُرخ اور مُنھ سختی سے بھِنچا ہوا تھا۔ اُس کے اندر کچھ پھٹنے کو تیار تھا۔ وہ اِس حالت میں دو تین منٹ تک رہا۔ لیں اُسے لگا جیسے وہ ہمیشہ سے اِسی حالت میں ہے۔

مرد افسر بولا۔ ”چلو، اب دفع ہو جاؤ۔ تمھارا ٹھیلا— تمھیں دوبارہ کبھی دِکھائی نہیں دے گا۔ اب تو معاملہ ہی ختم ہو گیا۔ تم نے ہماری عزت نہیں کی۔ اور ہمارے اِس وطنِ عزیز میں تمھیں اِس کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔“

محمد کا حلق خشک ہو رہا تھا اور تُھوک زہریلا۔ اُسے سانس تک لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اُس نے سوچا: اگر میرے پاس بندوق ہوتی تو میں اِن حرامیوں پر خالی کر دیتا۔ میرے پاس بندوق تو نہیں ہے لیکن میرا جسم، میری زندگی تو ہے۔ میری بے کار زندگی جو میرا ہتھیار ہے۔“

محمد اُٹھا اور اُن سے پرے ہٹ گیا۔ اُس نے موٹر بائیک سٹارٹ کی اور بلدیہ ہال کی سمت روانہ ہو گیا۔

اُس نے بائیک کو ایک کھمبے کے قریب کھڑا کر کے اُسے تالا لگایا اور دوبارہ میئر یا اُس کے کسی نائب سے ملنے کا مطالبہ کیا۔ استقبالیے پر بیٹھا شخص گزشتہ روز سے زیادہ مشتعل ہو گیا۔ واپس باہر نکل کر محمد کو تھیلے میں پڑی گیسولین سے بھری بوتل کا خیال آیا۔ اُس نے اپنے سفید لباس کو درست کیا اور چوراہے پر ٹہلنے لگا۔ کسی نے اُس پر دھیان نہیں دیا۔

وہ دسمبر کی ایک دھوپیلی صبح تھی۔ دسمبر کی ۱۷ تاریخ۔ اُس کے ذہن میں دُھندلے چہرے اُبھر آئے۔ بستر پر لیٹی ماں، تابوت میں پڑا باپ، خوشعبۂ فن وادبیات میں، مُسکراتی ہوئی زینب، غصّے ہوتی ہوئی زینب، اُس سے کچھ نہ کرنے کی التجا کرتی ہوئی زینب؛ بستر سے نکل کر اُسے پُکارتی ہوئی ماں؛ اُس عورت کا چہرہ جس نے اُسے پہلے بھی اور پھر دوبارہ تھپّڑ رسید کیا تھا؛ اُس کا جھکا ہوا بدن جیسے وہ سزا کے لیے اپنے آپ کو جلاد کے حوالے کر رہا ہو؛ نیلا آسمان؛ اُس پر ایک دیوہیکل درخت کا سایہ؛ درخت کے سائے تلے وہ زینب کے بازوؤں میں؛ وہ بچّے کے رُوپ میں دوڑتا ہوا کہ سکول سے دیر نہ ہو؛ فرانسیسی اُستاد کی اُسے شاباشی؛ کالج کا امتحان دیتے ہوئے، ماں باپ کو اپنا ڈپلوما دِکھاتے ہوئے، ڈپلومے کے ایک طرف ”بے روزگار“ کے نقش کیے ہوئے الفاظ؛ سنک میں جلتا ہوا ڈپلوما؛ باپ کی دوبارہ تدفین؛ رونا پیٹنا؛ پرندے؛ صدر اور اُس کی اہلیہ دھوپ کی بڑی بڑی سیاہ عینکیں لگائے ہوئے؛ عورت جس نے اُسے تھپّڑ رسید کیا تھا؛ اُس کا ساتھی جس نے اُس کی اہانت کی تھی؛ آسمان پر چڑیوں کا اُڑتا ہوا غول؛ ”سپارٹاکس“؛ عوام کے لیے لگائل؛ اُس کی ماں اور دونوں بہنیں پانی بھرنے کے لیے قطار میں لگی ہوئیں؛ ایک بار پھر شُرطے اُسے وحشیانہ مارتے ہوئے؛ گالیاں، گھونسے؛ گالیاں، گھونسے......۔

محمد نے میئر سے ملاقات کروانے کے لیے آخری بار کہا۔ انکار اور تذلیل۔ استقبالیہ والے شخص نے اُسے موٹے سرے والے ڈنڈے سے دھکا دیا تو زمین پر گر گیا۔ چُپ چاپ اُٹھا اور بلدیہ ہال کے مرکزی داخلے کے سامنے بنے سٹینڈ میں چلا گیا۔ اُس نے تھیلے سے گیسولین کی بوتل نکالی۔ اُسے اپنے اُوپر اُنڈیلا۔ چوٹی سے سر تک بوتل خالی کی۔ پھر لائٹر روشن کیا، ایک لمحے کے لیے اُس کے شعلے کو گھورا اور اُسے اپنے لباس کے قریب لے آیا۔

چشمِ زدن میں آگ بھڑک اُٹھی۔ بلا تاخیر لوگوں کا انبوہ اُس کی طرف دوڑا۔ استقبالیے والا شخص چیخنے چِلّانے لگا۔ اُس نے اپنی جیکٹ سے آگ بجھانے کی سعی کی لیکن محمد الاؤ بن چکا تھا۔ تب تک ایک ایمبولینس بھی آ پہنچی۔ آگ بجھا دی گئی لیکن محمد تمام تر انسانی شباہت کھو چکا تھا۔ وہ تیز آگ پر کھال سمیت بھنی ہوئی بھیڑ کے مانند سیاہ پڑ گیا تھا۔

استقبالیے والا شخص چلّا رہا تھا۔ ”یہ سب میرا قصور ہے۔ مجھے اس کی مدد کرنا چاہیے تھی۔“

محمد ہسپتال میں ہے۔ اُس کا سارا جسم ممیوں کے مانند پٹیوں سے ڈھانپا ہوا ہے۔ وہ بے ہوشی میں ہے۔ راہداری میں افراتفری برپا ہو جاتی ہے۔ سفید کوٹوں میں ملبوس ڈاکٹر اور نرسیں راہداری میں محمد کے کمرے کی سمت رہنمائی کرتی ہیں۔ صدر آ گیا ہے۔ صدر نے محمد کی حالت کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ صدر برہم ہے۔ اُسے میئر کے بارے میں پتا چلتا ہے کہ اُس نے محمد سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اُسے گولی مارنے کا حکم دے دیتا ہے۔ صدر برہم ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ عالمی پریس اُس کی کہانی نشر کر رہا ہے۔

ڈاکٹروں کا ایک ہجوم ہسپتال کے کمرے میں صدر کے پیچھے پیچھے رہتا ہے۔

فحش اور بے ہودہ نعروں والے کارڈ اور بینر۔

سارا ملک بغاوت کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ زینب اپنے بالوں کو سختی سے پیچھے باندھے ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کرتی ہے۔ اُس کا مُکا بلند ہے۔ وہ چلا رہی ہے۔

محمد ۴ جنوری ۲۰۱۱ء کو چل بستا ہے۔

ہر طرف احتجاج ہی احتجاج ہے۔ ایک ہی پُکار ہے: “ہم سب محمد ہیں!”

صدر چوروں کی طرح ملک چھوڑ کا بھاگ نکلتا ہے۔ اُس کا جہاز ستاروں بھری رات میں غائب ہو جاتا ہے۔

احتجاج ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔

جگہ جگہ محمد کی تصاویر لگی ہیں: ستم رسیدہ اور علامت۔ عالمی میڈیا اُس خاندان کے انٹرویو لینے کے لیے اُس ملک کی طرف دوڑا اُٹھتا ہے۔

حد یہ کہ فلموں کا ایک ہدایت کار بھی اُنھیں ملنے آتا ہے۔ وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں والی ماں کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھماتا اور کہتا ہے۔ “براہِ کرم، اِس مدد کو قبول کریں۔ یہ زیادہ تو نہیں ہے۔ تقدیر ایسی ہی چیز ہے، ظالم اور نا انصاف۔”

وہ جھکتا ہے اور روتی ہوئی عورت کے کان میں سرگوشی کرتا ہے۔ “یہ اچھی بات ہے کہ آپ کسی سے بات نہیں کرتیں۔ صحافیوں کو کوئی انٹرویو مت دینا۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں محمد کی کہانی سامنے لاؤں گا۔ ساری دُنیا کو پتا چلنا چاہیے کہ کیا ہوا ہے۔ محمد ہیرو، ستم رسیدہ اور شہید ہے۔ آپ اتفاق کرتی ہیں؟ آپ میرے علاوہ کسی کو نہیں بتائیں گی۔ میں اب چلوں گا لیکن آپ کو کسی بھی شے کی ضرورت ہو تو یہ رہا میرا کارڈ اور میرا سیل فون نمبر، مجھے کال کر لینا۔”

ماں اُس شخص کی بات ذرا برابر بھی نہیں سمجھ پائی۔ لیکن اُس کی بیٹیاں اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ “یہ شخص ہمارے بھائی کی موت خریدنا اور اُس سے منافع کمانا چاہتا ہے! کیسا عفریت ہے! کتنا بڑا عفریت! محمد کی کہانی کسی کی مِلک نہیں ہے۔ اُس کی کہانی دُوسرے لاکھوں کروڑوں لوگوں کی طرح ایک عام آدمی کی کہانی ہے جنھیں کچلا گیا، جن کی اہانت کی گئی اور جنھیں زندگی میں رد کر دیا گیا اور جو یہ تمام ظلم و ستم سہنے کے بعد دُنیا بھر کے لیے روشنی بنے۔ کوئی کبھی اُس کی موت چُرا نہیں سکے گا۔”

☆☆☆☆

پروفیسر جمال ملک

جرمن سے ترجمہ: بشریٰ اقبال ملک

مدرسے کا خواب

اسے لگا کہ وہ ایک بے حد روشن کمرے میں ہے۔ اور ایک گھنی بھنوؤں اور کالی داڑھی، سرمے لگی تیز معترض آنکھوں والے چہرے نے اسے حصار میں لے رکھا ہے۔ چہرے کے لب ہل رہے ہیں اور کچھ نپے تلے لفظ اس کی سماعت سے ٹکرا رہے ہیں۔

ہم حق اور سچ ہیں۔ دنیا نہیں تو آخرت ہماری ہے۔ دنیا لینے والے، انگارے تیرے منتظر ہیں۔

اس نے سر کو تکیے پر پٹکا اس کا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا اور ماتھے سے نکلنے والا پسینہ اس کی بھنوؤں کو بھگو رہا تھا۔

اس نے سوچا۔ وہ کہاں ہے۔ ہوسٹل ہی میں ہے نا۔ یا۔۔۔ **آخرت**

خوف سے لرزتے پسینے میں شرابور سالک نے آنکھیں کھولیں گردن اٹھا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا وہ تینوں بے خبر سو رہے تھے۔

کمرے میں روشنی کھڑکی اور دروازے کی درزوں سے چھن چھن کر کمرے کو نور النور کر رہی تھی۔

باہر دور سے کسی گاڑی کے انجن کی گڑگڑاہٹ اور قدموں کی دھمادھم سنائی دے رہی ہے جو اب بھاری بوٹوں کی آہٹوں میں بدلنے لگی ہے۔

بھاری بوٹوں کی آوازوں میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی شامل ہوئیں تو وہ ہمت کر کے اٹھا اور کمرے کے دروازے کی درز سے باہر جھانکا۔ برآمدے میں کمرے کے عین سامنے والی سیڑھیوں پر چار پانچ فوجی جوان اپنے کتے لیے اوپر جا رہے ہیں۔ وہاں مدرسے کے بڑے درجوں میں زیر تعلیم لڑکوں کے کمرے ہیں۔

عزت بھی وہیں رہتا ہے۔

بھاگنے اور دروازہ توڑنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں اور شور اتنا بڑھا کہ اس کے تینوں ساتھی بھی جاگ گئے اور اس کے ساتھ چابی کے روزن اور دروازے کی درزوں سے باہر جھانکنے لگ گئے۔

سامنے مدرسے کے دالان میں فوجی گاڑیوں کی روشنی مدرسے کے ساتھ والی مسجد کی سفید دیواروں پر پڑ رہی ہے اور سبز مینار اندھیرے میں بھی چمک رہا ہے۔ بہت عجیب پراسرار اور وحشت خیز منظر ہے۔

کمانڈوز دو لڑکوں کو گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں۔ انھوں نے دیکھا، ان میں سے ایک لڑکا عزت ہے۔

تینوں نے حیرت سے سرگوشی میں کہا۔ عزت، اونہیں

سالک کا دل ڈوب گیا اس کا خوف یکا یک ایک گہری اداسی میں بدل گیا۔

سب کو فوج اور جامعہ حفصہ والوں کے درمیان ہونے والی لال مسجد کی خون ریز جنگ یاد آ گئی۔ جس کے بارے میں انھوں نے اخبارات میں عجیب ہولناک خبریں پڑھی تھیں اور تمام ٹیلی ویژن چینلز نے اس واقعے کو براہ راست نشر بھی کیا تھا۔

یہ مدرسہ اس شہر کا سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ اس کا دوست عبدالمصطفے مدرسے میں کتابی کیڑا مشہور ہے۔ اخبارات اور رسائل کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہے۔ اور سب کو معلومات فراہم کرتا رہتا ہے۔

یہاں بھی جامعہ حفصہ والا کوئی سلسلہ ہو سکتا ہے دوستو۔

لال مسجد کے واقعے کے بعد سے ہر مدرسے کو شک کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ فوج کو پارلیمنٹ سے اجازت مل چکی ہے کہ وہ کسی بھی ادارے میں جہاں انھیں مشکوک سرگرمیوں کی اطلاع ملے چھاپہ مارے سکتے ہیں۔ پاکستان دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے جہاں مسلمانوں اور مدرسوں کی تعداد زیادہ ہے۔ معلوم ہے ہمارے مدرسے کے اس ہوسٹل میں ہزار سے زیادہ طالب علم رہتے ہیں۔ نجانے کون کون ہوگا یہاں پر دہشت گرد۔

سالک کو اس وقت اس کی یہ باتیں ناگوار محسوس ہوئیں۔

وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا کہ ان کے مدرسے کا تعلق کسی شدت پسند گروپ سے ہو سکتا ہے اور خاص طور پر عزت کا۔

فجر کی اذان شروع ہوئی تو باہر سے کوئی میر کا شعر گنگناتا ہوا گزرا۔

سرسری تم جہاں سے گزرے ہو
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

ان سب کا ڈر سے برا حال تھا وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

ناشتے کے کمرے میں دریوں پر بیٹھے تقریبا تمام طلبا خاموش اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ طلبا بھی، جو ہر روز ناشتے میں ملنے والی روکھی پھیکی روٹی اور پانی ملی دہی کو چٹخارے لے لے کر کھاتے ہیں آج سر جھکائے یوں ناشتہ کر رہے تھے جیسے زہر مار کر رہے ہوں۔

سالک نے اپنی جماعت کے لڑکوں کی صف کو دیکھا سب سہمے ہوئے تھے ان کی سوچ بھی ان کی

عمروں کی طرح کچی تھی ۔ وہ بڑی جماعت کے لڑکوں کو، جن کی عمریں سولہ سے بیس کے درمیان ہوں گی، مشکوک ورخوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔

سالک کی نگاہ مدرسے کے دالان کی طرف اٹھی جہاں چند گھنٹے پہلے فوجی گاڑی کھڑی تھی ۔ اب وہاں ایک دری بچھی ہے، اس دری پر استاد نورانی شاہ ملیشیا رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس بڑی سی سرمئی رنگ کی پگڑی سر پر جمائے آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں ۔ پگڑی نے ان کے آدھے ماتھے کو چھپا رکھا ہے ۔ ان کے سامنے رحل پر قرآن پاک کھلا ہے اور وہ تلاوت میں مصروف ہیں ۔ ان کی مہندی سے رنگی داڑھی سورج کی شعاعیں پڑنے سے چمک رہی ہے ۔

سالک نے غور سے ان کا جائزہ کر لے کر اندازہ کرنا چاہا کہ کیا رات والے واقعے کا انھیں علم ہو چکا ہے یا نہیں ۔

ناشتے کے بعد تمام لڑکے درس کے لیے ان کے اردگرد آ کر بیٹھ گئے اور وہ ان سے کل پڑھائے گئے سبق کے بارے میں سوالات کرتے رہے ۔

عربی زبان کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے وہ فرما رہے تھے کہ مدارس عربی زبان سکھانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں ۔ اچھی عربی زبان آنے کی وجہ سے طلبا خود اپنی عقل سے نہ صرف قرآن اور شریعت کو سمجھ پاتے ہیں بل کہ منطق کے اصولوں کو بھی جان جاتے ہیں ۔

نورانی شاہ نے سر اٹھا کر طالب علموں کو فخر بھری نظروں سے دیکھا ۔

اسے عزت یاد آنے لگا ۔

اٹھارہ انیس سال کا گوری رنگت اور سنہرے بالوں والا نرم مزاج اور سنجیدہ سا یہ نوجوان اسے بہت بھاتا تھا ۔

شروع شروع میں سالک برآمدے کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کو دیکھتا تھا ۔ اس کا سامنا کرنے سے اسے شرم سی محسوس ہوتی تھی ۔ عزت کو اس بات کا علم تھا وہ اکثر اس کو پاس بلا کر ہاتھ ملاتا اور دیر تک اس کا ہاتھ پکڑے رکھتا پھر اس سے، اس کے خاندان کے بارے میں پوچھتا، جو سالک اس کو تفصیل سے بتاتا ۔

مگر خود سالک چاہتے ہوئے بھی کبھی اس سے اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھ سکا کہ وہ تو ایک ترکمان ہے ۔ یہاں کیوں کر آ گیا ہے ۔ اس کا خاندان کہاں ہے ۔

مگر عبدالمصطفےٰ کو اور باتوں کی طرح عزت کے بارے میں بھی علم تھا ۔ اس نے بتایا کہ عزت ایک ترک مجاہد کا بیٹا ہے ۔ جو افغانستان کو روس سے آزاد کروانے کی جنگ میں شہید ہو گیا تھا ۔ یہ سرد جنگ ۱۹۷۹ سے ۱۹۸۹ تک جاری رہی تھی اور ہمارے مدرسے میں عزت کے علاوہ بھی بہت سے طالب علم اس جنگ میں شہید اور لاپتہ ہو جانے والوں کے بچے ہیں ۔

وقفے میں ہر طرف رات والے واقعے پر چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔

کچھ لڑکے ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ رات گرفتار ہونے والے لڑکے دراصل کسی آرمی بیس کیمپ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ انٹیلی جنس والوں کو پتا چل گیا اور وہ پکڑے گئے۔

سالک کشمکش کا شکار ہو گیا۔

ایک بڑا لڑکا دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ اس نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ ۱۹۸۰ میں یو ایس ایڈ نے پچاس ملین ڈالر خرچ کر کے پاکستان اور افغانستان کے مدرسوں کے نصاب میں جہاد کی اہمیت اور ضرورت پر مضامین شامل کروائے تھے۔ تب ہی سے مدرسوں کے طلبا کو کشمیر اور بوسنیا جا کر بھی جہاد کرنے کا خیال آیا۔

پھر اس نے ٹھنڈی آہ بھر کہا۔

اب تو بہت سے معصوم اس طریقے سے جنت میں جانے کا راستہ اختیار کر رہے ہیں کیوں کہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے نا۔ کیا کریں وہ اب ----

نہیں عزت ایک دہشت گرد نہیں ہو سکتا اور اگر وہ واقعی دہشت گرد ہوا تو۔

اس خیال نے سالک کا مدرسے میں رہنا مشکل کر دیا۔

وہاں کی بیماری کا بہانہ بنا کر گھر چلا آیا۔

اس کا گھر اندرون شہر کی ایک نیم بوسیدہ سی عمارت میں ہے۔ جہاں وہ دو کمروں پر مشتمل ایک گھر میں اپنے والدین اور چھ بہن بھائیوں کے ساتھ رہتا ہے۔

اس کے اچانک گھر آنے پر اس کی ماں اور بہنیں بہت خوش ہوئیں۔ ماں نے حسب معمول نظر بد سے محفوظ رہنے کے لیے اسے تعویذ پہنایا جو وہ اپنے پیر سے بنوا کر لاتی ہے۔ باورچی خانے کے پیچھے چھوٹے سے صحن میں جو بطور غسل خانہ بھی استعمال ہوتا ہے، سالک کو سگریٹ کا دھواں اڑتا نظر آیا تو وہ سمجھ گیا کہ والد گھر پر ہیں انھیں سالک کا مدرسے سے چھٹی کرنا سخت ناپسند ہے

اپنے اچانک گھر آنے کی وجہ کا بہانہ سوچتے ہوئے وہ ان کی طرف بڑھا اور ڈرتے ڈرتے سلام کیا۔

وہ شیشے کے سامنے ہونٹوں میں سگریٹ دبائے شیو کرتے رہے۔ نلکے کے اوپر لگا یہ آئینہ اب اتنا پرانا اور پیلا ہو چکا تھا کہ اس میں بمشکل شکل نظر آتی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ان کا اس سے بات نہ کرنے کا بہانہ ہے۔

جب سے سالک نے ہوش سنبھالا ہے تب سے اس کے والد ایک پولیس آفسر کے ذاتی ڈرائیور ہیں۔ انھوں نے اپنی تینوں بڑی بیٹوں کا جہیز جمع کرنے کے بجائے تینوں بیٹوں کو بھی اس افسر کی طرح افسر بنانے کا سپنا دیکھا تھا اور اس مقصد کے لیے سب کا پیٹ کاٹ کر سب سے بڑے بیٹے کو ایک پرائیوٹ انگلش میڈیم سکول میں داخل بھی کروایا تھا مگر اس کے لیے انگریزی زبان مشکل تھی۔ ٹیوشن کی فیس بھرنا ناممکن تھا۔

اس لیے وہ امتحانات میں فیل ہوتا اور مار کھاتا رہا پھر روز روز کی مار سے تنگ آ کر گھر سے ہی بھاگ گیا اور نشہ شروع کر دیا۔ اب نجانے کہاں ہے وہ۔

سالک کو اس بات کے علاوہ یہ دکھ بھی ہے کہ لائق اور محنتی ہونے کے باوجود اسے افسر بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی۔ مگر وہ جانتا ہے کہ اسے مدرسے میں بھیجنا والد کا شوق نہیں مجبوری ہے اس سے ایک سال چھوٹا بھائی تو مدرسہ بھی نہیں جا پایا۔ کیوں کہ والد کا خیال ہے گھر میں تین جوان لڑکیاں ہیں۔ جس محلے میں وہ رہتے ہیں وہ دن کو بھی غیر محفوظ ہے اس لیے اکیلی خواتین کی حفاظت کے لیے کسی مرد کا گھر پہ رہنا ضروری ہے۔

سالک نے اپنے کمزور سے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا جو کسی چوکیدار کی طرح چوکنا اور ہوشیار دکھائی دے رہا تھا۔

کھانے کے بعد سالک نے مدرسے کا واقعہ بتایا تو والد نے سخت لہجے میں کہا۔

کچھ بھی ہو تم کو وہیں رہنا ہے بس۔ مدرسہ نہیں چھوڑنا۔ ایک بیٹا گنوا چکا ہوں۔ آوارگی میں پڑو گے۔ بھنگ سستی اور تعلیم مہنگی ہے یہاں۔

انھوں نے سگریٹ کو زمین پہ مسل کر بجھایا۔ سیاستدان اور حکمران سالے سب کے سب۔۔ وہ گالی دیتے دیتے رک گئے۔

سالک کو ان پر ترس آیا اس کا دل ہمیشہ انھیں تسلی کے چند لفظ کہنا چاہتا ہے۔ مگر اسے اپنے جذبات کو ظاہر کرنا آتا ہی نہیں ہے، اسے اظہار کرنا سکھانے والا ہے بھی کون۔

اس نے اپنی خاموش رہنے والی ماں اور شرمندہ شرمندہ چہروں والی بڑی بہنوں کی طرف دیکھا۔

یہاں تو سب ہی اپنے دکھ چھپاتے رہتے ہیں۔ باپ کے بعد ان سب کا سہارا میں ہوں۔

وہ پریشان ہو گیا۔

اسے اچانک والد پہلے سے زیادہ کمزور اور بوڑھے لگنے لگے۔

اس نے اسمائے ربانی کا ورد شروع کر دیا۔ جو اسے ایک استاد نے بتائے تھے اور کہا تھا کہ اس کے بعد جو بھی دعا مانگو گے فورا قبول ہوگی۔

اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی لیکن پریشانی کم نہ ہوئی اور وہ بھاری دل سے مدرسے کے لیے واپس روانہ ہو گیا۔ راہ میں اس نے گھر کی گلی کے نکڑ پہ کھڑے دکانوں کے تھڑوں پہ بیٹھے لڑکوں کو دیکھا اسے لگا کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

اس نے پلٹ کر اپنے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں اس کا بھائی چوکنا ہوا بیٹھا تھا۔

اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ پڑھ تو رہا ہے۔ مدرسے ہی میں سہی۔

پہلی کلاس مدرس جلال الدین کی تھی ۔ سالک کے لیے مدرسے کی اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ یہ مدرس بھی اک راز ہے۔ اس کی لمبی گھنی اور کالی داڑھی تیز اور چمک دار آنکھیں، جن کو وہ ہر طالب علم کی آنکھوں میں ڈال کر یوں بولتا ہے کہ اس کے بولے ہوئے الفاظ سب کو اپنے دل کی آواز محسوس ہونے لگتے ہیں۔

آج سالک کو یوں لگا جیسے وہ جماعت میں صرف اس سے مخاطب ہے۔

اب انصاف کی بات کرنی ہے اور انصاف کروانا بھی ہے۔ تعلیم سب کا بنیادی حق ہے ایک غریب اور یتیم کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دلوانا ہے۔ ہے یا نہیں۔

سالک کے سامنے مدرسہ حفصہ کے ڈنڈا بردار طلبا گھومنے لگے۔

مدرس جلال الدین نے سالک پر نظریں جمالیں اور بولا بہت ظلم ہو چکا ہے اب روکنا ہوگا۔ روکنا ہوگا یا نہیں۔

دونوں کی نظریں ملیں سالک خاموش رہا مگر اس کا نہ بولنا بھی دونوں کے درمیان ابلاغ کی طرح تھا۔

عصر کی نماز کے وقفے میں سالک کو مسجد کی فضاؤں میں ایک مخصوص خوشبو محسوس ہونے لگی۔ اس نے دیکھا عزت لوٹ آیا ہے۔ سب اس سے گلے مل رہے ہیں۔ اس کا لباس اجلا اور سر اور داڑھی کے بال صاف ہیں۔ جیسے وہ چھٹی گزار کر آیا ہے۔

وہ بھی اس کی طرف بڑھا تو عزت نے اسے گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔

جب سب وضو خانہ کی طرف جانے لگے تو سالک عزت کے ساتھ چل پڑا۔

وضو کے دوران میں عزت نے سرگوشیوں میں کچھ کہنا شروع کیا مگر نلکوں سے مسلسل پانی گرنے کی وجہ سے واضح طور پر سنائی نہیں دے پایا۔ سالک کو لگا کہ وہ آرمی کے خلاف کچھ کہہ رہا ہے۔

کیا عزت مجھے اپنا ہم راز بنانا چاہتا ہے۔

اس نے سوچا۔

دونوں نے ساتھ ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ شام کے کھانے پر بھی وہ عزت کے ساتھ ہی چپکا رہا۔ جیسے وہ اس کو دوبارہ کھو دینے سے ڈر رہا ہو۔ دونوں نے ٹین کی پلیٹ میں پتلی دال اور روٹی کھائی۔ سالک نے دیکھا کھانے کے دوران میں عزت سوچوں میں ہی کھویا رہا۔

آخر۔ فوجی اسے پکڑ کر کیوں لے گئے تھے اور پھر چھوڑ کیوں دیا؟

سالک نے دو انگلیوں اور انگوٹھے کی مدد سے نوالے بنا کر منہ میں ڈالتے ہوئے سوچا۔

یہ رات بھی بے چین گزری۔

صبح نورانی شاہ نے چادر سے انگلیوں پر لگے کھانے کو صاف کیا، لال داڑھی پر ہاتھ پھیرا کتاب کو

رحل پر رکھا اور سبق پڑھانے کے بجائے اداس لہجے میں افغان جہاد کی تاریخ دوہرانی شروع کر دی۔

کمیونسٹوں کے خلاف خانہ جنگی ہو رہی تھی ۔ سادہ لوح اور جذباتی مسلمان، جن کو افغانستان میں روس کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے مجاہدین بنا کر بھیج دیا گیا تھا، میں بھی ان میں سے ایک مجاہد تھا بہت ہی جیالا مجاہد ۔

وہ طنز سے مسکرایا سر ہلایا اور بولا:

”زندگی تھی اس لیے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا ۔ جان بچ جانے کے بعد سوچا ۔ اب یوں نہیں لڑوں گا جتنی زندگی باقی ہے اس میں قلم سے جہاد کروں گا ۔ مدارس کا کام علم دینا ہے بس ۔ میرے ساتھی شہدا کے یتیم بچوں کو مدرسے سنبھال رہے ہیں، حکومت تو نہیں سنبھال رہی ان کو بھئی ۔“

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا زندگی ایک بار ملتی ہے ۔ زندگی کی قدر کرو، گولی نہیں قلم چلاؤ بس قلم اٹھاؤ ۔ جہاد بالقلم سالک پر سے جیسے پچھلے دنوں کا سارا بوجھ ہٹ گیا ۔ اسے لگا جیسے وہ یہی سننا چاہتا ہے ۔ زندگی اور انسان کی قدر، اس نے جماعت کے کمرے کی کھڑکی سے باہر دالان میں مسجد کے اونچے مینار کو دیکھا جو ایک شان سے کھڑا تھا۔

کئی راتوں کے بعد وہ آج سکون سے سویا۔

دوپہر کو کھانے کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے دالان کے گھنے درختوں کے پیچھے عزت کو دیکھا ۔ جو جلال الدین اور دو اجنبی لڑکوں کے ساتھ دھیمی آواز میں گفتگو میں مصروف تھا ۔ وہ لڑکے مدرسے کے نہیں لگ رہے تھے ۔ اس نیم پوشیدہ سی میٹنگ نے اسے پھر سے پریشان کر دیا ۔ وہ جان بوجھ کر ان کی طرف آ گیا اور با آواز بلند سلام کیا ۔ سلام کی آواز پر سب چونکے اور ادھر ادھر بکھر گئے ۔ عزت سالک کی طرف مسکراتا ہوا بڑھا اور دونوں ساتھ ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف روانہ ہوئے ۔

عزت نے سالک کو پریشان دیکھ کر مصنوعی حیرت سے پوچھا: ”کیا بات ہے ۔ کیا ہوا ۔ اداس لگ رہے ہو ۔“

سالک کے دل نے کہا پوچھ لے کہ وہ کن چکروں میں پڑ رہا ہے ۔

مگر اس کی ہمت نہ ہوئی اس نے جلدی سے کہا: ”مدرس نورانی شاہ نے بتایا ہے کہ ہمارے مدرسے میں افغان جہاد کے شہدا کے بچے بھی پڑھتے ہیں ۔“

سالک نے دیکھا ۔

عزت تھوڑا سا چونکا اور اداس ہو گیا ہے ۔ سالک کو بہت افسوس ہوا کہ اس نے یہ بات اسے کیوں بتا دی ۔

چند لمحوں بعد عزت نے دبی سی آواز میں کہا ۔

مجھے معلوم ہے تم کو کیا جستجو ہے سالک۔ مگر میں بتا نہیں سکتا۔

سالک نے پہلی بار عزت کا ہاتھ پکڑا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ سالک گھبرا گیا اور جلدی سے بولا:

"مجھے نورانی شاہ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں کیوں کہ وہ جنگ کے خلاف ہیں انھوں نے قلم سے جہاد کی نصیحت کی ہے۔"

"میں ایک ایسا مدرسہ بناؤں گا، جس میں صرف قلم سے ہی جہاد کرنا سکھایا جائے گا۔"

سالک نے اتنے پرعزم لہجے میں کہا کہ عزت کو ہنسی آ گئی۔

"شاید مذاق کے موڈ میں ہو سالک۔"

"مذاق نہیں ہے ہمیں معلوم کرنا چاہیے آخر کو مدرسہ ہے کیا؟ سکول اور مدرسہ الگ الگ کیوں ہیں۔"

"اتنے چھوٹے لڑکے کے اتنے بڑے بڑے سوال۔" عزت خوش گوار موڈ میں بولا۔

"اچھا چلو میرے ساتھ پھر معلوم کرتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"ہمارے مدرسے سے کچھ فاصلے پر ایک مسجد ہے۔ وہاں کے امام صاحب بتا سکیں گے یہ سب کچھ۔"

سالک گھبرا گیا۔

"نہیں مدرسے سے بے وقت نکلنا آسان نہیں ہے۔ میں اپنی مسجد کے مولوی صاحب سے ہی پوچھ لوں گا۔"

عزت مسکرایا اور بولا۔

"اس مدرسے میں علم رکھنے والے کم ہیں۔ تم آؤ بس میرے ساتھ۔"

سالک حیران ہوا۔

گیٹ کا چوکیدار عزت کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا ہے اور وہ دونوں رجسٹر میں نام درج کیے بغیر ہی باہر نکل گئے۔

نیلی مسجد کے امام صاحب نے بھی عزت کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور وہ سالک کے شوق اور تجسس کے بارے میں جان کر خوش ہوئے اور بتانے لگے کہ:

"تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ۱۰۶۷ء میں بغداد میں پہلا مدرسہ، مدرسہ نظامیہ کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کے قیام کا مقصد خاص افراد کو عائلی قوانین کا علم اور ملکی امور چلانے والے علوم کی تربیت دینا تھا۔"

یعنی افسر بنتے تھے اس مدرسے میں۔ دینی تعلیم کے لیے نہیں بنا تھا مدرسہ۔ سالک بے اختیار خوشی سے اچھل پڑا۔

”ہاں بالکل جس طرح انگریزی میں لفظ اسکول ہے اسی طرح عربی میں مدرسہ کہا جاتا ہے درس گاہ کو۔“ مولوی نے اپنی بات جاری رکھی۔

”دینی تعلیم کے طور پر وہاں علم الاختلاف پڑھایا جاتا تھا۔ یعنی مختلف مذاہب کے درمیان بحث کو اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر اس کو ایک منطقی انجام تک پہچانے کی خصوصی تربیت دی جاتی تھی۔“

سالک اور عزت کے حیرت سے منہ کھلے رہ گئے۔

عزت نے بے اختیار پوچھا۔

”کیا مختلف مسلک اور مذاہب والے ایک ہی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ جیسے آج کل سکول یونیورسٹی ہیں۔“

”ہر مکتبہ فکر کی مسجد اور مدارس الگ الگ نہیں تھے تو گولی اور بم -----“

سالک کہتے کہتے روک گیا۔

امام صاحب چپ ہو گئے۔ عزت بھی سوچ میں ڈوب گیا۔

سالک کے دماغ میں سوالات ابھرنے لگے۔

وہ واپس مدرسے پہنچے تو مغرب کی جماعت تیار کھڑی تھی اس نے خشوع وخضوع کے ساتھ خود کو نماز میں محو کرنے کی کوشش کی مگر دماغ میں سوالات کے جھکڑ ہی چلتے رہے۔

”کیا مدارس کو مذہبی تعلیم کے لیے شروع نہیں کیا گیا تھا۔ اگر مدارس کی اصلاح کر دی جائے تو ہتو وہ بھی افسر بن پائے گا اور پھر عزت قلم سے جہاد کرے گا۔“

رات بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ کیا تدبیر ہو کہ اس کا مدرسہ اسکول بن سکے۔

صبح ہوتے ہی وہ مہتمم مولانا رضوی کے دفتر پہنچ گیا۔ رضوی صاحب کے شفیق چہرے اور نرم لہجے نے مدرسے میں اس کا رہنا ممکن کیا تھا۔ ان کی توجہ اور سرپرستی سے سالک کو اپنے ہونے کا احساس ہوا، وہ اس کے لیے ایک پناہ گاہ کی طرح تھے۔

دفتر میں وہ امتحانات کے پرچوں کے موٹے موٹے بنڈل سمیٹ رہے تھے۔ کالی شیروانی اور سفید شلوار اور سرمئی داڑھی میں ملبوس اس مہربان چہرہ بزرگ نے ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

”آؤ سالک۔“

وہ دم لینے کے لیے بیٹھ گئے اور انار کے شربت کا گلاس جو نجانے کب سے پڑا تھا، اٹھا کر آہستہ آہستہ پینے لگے۔

سالک نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں انھیں کو سب کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔

"کیا آپ اپنے دفتر کے لیے ایک مددگار نہیں رکھ سکتے مولانا؟"

وہ خوش ہو کر بولے۔

"تمھارے احساس کرنے کا شکریہ۔ بجٹ کا مسئلہ ہے میاں۔ تم بتاؤ کیوں آئے ہو۔"

سالک نے علم الاختلاف کے بارے میں پوچھا۔

مولانا مسکرائے۔

علم الاختلاف اچھا، اس بارے میں کس استاد نے کس جماعت میں بتایا ہے۔

"نہیں یہاں مدرسے میں نہیں پچھلے محلے والی وہ نیلی مسجد ہے نا ان کے امام صاحب نے بتایا ہے۔"

"او اچھا مگر تم وہاں کیوں اور کیسے چلے گئے۔" انھوں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

سالک نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ عزت لے کر گیا تھا۔

رضوی کے چہرے پر تفکر کا سایہ سا چھا گیا مگر وہ اسے بتانے لگے کہ:

"علم الاختلاف مدرسہ نظامیہ بغداد میں ہی شروع ہوا تھا تکثریت یعنی سب ادیان کا مل جل کا رہنا، مقصد مثبت تھا تہذیب ادب اور منطق کے دائرے میں رہ کر اختلاف رائے کرنا دوسرے کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے آداب سکھانا تھا۔ باقاعدہ علم تھا، مگر بدقسمتی سے چند شدت پسند ذہنوں نے ایک خاص مسلک اور فرقے پر بحث کے لیے اس کے استعمال کو پسند نہ کیا۔ اختلافات بڑھ گئے جس کی وجہ سے علم الاختلاف ختم ہو گیا۔ ہلاکو خان کی بغداد کی تباہی کے بعد ہم مسلمان درست اور غلط کے چکروں میں غلطاں و پیچاں ہو گئے۔ سوچ کا سلسلہ ختم ہوا اور تکفیر کے سلسلے شروع ہو گئے۔"

پھر رضوی صاحب نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"اگر اس علم کو مدارس سے ختم نہ کیا جاتا تو مذہب اسلام میں اتنی ٹوٹ پھوٹ بھی نہ ہوتی۔"

رضوی صاحب اور بھی کہنا چاہتے تھے مگر اچانک بجلی چلی گئی۔ پنکھے کی کھڑ کھڑ کے ساتھ ان کی میز پر پڑے کمپیوٹر کا شور بھی بند ہو گیا۔ وہ پرنٹ آوٹ دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

سالک کو لگا کسی نے جان بوجھ کر بجلی بند کر دی ہے۔ مگر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

اب اس کی دنیا مدرسہ ہے اور زندگی بس یہی اک سوال ہے کہ مدرسہ کی اہمیت کیوں اور کیسے ختم ہوئی اور اس کا مدرسہ جلدی سے سکول جیسا اہم کیسے بن سکتا ہے۔

اس نے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز الحاجات ادا کی اور دل کی گہرائیوں سے مدرسے کے سکول میں تبدیل ہو جانے کی دعا مانگی۔

تجسس کا سفر گھمبیر ہوتا ہے۔

وہ پہلی بار اکیلا مدرسے سے باہر نکلا اور نیلی مسجد کی جانب چل پڑا۔

سامنے سے آتے ہوئے دس بارہ شریر سے لڑکوں نے اچانک اسے ایک دائرے میں گھیر لیا۔

ان سب نے سفید شلوار قمیص اور کروشیے کی سفید ٹوپیوں پہنی ہوئی تھیں۔

وہ اس کی سبز پگڑی کو ہاتھ لگا کر اسے تنگ کرنے لگے۔

”اوئے جنت کے طوطے، کہاں جا رہے ہو۔“

سالک کے لیے عزت کی گرفتاری کے بعد یہ دوسرا خوف زدہ کر دینے والا واقعہ ہے۔

ایک لڑکا جو بمشکل بارہ سال کا لگ رہا ہے۔ بولا:

”نعتیں گاتے ہو، کھڑے ہو کر درود شریف پڑھتے ہو۔ گناہ ہے یہ بدعتی کہیں کے۔“

دوسرا شاید اس بھی کم عمر کا ہوگا غرا کر بولا۔

”قبروں سے شفاعت مانگتے ہو، تم اور تمھارے مدرسے والے بھی گناہ گار ہیں۔“ کافر بدعتی اور کافر کہلانا اس کے لیے بے حد شرمناک بات تھی۔

مدرسے سے اکیلے نکل آنے پر بہت پچھتایا۔ لڑکوں کے نرغے کو توڑ کر سرپٹ بھاگا اور مدرسے پہنچ کر ہی دم لیا۔ بے ترتیب سانسوں سے کمرے میں داخل ہوا تو عبدالمصطفےٰ جو کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

”کیا ہوا۔“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

باہر گیا تھا۔ راستے میں کچھ لڑکوں نے مجھے تنگ کیا عجیب باتیں کیں ہیں۔ ہمارے مدرسے کو بدعتی اور نجانے کیا کیا کہا۔

سالک بتاتے بتاتے رونے لگا۔

”ارے تم نے یہ پہلی بار سنا ہے۔“ عبدالمصطفےٰ اسے پیار سے سمجھانے لگا۔

معلوم ہے کچھ لوگ تو میرا نام سن کر ہی مجھے کافر قرار دے دیتے ہیں۔ رو کیوں رہے ہو یار ان کے کہنے سے کیا تم کافر ہو گئے ہو۔ عبدالمصطفےٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے اسٹائل سے بولا۔ یہ تو صدیوں کا سلسلہ ہے۔

”۱۳۲۷ میں ایک ابن تیمیہ تھا اس کے زمانے میں تقلید اور اجتہاد پر بحث کا بازار گرم تھا۔ تقلید اور اجتہاد کے امتیاز اور خصوصیات متعین کرنے پر بھی جھگڑے ہوتے تھے۔ اس نے کتب لکھیں۔ جیسا آج تمھارے ساتھ ہوا ہے تب بھی یہی ہوتا تھا۔“

سالک کو علم الاختلاف کی اہمیت کا شدت سے احساس ہوا۔

عبدالمصطفےٰ نے اس سے پوچھا۔

”تم کو کیوں معلوم نہیں یار کہ ہمارا مدرسہ اہل سنت والجماعت کا ہے، ہمارا ایمان ہے کہ محمدﷺ حاضر وناظر ہیں۔ آپ کی ذات سے ہمیں خصوصی لگاؤ ہے۔ مگر سامنے والا دیوبندی مدرسہ ہے۔ اسی طرح شیعہ اور سلفی اور دوسرے مدارس بھی ہیں۔

سالک کا دماغ گھومنے لگا۔ ”یہ سب کیا ہے۔“

اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔

”تو کیا دیوبندی حضورﷺ کے بارے میں ہم سے کچھ الگ کہتے ہیں“

سالک نے حضورﷺ کا نام لیتے ہوئے اپنی انگلیوں پر پھونک ماری، انھیں چوما اور آنکھوں سے لگایا پھر غصے سے کھڑے ہوکر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

”مجھے کافر کہتے ہیں اور خود وہ استغفر اللہ۔ کافر تو خود ہوئے نا۔“

مگر دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ جذباتی ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں اس طرح لڑائی ہوتی ہے۔

عبدالمصطفےٰ نے سالک کو تفصیل سے بتانا شروع کیا اور دیوبندی اور بریلوی، اہلحدیث مدارس کا فرق بتاتا ہی چلا گیا۔

سالک کو یاد آیا کہ ایک دن اس کے والد نے اس کی ماں اور بہنوں کو اس بات پر بہت پیٹا تھا کہ وہ گلی میں کسی کے گھر محرم کی مجلس سننے چلیں گئیں تھیں۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ والد محرم کی نیاز کھانے سے بھی منع کرتے تھے۔ جب کہ ماں کہتی تھی ابا سے چھپ کر کھا لیا کرو بیٹا ہمارے گھر میں تو کبھی ایسے اچھے کھانے پکانے کے پیسے ہوں گے ہی نہیں کھا لو۔ ہم بھی محرم اور دوسرے مذہبی تہواروں پر محلے کے گھروں میں مزے مزے کے کھانے کھانے جاتے تھے اور اگلے محرم، شب برات، کونڈے اور گیارہویں شریف جیسے دنوں کے جلدی سے پھر آنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

اس نے سوچا۔

”کیا اس کے والد کو معلوم ہوگا کہ بریلوی دیوبندی اور دیگر مکتبہ فکر ہیں کیا۔ اس کے والد نے شیعہ سنی کے علاوہ کبھی کسی دوسرے فرقے کا نام سنا ہوگا۔“

”اچھا ہی ہے اگر ان کو یہ سب معلوم نہیں ہے۔ وہ ان سب ناخوشگوار معلومات کو حاصل کر کے کریں گے بھی کیا۔“

سالک کو بہت غصہ آ رہا تھا۔

اس نے سامنے برآمدے میں رضوی صاحب کو اپنے دفتر کو تالا لگاتے دیکھا۔ تو وہ بے اختیار ان کی طرف لپکا۔ وہ اس کا اداس چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

سالک نے ان کو دوسرے مدرسے والوں کے ساتھ مڈبھیڑ کی داستان سنائی۔

”کیا انھوں نے تم پر حملہ کیا ہے مار پیٹ کی ہے؟“

”نہیں جناب مگر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔“

جو معلومات عبدالمصطفےٰ کے پاس ہیں وہ میرے پاس کیوں نہیں ہیں آخر۔ میں تو اپنی کم علمی پر پریشان ہوتا جا رہا ہوں۔“

بیٹا ان باتوں کا بہت سے پاکستانیوں کو علم نہیں ہے۔ پہلے تو بہت ہی کم لوگ ان مکتبوں کو جانتے تھے۔ یہ جو چند دہائیوں سے مذہبی تشدد بڑھا ہے تب سے عام فرد تک ان سب مکاتب فکر کے نام پہنچے ہیں۔“

”جیسے آج تم پر حملہ ہوا ہے تو اب تم معلوم کر کے ہی رہو گے کہ آخر دونوں مکاتب فکر میں کیا فرق ہے۔ بس بیٹا باتیں اس طرح بڑھتی ہیں یا جان بوجھ کر بڑھا دی جاتی ہیں۔ اب اگر تم ریڈیو یا ٹی وی والوں کو یہ واقعہ بتا دو، وہ سب تک پہنچا دیں گے اور بات اور بڑھے گی۔ نفرت کی فضا پھیلا رہے ہیں میڈیا والے۔

رضوی صاحب اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے اور سالک سوچتا رہا۔

”نجانے کتنے گھر ہیں جہاں ریڈیو یا ٹی وی تو کیا بجلی ہی نہیں ہے۔ وہاں یہ نفرتیں کیسے پہنچ رہی ہیں پھر اور نہ جانے میرے والد کی طرح کتنے والدین ہوں گے جنھیں علم ہی نہیں ہوگا کہ ان کے بچے کن مدارس میں پڑھ رہے ہیں۔“

عزت سے ملاقات ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔

وہ آج جماعت کی طرف جاتے ہوئے وہ برآمدے سے گزرا تو اس کے کانوں سے عزت کی آواز ٹکرائی۔ وہ اس جانب بڑھا۔

اس نے کمرے میں جھانکا تو رضوی صاحب نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہاں عزت اور جلال الدین دونوں تھے کوئی تلخ سی بحث ہو رہی تھی۔

رضوی صاحب مضبوط لہجے میں فرما رہے تھے:

”اس مدرسے کو پاکستان کا بہترین دارالعلوم بنانے کے لیے دن رات ایک کیا ہے۔ یہاں سب نظریات اور نقطہ نظر کو پڑھایا جائے گا۔ نصاب میں ترمیم ہونی چاہیے۔ آپ کو اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے نوجوانوں کو شعور اور نئے زاویوں کی ضرورت ہے۔“

ہر مسلک فرقے اور مذہب کے بارے میں پڑھانے سے لوگوں میں تہذیب اور برداشت پیدا ہوگی۔ امن لانے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے۔“

”کیوں ہو رہی ہے آج امت مسلمہ تباہ۔ معلوم ہے کیوں۔“

سالک نے دیکھا جلال الدین کا لال چہرہ اس کی لمبی اور گھنی کالی داڑھی کے عکس میں پنہاں ہو گیا۔

جیسے بادل سورج کو گھیر لیتے ہیں۔

"ابن خلدون کی کتاب مقدمہ ١٤٠٦ میں لکھی تھی اس نے۔ پڑھی ہوگی جلال الدین صاحب آپ نے بھی۔"

جی۔ ابن خلدون اس نے دینی اور دنیاوی علم کو منقولہ اور معقولہ کہہ کر الگ الگ کیا ہے۔ مگر مولانا علوم کا سرچشمہ قرآن اور سنت و حدیث ہی ہیں بس۔"

جلال الدین نے جھٹ سے جواب دیا۔

"روایتی طریقوں سے الہامی کتب اور انبیائے کرام کے سنت اور فقہ کا علم دینا، آپ کے نزدیک مکمل نصاب ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ برطانوی نوآبادیاتی نظام نے جان بوجھ کر معقولات مثلاً علم الفلکیات، میڈیکل اور ریاضی اور علم الکلام وغیرہ کو دنیاوی علوم قرار دے کر مدارس سے خارج کروادیا تھا۔ نکلوایا تھا انھوں نے دین سے دنیا کو۔ تا کہ پھر کوئی فارابی، ابن سینا، ابن بطوطہ، عمر خیام ہمارے مدارس سے نہ نکل پائیں بل کہ ان کی بنائی ہوئی یونیورسٹیوں سے نکلیں۔"

مولانا جلال الدین نے زور سے گلے کو کھنگھارا۔ جیسے خود اپنے سامنے لاجواب ہو رہے ہوں۔

سالک نے چور نظروں سے عزت کے تاثرات کا جائزہ لینا چاہا جب کہ عزت، جلال الدین کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ان دونوں کی نگاہیں ملیں جن میں کچھ ناراضگی جھانک رہی تھی۔

پیریڈ کی گھنٹی بجی۔

سب مہتمم کے کمرے سے نکل کر اپنی اپنی جماعتوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

"تو مدرسے میں صرف دینی علوم ہی نہیں پڑھائے جانے چاہیں۔"

سالک کو جماعت کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خیال آیا۔

بے چینی کا سلسلہ لگن میں تبدیل ہونے لگا۔

"مدرسے کی ڈسپنسری میں کام کرنے والے مسیحا اور دوائیاں ایجاد کرنے والے سائنس دان مدرسوں کے تعلیم یافتہ بھی تو ہو سکتے ہیں نا۔ اگر نہیں تو کیوں نہیں۔"

سالک کے دماغ میں ہزاروں سوال ابھرتے ڈوبتے ابھرتے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ آسمان پر نیلے پیلے نارنجی اور سرخ رنگ ایک دوسرے میں گھل مل رہے تھے۔ میدان میں چند لڑکے چڑی چھکا کھیل رہے ہیں۔ پرندے ان کے سروں کے اوپر سے اڑ کر اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف رواں تھے۔ شام کی اذان کی گونج فضاؤں میں پھیل رہی تھی۔ تمام طلبا کھیلنے والوں کے آس پاس سے گزر کر مسجد کی طرف جا رہے ہیں۔

سالک نے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں ایک چڑیا اکیلی ہی اپنے گھونسلے کی طرف روانہ تھی۔

لڑکے کھیلنے میں مگن تھے ان کے لیے اپنا جمایا ہوا کھیل زیادہ مقدم تھا۔

مسجد میں مولانا رضوی، امام صاحب کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ سالک زانو تہہ کر کے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

مولانا نے خوش دلی سے مولوی صاحب کو بتایا۔

”مولوی صاحب یہ دوسری مسجد کے مولانا سے علم لینے جاتا ہے۔ آپ کے پاس نہیں آتا۔ کچھ تحقیق ہو رہی ہے۔“

”گھر سے تو اس برخوردار کو کوئی دوسری خواہش رکھنے کی اجازت ہی نہیں ملی ہوگی۔ کہا گیا ہوگا بس روٹی کما کر لا اور باپ کا سہارا بن۔ یہ لگن آپ کی صحبت نے دی ہوگی مولانا۔“

سالک پر جیسے ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ بے بس باپ، بوڑھی ماں اور اداس بہنیں، ناکام بھائی، واقعی وہ ماحول مجھے کیا دے سکتا تھا یہ تو مولانا رضوی ہی کی دین ہے۔ اس کا دل چاہ کہ وہ رضوی کے پاؤں چھو لے۔“

جناب کیا آپ کو لگتا ہے کہ ایک بار پھر ایسا ہو جائے گا کہ ابن خلدون، ابن رشد، ریاضی دان، سائنس دان، کیمیاگر اور شاعر مدارس سے نکلیں گے۔“

اس نے عقیدت سے پوچھا تو مولوی صاحب اٹھ کر نماز پڑھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

مولانا نے اداسی سے اپنی بوڑھی انگلیوں کے درمیان تسبیح کے دانے گھمانے شروع کر دیے۔

بولے:

”پہلے منقولات سے معقولات زیادہ اہم ہوا کرتے تھے، فلاسفی، ریاضی، کیمیا، طبیعیات اور علم الکلام بہت سے دوسرے علوم لازمی مضامین تھے اور یہ سلسلہ تینوں اسلامی سلطنتوں کے مدارس میں جاری رہا۔

کون سی تھی وہ سلطنتیں۔ سالک نے حیرت سے پوچھا:

”ترکی کی سلطنت عثمانیہ، ایران کی سلطنت صفویہ اور ہندوستان میں سلطنت مغلیہ۔“

”تو کیا وہاں کے مدارس میں دینی تعلیمات دی ہی نہیں جاتی تھیں مولانا۔“

سوال کرتے ہوئے سالک کو لگا کوئی آیا ہے ہوا میں جانی پہچانی خوشبو سما گئی تھی۔

عزت نے مولانا اور امام صاحب کو سلام کیا اور اس کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گیا۔ سالک کو اس کی گرمی اور خوشبو نے سرخ کر دیا۔

مولانا نے اس کی، اس تبدیلی کو محسوس کیا مگر ظاہر کیے بغیر بات جاری رکھی۔

”کیوں نہیں فقہ و حدیث اور سنت بھی پڑھایا جاتا تھا۔ مگر اظہار اور اختلاف رائے کی کھلی اجازت

کے ساتھ، دوسرے کے خیالات کا احترام رکھتے ہوئے وہ پڑھایا جاتا تھا۔"

"تبھی تو ایسے رنگ برنگ فرقے اور مسلک نکل آئے۔ عقل پر کامل تکیہ کر لینے کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔"

عزت کے لہجے میں غراہٹ کا عنصر چھلکا۔ سالک نے محسوس کیا کہ وہ غصے سے لرز رہا ہے۔

"اللہ کا کلام اور فقہ و حدیث اور سنت ہی علوم ہیں بس۔ باقی تو بس فنون ہیں۔ پرانے لوگ سیاست کر کے گئے ہیں۔ دین کا حق ادا کر کے نہیں گئے۔"

مولانا نے تحمل سے اس کی باتیں سنیں اور مسکرائے۔

مولوی صاحب نے تکبیر پڑھی، اللہ اکبر اور سب با جماعت کھڑے ہو گئے۔

سالک نماز کے دوران میں عزت کے رویے پر کڑھتا رہا۔

نماز کے بعد جوتوں کے ڈھیر میں اپنے جوتے اور چپل کی تلاش کے دوران میں مولانا رضوی نے عزت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"عزت میاں نئے ممالک اور معاشروں میں ان کے اصولوں کا احترام کیے بغیر اسلام کو پھیلانا ناممکن تھا۔ یہ سیکھنا بہت ضروری ہے۔ ہر مذہب اور معاشرے بل کہ ہر انسان کی ایک اپنی منطق ہوتی ہے۔ اس کا احترام ہی احترام انسانیت ہے۔ انسانی فطرت انسانیت کو بہ نسبت مذہب کے زیادہ جلدی قبول کرتی ہے۔"

مسجد کے باہر باغ میں سے گزرتے ہوئے عزت نے حسب عادت سالک ہاتھ پکڑ لیا۔

اچانک انھیں گلا کھنکھارنے کی آواز نے چونکا دیا۔

مولانا رضوی ان کے پاس سے تیزی سے گزر گئے۔

عزت نے ناگواری سے ان کی طرف دیکھا اور بولا؛

"سالک تم مولانا کے پاس زیادہ نہ جایا کرو ان کی باتیں عجیب ہیں۔ میں ان کے نظریات سے اتفاق نہیں کرتا ہوں ابھی تم نے سنا وہ انسانیت اور مذہب کو الگ الگ کہہ رہے تھے۔"

سالک خاموش رہا اس نے دل میں خود سے کہا۔

"میں عزت سے ڈرتا ہی رہوں گا اسے کبھی سمجھا نہ پاؤں گا۔"

رات بھر اس کے کانوں میں رضوی صاحب کی کھنکار اور عزت کے جملے گونجتے رہے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح فجر کے بعد وہ مولانا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

آج مولانا اسے بہت سنجیدہ اور فکر مند سے دکھائی دیے۔

انھوں نے گہری سانس لی۔ پیٹ پر سے شیروانی کی سلوٹ کو کھینچ کر سیدھا کیا۔ اور بولے:

"سالک سنو عزت نہ تمھارا ہم عمر ہے اور نہ ہی ہم جماعت۔ وہ تم سے الگ مزاج اور سوچ کا حامل

ہے۔ اس کے ساتھ زیادہ مت گھومو۔"

"امتحانات قریب ہیں۔ پڑھائی پر دھیان دو۔"

جی جی۔ سالک شرمندگی سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کیا کرے۔ سر اٹھائے یا نہ، ہاتھوں کو کہاں رکھے کہاں باندھے۔

مولانا نے اس کی حالت کا بغور جائزہ لیا اور کہا:

"میں لڑکوں کے ایسے مسائل کو اکثر حل کرتا رہتا ہوں بیٹا۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پڑھنے اور سیکھنے پر توجہ دو۔ امتحان کی تیاری کے لیے تم کو اپنے نصاب کی کتاب کے متن سے زیادہ حاشیوں اور تبصرے پر توجہ دینی ہوگی۔"

موضوع کی تبدیلی سے سالک کے انداز میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اس کے جھکے ہوئے کندھے پھر سے تن گئے اور آنکھوں میں شرمندگی کی جگہ ذہانت نے واپس لے لی۔

"جی تو کیا متن کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی ہے۔" اس نے سوال کیا۔

"موجودہ وقت کی منطق کے لحاظ سے ان پرانی باتوں اور متون کو نئے معنی دیئے جاتے ہیں تاکہ ان کی منطق زیادہ سمجھ آئے۔ متن کے مرکزی خیال کو سمجھنے کے بعد، حاشیوں تشریحات اور تبصروں کو پڑھو۔ کیوں کہ وہ متون ان کے اپنے وقت کے حساب سے لکھے گیے تھے۔"

پھر وہ مسکرا کر فخر سے بولے۔

لوگ سمجھتے ہیں مدارس میں بوسیدہ اور قدیم نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ قرون وسطی کی کتب۔ دراصل عام آدمی کو حاشیوں اور تشریح کی اہمیت کا علم نہیں ہے۔"

سالک کے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو گیا وہ خوشی خوشی اپنی جماعت کی طرف روانہ ہوا۔

اسلامی سلطنت کے حکمرانوں کو معاشروں کے ثقافتی ملاپ کے ذریعے ترقی کرنے کا گر معلوم تھا اس لیے درسگاہوں میں منقولات کے بجائے معقولات پر زیادہ زور رہتا تھا۔ تینوں اسلامی سلطنتوں میں کسی حد تک ایک جیسا ہی نصاب رائج رہا ہوگا۔ تب ہی تو سلطنتیں پروان چڑھیں اور اتنے بڑے بڑے حکمران پیدا ہوئے۔

باہر اس نے عزت کو دیکھا جو اس کا منتظر تھا اس نے سالک پر ناراضگی کی بوچھاڑ کر دی۔

"میں نے کہا ہے نا۔ کہ تم مولانا کے پاس مت جاؤ۔ تم پھر گئے ان کے پاس۔ کیوں؟"

سالک کے لیے عزت کا یہ روپ بالکل نیا تھا وہ گھبرا گیا اور کوئی جواب دیے بغیر ہی تیز قدموں سے جماعت کی طرف چلنے لگا۔

عزت اس کے پیچھے پیچھے آنے لگا اس کے قدموں اور سانس کی آواز اسے آتی رہی۔ اسے عزت

سے ڈر لگنے لگا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا جماعت کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس نے سوچا آخر وہ مولانا جیسے خضر صفت انسان کو ناپسند کیوں کرتا ہے۔

دوسرے دن مولانا نورانی شاہ نے فضل امام خیر آبادی کی کتاب المرکات الامیزانہ پر ایک درس دینا تھا یہ کتاب رسالہ الشمس فی القواعد المطقیۃ اور التہذیب فی المنطق کا خلاصہ ہے یہ رسائل تیرہویں صدی کے مدارس میں منطق اور علم فلسفہ کے مضامین کے طور پر پڑھائے جاتے تھے۔ اس درس کی تفصیلات پڑھ کر سالک پر حاشیہ تشریح اور تبصرہ کی اہمیت مزید واضح ہوئی

سب بڑے کمرے میں جمع مولانا نورانی شاہ کے منتظر تھے۔ سالک کمرے میں داخل ہوا تو عزت پہلے سے وہاں موجود تھا اس کے قدم عزت کو دیکھ کر لڑکھڑا سے گئے۔ وہ اس کے پاس جانے کے بجائے پیچھے آخری رو میں جا کر بیٹھ گیا۔

عزت نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس کی کی آنکھوں میں سوال تھا۔

اتنی دور کیوں بیٹھے ہو۔

درس شروع ہو چکا تھا سب شاہ نورانی کی طرف متوجہ تھے۔ وہ ارسطو کے فلسفہ استدلال اور قیاس کے بارے میں بتا رہے تھے۔

درس میں ایک مقام پر کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کے لیے دو مختلف آرا کے متعلق بات آئی۔

تو سالک اپنے اندر سے پھوٹنے والے سوال کو نہ روک سکا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سوال کی اجازت چاہی۔ مگر شاہ نورانی نے اپنی بات جاری رکھی۔

کئی لڑکوں نے سالک کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ مگر وہ پھر بھی کھڑا ہو گیا اور پوچھنے لگا۔

جناب ہم بھی مسلمان ہیں اور فوج بھی، ہم بھی پاکستانی ہیں پھر یہاں فوج مدرسوں میں آ کر کیوں گرفتاریاں کرتی ہے۔ کیا آپ اس کو کسی اختلاف کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ایک مذہب پر مختلف آرا رکھنے والوں کا آپس میں عدم برداشت۔

شاہ صاحب کو اس کی یہ حرکت اچھی نہ لگی انھوں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے اسے غصے سے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا حکم دیا۔

وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔

لیکچر ختم ہوتے ہی عزت تیزی سے اٹھ کر چلا گیا اس کا ہر قدم اس کے اندر کی تلملاہٹ کو ظاہر کر رہا تھا۔

مگر نورانی شاہ نے سالک کو اشارے سے پاس بلایا اور نرمی سے بولے۔

”دیکھو سالک ایسے سوال سب کے سامنے نہیں پوچھتے۔ ہر ملک میں حکمرانوں اور عوام کی منطق

میں فرق ہوتا ہی ہے۔ خاص طور پہ ہمارے جیسے ممالک میں جہاں کوئی بھی نظام مکمل نہیں ہے۔ کوئی طویل المیعاد منصوبہ نہیں ہے۔ ایک حکمران دوسرے کے بنائے ہوئے کام بگاڑتا ہے۔ پرانے روایتی طریقہ تعلیم کو فرسودہ کہہ کر نکال تو دیا تھا مگر اس کی جگہ میکاولے کا نظام تعلیم بھی تو سب پہ نافذ نہ کر واس کے۔ تعلیمی نظام قوم کی بنیاد ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں سرکاری، پرائیوٹ، اسلامی، الگ الگ بنیادیں ہے یہاں تفرقہ تو ہوگا۔ اب یہ باتیں میں اپنے خطبے میں تو نہیں کہہ سکتا ہوں۔"

شاہ نورانی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور چلے گئے۔

ان کے جانے اور عزت کے جانے کے انداز میں کتنا فرق ہے۔

ایک سوال لے کر چلا گیا دوسرا سوال دے کر۔

جب وہ باہر نکلا تو مدرسے کی مطبخ میں کام کرنے والا چھوٹا لڑکا، اس کے پاس مولانا رضوی کا بلاوا لایا۔ سالک کو اس بچے کے میلے کپڑوں اور ننگے پاؤں کو دیکھ کر اپنا چھوٹا بھائی یاد آیا۔

"زندگی کتنی مشکل ہے۔" سالک اندر تک لرز گیا۔

وہ رضوی صاحب کے دفتر پہنچا تو رضوی صاحب الماری سے کچھ رجسٹر نکال کر جھاڑ رہے تھے۔

انھوں نے سالک کو بتایا کہ کل اساتذہ کی سالانہ میٹنگ ہے۔ اسے چائے کا انتظام کرنا ہوگا۔

سالک نے تابعداری سے دل پہ ہاتھ رکھ کر کہا کہ جی جناب ہو جائے گا اور وہیں کھڑا رہا۔

مولانا نے رجسٹر سے نظر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے جلدی سے سوال کیا۔

"جناب اسلامی سلطنتوں کے زوال کے بعد مدارس کا حال کیا ہوا۔ نصاب میں کیا تبدیلیاں آئیں؟"

مولانا نہایت شفقت سے مسکرائے اور سر ہلا کر کہا۔

"دوسرا ارسطو بننا چاہتے ہو میاں۔۔۔۔؟"

اور کرسی پہ بیٹھ کر نہایت سنجیدہ لہجے میں اسے کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

جس سوال کا جواب تم کو چاہیے وہ آرام سے تو نہیں ملے گا۔ کم عمر ہو، ابھی بہت وقت ہے تمھارے پاس۔ مجھے لگتا ہے تم کچھ کر جاؤ گے میاں۔ چلو مختصر سا سن لو۔۔۔۔"

"ایک تو تھا بغداد کا مدرسہ نظامیہ جو ہلاکو خان کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔ مگر ۱۶۷۷ء سے ۱۷۴۸ء تک ایک ملا نظام الدین تھا لکھنو ہندوستان میں فرنگی محل میں رہتا تھا۔ اس ملا نظام الدین نے ایک نصاب بنایا تھا۔ جو ان کے نام کی مناسبت سے درس نظامی مشہور رہا۔ بہت ہی اچھا نصاب تھا وہ مدارس کے لیے۔ آج کل کے مدارس دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بھی یہی نصاب پڑھا رہے ہیں جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ نصاب پڑھایا جا رہا ہوتا تو مدارس کا یہ حال ہوتا بھلا؟"

مولانا نے برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔

سالک نے مڑ کر دیکھا۔

مدرس جلال الدین کلف سے اکڑے ہوئے سفید شلوار قمیص میں ملبوس کہیں سے واپس آرہا تھا۔ اس کے پیچھے دو افراد تحائف کے ٹوکرے اٹھائے اس کے کمرے کی جانب جا رہے تھے۔ یقیناً وہ کسی نکاح، ختنے یا عقیقے کی تقریب کی دعا پڑھ کر آئے تھے۔

سالک کو معلوم تھا کہ مدرسے کے اکثر اساتذہ اس قسم کی مختلف تقریبات میں جانے کو وطیرہ بنا چکے ہیں۔

جب سالک اپنے کمرے میں آیا تو عبدل المصطفٰی لڑکوں کو اخبار کی کوئی رپورٹ، جس میں حکومت اور مدارس کے منتظمین کے درمیان اختلافات کا ذکر تھا پڑھ کر سنا رہا تھا۔

سالک بھی سنتا رہا۔

رپورٹ ختم ہوئی تو عبدل نے کہا کہ وہ لائبریری جا رہا ہے۔

سالک بھی ساتھ چل پڑا راستے میں سالک نے کہا۔

"تم نے سنا آج شاہ نورانی نے ارسطو کی بات کی کہ حکمرانوں اور عوام کی منطق الگ الگ ہوتی ہے۔ اس رپورٹ میں ایسا ہی کچھ نظر آیا ہے۔"

"وقت نہیں بدلتا ہے شاید، صرف زمانہ تبدیل ہو جاتا ہے۔" عبدل المصطفٰی نے اقرار میں سر ہلایا۔

"مجھے معلوم کرنا ہے کہ مغل سلطنت کے زوال کے بعد مدارس کے ساتھ کیا ہوا؟ اور درس نظامی کا کیا بنا؟"

عبدل المصطفٰی نے سالک کو بتایا۔

آج کل پاکستان میں ۴۰ ہزار مدارس ہیں، جن میں بیس لاکھ لڑکے پڑھ رہے ہیں۔ لڑکیوں کی تعداد انکے علاوہ ہے۔"

"لڑکیوں کے مدارس؟"

"ہاں لڑکیوں کے لیے بھی مدرسے ہیں۔ ان کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔" عبدل نے بتایا۔

"کاش والد نے بہنوں کو مدرسے ہی بھیج دیا ہوتا۔ کیوں شادی کے انتظار میں گھر میں بیٹھا رکھا ہے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے ان کی روٹی کے لیے، اوباشوں کی بری نظر پڑ جانے کے خوف سے بھی نجات مل جاتی۔ میری بہنیں انسان ہیں حیوان تو نہیں، زندگی صرف روٹی ہی تو نہیں مانگتی نا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

سالک کا دل بہنوں کے دکھ سے بھر گیا۔

"کیا دینی رجحان کا بڑھ رہا ہے؟"

سالک نے پوچھا تو عبدل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

سالک نے حیران ہو کر اس کو ہنستے دیکھا۔

”یہ بیان ہر سیاست دان دیتا اور اس سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مدارس کی تعداد بڑھنے کی وجہ غربت ہے بس۔ دینی رجحان نہیں۔“

لائبریری میں ان دونوں نے مل کر کتابیں تلاش کیں۔

اس نے دیکھا کہ عزت بھی ایک شیلف کے پاس کھڑا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہے۔

”یہ کب آیا۔ کہیں یہ میرا پیچھا تو نہیں کر رہا؟“ سالک کو ڈر لگا۔

وہ اس کی طرف آیا۔

میز پر بکھری کتب دیکھ کر پوچھا۔

”مل گیا تم کو اپنا وہ خواب والا مدرسہ کہ نہیں۔“

پھر طنز سے ہنسا۔ ”وہی جو تم نے اور میں نے مل کر بنانا ہے۔“

عبدل ان دونوں سے بے خبر کتابوں میں گم تھا۔

اچانک اونچی آواز میں کہا۔

”مل گیا۔“

لائبریری میں موجود سب چونک کر عبدل کو دیکھا۔ سالک اور عزت کتاب پر جھک گئے۔

”جب ہندوستان میں نظام وکٹوریا یعنی برطانوی استعماریت مسلط ہوئی تو بڑے مدارس بند ہو گئے یا کروا دیے گئے۔“

”کیوں کہ انگریزی سامراجی نظام کو یہاں پر ایک نیا تہذیبی نظام نافذ کرنا تھا۔“

”جیسے ان سے پہلے تو ہندوستان میں جنگلی اور جہلا بس رہے تھے۔“ عزت نے حقارت سے کہا۔

عبدل نے پڑھا:

”نئی تہذیب سکھانے کے لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کا رواج ڈالا گیا۔ خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا گیا۔“

عزت نے بیزاری سے سر ہلا کر کہا۔

”ایک عالمی اخلاقی نظام کی آڑ میں یہاں کے معاشرتی ڈھانچے کو بھی توڑنا تھا۔“

پھر وہ ایک کتاب اٹھا کر جانے لگا تو سالک نے اس کی کتاب کا عنوان دیکھا Clash of Civilization۔

عزت کے جانے کے بعد سالک کو بیت الخلا جانے کی حاجت محسوس ہوئی۔

حاجت کے بعد طہارت کرتے ہوئے۔ اسے ہندوستان کو جدید بنانے والی بات یاد آئی اس کی

بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی اور اسے عبدل المصطفےٰ کے تہذیب اخلاق سے پڑھ کر سنائے ہوگئے کچھ مضامین کا خیال بھی آیا۔ وہ مسکراتا ہوا واپس کتب خانے پہنچا۔

تو عبدالمصطفےٰ میکاولے کے تعلیمی نظام سے تجدید تہذیب کرنے کے بارے میں بتانے لگا:

”مگر کس تہذیب کی تجدید؟“

سالک نے سوچا۔

اسے یاد آیا جب اس نے عزت سے کہا تھا کہ وہ دونوں مل کر دنیا کی سب سے اچھی یونیورسٹی کے معیار کا مدرسہ بنائیں گے، جس میں دنیاوی علوم کو اہمیت دی جائے گی تو عزت نے کہا تھا ہمارے پاس اپنا نظام موجود ہے ہم پہلے مدارس کے آپس کے اختلافات دور کریں گے۔ جو صرف ایک شریعت کے نفاذ سے حل ہو سکتے ہیں۔ سنو شریعت اہم ہے معقولات نہیں۔

دوسرے دن میٹنگ میں سارے مدرس و معلم جن کی تعداد پچاس تھی موجود تھے۔

مولانا رضوی نے سالک کو مدرسے کے ماہنامہ رسالے کا ایک بنڈل جو آج ہی پریس سے آیا تھا دیا، جو اس نے اساتذہ میں تقسیم کر دیے۔

اس میں مدرسے کو ملنے والی امداد کی تفصیلات کی رپورٹ تھی جو زکواۃ، صدقہ وخیرات اور زکواۃ آرڈیننس ۱۹۸۰ کے تحت مدارس کو ملنے والی حکومت کی امداد پر مشتمل تھی۔

مولانا رضوی نے بتایا کہ اس سال کی آمدنی میں کمی ہوئی ہے۔ جب کہ طلبا کی تعداد اور مہنگائی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

”اگلا مہینہ زکواۃ کا ہے۔ ہمیں مالی مشکلات کے بحران سے بچنے کے لیے سنجیدگی سے کوئی لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا۔“

”کہیں ایسا نہ ہو دوسرے اضافی اخراجات اور باورچی خانے کا خرچ پورا کرنا ہی مشکل ہو جائے۔“

سالک کو ایک دم مدرسے کا بدذائقہ کھانا جو اکثر دال، پیاز روٹی اور کبھی کبھار پتلے شوربے والے گوشت کے سالن پر مشتمل ہوتا ہے یاد آیا اور اس کا دل متلانے لگا۔

اساتذہ نے مشورے اور تجاویز دینی شروع کیں کہ امداد کو کیسے بڑھایا جائے جو صوفی علی قادری جو مولانا کے سکریٹری تھے ضبط تحریر کرتے جا رہے تھے۔

ایک مدرس نے عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر بھی زیادہ گوشت اور کھالیں جمع کرنے کے لیے نیا منصوبہ بنانے کی بات کی تو سالک کو گوشت کے وہ پکوان یاد آئے جو سال میں ایک بار کھانے کو ملتے ہیں۔ سالک کو بھوک کا احساس ہونے لگا۔

ایک مدرس نے 1960 میں وقف پر حکومت کے قابو کر لینے کا بتاتے ہوئے حکومت اور مدارس

کے درمیان چپقلش کا ذکر کیا اور مدارس میں سیاست اور مالی بے اعتدالیوں کے بارے میں بھی بتایا۔

سالک نے دیکھا کہ جلال الدین کا رنگ اڑ سا گیا ہے۔ وہ اپنے دائیں بائیں بیٹھے دو درمیانی عمر والے اساتذہ سے، جن کو سالک بالکل نہیں جانتا تھا کھسر پھسر کرتا رہا۔

جب ایک مدرس نے بتایا کہ سیاسی پارٹیاں مدارس کے لوگوں کو بھرتی کرتی ہیں۔ ان کو بسوں میں بھر کر شہروں میں توڑ پھوڑ کرواتی ہیں جس کی وجہ سے اکثر تاجر حضرات کو نقصان ہوتا ہے اس لیے بھی وہ مدارس کو امداد دینے سے کترانے لگے ہیں۔

جلال الدین نے انتہائی غصے سے کہا۔ ”یہ سب جھوٹ ہے کہ سیاسی پارٹیاں مدارس کے لوگوں کو بھرتی کرتی ہیں۔“

”اگر مدارس کے کچھ طلبا جلسوں میں چلے جاتے ہیں تو وہ ان کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔“

ایک مدرس نے کہا کہ مدارس کا نظام اور تعلیم کا معیار گرنے کی کئی وجوہات ہیں مگر بڑی وجہ غربت ہے۔ اکثر ماں باپ اپنے بچوں کو روٹی اور کپڑے مہیا نہیں کر سکتے۔

”تعلیم تو دور کی بات ہے۔“

سالک کے کان شرم سے سرخ ہو گئے۔

ملک بھر کے سکولوں سے نکالے ہوئے بچوں کی بڑی تعداد بھی مدرسوں میں بھیج دی جاتی ہے۔ گویا مدارس درس گاہیں نہیں بلکہ معاشرے کے غربا کو سنبھالنے کے ٹھکانے ہیں۔

کوئی بیچ میں سے بولا:

”چلیں جی مدارس اچھی درس گاہیں نہ سہی کم از کم غریبوں کی پناہ گاہ تو بن رہے ہیں۔“ سب ہنسنے لگے۔

نورانی شاہ نے فکرمندی سے کہا۔

” حکومت سے زیادہ تو عوام کی خدمت ہم کر رہے ہیں۔ پھر بھی برے ہم ہی کہلاتے ہیں۔ ہمارے مدرسے میں کچھ جرائم پیشہ افراد آ گئے ہیں۔ پچھلے مہینے رینجرز کا یہاں آنا بہت فکر انگیز بات ہے۔“

جلال الدین نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مدرس کو کہنی ماری۔

مولانا رضوی نے کہا کہ اس میٹنگ کا دوسرا نقطہ بحث بھی یہی ہے۔ آپ کی تجاویز چاہئیں۔

جلال الدین نے فوراً پوچھا: ”مولانا رضوی آپ کی اپنی رائے کیا ہے؟“

”ہم کو پولیس کی مدد لینی چاہیے اور مشکوک عناصر کو حوالے پولیس کرنا چاہیے۔“ مولانا بولے۔

سالک عزت کے لیے بے چین ہو گیا اس کا دل ڈوب گیا۔

ایک جہاں دیدہ بزرگ فرمانے لگے۔

’’مولانا رضوی کس کس کو پولیس کے حوالے کرو گے۔ کس کس کو پولیس سنبھالے گی، کہ صاحب تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے۔ یہ تو اب گھر گھر کے مسئلے ہیں۔ اپنے گھروں کے مسائل خود حل کیجیے۔‘‘

’’اچھا تو کیا اپنی پولیس خود بنالیں جامعہ حفصہ کی طرح۔‘‘

ایک بار پھر محفل میں قہقہے لگے۔

لیکن وہ بزرگ سنجیدہ ہی رہے کہنے لگے۔

’’میرے پاس ایک تجویز ہے۔ سنیے ملک کے تمام مدارس کی اپنی مساجد اور ان سے منسلک مساجد کی تعداد تقریباً دس لاکھ ہے۔‘‘

کمرے میں اب سکوت کا وقفہ تھا۔

سوائے جلال الدین کے کسی نے پہلو نہ بدلا۔

’’ان مساجد کے ذریعے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ کنٹرول، اصلاح، تعلیم و تربیت بھی۔‘‘

مولانا رضوی بولے:

’’یہ تجویز نئی نہیں ہے۔ بہت بات ہو چکی ہے اس پر، مگر یہ کام نہیں ہو سکتا اس کی ایک نہیں ہزاروں وجوہات ہیں۔‘‘

سب سے بڑی وجہ معاشرتی بے اعتباری ہے۔ مسلکی اختلافات کو ہوا دی جاتی ہے۔ ہر مسلک کا ایک نیٹ ورک بن چکا ہے۔ اجتہاد کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اختیارات کی جنگ چل رہی ہے۔ مدارس خود معقولات کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔‘‘

’’ان کے فتووں کا دام لگا ہوا ہے نا۔‘‘ ایک معلم نے افسوس سے کہا۔

سالک نے سوچا مولانا رضوی نے جتنے مسائل بھی گنوائے ہیں ان کا حل اس ایک علم اختلاف ہو سکتا ہے۔ اور عزت کے ایک شریعت کے نفاذ کا حل بھی اسی سے ہو گا بس۔

مولانا رضوی نے کہا۔

ہمارے نوجوانوں کو تعلیم اور روزگار کی اور ترقی کی ضرورت ہے۔ ایڈمنسٹریشن، بیوروکریسی تک ہمارے مدارس کے طلبا پہنچ سکتے ہیں اگر یہاں کے نصاب کو وقت کی ضرورت سے ہم آہنگ کر دیا جائے گا تب۔ برطانوی سامراجی نظام کا پہلا شکار مدرسے تھے۔ ہم کو صرف دین پر لگا دیا اور اپنے سکولوں سے دین کو نکلوا دیا۔ جہاں بھی وہ گئے وہاں کی معاشرت کو بانٹ دیا اور وکٹوریا راج قائم کیا جناب۔‘‘

سالک نے اپنے خواب کے مدرسے کا تصور کرنا شروع کر دیا۔

اسے لگا جیسے وہ الغزالی ہے۔ وہ ملا نظام الدین ہے۔ اس کے مدرسے کے فارغ التحصیل علم افراد دنیا میں نت نئی ایجادات کر رہے ہیں۔ شاعری کر رہے ہیں۔ مشہور فلاسفر ہیں۔

وہ بری طرح چونک گیا۔

جب کسی نے کہا کہ مدرسے سے فارغ التحصیل طلبا تو بس مدرس یا امام مسجد بنتے ہیں یا فوج میں سپاہی اور صوب دار بن جاتے ہیں۔

ایک جوان اور دل جلے مدرس نے کہا۔

"حالاں کہ اسٹریٹ پاور ہمارے ہاتھوں میں آ رہی ہے۔"

سالک میٹنگ ختم ہونے کے بعد کمرے میں آ کر ساتھیوں کو میٹنگ کی روداد سناتا رہا۔

عبدالمصطفٰے نے اسے بتایا کہ ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ والی اسلام مائزیشن پالیسی میں یہ ہے کہ جو مدارس حکومت سے تعاون کریں گے وہی حکومت کی امداد سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ مگر دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ مشرق وسطٰی میں کام کرنے والے افراد مدارس کو کافی امداد دیتے ہیں۔ جو حکومت کی امداد سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اس لیے مدارس میں حکومتی قوانین کو کوئی نہیں مانتا ہے۔ ہر مدرسہ اپنی من کرسکتا ہے۔

سالک تھک چکا تھا۔ جلد ہی سو گیا۔ مگر پھر آدھی رات کو اسے بے چینی اور وہم ہونے لگے۔ اسے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

اس نے باہر جھانکا۔ دالان میں پانچ چھ افراد بڑے گیٹ کے قریب کھڑی ایک گاڑی کی طرف جا رہے ہیں۔ سب سے پیچھے والے کی چال سے، اسے لگا جیسے وہ عزت ہے۔ اور سب سے آگے جانے والے کے ہاتھ ہلانے کا انداز جلال الدین جیسا تھا۔ سب تیزی سے گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی چلی گئی۔

اگلی صبح نماز اور دعا پر جلال الدین اور عزت دونوں غائب تھے۔

مگر ناشتے کے بعد جلال الدین وہاں موجود تھا جہاں حسب معمول عبدالمصطفٰے اخبار کی خبروں پر تبصرے کرتا ہے۔ اس نے ایک خبر پڑھی کہ آج رات پھر ایک فوجی چوکی پر خودکش حملہ ہوا ہے۔

سالک کے ہوش اڑ گئے اس نے گھبرا کر اس جانب دیکھا جہاں جلال بیٹھا تھا۔ وہ جگہ اب خالی تھی۔

سالک لڑکوں کو دھکیلتا ہوا ہوسٹل کی طرف بھاگا۔ اسے عزت کے کمرے میں جا کر دیکھنا تھا۔ وہ کہاں ہے۔

اسے باہر والے گیٹ کی جانب سے عزت واپس آتا دکھائی دیا۔ وہ تھکا ہوا اور پریشان تھا۔

سالک نے اسے دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا وہ سر جھکائے اس کے سامنے سے گزرتا ہوا ہوسٹل کی طرف چلا گیا۔

سالک ٹھنڈی آہ بھر کر کتب خانے چلا آیا۔ جہاں عبدالمصطفٰے اس کے لیے کتابیں تلاش کر رہا تھا۔

اس نے سالک کی اداسی دور کرنے کے لیے ہنس کر کہا۔

"بھائی پیسے کی کمی اور سیاست کی زیادتی تم کو کچھ نہ کرنے دے گی۔ کیوں دکھ پال رہے ہو مدرسہ

نظامیہ بنانے کے خواب میں۔ سب دھرا کا دھرا رہ جائے گا سمجھے۔۔۔‘‘

مگر سالک اس وقت بس عزت کے بارے میں سوچتا رہا کہ آخر وہ کن لوگوں کے ہاتھ اور کیوں کھلونا بنا ہوا ہے۔

اب تو وہ ہمت کر کے اسے ضرور سمجھائے گا کہ جس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے ایک عالمی معاشرہ گلوبل وولیج کے نام پر سیاست شروع کر رکھی ہے بالکل اسی طرح اسلحہ فروشوں نے ایک اسلام کا شوشہ چھوڑ کر مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا ہے۔ اسلحہ بیچ کر پیسہ کما رہے ہیں اور کچھ سیاست دان تم جیسے معصوم اور دکھی افراد کو ہتھیار پکڑا کر اپنے اپنے مخالفین کو مروا رہے ہیں۔

دوسرے دن وہ اس کو تلاش کرتا پھرا مگر وہ کہیں نہ ملا۔

شام کو کتب خانے پہنچا تو کتب خانے کے منتظم نے، اسے اس کے والد کا خط دیا۔

اس خط میں اس کے والد نے لکھا تھا کہ بڑی بہن کی شادی کی عمر تو گزر رہی گئی پر درمیان والی کے لیے ایک اچھا رشتہ آیا ہے۔ وہ بارات کا اچھا کھانا اور جہیز کی فرمائش کر رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہاں سے اتنے پیسے لاؤں کہ کم از کم ایک بیٹی کو اپنی زندگی میں بیاہ جاؤں۔ تمھارا بوجھ کم کر سکوں۔ مگر میں ایسا نہیں کر پاؤں گا۔ مجھے معاف کر دینا۔

وہ یہ پڑھ کر گم سم ہو گیا۔ اس کا دل تڑپ گیا کہ آخر وہ کس طرح اپنے بے بس باپ کی مدد کرے۔ پیسہ کہاں سے لائے۔

منتظم نے سالک کی حالت دیکھی تو وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی کمر کو تھپکنے لگا۔

سالک نے مدہوشی کی سی حالت میں اس سے پوچھا۔

’’کیا آپ نے اس لائبریری کی سب کتب پڑھی ہیں۔‘‘

منتظم نے کہا ساری تو نہیں پڑھیں مگر تقریباً آدھی۔

کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ نے پڑھا ہے کہ اکیلی خواتین جن کا کوئی محرم نہ ہو۔ یا محرم باوجود کوشش کے اس کے لیے روٹی اور چھت مہیا نہ کر سکے تو پھر ایسی خواتین اور بیٹیاں کیا کریں۔

منتظم اس اچانک اور پیچیدہ سوال سے گھبرا گیا۔ بولا:

’’باپ پر بوجھ ہو تو باپ کو چاہیے کہ اس کا نکاح کر دے۔ بلکہ حکم تو یہ ہے جلد سے جلد نکاح کر دو۔ بس نکاح ہی حل ہے عورت کے مسائل کا۔ مگر وہ تو جہیز کے اور بارات کے کھانے کے بغیر نہ ہو پائے گا۔ کوئی اور حکم؟‘‘

منتظم لاجواب تھا دبی زبان میں بولا:

آج کل کی پڑھی لکھی لڑکی تو جاب کر۔۔۔

میں آج کل آج کل کی نہیں، حکم الٰہی کی بات کر رہا ہوں۔ شرعی حکم کی۔ سالک نے بے بسی سے مچل کر پوچھا پھر بولا:

"چلیں فرض کریں آج کل کی لڑکی ہے مگر وہ پڑھی لکھی نہیں ہے اور کوئی محرم بھی نہیں ہے۔ وہ کیا کرے وہ کہاں جائے؟"

منتظم خاموش تھا۔ اس کی کتابیں خاموش تھیں۔

سالک رات بھر بستر میں چھپ کر روتا رہا۔

صبح وہ اسی ستون کے پیچھے جا کھڑا ہوا جہاں پر دو سالوں سے عزت کو جھانک کر دیکھا کرتا تھا۔

وہ سامنے سے آیا۔ آج وہ ناراض سا تھا اس نے اس کی طرف دیکھا۔ مگر مسکرایا نہیں اور نہ ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

سالک اس کی طرف بڑھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

عزت حیران ہوا اور اس نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے گلے لگا لیا۔

سالک کو اس کی پناہ میں سکون ملا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

اور اس نے اسے وہ خط پکڑا دیا۔ عزت نے خط پڑھا اس کے چہرے پر دکھ اور غصے کے آثار نمایاں ہوئے۔

اس نے ہونٹ دانتوں میں دبا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"اس دنیا پر ظالموں کا راج ہوتا جا رہا ہے معلوم ہے کیوں۔ وہ اس کے بہت قریب آ کر بولا۔ کیوں کہ ہم بزدل ہو گئے ہیں ان کا مقابلہ نہیں کر رہے ہیں۔"

اس نے سالک کا ہاتھ زور سے دبایا اور سرگوشی کی۔

"اگر تم ہمت کرو تو جلد ہی جہیز کا انتظام ہو جائے گا اتنا ملے گا کہ تینوں کے جہیز بن جائیں گے۔ آج رات مجھے ایک جگہ جانا ہے۔"

سالک جو وہ سن رہا تھا اسے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنی جلدی سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر کس قیمت پر۔ کیا کر کے؟ وہ سارا دن اسی کشمکش میں رہا۔ شام کو نہ وہ کتب خانے گیا اور نہ ہی نماز کے لیے مسجد جانے کی ہمت ہوئی۔

آدھی رات کو نیم خوابیدگی کی حالت میں سالک کمرے سے نکلا ہے اور عزت کے کمرے کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔

☆☆☆☆

محمود احمد قاضی

بُکل دے وچ چور

کسی نے آ کر چیختے ہوئے بتایا۔ بڑے چوک میں نصب اطلاعی تختے پر کچھ بہت ہی عجیب لکھا ہے۔

کچھ دیر تک تو لوگوں کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں اور جب آیا تو سب چوک کی طرف بھا گے۔ وہاں پہلے سے ہی کچھ لوگ ہجوم کر چکے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کے کندھوں سے اوپر ہو کر اچکتے ہوئے آگے کھڑے ہوؤں کی بغلوں میں سے جھانکتے ہوئے اس طرف دیکھ رہے تھے جدھر سب کی نگاہیں مرکوز تھیں۔

اطلاعی تختے پر لکھا تھا:

جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ کچھ عرصے سے ہمارے قصبے میں ہر طرف چکراتے پھرتے، ہر چیز میں منہ مارتے کتوں کی بھرمار ہو گئی ہے۔ یہ ایک پریشان کر دینے والی بات ہے اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کتوں سے نجات حاصل کر لی جائے۔ اس سلسلے میں بلدیہ ہذا کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ آج ہی اپنے گھروں سے نکلیں اور اس کتا مار مہم میں بلدیہ کے سٹاف کا ساتھ دیں۔ آپ میں سے جو کوئی بھی کسی کتے کو مار کر لائے گا اسے شکریے کے ساتھ یک صد روپیہ انعام بھی دیا جائے گا۔

مہتمم بلدیہ

سب یہ اشتہار پڑھ کر مسکرائے بھی اور کسی قدر لالچ میں بھی آئے کہ ایسا کرنے پر سو روپے کی رقم بھی ان کو ملنے والی تھی۔ چناں چہ سب ہی کچھ سوچ کر تھوڑا رک کر اس مہم پر نکل پڑے۔

یہ قصبہ بڑا پر سکون اور خواب آور ماحول والا وسیب رکھتا ہے۔ یہاں دنگا فساد نہیں ہوتا، چاقو چھری نہیں چلتی، گولی چلنا تو خیر بعید از قیاس چیز ہے۔ یہاں پر کسی ایک کی خوشی سب کی خوشی ہوتی ہے اور کسی ایک فرد کا غم سب کا سانجھا ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ خوراک اور دوائیوں میں ملاوٹ نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کو کرنے دیتے ہیں، امن پسندوں کے لیے یہاں آرام ہی آرام ہے، بروں کے لیے ادھر کوئی جگہ اور ٹھکانہ نہیں۔ یہاں اونچی آواز میں بات کرنا بد تہذیبی کی علامت ہے۔ یہاں عورتوں کو نہ تو جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے اور نہ ہی انھیں گھورا جاتا ہے۔ یہاں بچوں سے شفقت اور بڑوں سے یگانگت سے پیش آیا جاتا ہے۔ شہر کے عین درمیان میں بڑے چوک کی داہنی طرف ایک وسیع و عریض پارک ہے۔ یہاں شام کو بچے بڑے سب سیر کو آتے ہیں۔ لوگ گھروں سے باہر نکلتے ہوئے اپنے دروازے بند نہیں کرتے بل کہ کھلے چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ یہاں آج تک کسی کی کوئی بھی چیز چوری نہیں ہوئی اور نہ ہی شاید آئندہ کسی کو کچھ چرانے کا خیال آ سکتا ہے۔ آلو،

گوبھی، مٹر، بکری کا گوشت، مرغی کی ٹانگ ہر گھر سے دوسرے گھر میں بھیجی جاتی ہے، عورتیں ہنڈیا میں کھانا پکاتے وقت ایک پیالی پانی زیادہ ڈالتی ہیں یا پکانے والی چیز کی تھوڑی سی مقدار زیادہ کر دیتی ہیں تاکہ دوسرے بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

حمید کی قمیص رشید پہن سکتا ہے، اسی طرح جمیلہ کا فراک کسی دوسری ثریا کے بدن کی زینت بن سکتا ہے۔ بچے بہلو کی ٹوپی کسی دوسرے موٹو کے سر پر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ہر ایک، ہر ایک کے ساتھ اپنی زندگی، اپنے خواب، اپنی خواہشات شیئر کر سکتا ہے اور کرتا ہے، ہر ایک شخص یہاں دوسرے کے سامنے عیاں ہے جیسے کہ دن کو گرم کرتے سورج کی روشنی، یہاں رات صرف سونے کے لیے ہوتی ہے۔ رات کو نو بجے کے بعد سب سو جاتے ہیں، یہاں چوکیدار تو ہوتا ہی نہیں کہ ادھر اس کی ضرورت کبھی محسوس ہی نہیں کی گئی۔ سبزی کی دکانیں، گوشت والے، لوہار، ترکھان، آرا مشین والے، مستری، موچی، نائی، دھوبی، ماشکی، بینڈ بجانے والے، سب یہاں ایک ہی جگہ دستیاب ہیں۔ یہاں کا اکلوتا بینک سب کی ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ محکمہ ڈاک و تار والے بھی ادھر موجود ہیں۔ سول ہسپتال بھی ہے، ایک تنہا اداس، خاموش ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ قدرے دھیمے شور سے بھرا ایک بسوں کا اڈا بھی ہے۔ یہ شہر ایک قدرتی اور فطری ابھار کے اوپر آباد ہے۔ اس کے چاروں طرف گھنے جنگل ہیں، وہاں لومڑیاں اور گیدڑ رہتے ہیں، پرندے بھی وہاں ہیں۔ ان جنگلوں میں موجود ایک جھیل کے گرد اُگے پھولوں سے ایک بھینی بھینی خوشبو ہر وقت اڑتی رہتی ہے جو کہ اس قصبے کے باسیوں کو ہوش میں بھی مدہوش کیے رکھتی ہے۔ لوگ اسے محبت کی خوشبو کہتے ہیں۔ جنگلوں سے پرے اترائی ہے، ڈھلان ہے۔ وہاں دھند ہے، ٹھنڈ ہے، گیلا پن ہے جب کہ ادھر قصبے کی فضا معقول ہے۔ اسی لیے یہاں کے اہل نگر بھی معقول طبیعتوں والے ہیں۔ قرینے، قاعدے اور ترتیب سے زندگی گزارنے والے۔ قصبے کے اسی سبھاؤ کے درمیان یہ خبر ہوا کہ کندھوں پر سوار ہو کر سب کے ساتھ ہو لی تو لوگ ایک دوسرے کے سنگ ہوئے۔ سب گھروں سے نکل پڑے۔ ایک ہی دھن ان کے من میں سمائی تھی کہ کسی نہ کسی طرح انھیں آج کے آج ہی کتوں سے نجات حاصل کر لینی ہوگی۔ سو بچے، عورتیں، مرد، بزرگ، جوان، دکان دار، اکلوتے بنک کی برانچ کے لوگ، ڈاک تار والے بابو، ڈاکیا، سبزی فروش حتیٰ کہ سب ہی پیشوں سے متعلق لوگ اس وقت باہر نکل آئے تھے۔ وہ قصبے کی مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ قصبہ جو ایک قدرتی گولائی لیے ہوئے تھا وہ اس کے کناروں تک چلے گئے۔ سب کی یکساں پسند تھی۔ چائے، گیت اور بارش۔ وہ اس وقت یہ کچھ بھی بھولے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہر جگہ کو کھنگالا۔ چیزوں کو کھدیڑا اور سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ شہر کی ترتیب بے ترتیبی میں بدل گئی۔ لوگ ایک دوسرے پر غصہ ہونے لگے۔ پہلی بار ایک آدھ ہلکا پھلکا جھگڑا بھی دیکھنے کو ملا۔ ڈاک تقسیم ہونے سے رہ گئی، بنک میں چیک کیش نہ ہو سکے، ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجتی رہیں مگر کوئی فون سننے والا موجود نہ تھا، ہسپتال میں مریضوں کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا، بسوں کا اڈا سنسان پڑا رہا، نہ کوئی باہر آیا نہ ادھر سے

کوئی باہر گیا۔ ریل گاڑی بغیر کسی مسافر کو لیے یا اتارے اداسی سمیٹتی ہوئی روانہ ہو گئی۔ سبزیاں، گوشت اور باقی ضرورت کی تمام اشیا ویسی کی ویسی پڑی رہیں کہ کسی کو کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سب تو بس کتوں کی تلاش میں تھے، کتے مل نہیں رہے تھے اور آج کسی بھی گھر میں ناشتہ نہیں بن سکا تھا۔ دوپہر کا کھانا گول ہو گیا تھا۔ اب رات سر پر تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اس شب کو کسی گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ سب تھک گئے تھے۔ سارے اپنی پژمردگی اور مایوسی کے ساتھ جب لوٹے تو انھوں نے ہر گھر میں ایک کتے کو بیٹھے ہوئے پایا۔

☆☆☆☆

شعیب خالق

کچھ اوجھل سا

کچھ اوجھل سا دکھتا ہے
ذرا غور سے دیکھو
غور میں بھی اوجھل ہی دکھتا ہے۔
کوئی اندازہ لگا کر کہو۔
اندازہ بھی کچھ اوجھل سا ہی ہوگا۔
احساس کیا کہتا ہے؟
احساس کی آنکھ بھی گومگوٹول ہے۔
کوئی سایہ؟
وہ روشنی میں رکاوٹ نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی سایہ ہے۔
کوئی دھندلی تصویر؟
خلائی دھند میں سب اوجھل ہے کوئی تصویر نہیں۔
کوئی اشارہ؟
اوجھل خود کو مجسم بھی سمجھتا، مگر دکھتا نہیں۔
کوئی آواز سنائی دی ہے؟
نہیں، گھپ چُپ ہے۔
تو آؤ پھر میرے پاس اوجھل کو ظاہر کرنے کی ایک ترکیب ہے۔
اچھا، وہ کیا؟
پہلے دھیان اور امکان کو گراہ لگاؤ۔
الگ الگ؟
نہیں جیسے میں اور تم ایک گرہ میں بندھے ہیں ایسے ہی اِن دونوں کو بھی ایک گرہ میں باندھ کر آنکھ
کھلی رکھو اور کائنات کے سفر پر میرے ساتھ چلو۔
مگر آنکھ کا حجم بہت چھوٹا اور کائنات بہت گہری ہے۔

یوں جانو جُزاور کُل کے درمیان حُجم ہی اوجھل پن کا باعث ہے۔

بالکل، میرے پاؤں سے لے کر سر تک کا فاصلہ محض چند فُٹ اور اوجھل پوری کائنات میں حلول کیا ہوا؟

تمھیں بھی اپنی کائنات میں حلول کیے بنا اوجھل نہیں دکھ سکتا۔

میرے چند فٹ وجود کا اس قدر وسیع کائنات میں حلول کیونکر ممکن ہے؟

سانس اندر کو کھینچو اور اپنا قد اوپر اُٹھاؤ، ہم دیومالائی ترکیب کے ساتھ کائنات میں حلول کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

چلو میرا قد اوپر اُٹھ رہا ہے، آنکھیں کھلی رکھوں؟

ہاں ابھی زمین کا بلور انگوٹھے اور شہادت والی انگلی کی پوروں بیچ رکھ کر جب تم دیکھو گے تو ......

مگر......مگر میرا قد اتنا بڑا ہو چکا ہے تو پھر پاؤں خلاؤں میں کیسے ٹک سکیں گے؟

خلا میں خیال کی زمین پر پاؤں جما کر رکھو اور معلق کیفیت میں بھی معلق نہ رہو۔

تو کیا کائنات کے پاؤں بھی محض خیال کی زمین پر جمے ہوئے ہیں۔

خلا بھی خیال ہی جانو اور شور سن رہے ہو نا، آنکھیں کھلی رکھنا۔

اچھا اوہ، اوہ ....یہ شور..........یہ رفتار...........

سامنے کیا دِکھتا ہے؟

خلا اور گردشی نظام شمسی اور اس کا شور

مگر اس گردشی شور کے باوجود ہماری آواز میں خلل نام کی کوئی چیز نہیں۔

تو کیا خیال کی زمین پر آواز بھی خیال ہے؟

ہاں، یہ سب اوجھل کی لہروں کا جال ہے۔

یہ سامنے جو گھوم گئی ہے، وہ ایک چاند والی ہماری زمین ہے نا؟

ہاں، چھوٹا سا روشن بلور جس کے گرد نقطہ نُما چاند گھوم رہا ہے۔

تو پھر......تو پھر اپنے اور سورج کے گرد گھومتی بلور نما زمین شہادت والی اُنگلی اور انگوٹھے کی پوروں میں دبا کر روک لوں۔

نہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا۔

مگر تم نے تو کہا تھا......

......وہ میں نے کائناتی حلول کی جانب تمھارا موڈ بنانے کے لیے کہا تھا۔

پھر ہاتھ روک لوں؟

ہاں، انگلیوں کی پوروں کا نرم و گداز دباؤ زمین پر قیامت بپا کر ڈالے گا اور سورجی مدار میں مقناطیسی ارتعاش تباہی مچا دے گا۔

پھر ان گردشی بلوروں کے ساتھ ساتھ گردش میں رہیں؟

نہیں، بس خلا میں اپنے جسم کی ذرا سی کمر اور گردن کا خم کافی رہے گا۔

مگر شہادت والی انگلی اور انگوٹھے کی پوروں بیچ زمینی بلور ....

میں نے کہا، رہنے دو، بس یہاں سے اوجھل کو دیکھو اگر دکھتا ہے۔

نہیں کہیں بھی نہیں، ادھر تو بس لاوہ ابلتا سورج، چنگاریاں اگلتی گیند دکھائی دے رہا ہے۔

ہاں، سورج کی حرارت ہی زمینی فصلیں بونے اور کاٹنے کا سلسلہ ہے۔

مگر بیج اور سورج کا حجم؟

وہ دیکھو مریخ بھی فٹ بال جیسا لگ رہا ہوگا، ہیں نا؟

ہاں مریخ پر تو ہمارے ہاتھوں کے بنائے ہوئے کھوجی کھلونے بھی ہو گزرے ہیں۔

چھوڑو، کارٹونی کھلونوں کا ذکر دیومالائی ترکیب میں سوچو، خیال کی زمین پہ پاؤں میں زور بھرو اور سانس اندر کی جانب کھینچو۔

آنکھیں بند کر لوں؟

نہیں آنکھیں کھلی رکھو، دھیان اور امکان کی گرہ اور کس لو اور جان لو کھلی آنکھیں روشنی اور بند آنکھیں اندھیرے کا یقین ہے۔

کیا خیال کی زمین ہی یقین ہے؟

ہاں، خیال جس قدر ٹھوس ہوگا، یقین بھی اتنا ہی پختہ ہوگا۔

مگر زمینی بلور اگر اوجھل ہو گیا تو پاتال میں گرتے نہ چلے جائیں گے۔

نہیں، میں نے کہا نا، خیال کی زمین بہت مضبوط ہے۔ ہمارے پاؤں اپنی گردشی زمین پہ ہرگز نہیں رہے۔

میرا جسم، میرا قد، اتنا بڑا اور یہ سامنے روشنی کی دھول سی کیا شے ہے؟

اب تم کسی دیوی کی چھاتیوں سے گرے دودھ کے قطروں کا بکھراؤ دیکھ رہے ہو، یہ ہماری دودھیا کہکشاں ہے۔

مگر وہ ہماری زمین اور نظام شمسی کا شور۔

اس کہکشاں کے داخل میں وہ سب اوجھل ہو چکا اور ویسے ہی کئی نظام شمسی اس دودھیا کہکشاں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہم اپنی کہکشاں سے باہر نکل آئے ہیں۔

بہت خوبصورت ہے یہ دودھ کے قطروں سے بنی کہکشاں۔ کچھ دیر یہاں دم لے لیں؟

ہاں، مگر کہکشاں کو فاصلہ رکھ کر دیکھو اسے چھونا نہیں۔

میرا جی چاہتا ہے، دونوں ہاتھوں کی اوک میں بھر کر اس دودھیا کہکشاں کو اور قریب سے دیکھوں۔

ہرگز نہیں، ہاتھ پیچھے لے آؤ، کسی آوارہ پتھر نے بھی اپنی رفتار اور سمت اگر بدل لی تو کہکشاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو سکتی ہے۔

لیکن کہکشاں میں ٹکراؤ اور انتشار کہیں پہلے ہی سے موجود چلا آ رہا ہے۔

اپنے جسم کے پھیلاؤ پر نظر رکھو اور پاؤں میں زور بھرو، سانس اندر کی جانب کھینچو، کچھ اوجھل سا ابھی بہت دور ہے۔

کائنات میں اس قدر گہرائی اور بلندی ہے کہ دوری کہیں ختم ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔

مادے اور خلا کا تناسب ہی اگر غیر مناسب ہے تو گھبراؤ نہیں۔ بلندی اور پستی ایک ہی سے فاصلوں میں بندھے ہیں۔

تو پھر اس کے مخالف، دائیں بائیں، سامنے اور پیچھے، کیا معلوم اوجھل بھی کوئی سمت ہم سے اوجھل رکھے ہوئے ہے۔

ہم نے خود الجبرا اور حساب کے بنیادی کلیے اخذ کرنے میں کوئی غلطی کر دی تھی اور اب اس کے سبب ہم سانپ کے بجائے اس کی لکیر کو پیٹتے چلے آ رہے ہیں۔

یہاں تو کائنات بے سمت ہو چکی ہے اور اس بے سمتی کائنات میں سب ایک سا دکھتا ہے۔

بس سیاہ گڑھوں سے بچ کر آگے بڑھنا، ان میں انتہائی کشش ہے۔

کیا مطلب، انتہائی کشش؟

مادہ جب خلا کی مکمل نفی پر اتر آئے تو اس کے داخل کا ٹھوس کردار ہی انتہائی کشش ہے اور وقت کو بھی وہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں۔

تو پھر کچھ اوجھل سا کہیں انھی سیاہ گڑھوں میں ہی نہ چھپا ہو۔ آؤ ذرا قریب سے کسی گڑھے میں جھانک کر دیکھیں۔

نہیں، ہرگز نہیں، ان کے قریب سے گزرتی روشنی بھی اگر کشش کھینچ لے تو وہ روشنی اندھیرے میں ڈھل جاتی ہے۔

لیکن کچھ کائناتی روشن آنکھیں بھی تو ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔

وہ آنکھیں کہکشاؤں کے ماں باپ کی آنکھیں ہیں۔

اتنی ڈھیروں کہکشائیں، کہکشاؤں کے خاندان کی رنگینیاں بھی الگ الگ دکھائی دے رہی ہیں۔

ستاروں اور کہکشاؤں کے رنگ ان کی عمر کا پتہ دیتے ہیں مگر سیاہی کی عمر کوئی نہیں ۔

تو پھر کچھ اوجھل سا، اسی سیاہی کے داخل کا کردار ہی نہ ہو ۔

کھلی آنکھیں روشنی اور بند آنکھ اندھیرے کا یقین ہے، یہی کہا تھا نا ؟

ہاں مگر کیا زمین محض بند آنکھوں کے یقین میں الجھی ہوئی ہے؟

پوری کائنات ہی اندھیرے کا یقین ہے وگرنہ روشنی ہوتی تو کیا کچھ اوجھل سا،، اوجھل رہ سکتا تھا ۔

مگر ہم تو کائنات میں روشنی کی سست رفتار بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔

یہ کائنات ، یہ خواب کیا ہے؟ روشنی وقت اور دھیان کی رفتار کیا ہے؟ یہ سب چھوڑو، اوجھل سا، اوجھل ہی رہنے دو، واپس زمین اور گھر کو لوٹیں ۔ مجھے ڈر لگنے لگا ہے ۔

نہیں ڈرو نہیں، ارتقا بے خوف چلتا ہے ۔ تم بستر پر سوئے ہوئے وجود کی بند آنکھوں میں ایک بار واپس ضرور لوٹو گے مگر ......

یہ اگر مگر چھوڑو، سفر بالخواب ختم ہوا، کائنات کے حُجم میں حلول بھی ہم کر چکے، اب بند آنکھوں میں واپس چلو ۔

واپسی ممکن نہیں، یہ کائنات جو اپنا حُجم پکڑ رہی ہے، تم دیکھ سکتے ہو نا ؟

ہاں مگر ......مگر، یہ پاتال میں ڈوبنے کا احساس کیوں پھیل رہا ہے؟

زمین پر تمھاری قبر میں لوگ مٹھی بھر مٹی ڈال کر جا چکے ہیں ۔ میں اور تم کی گراہ کھُل چکی، میری آواز سن سکتے ہو؟

نہیں ......ں......ں......ں ......

ہاہاہا، میں نے تمھارے خواب کا تمام رس چوس لیا اور اب اس مٹھی بھر کائنات سے باہر ایک اور بڑی اور بے انت کائنات میں داخل ہو رہا ہوں ......میں ایک ہو گیا ہوں، اب کچھ اوجھل سا، اوجھل نہیں رہا......ہاہاہا

☆☆☆☆

ایوب اختر

ابہام

وہ ایک مرتبہ پہلے بھی اس ہوٹل میں ٹھہر چکا تھا۔ تب وہ مختلف کمرے دیکھنے کے بعد اپنی مرضی کے ایک سو بیالیس (۱۴۲) نمبر کمرے میں ٹھہرا تھا۔ آج جب منیجر نے اسے سینتیس (۳۷) نمبر کمرے کی چابی پیش کی تو اس نے فوراً چابی کاونٹر پر رکھتے ہوئے کہا:

”نہیں! مجھے ایک سو بیالیس نمبر چاہیے۔“

منیجر نے ایک دم اپنی مسکراہٹ کو اس کی خوب صورت بیوی کے چہرے سے اٹھاتے ہوئے کہا:

”صاحب! افسوس ہے ہمارے پاس اس وقت اور کوئی کمرہ خالی نہیں۔ سیزن کے رش کی وجہ سے تمام کمروں کی بکنگ ہو چکی ہے۔ یہ سینتیس نمبر وی۔ آئی۔ پی روم ہے۔ اس کی ایک سائیڈ ونڈو برفانی پہاڑوں کی طرف کھلتی ہے، جہاں سے آپ فوجی چھاونیوں کا نظارہ بھی کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد آپ اسے ضرور پسند کریں گے۔ میں ابھی آپ کو اپنے رجسٹروں کے اندراج دکھا سکتا ہوں بہت سی معروف شخصیات ہمارے ہوٹل کے اس روم میں ٹھہر چکی ہیں۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے، ہم اسی کمرے میں رہیں گے“ اور یہ کہتے ہی اُس کی بیوی نے چابی اُٹھا کر سامان کے پاس کھڑے ہوئے ویٹر کو تھما دی تو اُس کے خاوند نے منیجر کی مسکراہٹ میں اپنی مسکراہٹ اُچھال دی۔

ویٹر کمرے میں سامان رکھ کر چلا گیا تو اُس کی بیوی سلمٰی نے اپنی حیرت بھری خوشی میں خاوند کو شریک کرتے ہوئے کہا:

”نعیم اتنا خوب صورت کمرہ تو میرے تصور میں بھی نہیں تھا۔“

”ہاں! یہ بہت شان دار ہے۔“

”تم نے بغیر دیکھے خواہ مخواہ منیجر سے بحث کی۔“

”مجھے اِس کے نمبر نے چونکا دیا تھا۔“

”کیا مطلب......؟“

”علم الاعداد کے ماہرین سینتیس (۳۷) کے ہندسے کو موت کا ہندسہ بتاتے ہیں......“

”نعیم! علم تو خوف سے نجات دلاتا ہے......“

"میں خوف زدہ نہیں ہوں لیکن ایک پُراسراریت لاشعوری طور پر ہماری گفتگو اور ماحول میں در آتی رہے گی۔ جب کہ ہم یہاں فطرت کی خوب صورتیوں کو کسی اور انداز سے دیکھنے، محسوس کرنے آئے ہیں۔"

"تُم نے موت کو پُراسرار کہا، کیا اِس پُراسراریت کو ہم فطرت کے ایک حُسن کے طور پر قبول نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں... پُراسراریت بھی دراصل ایک ابہام ہے اور مجھے ابہام کے حُسن یا حُسن کے ابہام پسند ہیں لیکن کوئی مجھ سے میری عمر پوچھے تو میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں چالیس سال کا ہو گیا ہوں۔ میں تو کہوں گا کہ میں نے اپنی عمر کے چالیس سال گزار دیے... ابھی تھوڑی دیر پہلے آئینے دیکھتے ہوئے تمھارے چہرے پر حُسن کے ابہام مُسکرائے تھے۔ وہ ایک حسین لمحہ تھا جو کسی نئی نظم یا پینٹنگ کا مُحرک بھی ہو سکتا تھا مگر کیا وجہ ہے کہ مجھے ایک دم میرا جی کی یہ لائن یاد آئی۔

"کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آ کر ملے ہیں۔"

"نعیم! مَیں تمھاری عمر بتانے والی بات کے ساتھ رہ گئی تھی.... کیا اس طرح تُم ارتقائی عوامل کا انکار نہیں کرتے ہو.... میرا مطلب ہے بچپن لڑکپن، جوانی، عُمر کے تجربے، ذہنی پختگی وغیرہ۔"

"نہیں! مَیں ارتقائی عوامل کا انکار کیوں کروں گا۔ یہ زندگی کی نعمتیں ہیں اور زندگی میرے خیال میں موت کی نعمت ہے۔"

"اِس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم مرنے کے لیے زندہ ہوتے ہیں....."

"جی بالکل! زندہ ہونے سے قبل اور زندہ ہوتے ہی ہم ہر لحہ مر رہے ہوتے ہیں۔ موت اِس سلیقے سے اپنی جُزیات اکٹھی کر رہی ہوتی ہے کہ زندگی حُسن کے اِس ابہام میں تصویر ہوتی چلی جاتی ہے....."

"نعیم! پھر یہ سکول، کالج، یونی ورسٹیاں، سائنس، ٹیکنالوجی، انسان کے زمینی، خلائی سفر، تجربہ گاہیں، جدوجہد..... یہ سب کیا اور کیوں ہے؟"

"ان سب باتوں کے جواب تمھارے پاس بھی ہیں لیکن تمھاری آنکھوں میں اُتری ہوئی تھکن کا تقاضا ہے کہ تُم کچھ دیر آرام کر لو اور میرا یہ مشورہ ہی تمھارے سوال کا جواب بھی ہے۔ سب سے بڑی حقیقت یا سچائی یہ ہے کہ انسان اَپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور میں اِس محبت کو یوں سمجھا ہوں کہ چوں کہ مجھے ایک دن نہیں ہونا اِس لیے مَیں اور میرا ہونا بہت اہم ہے....."

سلمٰی ایک دم اُٹھی اور اُس سے لپٹ گئی۔

"نہیں! 'میں' نہیں 'ہم'! کہو! ہم اور ہمارا ہونا بہت اہم ہے۔"

نعیم کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

اسی دوران میں اُسے کھڑکی کا خیال آیا... وہ ایک پٹ والی شیشہ دار کھڑکی تھی نعیم نے پٹ کے

ہینڈل کو ہُک میں سے نکالا تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ باہر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دور تک پھیلے ہوئے فلک بوس گلیشیرز..... ایک ٹھنڈی سفید دُنیا.....

فطرت کی بقا کا ایک منجمند راز..... برفانی ہوائیں اُن کے چہروں کو برفانے لگیں، اُن کے جسم کپکپانے لگے تو نعیم نے فوراً کھڑکی بند کردی.......

وہ کھڑکی کے پاس آمنے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد بھی دیر تک گلیشیرز کی سفید چمکیلی دُنیا میں چمکتے چاند، تاروں کے عکس دیکھنے میں محو رہے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سلمٰی نے کہا:

”دِن کو یقیناً برف کے اِن پہاڑوں سے بھاپ اُٹھتی ہوگی اور دیکھو! اَب یہ چاند تاروں کے گاؤں معلوم ہوتے ہیں۔“

”ہاں! میں جب پہلے یہاں آیا تھا تو انھیں اِس طرح سے نہیں دیکھ پایا تھا ہمارے اُس کمرے کی کھڑکی ”فیری میڈوز“ کی طرف کھلتی تھی... دُور تک پھیلی ہوئی سرسبز چراگاہیں، چیڑ اور دیودار کے اُونچے درخت اور اِن میں سے جھانکتے ہوئے گھر اور اِس سارے ماحول کو اپنے حُسن سے زندہ رکھتے ہوئے لوگ... مَیں ان لوگوں سے ملا ہوں۔ ان کی مسکراہٹوں میں زندگی مُسکراتی ہے۔

اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ان کے پاس ہنسنے مسکرانے اور خوش رہنے کے لیے بہت باتیں ہیں۔

سلمٰی نے نعیم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے بولی۔

”تُم بہت خوب صورت ہو...... بہت........ بہت زیادہ!“

”ارے ارے! یہ ایک دم!.......“

”سچ! محبت کی بات کرتے ہوئے تمھارا لہجہ ہی اور ہوتا ہے۔ تُم اس عظیم حُسن سے سجنے، سنورنے اور مہکنے لگتے ہو۔“

”ہاں! یہ سب ماحول کا اثر ہے۔ آج بھی اگر ایک سو بیالیس (۱۴۲) نمبر روم مل جاتا تو ہمیں زندگی کے زندہ موضوعات سُوجھتے۔ ہم چراگاہوں، درختوں، پھولوں، پگ ڈنڈیوں اور انسانوں کے حُسن و جمال کی باتوں سے اپنی باتوں کا آغاز کرتے۔ اپنے آپ کو ایک دوسرے میں ڈھونڈتے، سوچتے...... فطرت کے رنگوں میں جذب ہوتے ہوئے اپنے حُسن کی بات کرتے......“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم یہاں آتے ہی سینتیس (۳۷) کے ہندسے میں اُلجھ گئے مگر نعیم! ہم نے ایک سچائی پر بات کی.... موت ایک حقیقت ہے...“

”ہاں! موت ایک اٹل حقیقت ضرور ہے مگر حقیقت وہ ہوتی ہے جس کے ایک معنی پر سب اہلِ فکر مُتفق ہوں۔ اب موت ہمارے ہاں انتقال ہے۔ یعنی مختلف مذاہب کے لوگ اس کی وضاحت مختلف انداز

سے کرتے ہیں۔ حقیقت کے حوالے سے مَیں اپنے اُستاد کی بات سے آگے نہیں بڑھ سکا جو میں تمھیں بتا بھی چکا ہوں کہ سب سے بڑی حقیقت اپنے آپ سے محبت کرنا ہے۔ بہ ہر حال! تم کہہ سکتی ہو کہ ہم نے ایک اٹل حقیقت پر، ایک ابہام، ایک حُسن پر بات کی۔“

”نعیم! مجھے یونی ورسٹی کے وہ دِن یاد آتے ہیں جب میں، تُم اور سَر یوسف مختلف موضوعات پر لمبی بحثیں کرتے۔ بات کو کھولنا، بولنا اور مفاہیم کو بڑے تناظر میں دیکھنے، سمجھنے کا ہُنر میں نے اپنی اِن نشستوں سے ہی سیکھا۔ شروع شروع میں امی، آپی کو میرے کپڑوں سے آنے والی تمباکو کی بُو پر بہت تشویش ہوئی اور مجھے اس بُو سے دُور رہنے کے بہت لیکچر بھی ملے مگر مجھے تو اِن بحثوں کا چسکا پڑ گیا تھا۔ میں لفظ کے حُسن کی دیوانی ہو چکی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے..... میری ڈھارس بندھی اور میں اِس حُسن کی کچھ نئی دُنیائیں دریافت کرنے میں کامیاب ہوئی۔ یونی ورسٹی نے مجھے گولڈ میڈل سے نوازا تو سر یوسف نے کہا تھا:

”سلمٰی نے ثابت کر دیا ہے کہ شعر کو سمجھنے کے لیے شاعر ہونا ضروری نہیں بل کہ یہ لفظ سے عشق کی وہ منزل ہے جس کی ایک مثال سلمٰی ہے.....“

سر یوسف کے یہ الفاظ جب بھی دُہراتی ہوں میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ تُم، شاہد، پاشا اور ابُو ذرتو یونی ورسٹی آنے سے پہلے ہی اپنی پہچان بنا چکے تھے مگر لفظ سے میری جُڑت کے ہر محرک، ہر حُسن کا بڑا حوالہ سر یوسف ہیں.....“

”تم ٹھیک کہتی ہو، سر یوسف بڑے آدمی ہیں، اَیسے اُستاد کا ملنا نصیب کی بات ہے۔ وہ آج بھی کہیں جب ہمارا تعارف کراتے ہیں تو اپنی ذات کا ذکر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں اپنے آپ کو اُستاد کہہ کر مجھے خواہ مخواہ اپنی برتری کا دعویٰ نہیں کرنا۔ سَر یوسف کے ساتھ خُوب صورت یادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے مگر میں سوچ رہا ہوں کہ تمھیں اچانک یہ سب کچھ کیسے یاد آ گیا؟“

”ہاں! یہ سب بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم نے تقریباً ہر موضوع پر بحثیں کیں مگر اتفاق ہے کہ موت کے موضوع پر ہم نے بہت کم بات کی.....“

”میرے خیال میں اس موضوع پر سر یوسف کی خاموشی کا سبب اُن کا اپنا نظریہ ہے۔ وہ مذاہب سے مُتصادم موضوعات کو عام طور پر نہیں چھیڑتے.....“

”مگر میں سوچ رہی ہوں کہ یہ ایک دلچسپ اور بڑا موضوع ہے، اس پر لکھنا چاہیے۔ ایک مرتبہ جرمن موزرٹ کو پڑھتے ہوئے میں اِس موضوع کے حوالے سے چونکی تھی مگر پھر نہ جانے کیوں... میری توجہ اس طرف سے ہٹ گئی۔ مثلاً موزرٹ کہتا ہے کہ موت ہماری خوشیوں کی کُنجی ہے.....“

”واہ واہ..... کیا یاد دِلایا۔ موزرٹ کے وہ خطوط بھی جو اُس نے اپنے بیمار باپ کو لکھے تھے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں..... ٹھیک ہے تم اس موضوع پر لکھو۔ موت بلاشُبہ ایک بڑا موضوع ہے، پُراسراریت اور

ابہام اس موضوع کے وہ خاص پہلو ہیں جنھیں اگر تم زیادہ فوکس کروگی تو بہت سے نئے مباحث در آئیں گے۔ بہ ہر حال !.....اچھی بات ہے چلو اس کمرے نے کچھ تو دیا۔ ہم آپ کی اور بھی تعریف کرنا چاہتے ہیں۔ مگر سیانے کہتے ہیں رات ہونے سے پہلے رات کا کھانا کھالینا چاہیے.....“

”اوہ! سچ! تُم نے ایک دم بھوک جگا دی۔“

کھانے کے بعد وہ باہر نکلے مگر شدید ٹھنڈ کی وجہ سے بہت جلد واپس آ گئے اور ہوٹل کے احاطے ہی میں چہل قدمی کرنے لگے۔ اسی دوران میں وہ ایک جگہ تھوڑی دیر کے لیے رُک گئے۔ یہاں سے وہ فوجی چھاؤنی کا نظارہ کرتے رہے زرد روشنیوں میں بھاگتے دوڑتے فوجیوں کو دیکھ کر وہ حیران بھی ہوئے کہ اتنی رات گئے یہ کن سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ اسی بحث میں انگریزی فلموں کے مختلف کرداروں، نظاروں اور جنگوں سے ہوتے ہوئے وہ ایک بار پھر موت کے موضوع پر آگئے، جب سلمٰی نے کہا کہ وہ اس موضوع پر ضرور کام کرے گی تو نعیم نے کہا:

”تم یہ کام بہت بہتر انداز سے کرسکتی ہو۔ یہ تمھاری ایک اور بڑی کامیابی ہوگی۔“

سلمٰی کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

”نعیم! ذرا سوچو! ہم اگر اس سینتیس (۳۷) نمبر رُوم میں نہ آتے تو یہ اتنی ساری باتیں کیا کبھی ہم کر پاتے؟“

”واہ واہ! سلمٰی بیگم تمھیں نہیں معلوم تُم نے اتنے خوب صورت سوال میں کتنی بڑی بات کر دی..“

”سچ!؟“

”ہاں ہاں جی! سچ!“

”اچھا مجھے تُم سے ایک اور بھی بات پوچھنی ہے۔“

”بولو!“

”نہیں! یہاں نہیں.....بہت ٹھنڈ ہے، مُجھ سے تو اَب بولا بھی نہیں جا رہا۔“

”ارے! یہ تو میں بھول ہی گیا کہ اک صنفِ نازک مرے ہمراہ ہے۔“

وہ کمرے میں چلے گئے تو سونے سے پہلے نعیم نے کہا:

”تم کچھ پوچھنا چاہ رہی تھیں؟“

”نعیم! کبھی کبھی تُم جیسے کچھ کہتے کہتے رُک جاتے ہو، تمھاری آنکھوں کی بُجھارتیں مُجھے اُلجھا دیتی ہیں۔“

نعیم نے ایک دم سَر تکیے سے اُٹھایا اور پلنگ کے تاج سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سلمٰی بھی اُس کے برابر آ گئی تو وہ بولا۔

''ایک آرٹسٹ نے کہا تھا:

''فطرت سے میں ایک سلسلہ، رنگوں کے امتزاج کی ایک درست ترتیب مُستعار لیتا ہوں۔ فطرت پر یہ انحصار مَیں اس لیے کرتا ہوں تا کہ حماقتیں نہ کر بیٹھوں''.... بس میرا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اگر کہیں مجھے یہ احساس ہو جائے کہ مَیں لفظوں کو اُن کے پورے حُسن کے ساتھ بَرت نہیں رہا تو میں چُپ ہو جاتا ہوں، پھر اُس ادھوری بات کو آنکھیں اپنے انداز سے کہتی ہیں۔ اب اِس انداز کے رنگوں کو تم نے بُجھارتیں کہا۔ مُجھے ایک دم امیر خُسرو یاد آ گیا۔ امیر خُسرو نے بُجھارتیں لکھیں اور کیا خُوب لکھیں، یہاں بھی ابہام اس صنف کا حُسن ہے...تو سلمٰی جی! بولنا، بولتے بولتے چُپ ہو جانا اور یہ میری آنکھوں کے سلسلے..... بُجھارتیں ابہام..... سب تمھارے حُسن کے پرتو ہیں...''

یہ سُنتے ہی سلمٰی نعیم کہتی نعیم بیل ہو گئی۔

صبح سویرے دروازے پر مسلسل دستکوں کے شور سے دونوں اُکتاہٹ اور حیرانی کے عالم میں اُٹھے۔

کمرے کے باہر ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ پچاس پچپن سال کی عورت اور اُن کے پیچھے دو فوجی افسر اور ہوٹل کا منیجر کھڑا تھا۔ منیجر نے آگے بڑھتے ہوئے معذرت کے چند الفاظ ہی کہے تھے کہ وہ عورت تیزی سے کمرے میں آئی اور ایک ایک چیز کو بہ غور دیکھنے لگی۔ ہوٹل کا منیجر بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ نعیم نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا تو فوجی افسر نے نعیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''ہم آپ سے بہت معذرت خواہ ہیں۔ مَیں آپ کو تمام تفصیل سے آگاہ کروں گا...اس وقت ہمیں آپ دونوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ یہ خاتون اور ان کا بیٹا علی شدید صدمے کے عالم میں ہیں۔ یہ یہاں زیادہ دیر نہیں رُکیں گے تاہم جب تک یہ چاہیں آپ انھیں اپنے کمرے میں چلنے پھرنے، اُٹھنے، بیٹھنے اور چیزوں کو چھونے وغیرہ سے منع نہ کریں۔ ہم آپ کے کسی بھی قسم کے نقصان کے ذمہ دار ہیں۔''

اور یہ کہتے ہی فوجی افسر کی نگاہیں نعیم کے چہرے پر جم گئیں۔

''okay!'' نعیم نے کہا۔ اور اُن کے ساتھ خاموش کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں خاتون کی آواز گونجی۔

نہیں! یہ وہ بیڈ نہیں۔ وہ اِس سے اچھا، بڑے تاج والا پلنگ تھا، وہ وہاں اُس کھڑکی کے ساتھ تھا۔ کُرسیاں اُدھر اُس تصویر کے نیچے رکھی تھیں۔ علی! آؤ میرے بیٹے....'' وہ علی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کھڑکی کے پاس لے گئی پردہ ہٹانے کے بعد بولی۔

''دیکھو! یہ ہیں وہ سفید، ٹھنڈے پہاڑ...رات بھر ہم انھیں دیکھتے رہے، اِن کی شان میں کیا کیا کچھ نہیں کہا...مگر تُم! تُم نہ اِن کے دھوکے میں آنا، تمھارے باپ کی بہت دوستی تھی اِن سے اور یہ!......یہ اپنے ہی

دوست کو کھا گئے۔ ان کی رنگت اور چمک دمک پر مَت جانا۔ علی! علی بیٹا! برف کی ہر قسم سے، ہر اثر سے بچنا۔ اپنے بچوں کو آئس کریم تک نہ کھلانا۔" اور یہ کہتے ہی وہ گرنے لگی تو علی نے فوراً اُسے تھام لیا۔ سلمیٰ نے آگے بڑھ کر علی کی مدد سے اُسے بیڈ پر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ ہوش میں آ گئی تو فوجی افسر کے کہنے پر علی نے ماں کو فوجی کیمپ میں چلنے کا کہا۔

کمرے سے نکلتے ہوئے وہ نعیم اور سلمیٰ کے پاس رُک گئی۔

"میرے بچو! چلے جاؤ... یہاں سے فوراً چلے جاؤ... دیکھو! کتنے پیارے لگ رہے ہو۔ باہر مت جانا، ان سفید پہاڑوں کے فریب میں مَت آنا... مَت آنا اِن کے فریب میں..."

بعد میں فوجی افسر نے بتایا۔

"چند روز پہلے گلیشیرز میں پٹرولنگ کے دوران میں مُجھے ایک کپڑے کا ٹکڑا نظر آیا اور میں نے جوانوں کو اُس جگہ کُھدائی کے لیے کہا تو وہاں سے ایک نوجوان کی Dead body ملی۔ اُس کی جیب سے ملنے والے کاغذات اور Identity card کی مدد سے ہم اُس کے گھر والوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ فون پر میری جس خاتون سے بات ہوئی وہ یہی تھیں۔ بائیس سال پہلے، شادی کے چند دنوں بعد وہ یہاں آئے اور یہ حادثہ پیش آیا۔

آج صبح خاتون نے ہمیں بتایا کہ وہ اسی ہوٹل کے سینتیس نمبر روم میں ٹھہرے تھے، ان کی خواہش پر ہم یہاں آئے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد افسر بولا۔

"بہر حال... آپ بہتر جانتے ہیں اس طرح کے اتفاقات توہمات کو جنم دیتے ہیں، مَیں ایک مرتبہ پھر آپ کا شکر گزار ہوں...."

افسر چلا گیا تو نعیم نے خاموش، چُپ، کھوئی کھوئی سلمیٰ کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

"کم آن سلمیٰ! کم آن!"

"مَیں اس خاتون کو اور اس سارے واقعے کو کبھی نہیں بھول سکتی۔"

"ہاں! یہ اس عظیم دُکھ کا حُسن ہے۔"

"نعیم! بس! ہم اب یہاں سے واپس ہوں گے۔"

"ہاں ہاں! ظاہر ہے مگر کچھ دن۔۔۔"

"نہیں نہیں! ابھی۔۔۔ بَس ابھی ہم اپنی پیکنگ شروع کرتے ہیں اور نکلتے ہیں۔"

"سلمیٰ کیا ہو گیا ہے۔؟"

"کیا ہو گیا ہے؟ تمھیں نہیں پتا کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ..... پلیز! میرا دم گُھٹنے لگا ہے، مَیں مر

جاؤں گی۔''

نعیم نے فوراً اُسے بانھوں میں بھر لیا۔

''ٹھیک ہے۔ اپنا موڈ اچھا رکھو! تھوڑا سا سامان ہے۔ تُم پیکنگ کرو، مَیں جیپ کا بندوبست کرتا ہوں...''

''نہیں! تُم کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہوٹل کے منیجر سے کہو.....''

منیجر کی طرف جاتے ہوئے نعیم کو اُس خاتون کے خاوند اور بیٹے علی کے بارے میں طرح طرح کے خیال آتے رہے۔

جیپ آ گئی اور ویٹر سامان رکھ چُکا تو نعیم نے ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بُلایا اور آہستگی سے پوچھا۔

''سیٹوں کے ساتھ سیفٹی بیلٹ ہیں؟''

''ڈرائیونگ اور فرنٹ سیٹ کے ساتھ ہیں مگر پچھلی سیٹ کے ساتھ نہیں ہیں صاحب!''

''ٹھیک ہے! چلو!''

جیپ کا انجن اسٹارٹ ہو گیا تو نعیم نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''سلمٰی! تُم اِدھر آگے بیٹھ جاؤ۔''

اُس نے پچھلی نشست پر اکٹھے بیٹھنے کی بہت ضد کی مگر نعیم کے زیادہ اصرار پر مان گئی۔

نعیم نے اپنے ہاتھوں سے اُس کا سیفٹی بیلٹ باندھا اور خود پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆

بلال احمد

من دیگرم نیست۔۔۔۔

رات ہال کی سنگی دیواروں کے باریک رخنوں سے سرسراتی، کھرکھراتی اندر داخل ہو رہی تھی ....سازشی وقت پتھریلے فرش پر رینگ رہا تھا۔ ہال کی اونچی چھت کے درمیان ایک شش پہلو روشن دان تھا اور اس کے عین نیچے فرش پر لکڑی کا ایک پُر ہیبت کٹہرا ایستادہ تھا۔ کٹہرے کے سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک اونچا چبوترہ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تعمیر کیا گیا تھا۔ چبوترے پر ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

کٹہرے کے تین اطراف ایک ہجوم تھا جو کم روشنی میں سایوں کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سایہ نما موجودات آپس میں عجب سرگوشیوں میں محو تھے۔ ان کی آنکھوں میں معدومیت کے بجھے پن کے ساتھ عجب ہلکی سی چمک تھی۔ ان کی گونجیلی مگر دبی دبی آوازوں سے سارا ماحول مضطرب تھا۔ ہجوم کے گرد گاڑھا خوشبودار دھواں لہروں کا جال بُن رہا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں وہ ایک اکیلا حاضر و موجود سے لاتعلق ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اِس کی نگاہ سامنے خالی چبوترے پر تھی۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اور پیشانی پر تفکر کی لکیروں کا جال۔ مجمع میں بے چینی کا سبب اس کا وجود تھا۔

پھر یک دم سامنے کی دیوار پر تیز روشنی کا ایک پردہ سا کھلتا چلا گیا۔ ہجوم میں آوازوں کی بھنبھناہٹ ختم ہو گئی اور کٹہرے کے سہ طرفہ ہجوم نے گردنیں خم کر دیں اور گویا پتھریلے مجسموں کی صورت دھار گیا۔ ہال میں صرف دھواں محرک تھا۔ جو اب ایک دبیز چادر کی طرح ان مجسموں کے سروں پر تن گیا تھا۔ کثیف اور خوشبودار دھواں بجائے خود ایک وجود تھا۔

وہ ایک اکیلا، جس میں گردن اُٹھا کر دیکھنے کی سکت تھی، چبوترے کی جانب نظریں جمائے کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا جو روشنی کے پردے سے نمودار ہوا تھا وہ جسیم اور دراز قامت مست نگاہوں سے اپنے حضور ساکت پر عقیدت ہجوم کو تک رہا تھا۔ اپنے لبوں پر ایک ملکوتی تبسم لیے وہ ایک عجیب معبودانہ سرشاری سے جھوم رہا تھا۔

پتھریلی دیواروں کے باریک رخنوں سے داخل ہوتی ہوا کی سرسراہٹ مدہم سیٹیاں بجا رہی تھی۔

پھر وہ ایک اکیلا جو چبوترے پر نگاہیں گاڑے کھڑا تھا پکار اُٹھا۔

”سنو! حضرت جی تمھارا یہ سفینۂ نجات کے دریا میں تیرنے والا نہیں کہ تم تو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو۔“

”او ہو تم بھی یہاں موجود ہو راندۂ درگاہ“ حضرت جی حلق کے بل چیخے۔“ چبوترے پر چنگاریاں

سی اُڑنے لگیں۔

"ہاں میں ہوں، تمھیں بتانے کے لیے کہ تم جو وحدت و کثرت کی باتیں کرتے پھرتے ہو جزو کل کے راگ الاپتے ہو ان باتوں کی اصل سے بہت دور کھڑے ہو...... تم ...... تو محض بقائے نسل کا تسلسل ہو، ناسوت میں رینگنے والے کیڑے تمھیں مقامِ ملکوت، لاہوت قسم کی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔ تم فنا و بقا کو کیا جانو ......تم تو"

"خاموش رہو...... برداشت کی ایک حد ہے اور ہم نے تو اس سے بڑھ کر وقت دیا تمھیں کہ شاید تم لوٹ آؤ...... شاید توبہ کا دروازہ تم پر کھل جائے مگر تمھارا قلب سیاہ ہو چکا...... آہ...... تم؟"

"ٹھہرو حضرت جی! یہ باتیں تمھارے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔ تمھارے چہرے پر حیا نہیں، تمھاری آنکھ پُرنم نہیں، تمھارے ہاتھ میں عطا نہیں، پھر بھی تم دعوے دار ہو ان مقامات کے۔"

"خاموش نابکار" چبوترے والا لرزتے ہوئے چیخا۔ اس کی معبودیت کرچی کرچی چبوترے پر بکھر گئی۔ مجمع سے پرہول آوازیں بلند ہونے لگیں۔ گستاخ، بے ادب، بے نصیب...... بے ادب، بے نصیب۔

حضرت جی گرجتے رہے۔ "تو گنہگار ہے تو نے دیے ہوئے سانسوں کی پاسداری نہ کی، تجھ سے اپنی ذات کی نفی نہ ہو سکی تو منکر ہے بیعت کا جو تو نے ہمارے ہاتھ پر کی۔ انکار کرنے والا منکر ہوتا ہے۔ ہم تجھے تھوڑی مہلت دیتے ہیں۔ ہمارے اور ان مردانِ باصفا کے درمیان حائل نہ ہو، ہم نے تجھے وقت دیا سوچنے کا۔

فرش پر رینگتے وقت نے پہلو بدلا تو رات کی سیاہی میں اضافہ ہو گیا۔ چبوترے والا ہجوم کی طرف متوجہ ہوا جن میں سے ہر کوئی اس کی معبودیت کی بکھری ہوئی کرچیاں اپنے ہاتھوں میں سمیٹے آگے بڑھا اور کرچیاں اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ حضرت جی نے خود کو سمیٹا اور اب وہ مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ روشنی کا وہ دودھیا پردہ جو اس باغی کی آواز سے ملگجا ہو گیا تھا پھر چمکنے لگا۔ ہجوم کے سر پر خوشبودار دھوئیں کی چادر مستانہ وار لہرانے لگی۔ حضرت جی نے اپنی نگاہیں مجمعے پر مرتکز کر دیں۔ یکا یک ان ساکت لوگوں میں نامعلوم تحرک عود کر آیا سکوت ایک بار پھر بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ انھوں نے زبان کے جھاڑو سے لفظوں کی گرد اُڑانا شروع کر دی۔ مست نگاہ یار کا تازیانہ مردانِ باصفا کو بسمل کر گیا۔ وہ پتھر یلے فرش پر پچھاڑیں کھانے لگے۔ عقب میں کہیں دور سے بے ہنگم ڈھول اور ساز بجنے لگے، اندھیرے میں نادیدہ قوالوں کی بھدی اور چری ہوئی آواز بلند ہوئی۔

مدہوش بایک ساغر اے پیر مغاں کر دی
دل بردی و جاں بردی بے تاب و تواں کر دی

پھر اس شعر کی تکرار سے سارا مجمع تڑپنے پھڑکنے لگا۔ چبوترے والا ایک بازو فضا میں بلند کیے مستانہ وار جھوم رہا تھا وہ دائروں میں چکر لگاتا مجمعے کے درمیان آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے گویا مے کے چشمے رواں

تھے۔ مردانِ باصفا اس کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسوں سے نواز رہے تھے۔ جن نوآموز لوگوں کو یہ حرکات کرنے کی جرأت نہ ہوئی حضرت جی خود جھک کر اُن کے پاؤں چھو لیتے تو انھیں بھی خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا یہ ہنگامہ جاری تھا کہ حضرت جی نے ایک نگاہِ غلط اس اکیلے پر ڈالی جو مضحکہ خیز نظروں سے سب کا نظارہ کر رہا تھا۔ حضرت جی کی نگاہ جوں ہی اس دیوانے کی نظر سے چار ہوئی وہ تڑپ کر رقص کرتا ہوا سب کے درمیان آیا۔ حضرت جی تیز سے چکراتے ہوئے چبوترے پر جا کھڑے ہوئے۔ اس اکیلے نے اتنی پر زور آواز میں گانا شروع کیا اور کہ قوالوں کو اپنی آواز بند کرنا پڑی۔

بیا جاناں تماشہ کن کہ در انبوہ اغیاراں
بعد سامانِ رسوائی سر بازار می رقصم

مجمع جہاں تہاں ساکت ہو گیا۔ چبوترے کا رنگ آتشی ہونے لگا اور حضرت جی نے سلگتی ہوئی نگاہوں سے اس مستانے کو گھورا اور چیخ اُٹھے۔

''خاموش بد بخت ...... گستاخِ اولیائے کرام تجھے کیسے جرأت ہوئی کہ ایک ولی کے شعر کو تبدیل کرے کم بخت تو نے جاں بازوں کو اغیار بنا ڈالا۔ یہی ہیں وہ تیری باتیں جنھوں نے تجھے راندۂ درگاہ کر ڈالا۔ تو بھول بیٹھا کہ کل تو بھی اس کل کا جزو تھا۔ کوئی اور نہیں تو نے خود اپنا فیصلہ کر دیا۔ تو جاں باز سے غیر ہو گیا۔ حضرت جی کی نالگیں غصے سے لڑکھڑا رہی تھی اور مجمع اس جلالی کیفیت پر سانس روکے ساکت ہو گیا تھا۔ ''تو سماع کی روایت بھول بیٹھا تو نے حال کی کیفیت کو پارہ پارہ کیا۔ اب سزا تیرا مقدر ٹھہری۔''

''حضرت جی تم اپنی من پسند گھسی پٹی روایتوں پر قائم رہ کر اصل تاریخ سے منحرف مستقبل کے ادراک سے نا آشنا، بایں ہمہ تم حال مست ہونے کا دعویٰ رکھتے ہو۔ حال جو جاری وقت ہے ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک معلق لمحے کو تھام لینے کی احمقانہ سعی، اُس پر تم نے خود کو عینِ عیون جانا ......اور''

''خاموش رہ منکر۔' 'حضرت جی چیخے'' اسے کھینچ کر اعترافِ گناہ کے کٹہرے میں کھڑا کر دو۔'' مجمع اس ایک اکیلے پر ٹوٹ پڑا۔

رات چھت کے عین درمیان روشن دان سے اگلے پہر کی سیاہی انڈیل رہی تھی۔ وقت ہزار آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ چبوترے کے چاروں جانب آگ بھڑک رہی تھی۔ ہال کے باہر موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔ دیواروں کے رخنوں سے آنے والی تیز ہوا کی سیٹیاں بلند ہو گئی تھیں۔

''حضرت جی یہ ہم سے گھسٹ نہیں پا رہا۔'' مجمع نے شکایت کی۔

''وائے حسرت! تم سب سے یہ ایک اکیلا گھسٹ نہیں پا رہا ...... گویا تم سب ـــــ''

حضرت جی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی زلفیں نوچنے لگے، پھر گرج کر بولے: ''کٹہرے کو گھسیٹ کر اس کے گرد جما دو آج اس کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔''

رات سنگی فرش میں لپ لپ دھنس رہی تھی ۔ وہ ایک اکیلا سوچ رہا تھا کہ بیتے ہوئے ماہ وسال کی ریاضت کیا ہوئی ۔ وقت مسکرا اُٹھا ۔ چبوترے کے گرد شعلے الاؤ کی صورت دھار گئے ۔ ہوا اور بارش میں اور تیزی آ گئی ۔ وہ ان عوامل سے بے نیاز سوچ رہا تھا ۔ بیتے ہوئے مہ وسال کی ریاضت کیا ہوئی ۔ اُن لمحوں کی گنتی ...... کوئی حساب کہیں درج ہے ۔ نہیں کہیں نہیں ...... صرف لوحِ محفوظ پر کہاں ہے یہ لوحِ محفوظ قلب میں یا ذہن میں ؟ پھر ان سوالوں کا جواب اس کی پیشانی پر دمکنے لگا وہ پر یقین سوچ رہا تھا ۔ ذہن میں، ذہن میں، ذہن میں ۔

اعترافِ گناہ کے کٹہرے کو کھینچ کر اس کے گرد جما دو ۔

''مگر حضرت جی ہم اس کٹہرے کو کیسے کھینچیں اس پر تو ہزاروں لاکھوں گناہوں کا بوجھ ہے ۔''

وہ اکیلا خود کلامی میں بڑبڑا رہا تھا ۔ ''نفی میں تو انکار ہے ۔ اپنے وجود کا انکار اور انکار کرنے والا منکر ۔ ابھی تم نے خود تو کہا تھا ۔ مگر میں کیا کروں میری آگہی نے مجھے قتل کر ڈالا اور میرا پارہ پارہ وجود پاتال میں بکھر گیا اور اب میرے حصے کا سارا وقت نزع ہے ...... اچانک اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا وہ اُٹھا اور دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے گائے گیا ۔

خود تیغ زنی بر من نام و گراں کردی
نامِ دگراں کردی، نام دگراں کردی

وہ مستانہ وار تکرار کر رہا تھا ۔

''چپ رہو، گناہ گار ۔'' دیگر کی کیا بات کرتے ہو'' حضرت جی چلا اُٹھے، ''نہیں جانتے ہم نے تمھیں بتایا تھا کہ من دیگرم نیست تم بھی کل کا جز و ہو میں بھی ۔''

اس اکیلے نے ایک فلک شگاف نعرہ مارا ۔

''پکڑا گیا، پکڑا گیا، کہتا ہے کہ من دیگرم نیست ۔''

حضرت جی بھنا کر مجمع میں آن کھڑے ہوئے اور بولے : ''ہاں، ہاں یقین درام، عین الیقین، کہ حق الیقین من دیگرم نیست ۔'' وہ بے خودی کے عالم میں کٹہرے میں جا کھڑے ہوئے، سارا مجمع لحہ کو دم بخود ہوا حضرت جی اعترافِ گناہ کے کٹہرے میں تھے پھر وہ سب اس اکیلے کے گرد رقص کرنے لگے ۔ مگر وہ دائرہ توڑ کر باہر نکل آیا ۔ ایک پُر ہیبت گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہال کی ساری عمارت زمین پر آن گری زمین دھڑک رہی تھی وہ ایک اکیلا جانے کہاں تھا ۔ عمارت کا کھنڈر سیلاب میں گم ہو گیا تھا اور سازشی وقت پانی کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا ۔

☆☆☆☆

نجم الدین احمد

حادثے سے سانحے تک

”میں نے لڑکی کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ اُس کا نرخرہ اُدھڑا ہوا تھا۔ گردن، بازوؤں، پستانوں، پیٹ، رانوں اور کمر کے بالائی حصے پر بے دردی سے بھنبھوڑنے سے گہرے زخم تھے لیکن چہرے اور باقی بدن پر خراش تک نہیں تھی۔ کلائیوں اور ٹخنوں سے اُوپر پنڈلیوں پر رَسّی کے بَٹوں کے لہریے دار گہرے نشان جیسے رَسّی سے سختی سے ہاتھ پیر باندھے گئے ہوں۔ موت کا وقت: رات دس بج کر بیس منٹ، موت کی وجہ: شہ رگ اور سانس کی نالی کٹنے سے خُون کا کثیر بہاؤ اور تنفس کی بندش، بے حد خوف و دہشت کے باعث دِل کی دھڑکن کا بند ہونا تھا۔“

”اور میں نے لڑکے کا پوسٹ مارٹم تو نہیں کیا تھا کیوں کہ اُس کے والد نے اجازت نہیں دی تھی البتہ سرسری معائنہ ضرور کیا تھا۔ وہ خُودکشی تھی۔ نائن ایم ایم پسٹل کی گولی کنپٹی کے دائیں جانب سے داخل ہو کر ترچھی گھومتی ہوئی بائیں کان کے عقب سے حرام مغز کو مَس کرتی ہوئی نکل گئی۔ اور ہاں ایک اور اہم بات...... میری نظریں اتفاقاً اُس کے پیٹ کے نچلے حصے کی دائیں سمت، ہٹی ہوئی شرٹ کی وجہ سے چلی گئیں۔ میں نے زخم کے بڑے بڑے اور پُرانے ٹانکوں کے نشان دیکھے تو تجسس کا شکار ہو گیا۔ میں نے لڑکے کی پینٹ اُتروا کر دیکھا کہ......!“

”فہیم ہمارے ساتھ کاسماس (Cosmos) ہائی سکول میں تیسری جماعت میں داخل ہوا تھا۔ اُس نے پہلی دو جماعتیں گھر ہی پر پڑھی تھیں۔ وہ ایک دبلا پتلا اور پھرتیلا لڑکا تھا۔“

”ہاں، علی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے چند ہفتے وہ خاموش رہا۔ پڑھائی میں بھی اِتنا تیز نہیں تھا۔ سست اور کاہل تھا۔“

”مجھے تمھاری بات سے اتفاق نہیں ہے، ربیعہ۔ وہ سست اور کاہل ہرگز نہیں تھا۔ اِس کا ہمیں بعد میں بخوبی پتا بھی چل گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ شروع میں ماحول سے شناسا ہونے اور دھیرے دھیرے گھلنے ملنے کی کوشش کی وجہ سے چپ چاپ اور اپنے آپ میں مگن رہتا تھا۔ جیسے ہی وہ نئی جگہ اور نئے لوگوں یعنی ہم سے آشنا ہوا اُس کے پَر پُرزے نکلنے لگے۔“

”ناصر کا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ بعد میں وہ نہ صرف پڑھائی میں بہت تیز ثابت ہوا بلکہ خُوب شرارتی بھی۔ وہ ہمیں بھی اپنی شرارتوں میں شریک کر لیتا تھا۔ وہ نئی نئی شرارتیں ایجاد کرتا اور ہمیں اپنے ساتھ ملا لیتا۔“

”جمال، مجھے تمھاری بات سے پُورا اِتفاق ہے۔ وہ واقعی پڑھائی اور شرارتوں دونوں میں بہت

آگے کی چیز تھا۔ اکثر خود بچ نکلتا اور الزام ہمارے سر آتا۔“

”نبیلہ، تم نے اُس کی شخصیت کا بہت حد تک ٹھیک تجزیہ کیا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں ہمیں یُوں کہنا چاہیے کہ اُس نے بہت جلد ہمیں اپنا گرویدہ کرلیا اور ہم اُس کے سامنے پانی بھرنے لگے۔“

”نرگس، تم سے زیادہ اُسے کون جانتا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اُس سے دبتے تھے کیوں کہ وہ بہت امیر باپ کا بیٹا تھا۔“

”ہاں علی، ہم ہی کیا پُوری سکول انتظامیہ ہی اُس سے دبتی اور اُس کے نازنخرے اٹھاتی تھی۔ آخر اُس کا باپ سکول کو ہر ماہ چندے میں خطیر رقم جو دیتا تھا۔“

”ربیعہ تمھارا کہنا اتنا درست بھی نہیں ہے۔ سکول کو چندہ تو ہمارے والدین بھی دیتے تھے۔“

”نرگس، تم تو اب بھی اُسی کی حمایت کروگی!“

”میں اُس کی حمایت نہیں کررہی۔ سکول انتظامیہ گنجے والے حادثے کے بعد اُس سے نرمی سے پیش آتی تھی اور بس۔ تم نے خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں بھی وہیں موقع پر موجود تھا۔ میں بھاگ کر سکول کے اندر داخل ہوگیا تھا لیکن میں نے گیٹ سے دیکھا کہ ڈرائیور، جو ابھی گیا نہیں تھا، پھرتی سے گاڑی سے دوبارہ نیچے اُترا۔ اُس نے سڑک کے کنارے آدھی اینٹ کا روڑا اُٹھایا تو گنجا اُس کی جانب لپکنے کے لیے مُڑا لیکن اُس نے فہیم کو بچاتے ہوئے روڑا سُرعت سے گنجے کو دے مارا۔“

”روڑا گنجے کے پیٹ پر لگا۔“

”وہ لڑکھڑا کر ایک بار گرا لیکن پھر اُٹھ کر بھاگ گیا۔“

”اور دوبارہ کبھی نظر نہیں آیا۔“

”وہ تقریباً تین ماہ ہسپتال میں رہا تھا نا جمال؟“

”ہاں، جب وہ لوٹا تو کتنا کمزور اور زرد تھا! لیکن آہستہ آہستہ اُس کی صحت بحال ہونے لگی لیکن پھر بھی اُس کے پاپا نے اُسے کئی مرتبہ ملک سے باہر علاج کے لیے بھیجا حالاں کہ وہ بالکل ٹھیک ہوچکا تھا۔“

”ہاں ربیعہ، وہ پچھلے مہینے بھی تو گیا تھا!“

”اُسے صرف دو ہی چیزوں سے دِلچسپی تھی، پڑھائی اور ہاکی۔ اِس کے علاوہ وہ سکول تک ہمارا بہت اچھا ساتھی اور دوست تھا لیکن پھر وہ بدلنے لگا تھا۔“

”اُس کا روّیہ عجیب ہوگیا تھا۔ خاص طور پر لڑکیوں کے ساتھ تو بعض اوقات انتہائی بدتمیزی سے پیش آتا۔“

”بعد میں جب اُسے احساس ہوتا اور شرمندگی گھیرتی تو وہ پچھتاوے کا اظہار کرتے ہوئے کھلے دِل

سے معافی بھی تو مانگ لیتا تھا۔ اُس نے تم سے تمھاری سال گرہ والے دِن کی اپنی بدتمیزی پر معافی مانگی تھی نا؟”

“پھر بھی ناصر، کبھی کبھی تو وہ بالکل باؤلا ہو جاتا تھا جیسے اُس میں اُس کتے کا باؤلا پن آ گیا ہو جس نے اُسے بچپن میں کاٹا تھا۔ وہ غرّاتا ہوا کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔”

“ہم اُسے چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ وہ ہمارے بچپن کا ساتھی تھا۔ سکول سے یُونیورسٹی تک ہم ساتھ رہے تھے، ساتھ پڑھے لکھے اور کھیلے کُودے تھے۔”

“ہاں جمال، اِس ایک معاملے کے علاوہ وہ ہمارا بہت اچھا ساتھی اور دوست تھا۔ اُس پر جب دورہ نہ پڑا ہوتا تو وہ نہایت ہم درد، غم گسار اور ساتھ نبھانے والا تھا۔”

“نرگس، تمھیں یاد ہے ایسے کسی بھی واقعے کے بعد وہ کئی کئی دِن کے لیے غائب ہو جاتا۔ بعض اوقات تو پندرہ پندرہ دِن گُزر جاتے لیکن ہمیں اُس کی شکل تک دِکھائی نہ دیتی۔”

“اور جب وہ آتا تو ہمیشہ خُوش گوار مُوڈ میں ہوتا لیکن نڈھال دِکھائی دیتا جیسے کئی روز کا بیمار ہو لیکن زبردستی بستر سے اُٹھ کر آیا ہو۔”

“شاید اُس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا۔”

“یا شاید، ربیعہ، اُسے کوئی ایسی بیماری لگ گئی تھی جسے وہ ہم سے شیئر کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کیوں شکیل؟”

“یہ سب خیال آرائیاں ہیں۔ اُس کی غیر حاضریاں ہمارے لیے معما تھیں لیکن شاید کالج اور بعد میں یُونیورسٹی انتظامیہ کے لیے نہیں کیوں کہ ہمیں محض تین روز کی مسلسل غیر حاضری پر شوکاز نوٹس مل جاتا تھا لیکن اُسے کبھی پُوچھا تک بھی نہیں گیا۔ تم لوگ کیا کہتے ہو؟”

“اُس کا باپ جو بہت اثر و رسوخ والا ہے! اُسے کیوں پُوچھتے؟”

“سکول سے یُونیورسٹی تک صرف ہم ساتوں ہی اکٹھے رہے۔ باقی ساتھی راستے بدلتے چلے گئے۔ کسی نے کوئی شعبہ جوائن کر لیا تو کسی نے بزنس۔ لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم کہ فہیم نے نیہا کا قتل کیوں کیا؟”

“نیہا کے ساتھ ہماری دوستی یُونیورسٹی کے شروع کے دِنوں ہی میں ہو گئی تھی۔”

“پھر آہستہ آہستہ یہ دوستی بڑھتی چلی گئی۔ فہیم کے ساتھ اُس کا تعلق جلد ہی گہرا ہو گیا تھا اور نرگس بے چاری نے اپنے دِل پر پتھر رکھ لیا۔”

“ہاں، اُس کے بعد فہیم نے یُونیورسٹی میں بہت کم چھٹیاں کیں۔ وہ بہت کم غیر حاضر رہنے لگا تھا۔ اُس پر دورے بھی کم پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بہت کم عرصے کے لیے ہوا۔”

“وہ نیہا کو اپنے ماں باپ سے ملوانے اپنے گھر بھی لے کر گیا تھا۔”

“نیہا کو اپنے ماں باپ سے ملوانے کے بعد ...... دو چار روز بعد ہی وہ ایک بار پھر غائب ہو گیا۔

مہینے بھر بعد لوٹا تو ......تو اُس کی حالت سے لگتا تھا جیسے وہ شدید بیمار رہا ہو۔ وہ نہایت شکستہ، ٹوٹا پھوٹا اور مایوس دِکھائی دیتا تھا۔“

”ہم نے بہت کریدا۔ اُس کا مسئلہ دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن اُس نے کچھ نہیں بتایا۔“

”ہاں......لیکن اگلے روز اُس نے نیہا کو شام کو ملنے کے لیے کہا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنا معاملہ صرف نیہا سے ڈِسکس کرنا چاہتا ہے۔ اِس لیے وہ اُس سے ضرور ملے۔“

”اور اگلے روز ہمیں یہ دہشت ناک خبر سننے کو ملی۔“

”فہیم یُونیورسٹی میں ایک اچھے اور ذہین طالب علم کی شہرت رکھتا تھا۔ یُونیورسٹی میں طلبا کو سکول اور کالج کی نسبت زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے اور اساتذہ اُن کے بارے میں کریدتے ہیں نہ اُن پر پابندیاں عاید کرتے ہیں کیوں کہ تب تک وہ میچور ہو چکے ہوتے ہیں۔“

”بل کہ یُونیورسٹی میں اساتذہ طلبا سے جھجکتے ......بل کہ یُوں کہنا چاہیے کہ ڈرتے ہیں کیوں کہ بعض اوقات کسی ایک طالب علم کی معمولی سی شکایت پر بھی طلبا تنظیمیں میدانِ عمل میں کُود پڑتی ہیں اور ہنگامہ بڑھنے سے یُونیورسٹی کو کئی کئی روز کے لیے بند کرنا پڑ جاتا ہے۔“

”اُس کے باپ نے اُس کے کالج میں داخلے کے وقت ہی بتا دیا تھا کہ......اُسے دورے پڑتے ہیں۔ وہ اُس کا علاج کروا رہا ہے جس کے لیے ہفتے پندرہ دِن کے لیے وہ اُسے ہر دو چار ماہ بعد بیرونِ ملک بھیجتا ہے۔ اِسی لیے ہم نے کبھی سختی سے کام نہیں لیا تھا۔“

”پرنسپل صاحب درست فرما رہے ہیں۔ دُوسری بات یہ کہ وہ سب سے زیادہ محنتی اور ذہین و فطین طالب علم تھا۔ جینیئس تھا۔ اُس نے فائنل میں سب سے زیادہ سکور کیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا، نذیر صاحب؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور پرنسپل صاحب نے بھی درست فرمایا ہے۔ وہ اپنے اچھے کھیل کی وجہ سے بھی کالج کی مجبوری تھا۔ وہ کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان بھی تھا۔ جب تک وہ کالج میں رہا ٹیم ایک بھی میچ نہیں ہاری اور ہمیشہ اوّل آ کر قومی سطح پر کپ جیتتی رہی تھی۔“

”ہاں، مجھے اب بھی یاد ہے۔ وہ بہت ذہین اور محنتی لڑکا تھا۔ ہر کلاس میں اوّل آتا تھا۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا، مقبول صاحب؟“

”کیا؟ کیا کہہ رہے ہو، احمد علی صاحب؟ ذرا اُونچا بولو۔“

”صفدر علی خاں کا بیٹا فہیم جو تیسری جماعت میں داخل ہوا تھا۔“

”او ہاں، اچھا۔ وہ لڑکا۔ لیکن وہ کون سا لڑکا تھا؟ مجھے یاد نہیں آ رہا؟“

”وہی جسے ایک بار کتے نے کاٹ لیا تھا۔“

”تو یُوں کہو نا کہ صفدر علی خاں صاحب کا بیٹا۔ ہاں، وہ اچھا لڑکا تھا، پڑھائی میں بھی اور کھیل میں

بھی۔ ہاکی تو اچھی کھیلتا ہی تھا کرکٹ کا بھی بہترین کھلاڑی تھا۔ نویں جماعت سے سکول کی ہاکی ٹیم کا کپتان بن گیا تھا۔ سکول سے کبھی ناغہ نہیں کرتا تھا۔ وقت پر کام کرتا تھا۔ میٹرک میں بھی اُس نے بورڈ میں نُمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔ ہیں نا؟“

”ہاں، اُسی کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کو اب بھی وہ واقعہ یاد ہے۔“

”لو بھلا، یاد کیوں نہ ہو۔ بہرہ ہوا ہوں، یادداشت تو نہیں گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُسے سکول میں داخل ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اُسے ڈرائیور فوکسی کار پر سکول چھوڑنے اور لینے آتا تھا۔ ایک روز صبح سویرے سکول شروع ہونے سے چند منٹ قبل، جب ہم سکول کے بڑے میدان میں اسمبلی کی تیاری کر رہے تھے، ڈرائیور نے اُسے سکول کے گیٹ کے سامنے اُتارا۔ وہ جیسے ہی اُتر کر سکول کے گیٹ کی سمت بڑھا کسی طرف دبکا ہوا ایک ہلکایا ہوا جنونی کُتا نکلا اور بھاگ کر اُس پر حملہ آور ہوا۔“

”کُتے نے اُس بے چاری ننھی سی جان کو بُری طرح کاٹا جس سے اُس کی پینٹ اور قمیص خُون سے بھر گئیں بل کہ اُن سے خُون کے قطرے بھی تسلسل سے ٹپکنے لگے۔ وہاں دُوسرے بچے بھی سکول میں داخل ہونے کے لیے موجود تھے۔ وہ سب چیختے چلاتے گیٹ کو دھکے مارتے اندر داخل ہوئے تو جیسے ایک کہرام بپا ہو گیا۔ ہم سب اسمبلی میدان سے باہر کی طرف بھاگے۔“

”تب تک صُورتِ حال جاننے کے لیے اساتذہ سکول سے باہر نکل آئے تھے۔ چاروں طرف اساتذہ اور بچوں کا جم گھٹ اکٹھا ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے دو اساتذہ کی مدد سے زخمی فہیم کو گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال روانہ ہو گیا۔“

”دو اساتذہ ہم راہ گئے تھے اور بعد میں باقی اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحب بھی ہسپتال گئے تھے۔ مقبول صاحب بھی تیمارداری کے لیے گئے تھے۔ کیوں مقبول صاحب؟“

”ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ زاہد اور اقبال ہم راہ گئے تھے۔“

”اُفوہ، وہ دونوں تو اب اِس دُنیا میں نہیں رہے۔ بس یادیں رہ گئی ہیں۔ بہت سے ساتھی چلے گئے۔ پتا نہیں کب ہماری باری آ جائے۔“

”ہاں، اکثر نہیں رہے۔ شاید ہم دونوں ہی بچے ہیں۔“

”دیکھو، ہم کب جاتے ہیں۔“

”وہ ایک حادثہ تھا، محض ایک حادثہ! بل کہ سانحہ! اور یہ سانحہ بھی ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ ہم اپنا اکلوتا بیٹا کھو بیٹھے ہیں۔“

”اب ہم میں اتنی طاقت ...... یا حوصلہ نہیں بچا کہ اِتنی بڑی جائیداد کے لیے نیا وارث پیدا کر کے پال پوس کے اُس جتنا بڑا کر سکیں۔ اُن کی دو بیٹیاں اور بھی ہیں۔“

''بات صاف ہے۔ وقوعہ واضح تھا۔ لڑکی کے ہاتھ پاؤں درخت سے باندھ کر فہیم نے اُس کا وحشیانہ انداز میں قتل کیا اور خود پسٹل سے خودکشی کر لی۔ اب پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟ کیا معما ہے اِس میں؟''

''ہمیں اُس کی یادیں دہراتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن میں ایک ماں ہونے کے ناطے لڑکی والوں، خاص طور پر اُس کی ماں کا دُکھ سمجھ سکتی ہوں۔''

''ہمیں کبھی یہ شکایت نہیں ملی کہ وہ سکول، کالج اور یونیورسٹی کے اپنے ساتھیوں سے بدتمیزی سے پیش آتا اور اُن پر غراتا تھا۔ یا اُس پر ریبیز کے اثرات تھے؟ اگر ہمیں پتا ہوتا کہ وہ ریبیز کے اثرات سے جنونی ہو گیا ہے اور پاگل ہو کر بالآخر کسی کا خون کر دے گا تو......!''

''شاید ہماری تربیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ یہ اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے اُسے وقت نہیں دے پاتے تھے اور میں اپنی سوشل ایکٹیویٹیز کی وجہ سے۔ وہ تنہائی کا شکار ہو گیا تھا۔''

''اُس نے گھر میں کبھی توڑ پھوڑ کی نہ کبھی ہم سے یا گھر کے ملازموں سے بھی بدتمیزی اور بدتہذیبی سے پیش آیا۔ ہاں، اُس لڑکی سے ملاقات کے بعد سے وہ کبھی کبھار بس اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ کئی کئی دِن بند رہتا۔ اُسے کھانا پینا بھی وہیں پہنچایا جاتا۔''

''وہ مجھ سے ہر وقت نیہا کی باتیں کرتا رہتا تھا۔''

''ہاں، کُتّے نے اُسے اِس بُری طرح کاٹا تھا کہ وہ اُس کے پیٹ اور رانوں کو ادھیڑنے کے ساتھ ساتھ پینٹ پھاڑ کر اُس کے......اُس کے......نُھے سے عضو کی چھوٹی سی بوٹی کو بھی بُری طرح چبا گیا تھا۔ وہاں صرف چھچھڑا ہی بچا تھا، انگلی پر لگی دھجی جیسا۔''

''ہم نے اُس کا بہت علاج کروایا لیکن......''

''میرے پاس تب بھی آج کی طرح بہت دولت تھی۔ میں اُس کے علاج کے لیے سب کچھ لٹانے کو تیار تھا۔ میں اُسے کئی ملکوں میں لے کر گیا۔ میں نے اُس کی پلاسٹک سرجری کروانے کی بھی کوشش کی لیکن اُس زمانے میں پلاسٹک سرجری نے آج جتنی ترقی نہیں کی تھی۔ تب زندہ ریشوں سے پیوند کاری نہیں ہوتی تھی اور اب جب یہ کام شروع ہوا تو زخم بہت پُرانا ہو چکا تھا۔ میرے اصرار پر ڈاکٹروں نے نئے زخم لگا کر سرجری کی کوشش کی لیکن بات نہیں بن سکی۔''

''وہ جب تک بچہ رہا اُسے احساس نہیں ہوا۔ لڑکپن میں بھی معاملہ بہت حد تک نہیں بگڑا تھا۔ لیکن......'' ''وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ اِس کا کوئی اور مصرف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جوانی سب کچھ سمجھا دیتی ہے اور جب وہ سمجھ گیا...... جب وہ سمجھ گیا کہ وہ اپنے بدن کے فطری تقاضے پُورے کرنے کا اہل نہیں، اپنے جذبات کی تسکین سے عاری ہے تو اُس پر دورے پڑنے لگے۔ اُس لڑکی، نیہا کی محبت نے اُس پر مایوسی اور محرومی کے مزید در کھول دیے تھے۔ وہ نیہا کو کسی اور کا ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا اور خود اُسے اپنانے کا......''

عامر رضا

زحل مشتری کے اثر میں

دن بھر میں چار حجامتیں جن میں کبھی کبھار ایک آدھ ٹنڈ بھی شامل ہوتی اور کوئی پانچ سے چھ شیویں، امجد نائی کی کل آمدنی کا ذریعہ یہی تھا۔ شیو کروانے والا اگر کوئی تگڑا دکان دار ہوتا تو اس کے ناک کے بال مفت میں کاٹنے پڑتے اور مٹھی چاپی الگ سے۔ اگر کہیں کوئی ہاتھ سخت پڑ جاتا تو دکان دار ایک موٹی سی گالی بھی دے دیتا۔
''حرام خور پولا پولا دبا۔'' وہ اس گالی پر غصہ پیتا اور ہاتھ کا دباؤ ہلکا کر دیتا۔

قلندری کریانہ سٹور کے مالک شیخ ''قہر الٰہی'' سے وہ سب سے زیادہ تنگ تھا۔ شیخ صاحب کا اصل نام تو فضل الٰہی تھا لیکن قہر الٰہی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ محلے والے قلندری کریانہ سٹور کا نام بھی کم ہی لیتے تھے عموماً ''شیخ قہر الٰہی دی ہٹی'' کہتے تھے۔ امجد کے لیے شیخ صاحب کو برداشت کرنے کی وجہ وہ ادھار تھا جو شیخ صاحب گاہے بگاہے بیسوں کڑوی کسیلی باتیں سنانے کے بعد دے دیا کرتے تھے۔ جس کا سود ان کے سب سے چھوٹے یعنی ساتویں بیٹے کی حجامت کی صورت میں چکانا پڑتا تھا اور اگر شیخ صاحب بیٹے کی حجامت نہ کرواتے تو پوتے کی ٹنڈ ضرور کروا لیا کرتے تھے۔

جمعے کا سارا دن شیخ صاحب کی نذر ہو جاتا۔ دن کا آغاز خط بنانے سے ہوتا جس میں اسے اتنا ہی وقت لگتا جتنے میں وہ چار چھوٹی اور ایک بڑی حجامت کر سکتا تھا۔ خط کے بعد شیخ صاحب کی پکوڑے جیسی پھولی ہوئی ناک سے بال کاٹنا اسے عذاب لگتا۔ شیخ صاحب کی ریش اور بالوں کو رنگنے کے بعد وہ دکان میں بیٹھے ایک آدھ گاہک کو بھگتانے کے قابل ہو ہی جاتا۔ اس دوران میں شیخ صاحب خبروں کا بقیہ والا صفحہ پڑھتے رہتے اور حکومت کی کارکردگی پر تبصرے رواں رکھتے۔ ہر تبصرے کے ساتھ ایک آدھ غلیظ قسم کی گالی بھی چپکاتے جاتے۔ خضاب کے خشک ہوتے ہی اخبار سائیڈ پر رکھتے دوسری جنگ عظیم کی پن اپ گرلز کے پوز میں بازو اٹھا کر سر پر رکھتے۔ ''چل بیٹا بغلوں کے بال اتار دے۔۔ چاول کے دانے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔'' یہ لمحہ اس کی زندگی میں سب سے زیادہ تلخ ہوتا۔ پسینے کی بو، جو سرانڈ کی شکل اختیار کر چکی ہوتی جب اس کے نتھنوں سے ٹکراتی تو اس کا سانس بند ہونے لگتا۔ گلے میں تھوک کا ایک پھندہ سا بن جاتا جسے وہ بال اتارتے ہوئے منہ دوسری طرف کر کے گلا صاف کرتے ہوئے زور سے تھوک دیتا۔ تھوک کی یہ تھرو اتنی تیز اور زوردار ہوتی کہ وہ دکان کراس کرتے ہوئے سڑک پہ جا گرتی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ دکان پر لکھ کر لگا دے۔ ''' بغلوں سے بال نہیں اتارے جائیں گے'' لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ کہیں اس کے رہے سہے گاہک بھی نہ چلیں

جائیں۔ شیخ کی بغلوں کو صاف کرتے ہوئے اس کی نظر اکثر ناصر پر پڑ جاتی، جس نے اس کی دکان کے سامنے بلیرڈ کا میز لگایا ہوا تھا۔ وہ نہا دھو کر، پاؤڈر لگا کر گھر سے دوپہر کے قریب نکلتا اپنی دکان کھولتا اور کام پر بیٹھ جاتا۔

سکول کی چھٹی کے بعد ناصر کی دکان کی رونق بڑھنے لگتی جو رات آٹھ بجے تک جاری رہتی۔ بلیرڈ کھیلنے کے لیے جو لڑکے آتے وہ اس کی دکان پر بھی بیٹھ جاتے، بالوں کو فوارے سے پانی کا سپرے مارتے کنگھی کرتے اور جو زیادہ بے تکلف ہوتے وہ تبت پاؤڈر بھی دراز سے نکال کر لگا لیتے۔ وہ لڑکوں کی اس حرکت سے تنگ ہونے کے باوجود انھیں کچھ نہ کہتا۔ لڑکوں کی دھما چوکڑی کو برداشت کرنے کی دو وجوہات اور بھی تھیں۔ پہلی وجہ بجلی کی لوڈ شیڈنگ تھی، جس نے اس کے کاروبار کو کافی متاثر کیا تھا۔ یو پی ایس نہ ہونے کی وجہ سے اسے شیو کرنے اور بال کاٹنے میں کافی مشکل ہوتی۔ کئی دفعہ تو یہ بھی ہوا کہ شیخ صاحب کی ریش کا خط ترشا ہو گیا اور جب اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ شرعی تقاضوں سے کم ہو گیا۔ جس پر شیخ صاحب سے اسے کئی بار مغلظاتِ مادر پدر بھی سننا پڑیں۔ دوسری وجہ ڈنڈی ہیر کٹنگ ایئر کنڈیشن سیلون تھا۔ جس کے سائن بورڈ پر جلی حروف سے "بجلی بند ہونے کی صورت میں جنریٹر کا انتظام موجود ہے۔" لکھا ہوا تھا۔ دکان کے اندر دیوار کے ساتھ بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر پر امپورٹیڈ کاسمیٹکس ترتیب سے چنی گئی تھیں۔ الیکٹرک ریزر چارجنگ پر لگے نظر آتے۔ گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے صوفوں کا انتظام کیا گیا تھا اور ہر صوفے کے ساتھ موبائل چارجنگ کی سہولت الگ سے دی گئی تھی۔ ہیر سٹائل کی تصویروں والے کیٹلاگ اور پرانے انگریزی رسالے بھی صوفے کے سامنے پڑی میز پر رکھے گئے تھے تا کہ رش کی صورت میں گاہک سکون سے بیٹھ کر رسالوں کو دیکھتا رہے۔ "دیواروں پر سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔" تو نہیں لکھا ہوا تھا البتہ ٹی وی کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹس جو کہ فاصلے سے پڑھا جا سکے ضرور آویزاں تھا جس پہ لکھا تھا "نیوز چینل لگانا منع ہے۔"

دکان چوں کہ بڑی تھی اور سرمایہ کافی لگا ہوا تھا اس لیے اس کے ریٹ بھی زیادہ تھے۔۔ اے سی روم ہونے کی وجہ سے ڈنڈی ہیئر کٹنگ والوں نے بغلوں کی صفائی سے معذرت کر لی تھی اور لکھ کر لگا دیا تھا کہ "کشمیر کی آزادی تک بغلوں کی صفائی بند ہے۔" اور اس کے نیچے بگ پاکی ریزر کا اشتہار چسپاں تھا جس میں ایک لڑکا ٹوپی پہنے اذان دے رہا تھا۔ اگر کبھی کوئی بغلوں کے بال اترونے کی خواہش کا اظہار کرتا تو اس کے کان میں ایک ہی آواز پڑتی "پاکی پائیں پاک ہو جائیں" اور خواہش کا اظہار کرنے والے کی نظر خود بخود بگ پاکی کے اشتہار کی طرف اٹھ جاتی۔

امجد کے پاس اب وہی لوگ آتے تھے جو حجامت اور شیو کے ساتھ بغلوں کی صفائی جھونگے میں کرواتے۔ بلیرڈ کھیلنے والے لڑکے اب ادھم اس کی دکان پر مچاتے لیکن بالوں میں سپایکس ڈلوانے کے لیے ڈنڈی کا رخ کرتے کہ امجد سپایکس کے نام پر پرانی طرز کی فوجی کٹنگ کر دیتا۔ جو اس نے اپنے باپ سے سیکھی تھی۔ جس دن لوڈ شیڈنگ طویل ہو جاتی اس دن اس کی بکری بھی کم رہتی۔ دکان کا کرایہ نکالنا مشکل ہوتا جا رہا

تھا۔ جیسے جیسے شیخ صاحب کے ادھار کی رقم بڑھتی اس تناسب سے مغلظات مادر پدر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا اور اب منجھلے لڑکے کی شیو بھی فری ہونے لگی تھی۔ کبھی کبھار وہ حاتم طائی کی قبر پہ لات مارتے ہوئے ٹریٹ کا لاکا ایک بلیڈ دکان سے جیب میں ڈال کے آجاتا۔ آدھے بلیڈ سے شیو اور آدھے بلیڈ سے بغلوں کی صفائی۔ فرق بس اتنا تھا کہ لڑکے کی بغلوں سے شاہ عالمی کے دو نمبر باڈی سپرے کی دھیمی سے خوشبو آتی تھی۔

رات کو دکان بند کر کے، ناصر کے پاس آ بیٹھنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ جب ناصر کاپی میں دکان کا حساب کتاب اور دن بھر کی آنے والے چائے کا کھاتا لکھنا شروع کرتا تو وہ سوچوں میں گم اپنی قلیل آمدنی اور ڈنڈی کے رزق کی فراوانی کا حساب کتاب کرتے کرتے بڑبڑانے لگتا۔

"اج فیر بتی بند رہی، حالات انج ای رہے تے ہٹی بالکل بند ہو جائے گی۔"

"تو وی جنریٹر لے لے" ناصر کاپی پر حساب کتاب لکھتے ہوئے نظر اٹھائے بنا کہتا۔

"دکان چلدی نہیں تے جنریٹر لے لے۔ گھر کھان نوں نیں تے ماں پہنے گئی۔" اس نے ناصر کو کاپی پر ٹوٹل لگاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ اگر چہ ٹوٹل کی رقم کچھ زیادہ تو نہیں تھی لیکن امجد کی اوسط آمدنی کے برابر ضرور تھی۔ یہی وہ موقعہ تھا جب وہ ناصر سے چائے کی فرمائش کر سکتا تھا اور اس نے موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

"اوہر ویلے چا، چل کچھ ہور پینے دیں آں۔" ناصر نے کاپی بند کر کے دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے روپے جیب میں ڈالے، دکان کی لائٹس بند کیں اور دونوں بازار کے عقب میں واقع اندھیر میں ڈوبی ہوئی گلیوں سے گزرتے ہوئے ناصر کے گھر پہنچے۔ اس دن اس کے گھر کوئی نہیں تھا۔ بیوی کرمس کی چھٹیوں کے لیے پنڈی گئی ہوئی تھی۔ اس لیے گھر میں ہر طرف بے ترتیبی کا راج تھا۔ دونوں گھر کے چھوٹے سے برآمدے میں، جس سے کچن کا کام بھی لیا جاتا تھا، بیٹھ گئے۔ ناصر نے لکڑی کی ایک چھوٹی سی میز پر مری بروری کی وسکی، دو گلاس اور نمکو کی ایک پلیٹ لا کے رکھ دی۔ ناصر نے بوتل کھولی دو پیگ بنائے۔ اپنا پیگ اس نے ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا البتہ امجد ہاتھ میں گلاس پکڑے بیٹھا رہا۔

"گلاس ہتھ وچ پھڑ کے نہیں بل کہ خالی کر کے سوچی دا اے۔" ناصر نے دوسرا پیگ بناتے ہوئے کہا۔ امجد نے کچھ کہے بنا شراب کا ایک گھونٹ لیا آنکھیں بند کر کے ناک چڑھائی جیسے کوئی بچہ دوائی کڑوی ہونے کا تاثر دے رہا ہو۔ اس کی شکل کے ڈیزائن دیکھ کر ناصر کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ناصر کو ہنستا دیکھ کر اپنی شرمندگی چھپانے اور مردانگی دکھانے کے لیے اس نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔ اس بعد کیا تھا دونوں نے ایسا ہلا مارا کہ آن کی آن میں پوری بوتل خالی کر دی۔ امجد پہلے تو گم سم بیٹھا رہا وہ اپنے پاؤں کی انگلیوں کو مسلسل اوپر نیچے کر رہا تھا، جو آہستہ آہستہ سن ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا تو اسے ایک عجیب سا لطف آیا جیسے اس کے عصاب کا تناؤ کم ہو گیا ہو۔ وہ بار بار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ گرمی کی ہلکی سی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ پورے جسم میں پھیلنے لگی۔ دکان اور کھانے کمانے کی فکر

اس کے ذہن سے اتر گئی تھی۔ ہوا میں گھورتے ہوئے اس نے اچانک شیخ کو موٹی سی گالی دی۔ ”حرامی دیاں بغلاں گرمیاں ہوں یا سردیاں کسی گٹر وانگ بو ماردیاں نیں، کئی واری دل کیتا کہ استرا پھیر چھڈاں لوگ اینوں جیسی قہر الٰہی کہندے نیں۔۔۔۔“

”تے پھیر دیناسی۔“ ناصر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”یار تھوڑا جیہا ادھاروی۔ تے اوہدے کولوں ای ملدا اے۔“ امجد نے سگریٹ پکڑنے کے لیے ناصر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس رات وہ شیخ فضل الٰہی اور ڈنڈی ہیر کٹنگ سیلون والوں کے بارے میں پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتا رہا۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ کب گھر آیا کب سویا۔ صبح اٹھا تو جو چیز اسے یاد تھی وہ رات کو آنے والا ایک بھیانک خواب تھا۔ جس میں وہ بغل کے چھوٹے چھوٹے لیس دار بالوں کے ڈھیر میں منہ تک دھنسا ہوا تھا وہ باہر نکلنے کے لیے جتنا زور لگاتا تھا اتنا ہی اس ڈھیر میں اور دھنس جاتا تھا۔ وہ اسی خواب سے ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

اس روز کے بعد ناصر کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینا شیخ اور ڈنڈی ہیر کٹنگ سلون کو گالیاں دینا اور لیس دار بالوں کے خواب سے ہڑبڑا کر اٹھنا اس کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ کبھی کبھی نشے میں وہ ناصر سے کہتا:

”توں ٹھیک ہے، پاوڈر لا کے دکان دا پھٹا چکیا تے بکری شروع۔۔ یار مینوں وی ایجی میز تے گینداں لے دے“ وہ ہوا میں انگلی سے بلیرڈ سٹک بنا کے اس کو آگے پیچھے کرتے ہوئے کہتا۔

”ماما ایڈا سوکھا کم وی نیں۔“ ناصر اس کی حرکت پر مسکراتے ہوئے کہتا۔

صبح دیر سے اٹھنا اور دکان پر لیٹ آنا اس کی عادت بن گئی۔ جمعے کے دن جب وہ کافی دن چڑھے دکان پر پہنچتا تو شیخ صاحب کو اپنا منتظر پاتا۔ شیخ صاحب ماں کی موٹی سی گالی سے اس کا استقبال کرتے اور پھر جلدی جلدی ہاتھ چلانے کا حکم صادر فرماتے۔ اس دوران میں وہ دبے لفظوں میں اس کی اور ناصر کی دوستی پر تنبیہہ بھی کرتے جاتے۔ جب وہ فائنل ٹچ کے بعد اپنا کرتا اٹھاتے تو اسے جھاڑ کر اس کی جیب میں سے امجد کے ہفتے بھر کے ادھار کی پرچی نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیتے۔ اس کا کاروبار اب کافی حد تک ختم ہو چکا تھا۔

صورت حال سے تنگ آ کر اس نے روزگار کے متبادل مواقع تلاش کرنا شروع کیے۔ بہت دن تک سوچتا رہا اس نے بلیرڈ کی میز لگانے کے امکانات کا بھی جائزہ لیا۔ لیکن اس میں بڑی قباحت ناصر کی دکان تھی۔ اگر وہ بھی بلیرڈ کا کاروبار شروع کر لیتا تو ناصر کے کام پر اس کا اثر پڑتا، اور ویسے بھی ناصر اس کا یار تھا پھر اس کے ساتھ پینا پلانا بھی چلتا تھا اور اگر وہ ایسا کر بھی لیتا تو پھر بھی دوسری قباحتیں اپنی جگہ موجود تھیں جیسے اس کی دکان میں میز رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ اگر وہ بازار میں میز رکھتا تو نوری الیکٹرک سٹور کا فرنٹ مارا جاتا اور ساتھ ہی قادری کریانہ سٹور کا مالک بھی متاثر ہوتا۔۔ کئی دنوں تک اس نے اس بات پر غور کیا۔ لیکن اسے کوئی ایسا راستہ نہ سوجھا جس پر چلتے ہوئے وہ اپنے بزنس کو تبدیل کر سکتا یا پھر اضافی آمدن کا کوئی ذریعہ بنا سکتا۔

گھر میں بیوی کے ساتھ لڑائی اور مار پیٹ ایک معمول بن گیا تھا۔ مار کھا کے وہ دو کو سنا سے دیتی تو تین گالیاں ناصر کو بھی رسید کرتی۔ پہلے پہل تو محلے والے لڑائی جھگڑے میں بیچ بچاؤ کرواتے رہے لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی تنگ آنے گئے۔ شیخ صاحب کے بڑھتے ہوئے قرض کے بدلے میں اس نے بیوی کو ان کے گھر جھاڑو پونچھے پر لگا دیا تھا۔ غریب عورت اگر خاندان کی طرف سے آسرا ہوتا تو شاید کبھی بھی یہ کام نہ کرتی لیکن حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں تھا۔ شیخ صاحب کی بیوی اس کے سر پر کھڑی ہو کر پورے گھر کی صفائی کرواتی اور ساتھ ساتھ پند و نصائح بھی جاری رکھتی۔ اس نے امجد کی بیوی کو دکان اور گھر کی خیر و برکت کے لیے بہت سے وظیفے بھی یاد کروا دیے تھے اور ایک پیر کا پتہ بھی دیا تھا جس سے وہ رزق کی برکت کا تعویذ لے کر آئی تھی۔ یہ اس تعویذ کی کرامت تھی کہ شیخ صاحب کی دکان نے دن دگنی رات چگنی ترقی کی تھی۔

امجد کی بیوی نے اسے پیر کے پاس جانے کو کہا، کچھ دنوں تک تو وہ ٹالتا رہا لیکن جب بیوی مسلسل پیچھے پڑی رہی اور رزق کی تنگی اسے گھن کی طرح چاٹنے لگی تو ایک دن وہ پیر روپی شاہ کے آستانے پر حاضر ہوا۔ آستانے کے دربان نے پہلے اس کا ایک تفصیلی انٹرویو لیا، کون ہے، کہاں سے آیا ہے، کیوں آیا ہے، آگے پیچھے کون ہے اور ذریعہ معاش وغیرہ کیا ہے۔ سارے سوالات کے جوابات سن کر دربان کے چہرے پر کوئی خاص خوشی نہیں آئی تھی اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ شخص دو ہزار تک کا ہدیہ بھی بڑی مشکل اور چون و چراں کے بعد نکالے گا۔ اس لیے اس نے اسے اگلے ہفتے کی تاریخ دے دی کیوں کہ وہ ہفتہ بکنگ کے لحاظ سے ابھی تک خالی جا رہا ہے۔

"اس ہفتے مشتری زحل کے پاس ہے زہرہ کی پوزیشن کمزور ہے۔ اگلے ہفتے زحل مشتری کے اثر سے نکل جائے گا۔ اگلا ہفتہ تمھارے لیے بہت مبارک ہے۔ بہت سے بند تالے کھل جائیں گے اور کئی کام نکل جائیں گے۔" دربان نے ایک سلیٹ پر حساب لگاتے ہوئے کہا۔ اس نے اسے ایک وظیفہ بھی بتایا۔ جو اسے کر کے آنا تھا۔

"دو ہجار ایک روپیہ لے کر آنا۔" دربان نے اسے ایک چٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔

"دو ہزار؟" امجد نے چٹ پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ چٹ کو کھولنے ہی والا تھا جب دربان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"گھر جا کے پاک صاف ہو کے کھولنا۔ دو ہزار آستانے کے لیے ہے شاہ جی پر تو صرف ایک روپیہ ہلال ہوگا۔۔۔۔۔ سمجھے۔"

امجد نے چٹ جیب میں ڈالی اور گھر آ گیا۔ بیوی کو سارا ماجرا سنا دیا۔ وہ بھی دو ہزار کی نذر نیاز کا سن کر پریشان ہوئی۔ رات کو دکان پر شراب پیتے ہوئے اس نے ناصر سے سارا قصہ بیان کیا۔ شراب زیادہ چڑھی تھی یا پھر اس وقت زحل مشتری کے اثر سے نکل گیا تھا ناصر نے فوراً دو ہزار روپیہ جو اس نے دکان کے کرائے

کے لیے رکھا تھا امجد کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

''اگر ایہدے نال تیرے رزق وچ برکت پے جاوے۔ تے کوئی زیادہ پیسے نہیں۔'' اس نے امجد کا گال تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ امجد نے پوری یک سوئی کے ساتھ وظیفہ کیا اور دو ہزار روپے لے کر روپی شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب نے اپنے پاس بڑی عزت و احترام سے بٹھایا۔ اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھتے رہے۔ پھر زعفران سے ایک چھوٹے سے کاغذ پہ آڑھی ترچھی لکیریں لگا اسے ایک خاص انداز سے بند کر ناصر کے حوالے کیا۔

''اسے چمڑے میں مڑھوا کے گلے میں ڈالنا ہے۔۔۔ اس سے زحل مشتری کے اثر سے نکل آئے گا زہرہ کی پوزیشن مضبوط ہوگی۔'' روپی شاہ نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

کئی دنوں تک وہ معمول کے مطابق دکان کھولتا رہا۔ گاہکوں کا انتظار کرتے کرتے وہ ایک آدھ بار آسمان کی طرف منہ اٹھا کے بھی دیکھ لیتا۔ ''پتہ نہیں ایس مشتری نے کدوں جان چھڈنی اے۔'' ایک رات وہ اور ناصر بیٹھے شراب پی رہے تھے جب ناصر کی بیوی نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ جب دونوں بھاگ کر اندر گئے تو اس کے بیٹے کی حالت خراب تھی وہ قے کر رہا تھا۔ ناصر بیٹے کو اٹھا کے ہسپتال لے گیا۔ بچے کو ہیضہ ہو گیا تھا۔ اسے ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ ناصر کے پاس جو پیسے تھے وہ اس نے ہسپتال کی فیس میں دے دیے۔ جب اس کا بچہ ہسپتال سے ڈس چارج ہوا تو اس کے پاس جیب میں ایک پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ اس نے امجد سے رقم کی واپسی کا تقاضا کیا۔ امجد نے اسے امید دلائی کہ جوں ہی زحل مشتری کے اثر سے نکلے گا وہ اسے اس کی رقم لوٹا دے گا۔ تین چار دن بعد اس نے پھر امجد سے تقاضا کیا وہ پھر ٹال گیا۔ ایک دو روز بعد اس نے پھر پیسوں کے بارے میں پوچھا لیکن امجد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگلے روز دکان کے مالک نے ناصر کو کرایہ وقت پہ نہ دینے پہ بھرے بازار میں کھری کھری سنائیں اور وارننگ دی کہ اگر اس نے ایک ہفتے اندر اندر کرایہ نہ چکایا تو وہ اسے اپنی دکان سے چلتا کرے گا۔ اس رات امجد جب اپنی دکان بند کر رہا تھا تو ناصر نے اسے آن لیا۔ دونوں میں پہلے تو تو میں میں ہوئی اس کے بعد بات ہاتھا پائی پہ اتر آئی۔ جس میں ناصر نے امجد کے گلے سے تعویذ نوچ لیا جو لڑائی میں زمیں پہ آن گرا۔ اردگرد کھڑے لوگوں نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ دونوں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ بظاہر معاملہ فوری طور پہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن اس زحل کا کیا کریں جو مشتری کے اثر میں تھا۔ امجد نے گھر آ کر کپڑے بدلے گلے پہ ہاتھ، مارا تو تعویذ غائب تھا۔ اسے یاد آیا کہ تعویذ لڑائی کے دوران میں ناصر نے اس کے گلے سے نوچ کر زمیں پہ پھینکا تھا۔ چارپائی پہ لیٹا ہوا دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں کب اس کی آنکھ لگی۔ صبح پھر وہ ایک بھیانک خواب سے ہڑبڑا کے اٹھا۔ لیکن اس بار خواب کچھ مختلف نوعیت کا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ناصر انھی لیس دار بالوں میں دھنسا ہوا ہے اور وہ ایک بالٹی میں بال بھر بھر کر ناصر کے سر پہ ڈال رہا ہے۔ اس کے جسم پہ رات جہاں جہاں کے لگے تھے وہاں ہلکے ہلکے نیل

پڑ گئے تھے اور ایک انگلی میں شدید درد تھا جو لڑائی کے دوران میں ناصر نے پکڑ کر کھینچی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن تھوڑی تکلیف ہوئی وہ پھر بستر پر لیٹ گیا۔

دوپہر تک پورے بازار میں تعویذ کی بے حرمتی کی خبر پھیلی ہوئی تھی۔ شیخ صاحب غصے میں امجد کو مغلظات دے رہے تھے کہ اس کی وجہ سے پیر روپی شاہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے تعویذ کی بے حرمتی ہوئی ہے۔

''میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ یہ چوڑا لڑکوں کو برباد کر رہا ہے۔۔۔ سارا دن سکول نہیں جاتے تھے یہاں کھڑے بلیرڈ کھیلتے ہیں۔ لڑکیوں کو بھی چھیڑتے تھے۔ اب سب اُس عذاب کو بھگتنا جو تم لوگوں پہ آئے گا۔'' شیخ صاحب نے غصے میں ان دکان داروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ان کی دکان پر اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے بلائے گئے تھے۔

''میرا تاں ایہدے وچ کوئی قصور نہیں میں تاں تو ہانوں سب سچ دس دتا اے۔'' امجد نے مسکین شکل بناتے ہوئے کہا۔

چند ایک تحمل مزاج دکان داروں نے بات رفع دفع کرنے کی کوشش کی لیکن معاملہ اس وقت خراب ہو گیا جب ناصر دکان کھولنے کے لیے پہنچا اسے دیکھتے ہی چند جذباتی قسم کے نوجوانوں نے اسے گالیاں دینا شروع کر دی۔ وہ حیرت سے سب کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑوں کی بارش شروع کر دی۔ ایک کی طرف سے پہل ہونے کی دیر تھی کہ پورا بازار کار خیر میں حصہ لینے کے لیے امڈ پڑا۔ بلیرڈ کی سٹکس سے مار مار کر انھوں نے اسے ادھ موا کر دیا۔ ہنگامے کی خبر جب ناصر کے محلے میں پہنچی تو وہاں سے چند جوشیلے نوجوان جائے وقوعہ کی جانب لپکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بازار میں گھمسان کا رن پڑ گیا۔ ٹی وی چینلز پر دو گروہوں کے درمیان تصادم کی بریکنگ نیوز چلنے لگی۔ شام تک بازار کے عقب میں واقع مسیحیوں کا محلّہ مکمل طور پر جل چکا تھا۔ پولیس نے پوزیشن سنبھال لی تھیں اور حکومتی نمائندے اور افسران مختلف چینلز کو بیپر دینے میں مصروف تھے۔ این جی اوز نے فیس بک کے صفحات پر دو تجل کے اعلانات کر دیے تھے۔ رات تک مکانات میں لگی آگ ٹھنڈی ہونے لگی۔

تین ماہ بعد زہرہ کی پوزیشن مضبوط ہو گئی تھی زحل نے مشتری کے اثر سے خود کو آزاد کروا لیا تھا۔ امجد نے روپی شاہ کا تعویذ بلیرڈ کی میز کے ساتھ بھی باندھ دیا تھا۔ اب وہ شیخ صاحب کی بغلوں کی صفائی کرتے ہوئے ایک نظر بلیرڈ کی میز پر بھی ڈال لیتا تھا کہ کہیں کوئی لڑکا اسے چونا لگا کے نہ نکل جائے۔

☆☆☆☆

تیمور اختر

عالمِ برزخ

میرے وجود کی کتھا بڑی کرب ناک ہے۔ اگر یوں کہو کہ میری زیست کی کہانی بڑی پرسوز تھی تو غلط نہ ہوگا۔ میری زندگی مدوجزر کی ایک داستان ہے۔ میں 23 دسمبر 1984ء کو لندن میں پیدا ہوا۔ میرے جسم کو پیٹر برگ کا نام دیا گیا ویسے بھی نام کے معاملے میں ہم اختیار رکھ بھی کیسے سکتے ہیں۔ ماں میرے جنم کے پانچ برس بعد وفات پا گئی تھی اوراس کے بعد میری ساری ذمہ داری میرے والد اسٹیفن کے سر پڑی انھوں نے میری ہر اس خواہش کو پورا کیا جس کا میں اظہار کرتا۔ میرے پاس آسائشیں تھیں میں کھل کر زندگی جی سکتا تھا اور جیا۔ سازگار ماحول نے میرے شوق کو پروان چڑھایا اور میں نے سیاح بننا پسند کیا۔ جب کبھی زندگی میں خواہش اور ضرورت کی جنگ ہوئی تو جیت ہمیشہ خواہش کی ہوئی اور مجھے اس سارے عمل کا افسوس بھی نہیں تھا۔

زندگی کا سولھواں برس تھا جب پہلی بار میں نے اپنے اندر مستور جنس کے جذبے سے آشنا ہوا، جب میں اور کولن ہائیڈ پارک میں ملے تھے۔ شام گزارنے کے بعد رات بھی ہم نے اکٹھی گزاری تھی۔ پہلی دفعہ جسمانی ملاپ نے میرے اندر برقی لہریں پیدا کر دی جو اگلے کچھ دنوں میرے دل و دماغ میں مرتعش رہی تھیں۔ اب ہماری ملاقات ہر ہفتہ کے اختتام پر ہوتی تھی۔ اس دوران میں مجھے شراب نوشی کی ہلکی سی عادت پڑ گئی جو باقاعدہ نہیں تھی۔ کبھی کبھی زندگی یوں کروٹ بدلتی ہے کہ ہمیں اندازہ تک نہیں ہوتا ہے کہ کونسا لمحہ ہمارا منتظر ہے۔ متھلڈا سے ملاقات بھی ایک ایسا ہی لمحہ تھا۔ یہ اپریل کی بات تھی جب دوپہر کے وقت کالج سے واپسی پر میں اور متھلڈا ایک ہی سٹاپ پر اترے۔ کچھ چیزیں ہمارے پاس ہوتی ہیں بس احساس دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری پہلی ملاقات نہایت خوشگوار موڈ میں ہوئی تھی۔ متھلڈا ہمارے فلیٹ سے تھوڑا فاصلے پر رہتی تھی اوراب ہماری ملاقات اکثر ہونے لگی اورانھی دنوں میں کولن کو مکمل طور پر بھلا چکا تھا۔ اب ہم گھنٹوں فلیٹ کے سامنے پارک میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ میرے لیے ایک دم سے ساری چیزیں غیر اہم ہوگئی تھیں تمام خوبصورت لڑکیاں، وقت کام، مشاغل سب کچھ اگر کچھ تھا تو صرف متھلڈا ہی تھی۔ اسی سال کے اختتام پر جب میری عمر چوبیس برس اور متھلڈا اکیس برس کی ہو چکی تھی جب ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے وہ ایک سٹور پر کام کرنے لگی تھی اور میں بطور سیاح مہینوں سفر میں گزار کر واپس آتا مگر اس کے پیار اور رویئے میں کوئی دیکھنے کو نہ ملتا۔ میں نے سیاح کے طور پر بہت سارے ممالک دیکھے امریکہ، افریقہ، چین، جاپان وغیرہ مختلف میگزین اور اخبارات میں ان کی ثقافت، تہذیب رسم ورواج

کے متعلق لکھا بھی........ اس دوران میں وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ احساس تک نہ ہوا، میں دیگر انسانوں کی طرح سوچتا کہ وقت کیسے گزرا؟

فلپس اور جینی دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو گئے تھے وہ دونوں نہ صرف صورت کے لحاظ سے متھلڈا پر گئے تھے بلکہ عادات کے لحاظ سے محنتی اور کم گو بھی تھے۔ فلپس جرمنی میں آٹو انجنیرنگ کی تعلیم کے لیے مقیم تھا اور جینی امریکہ میں فلائی تحقیقی ادارے سے منسلک ہو گئی اور وہ ہر چھ مہینے کے بعد آتی تھی اور اب کی بار ایک برس بیت چکا تھا کہ جینی مصروفیت کے باعث گھر چکر نہ لگا سکی۔ جینی کا چکر نہ لگانا میرے لیے باعثِ تشویش نہ تھا۔ ایک مفکر کا قول ہے کہ "پرندوں کے بچے جب اڑنا سیکھ جاتے ہیں تو وہ ماں باپ کے بنائے ہوئے آشیانوں میں واپس نہیں آتے"۔ ویسے اب میں اس قول کی صداقت کو جان چکا تھا۔

نومبر کی شام تھی، بے وجہ گاڑی چلاتے ہوئے اور موسیقی سنتے ہوئے لندن شہر سے بہت دور نکل آیا تھا۔ سرمئی شام تاریک رات کا روپ دھار رہا تھا بلند آواز میں موسیقی کے بول میرے کانوں سے ٹکرا رہے تھے:

I'm so lonely broken Angel

I'm so lonely, listen to my heart

اچانک موڑ سے میری گاڑی جب گہری کھائی میں جا گری، میں شدید زخمی تھا میرا سر ٹوٹی ہوئی گاڑی کے اسٹیرنگ پر تھا۔ گانا بند ہو چکا تھا اور میں ہمیشہ کے لیے گہری نیند سو گیا۔ وہ میرے جسم کی آخری شام تھی سارے مناظر بدل چکے تھے۔

میں یہ کیسے تاریک گڑھے میں ہوں، کہیں یہ قبر تو نہیں؟ اف کس قدر بھیانک سناٹا اور تنہائی ہے، کس قدر دہشت زدہ منظر ہے۔ کیا یہاں بھی کوئی وقت ہے؟ کیا وقت گزرے گا؟ مجھے کتنا وقت ہو گیا ہے اس حالت میں اور یہ تنہائی اُف.......... قبر کا عذاب قبر کی تنہائی سے بڑھ کر کیا ہوگا میں اس تنہائی سے عاجز آچکا تھا اور میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے اوپر اٹھنے کی کوشش کی، یہ کیا میرا جسم کہاں ہے؟ یہاں تو بوسیدہ ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں۔ تو کیا میں ایک روح ہوں، میں قبرستان سے نکل کر سکس روڈ سے ایسٹرن لندن میں تھا ہجوم کے درمیان، یہ لوگ مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتے میں ان کو مسلسل پکار رہا ہوں اور نہ ہی میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ کیا یہ مجھے سن سکتے ہیں؟ کیا میری آواز کا وجود ہے؟ یہ ہونے اور نہ ہونے کی کیسی کشمکش ہے۔ کیا شناخت کا معاملہ یہاں بھی درپیش ہے؟

مگر جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ دنیا اور آخرت کے درمیان والی منزل میں کسی شناخت اور پہچان کی ضرورت نہیں تو ابدی سکون میری روح میں سرایت کر گیا۔ کیا میں سارے بچھڑے ہوؤں سے مل سکتا ہوں؟ ساری روحیں ایک جیسی کیوں ہیں؟ ساری کی ساری روشن......... یہاں سارے معیارات بدل چکے تھے۔ راحت وسکون اور پہچان کے سارے معیارات یکسر مختلف تھے۔ امن و آشتی کے لیے میں کلیسا کی داخلی

سیڑھیوں کی طرف رُخ کرتا اور وہاں بیٹھ کر انجیل مقدس کی آیات اور تشریحات کو سنتا، یہ آواز میرے لیے دنیا کی تمام موسیقی اور خوبصورت گیتوں سے بڑھ کر تھی۔ میرے لیے امن و آشتی کا باعث صرف مذہبی تہوار اور تقریبات تھیں، کرسمس نوروز اور دعائیہ رسومات کس قدر راحت افزا ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں سیاح اور مورخ بھی رہا، میں نے بہت سارے ممالک دیکھے تھے مگر بہت ساری دنیا میں نہیں دیکھ سکا۔ میں نے اب جانا کہ کائنات ایک بے خبری کا گھر ہے جس میں بہت ساری چیزیں ہم بن دیکھے اور بن جانے مر جاتے ہیں۔ لیکن اب میں آزاد تھا اور کہیں بھی جا سکتا تھا کسی بھی خطے میں کسی بھی ملک میں، مجھے اب یہاں کسی ویزے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اڑ سکتا ہوں اور جہاز کی میرے لیے کوئی معنویت نہیں تھی۔ بارش، دھوپ، اندھیرا، اجالا میرے لیے یہ سب بے معنی ہیں۔ عالمِ برزخ میں میری روح گھٹن کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ ہر سفر کے بعد اس اندھیرے گڑھے کو پسند کرتی جہاں میرے جسم کو دفنایا گیا تھا۔ یہ روح اور جسم کا تعلق ابھی تک قائم ہے؟ کیا روح اب بھی جسم کی محتاج ہے؟ ہر بار میری روح ان بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھ کر کانپ اٹھتی۔ ڈر اور فکریں موت کے ساتھ مری کیوں نہیں......؟ میری روح اب بھی قبر کی مٹی کے نیچے بیٹھی یہ سوچ رہی ہے کہ، کیا اس جہاں کا بھی اختتام ہوگا؟......... کیا روح بھی فنا ہو جائے گی؟ مجھے ایک اور حقیقت کے آشکار ہونے تک کا انتظار کرنا ہے۔

☆☆☆☆

انور شعور

ہاتھ گو ہم کشادہ رکھتے ہیں
بانٹتے کم، زیادہ رکھتے ہیں

ہے ہمیں اہلِ درد سے نسبت
ہم یہی خانوادہ رکھتے ہیں

دامن آلودہ ہے تو ہو گا، ہم
صفحۂ دل تو سادہ رکھتے ہیں

ہیں رہِ راست کے مسافر شیخ
ہم کوئی اور جادہ رکھتے ہیں

ہم نے جب سے شروع کی ہے شراب
چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں

ہر سفر میں ہم اپنے ساتھ فقط
بادہ رکھتے، لبادہ رکھتے ہیں

ہم فرشتے نہیں بنے پھرتے
خود کو انسان زادہ رکھتے ہیں

تم سے کچھ سیدھے سادے لوگ شعورؔ
خواہشِ استفادہ رکھتے ہیں

☆☆☆☆

قیوم طاہر

کچھ رنگ الگ اُس کے ہیں، کپڑا ہے الگ سا
جو اب کے پہنتا ہے، وہ چولا ہے الگ سا

ترتیب تو دھڑکن نے کئی بار ہے بدلی
اس بار جو دل کو ہے وہ دھڑکا ہے الگ سا

اس بار کوئی اور ہے اس موجِ فنا میں
اے رقص گہہِ دہر! تماشا ہے الگ سا

نظموں کی ابھی شال کا ریشم نہیں کاتا
بُنتی ہے غزل جس سے، وہ دھاگا ہے الگ سا

اک راگ کی شبنم میں بھگویا شب نغمہ
اور صبح یہ کہتی پھرے نوحہ ہے الگ سا

میں خود بھی نہیں دیکھا، کہ آنکھیں نہ گنوا دوں
مُٹھی میں مری کوئی ستارہ ہے الگ سا

کیا اور اِن آنکھوں کی اذیت کو بڑھائیں
مہتاب ترے گرد یہ ہالہ ہے الگ سا

کوئی بھی نگر میری سکونت کا نہیں ہے
رہتا ہے جہاں مجھ کو، علاقہ ہے الگ سا

☆☆☆☆

محمد آصف مرزا

عقدۂ مشکل و آساں سے نکل آیا ہوں
صحنِ دنیا! ترے زنداں سے نکل آیا ہوں

کچھ ہراساں نہیں اندیشۂ نایافت سے اب
کلفتِ تنگیِ ساماں سے نکل آیا ہوں

اب ہے درپیش مجھے اپنے ہی اندر کا سکوت
اپنے اطراف کے طوفاں سے نکل آیا ہوں

مجھ کو کچھ یوں بھی خوش آیا ہے غزل کا پیکر
کسی پابندیِ عنواں سے نکل آیا ہوں

اپنے زخموں کے جلو میں ہوں بڑی راحت سے
تیری پُرسش کے نمک داں سے نکل آیا ہوں

جتنا بے مایہ ہوا اور گھٹی فکرِ زیاں
بیش و کم ہونے کے امکاں سے نکل آیا ہوں

اب مقابل ہے فقط ریگِ روانِ صحرا
دُور آوازۂ طفلاں سے نکل آیا ہوں

☆☆☆☆

شوکت کاظمی

تجھ سے کوئی بھی گلہ ہے نہ شکایت مجھ کو
عہدِ ہجراں کی نبھانی تھی روایت مجھ کو

تُو نے تو رنگ دیے تھے مجھے زیبائی کے
اپنے ہی خون سے لکھنی تھی حکایت مجھ کو

تُو نے گل اور ثمر میری طرف پھینکے تھے
ڈھونڈتی خود بھی رہی چشمِ عنایت مجھ کو

میں ترے دیدۂ بے خواب میں مے بھر نہ سکا
کتنے برسوں کی ملی یوں تو رعایت مجھ کو

خواہشِ وصل سے ہر چند فروزاں بھی رہا
سوزِ ہجراں کا بھی تھا شوق نہایت مجھ کو

اتنی تاخیر ہوئی وقتِ زوال آ پہنچا
مصحفِ یار کی گو یاد تھی آیت مجھ کو

میں ہی اس راہ میں طے اپنا سفر کر نہ سکا
مسلکِ عشق کی ملنی تھی ولایت مجھ کو

☆☆☆☆

سید ضیاءالدین نعیم

خبطِ عظمت میں گرفتار نہیں بھی ہوتے
لوگ کچھ باعثِ آزار نہیں بھی ہوتے

پسِ بازار بھی بک جاتے ہیں بکنے والے
کتنے سودے، سرِ بازار نہیں بھی ہوتے

اک تماشا سا بہر حال لگا رہتا ہے
منظرِ عام پہ کردار نہیں بھی ہوتے

یوں بھی ہوتے ہیں کسی آن مزاحم حالات
راہ دے دیتے ہیں، دیوار نہیں بھی ہوتے

پارسائی بھی کہیں ڈھونگ ہوا کرتی ہے
کچھ گنہ گار، گنہ گار نہیں بھی ہوتے

☆☆☆☆

نسیم عباسی

اب مری چاہت بھی چائے کی پیالی ہو گئی
جو تمھارے ہاتھ میں تھی اور خالی ہو گئی
کون کھڑکی کھول کر دیکھے گا اب اس کی طرف
چاندنی جاڑے کی پچھلی رات والی ہو گئی
دور تک میری رفاقت میں رہا کوئی خیال
پھر مرے ہمراہ میری بے خیالی ہو گئی
اس زمیں پر اس قدر بارود برسایا گیا
آسماں سے گرنے والی برف کالی ہو گئی
میرے لفظوں کو کیا ممتاز میرے عشق نے
میری ہر تحریر دنیا میں مثالی ہو گئی
قیمتی زیور ہوئے تیار دل کی آنچ پر
اس کی چشمِ شوق سونے کی کٹھالی ہو گئی
رخ بدلتی ہے بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ
کونج کا کیا ہے جنوبی یا شمالی ہو گئی
دھوپ میں خلقِ خدا پر چھاؤں کرنے کے لیے
پیڑ کی اپنی جسامت ڈالی ڈالی ہو گئی
وقت نے طبعِ رواں میں ریت بھر دی ہے نسیم
رفتہ رفتہ آبجو پانی سے خالی ہو گئی

☆☆☆☆

علی احمد قمر

آباد ہو گئے ہیں اندھیرے مکان میں
آسیب ڈیرے ڈالے ہیں میرے مکان میں
بارش نے بام و در میں دراڑیں ہی ڈال دیں
ہم نے ابھی کیے تھے بسیرے مکان میں
باہر بھی خوف سا ہے تعاقب میں ہر گھڑی
رہتے ہیں اب تو شام سویرے مکان میں
اندر بھی گھر کے رہتا ہے باہر کا ہی سماں
روزن سے بن گئے ہیں بہتیرے مکان میں
اب تو غریب خانہ گزرگاہِ باد ہے
چلمن کے بن گئے ہیں پھریرے مکان میں
گھر کیا ہے برق و باد کی زد میں ہے اک قفس
رکھتی ہیں بجلیاں ہمیں گھیرے مکان میں
کیا کیا بچائیں بارش و برق و ہوا سے ہم
اب تو گھٹا لگاتی ہے پھیرے مکان میں
دن میں جھانکتی ہے اداسی ہی شام کو
شب کی طرح ہیں مجھ کو سویرے مکان میں
گھر ہے کہ بارشوں میں ہے دریا چڑھا ہوا
کرتے ہیں اب قیام مچھیرے مکان میں
لے دے کے ایک جائے اماں تھی بچی ہوئی
کیا ڈھونڈتے ہیں جانے سپیرے مکان میں

☆☆☆☆

انجم خلیق

یہ پرندِ عشق کیسے ترے دام تک نہ آئے
وہ فنا کا راستہ کیا، جو دوام تک نہ آئے

چلو دن گزار لیں گے کسی کام میں الجھ کر
پہ کٹے گی رات کیسے جو وہ شام تک نہ آئے

نہ سہی میں جانِ محفل مگر ایسی بے رُخی کیا
کہ شمارِ دوستاں میں مرا نام تک نہ آئے

یہ عجب دعا ہے تیری، مرے نام کا ستارہ
رہے رفعتوں پہ لیکن، ترے بام تک نہ آئے

صفِ دشمناں میں شاید کہیں کوئی سر بچا ہے
مری تیغِ سر کشیدہ جو نیام تک نہ آئے

وہاں لشکری لڑیں کیا، جہاں حکم مل چکا ہو
کہ جو گرد اب اڑے گی وہ خیام تک نہ آئے

دمِ جشنِ تاج پوشی سبھی صف بہ صف تھے انجم
مگر اُس کی تعزیت کو تو غلام تک نہ آئے

☆☆☆☆

احمد حسین مجاہد

بُت سمجھنے لگے سبھی مجھ کو
دیکھ اب تو مرے سخی مجھ کو

یا تو مٹی ہی بھر بھری ہے مری
یا کوئی دکھ ہے واقعی مجھ کو

میں جسے ڈھونڈتا ہوں مدت سے
مل نہ جائے کہیں وہی مجھ کو

پاؤں پانی میں سر ہے پتھر پہ
یہ کہاں نیند آ گئی مجھ کو

دکھ سے دیکھا تھا میں نے خواب کبھی
جس کی ہے آج تک خوشی مجھ کو

☆☆☆☆

ڈاکٹر نثار ترابی

کڑے عذاب کی زد پہ تھا منزلوں کا سفر
ہماری راہ میں باقی تھا قاتلوں کا سفر

بچھا ہوا تھا کنارے پہ پیاس کا صحرا
اُگا ہوا تھا ہتھیلی پہ جنگلوں کا سفر

کسی کو مار دیا راستوں کی قربت نے
تو کوئی ہار گیا ہے مقابلوں کا سفر

یہ تار تار دسمبر نے کر دیا کیسے
دھنک مثال فضاؤں میں آنچلوں کا سفر

رواں دواں تھا کسی ناؤ کے تعاقب میں
مچلتی موج کی سنگت میں ساحلوں کا سفر

اُسے نثار ترابیؔ زمین لے ڈوبی
جس آسمان کو سونپا تھا بادلوں کا سفر

☆☆☆☆

افضل گوہر

خواب سے کیسے نکلنے کی تگ و تاز کروں
اتنی ہمت بھی نہیں ہے کوئی در باز کروں

خامشی پہلو بدلنے پہ اُتر آئی ہے
گر اجازت ہو تو میں بات کا آغاز کروں

خود سے کر سکتا ہوں جب مشورہ خاموشی سے
پھر کسی اور کو میں کس لیے ہم راز کروں

خاک نے رنگ بدلنے کا ہنر سیکھ لیا
اپنی زیبائی پہ جی کرتا ہے اب ناز کروں

خود سے باتیں بھی تو ہو سکتی ہیں ترتیب کے ساتھ
کیا ضروری ہے سُخن گوئی میں اعجاز کروں

☆☆☆☆

رحمان حفیظ

چراغ آنکھ کی سب بولیاں سمجھتے ہیں
یہ ہم سے پوچھ جو ایسی زباں سمجھتے ہیں

بہا کے لے گیا سب خدوخالِ عہد شباب
ہم آئنے کو بھی آپ رواں سمجھتے ہیں

ہمیں ازل سے محبت سکھائی جاتی ہے
ہم اہلِ حرف یہی اک زباں سمجھتے ہیں

تمام اہلِ نظر رہ نما نہیں ہوتے
کچھ اپنے آپ کو ہی کارواں سمجھتے ہیں

جہاں یقیں کے تجسس کی آنکھ کھل جائے
ہم اس کو منزلِ وہم و گماں سمجھتے ہیں

اٹھا چکی ہے خموشی تمام پردے مگر
ہم ان کہی کو ابھی درمیاں سمجھتے ہیں

تباہ کی گئی دنیاؤں کا غبار نہ ہو
زمین والے جسے کہکشاں سمجھتے ہیں

☆☆☆☆

رانا سعید دوشی

عقل! سمجھ لے ختم ہوا ہے دور تری سرداری کا
دل نے آج اعلان کیا ہے، اپنی خود مختاری کا

اپنی اپنی دنیا میں ہم دونوں سہمے سہمے ہیں
مجھ کو دل کا دھڑکا ہے اور اس کو دنیا داری کا

میری سانسیں پی کر اب وہ میری جوانی جیتا ہے
بچپن میں بھی کھیل گیا تھا، بچپن میری باری کا

سب کچھ دے کر خود غرضوں کو اس دنیا سے چلتا بن
ایک یہی آسان سا ، حل ہے تیری ہر دشواری کا

دل بنجارا، عشق نگر سے لٹ پٹ کر لوٹ آیا ہے
دوست بہت افسردہ ہیں، نقصان ہوا بیوپاری کا

مجھ سے تو ان دونوں میں سے ایک بھی بھر نہیں پایا ہے
اوک تمھارے ہاتھوں کی اور اک کشکول بھکاری کا

دوشی دوشی کہہ کر کس کا نام پکارا جاتا ہے
پھانسی گھاٹ پہ سنتا ہوں آوازہ اک درباری کا

☆☆☆☆

سعیدخان

جی کو جنوں لگے تو ہوس چھوڑیے جناب
مقدور ہو تو عشق میں سر پھوڑیے جناب

وہ قرب مانگیے جو نہ پابندِ زیست ہو
بے مہر قربتوں کی طلب چھوڑیے جناب

افتاد ہو گئے ہیں سوالوں کے دائرے
کس کس حصارِ کفر کو اب توڑیے جناب

اہلِ خرد کے بس میں فشارِ جنوں کہاں
ہاں سنگِ کوئے یار سے سر پھوڑیے جناب

سو منزلیں گنوا کے ملے گا سُراغِ عشق
خود راستے کھلیں گے نہ دل چھوڑیے جناب

اک سلسلہ زمیں سے ہزاروں برس کا ہے
کیسے مراجعت کی قسم توڑیے جناب

☆☆☆☆

شمشیر حیدر

کوئی خواب بنوں گا کوئی منزل ہو جاؤں گا میں
جتنا اب آسان ہوں اتنا مشکل ہو جاؤں گا میں

دنیا مجھ کو ڈھونڈ کے میرے پیچھے پیچھے آئے گی
عشق ترے مستوں میں جس دن شامل ہو جاؤں گا میں

ہنستے کھیلتے اُڑ جائیں گی نیندیں میری راتوں کی
ہنستے کھیلتے تیری جانب مائل ہو جاؤں گا میں

میں جو تجھ کو ڈھونڈ رہا ہوں یہ شغلِ بیکار نہیں
تُو مل جائے گا تو خود کو حاصل ہو جاؤں گا میں

میرا رستہ روکنے والے سب حیراں ہو جائیں گے
اپنی راہ میں ایسے اک دن حائل ہو جاؤں گا میں

کس کو خبر تھی بڑھ جائے گی اتنی میری سفاکی
کس کو خبر تھی اک دن اپنا قاتل ہو جاؤں گا میں

اپنے گھر کو آگ لگا دوں گا میں اپنے ہاتھوں سے
اتنا اپنے سود و زیاں سے غافل ہو جاؤں گا میں

☆☆☆☆

سجاد بلوچ

خواب ہوئے وہ میخانے اور خواب دکھانے والے لوگ
باقی رہ گئے بس ویرانے اور ڈرانے والے لوگ

ہم سینے میں قبر بنا لیتے ہیں جانے والوں کی
ہم ہیں لحہ لحہ غم اور سوگ منانے والے لوگ

کافی آگے نکل گئے ہیں میرے سارے ہمسفراں
اور بہت پیچھے ہیں میرے پیچھے آنے والے لوگ

چنوائے جاتے ہیں آخر کار آبی دیواروں میں
وحشی موجوں سے ہم ایسے سر ٹکرانے والے لوگ

اب تو زینۂ خواب کے ہر اک گام سے واقف ہو گئے ہیں
میری آنکھ سے میرے دل تک آنے جانے والے لوگ

کن لوگوں میں آ بیٹھے ہیں خاموشی کے ہمراہی
کس بستی میں آ نکلے ہم وحشت بسانے والے لوگ

آپ ہیں ٹھنڈی میٹھی چھاؤں کے شاداب سفیر اور ہم
دھوپ اگانے والے ہیں یا خاک اڑانے والے لوگ

☆☆☆☆

میثم نقوی

وہ آگ دیکھی کہ جس کا کوئی دھواں بھی نہیں
وہ زخم پائے کہ جن کا کہیں نشاں بھی نہیں

عجب ہے یہ کہ زمیں بھی سرکتی جاتی ہے
غضب ہے یہ کہ مرے سر پہ آسماں بھی نہیں

ترا نصیب کہ تو دل میں رہ تو سکتا ہے
مرا نصیب کہ میرا کوئی مکاں بھی نہیں

یہ رکنِ عشق ہے، اس کی ادائیگی لازم
میاں! یہ دشت نوردی سی رایگاں بھی نہیں

وہ سر نہیں ہے کوئی بوجھ ہے ندامت کا
جھکا ہوا بھی نہیں جو، سرِ سناں بھی نہیں

یہ کار زارِ جنوں آخری کسوٹی ہے
پھر اس کے بعد کوئی اور امتحاں بھی نہیں

☆☆☆☆

اظہر فراغ

لوگ اپنا کیا بھگت رہے ہیں
ہم کسی اور کا بھگت رہے ہیں

آپ رسی دراز کی اس کی
اب اسے جا بجا بھگت رہے ہیں

مخبری تھوڑی کر رہے ہیں تری
صرف اپنی سزا بھگت رہے ہیں

پانیوں سے دعا سلام نہیں
ناؤ کی بد دعا بھگت رہے ہیں

وہ بھی اقرار کر کے پھنس گیا ہے
ہم بھی اپنا کہا بھگت رہے ہیں

☆☆☆☆

ناصر زیدی

مصلحت

اُس سے بچھڑا ہوں تو فی الحال سکوں ہے مجھ کو
اور کچھ روز گزر جائیں تو پھر بات کروں
زندگی اُس کی رفاقت میں جو گزری، کیا تھی؟
زندگی تھی کہ بھیانک سا کوئی سپنا تھی؟
خواب تو خواب ہیں، اچھے بھی تو ہوتے ہوں گے!
میرے حصے کے حسین خواب چرائے کس نے؟
میرے اپنے تھے مرے ساتھ پرائے کتنے؟
آخر اک روز جزا اور سزا بھی ہو گی
فیصلہ ہوگا تو پھر خلقِ خدا بھی ہو گی
مَیں جو انصاف کا طالب ہوں تو کیوں فکر کروں؟
مصلحت کا ہے تقاضا یوں ہی خاموش رہوں!!

☆☆☆☆

نصیر احمد ناصر

روح کے پاؤں نہیں ہوتے

روح جب کسی جسم کو اوڑھتی ہے
تو اُس کے کپڑوں اور جوتوں کا سائز نہیں پوچھتی
اُس کا رنگ اور حسب نسب بھی نہیں دیکھتی
اور نہ دیگر اعضا کی کارکردگی
وہ دیکھتی ہے
کہ اس جسم میں کتنا پیار ہے
اس کی بیالوجی میں کتنی محبت ہے
کتنا نمک اور کتنا گلوکوز ہے
اس کے دل میں
کتنے سمندروں کی گہرائی ہے
اور آنکھوں میں
کتنے آسمانوں کی وسعت ہے،
کتنے بادل سما سکتے ہیں
اور بارشوں کے کتنے موسم ہیں
اس میں ہواداری کے کتنے راستے ہیں
کتنے دروازے، کتنی بالکونیاں ہیں
اور آنے جانے کے لیے
اس کے آرپار کتنی آسانی سے گزرا جا سکتا ہے
روح بادلوں کی طرح بے آواز چلتی ہے
روح کے پاؤں نہیں ہوتے

☆☆☆☆

علی محمد فرشی

آدمی سا دمی

درختوں کی باتیں سنو تو
یہ لگتا ہے جیسے وہ سچ کے سوا کچھ نہیں کہہ رہے ہیں:

"کسی اور دنیا کی مخلوق ہے آدمی
یا جڑیں چھوڑ کر بھاگتا پھر رہا ہے
مشینوں پہ اس کی حکومت
ہوا اُس کے قابو میں آئی ہوئی ساحرہ
جو اُسے آسمانوں کی سیریں کرائے
زمیں اُس سے ماں کی طرح پیش آئے

جڑیں ہم نہیں چھوڑ پائے
سو اس کی سزا میں
کھڑے سوکھتے ہیں
مگر اِس پہ افسوس کیسا؟
کہ ہم اپنی میّا کی چھاتی سے
چمٹے ہوئے نادمی ہیں
جو آزاد پھرتے ہیں
اک دن انھیں بھی
ہماری ہی میّا کے دامن میں چھپنا ہے آکر
یہ ہم جانتے ہیں"

سروں پر تنے گھومتے آسماں نے
کہاں جا کے رکنا ہے؟
معلوم اُن کو، نہ ہم جانتے ہیں

حسن منظر

لاوارث سامان

گندے نالوں کی پُلیوں کے نیچے
خالی ڈبوں میں ٹرینوں کے
بیٹھی قبروں
لاوارثوں کے
تکیوں، قبّوں میں
جو پڑی ہیں گٹھڑیاں، پوٹلیاں
میں ان میں کبھی بھی
نہیں جھانک کر دیکھتا ہوں

مل کہ کپڑے میں لپٹے بندھے کو
جن پہ ہوتا ہے دھوکا
ٹونے ٹوٹکے کا
ڈور سے انھیں بھی نہیں کھول کر دیکھتا ہوں

اور یوں بھی کہ
ڈر ہوتا ہے اُن میں
بم ہوگا یا اسلحہ
یا چوری کے گہنے
نقدی اور روکڑا

کوئی چور تھا
جس کے پیچھے پولیس تھی
اور وہ اس پوٹ کو
پھینک کر
ہو گیا گم شہر کے دھوئیں میں

اور لگتا کبھی ہے:
وہ بے سُدھ، اندھی بہری
باردانا کی بوری
گویا ہے مجھ سے
راہ گیر اِتنک پاس آؤ
میرا سونا پن آ کر مٹاؤ
میرے پاس بیٹھ جاؤ
دو گھڑی میرا دکھڑا بٹاؤ

سوچتا ہوں ہو گا کیا اس میں
ناج، بے پِسی سُرخ مرچیں؟
بُرادہ یا کوئلہ لکڑی کا
بھوسا، کھلی یا دلدّر
کبھی پاس کے ہی گھر کا
تب، مجھ سے کہتا ہے
میرا ہی خیال
خیریت چاہتے ہو؟

تو لو اپنی راہ

روز کے کوچنے سے تنگ آ کر
ایک دن پَو پھٹے
ایک گندی سڑیلی
گاڑھے دھبے لگی
چارپائی پہ سونے کی
بند مُنھ کی چدریا کو
کھول کر میں نے جھانکا
اُس اندھے کنوئیں میں
گُڑمُڑی مارے
جیسے رحمِ مادر میں ہو
مِچی آنکھیں اور ہونٹ
پیوستہ یک بہ دگر
اُس نے پوچھا:
بِاَیِ
ذَنبِ قُتِلَت ؟
(جرم کیا تھا میرا
جس پہ ماری گئی میں ؟)
ہو گئی وہ، یہی
پانچ، چھے
سات ایک سال کی
گُم متھولا تھا میں

دل میرا گنگ تھا
پھیپھڑے دم بخود
کہ دگر بار، اب کے
بند آنکھوں نے پوچھا:
بِاَیِّ ذَنبٍ قُتِلَت ؟
گو میرے ہونٹ چپکے رہے
ایک سے ایک پر
ڈوبتے میرے دل نے کہا:
”اے کسی کی کلی،
جس نے مَسلا تجھے
اس کی نظروں میں
ایک عورت تھی تو بھی،
پوری عورت
اور یہی ایک
مَصرف تھا تیرا۔“

☆☆☆☆

اشفاق سلیم مرزا

موت کا کھیل

یہ کھیل کب سے جاری ہے
یہ کھیل کبھی رُکا نہیں
یہ موت کا کھیل ہے

کل ہو یا آج
تاریخ کا یہ ایندھن
تاریخ کو رنگین اور تازہ دم رکھتا ہے
یہ عجب کھیل ہے
اکثر کھلاڑی یہ بھی نہیں جانتے
کہ وہ کیوں مر رہے ہیں

اُنھیں بتلایا جاتا ہے کہ
بس اُنھیں کھیلنا ہے
کون غلط تھا کون صحیح
موت کو اس سے کیا سروکار
جب وہ آتی ہے
کھلاڑی اُسے گلے لگا کر
خاک بسر ہو جاتے ہیں

وہ کولمبس ہو، یا قصرِ ابیض کے مکینوں سے کوئی
یا پھر پہاڑوں، ریگستانوں یا سمندروں کے
راستے سے آئے

کھلاڑی سورماؤں کے روپ میں
ڈھلنے کے لیے
خون کی ہولی کھیلتے ہیں

اُن سب کے پاس موت کے فرمان کا
اپنا اپنا جواز ہوتا ہے
دھرتی کے مکینوں کی آہ و بکا
ترائے سے اُٹھے
یا وتستا (۱) کے کناروں سے
پروشنی (۲) پر دس راجن یدھ سے
یا پانی پت کے میداں سے
سورماؤں کی فتح کی بشارتوں
کے آگے ماند پڑ جاتی ہے

اس کھیل میں
صرف کھیلنے والے جانتے ہیں
اُس لذتِ بے پناہ کو
جب حریف کے توانا جسم
رقصِ بسمل کے بعد
زمین بوس ہو جاتے ہیں
پر کھیل جاری رہتا ہے
تاریخ گواہ ہے
یہ کھیل کبھی رُکتا نہیں
قلمکاروں کے قلم سوکھ گئے
امن کی فاختہ اُڑاتے اُڑاتے
سب تھک گئے
کھیل پھر بھی جاری ہے

یہ کھیل ختم نہیں ہوگا
مرنے والوں کو تم کوئی نام دو
اُنھیں اس سے کیا سروکار
وہ تاریخ کے سٹیج پر
اپنا اپنا کردار ادا کرنے کے بعد
گمنام ہو جاتے ہیں
کھیل جاری رہتا ہے
کھلاڑی بدل جاتے ہیں

تاریخ نئی بشارتوں سے لیس
نئے کھلاڑیوں کا سوئمبر رچانے کے لیے
اُنھیں اُسی راہ پر لے جانے کے لیے
انسان کو آگے بڑھانے کے لیے
سجی ہوئی رتھ پر کھڑی
کرشن کا روپ دھارے
مسکرا رہی ہے

☆☆☆☆

۱۔ وتستا: دریائے جہلم ۲۔ پروشنی: دریائے راوی

عزیز اعجاز

دسمبر آ گیا ہے

سنو جاناں
اُداسی کی قبا اوڑھے
دبے پاؤں دسمبر آ گیا ہے
اور ہر جانب
اُداسی چھا گئی ہے
شہر میں اب
راج ہوگا اس ستم گر کا
زمستاں کی سنہری دھوپ نے
اس کا سواگت گرم جوشی سے کیا
پہروں ٹھٹھری رات
یخ بستہ ہواؤں کے جلو میں
خیر مقدم کے لیے آگے بڑھی
اور کپکپاتی کانپتی بانہیں
محبت سے گلے میں ڈال دیں
لیکن ----دسمبر سرد مہری سے ملا
اک اجنبی بن کر
بس اپنا موڈ ہے اس کا
کسی سے مہرباں ہو کر ملے تو
تمتماتا لمس
اس کو زندگی بھر یاد رہتا ہے
ولیکن جب مزاجِ یار برہم ہو
تو اکھڑ پن

بہت ناقابلِ برداشت ہوتا ہے
سنو جاناں
اداسی کی قبا اوڑھے
دبے پاؤں دسمبر آگیا ہے
اور ہر جانب
اداسی چھا گئی ہے
شیشم و سرو سمن
اخروٹ خوبانی
چناروں، پر لگے پتوں نے اپنا رنگ بدلا
سبز پیلے، کاسنی، ہلکے بنفشی
ہر طرف رنگوں کی
اک قوسِ قزح سی سج گئی ہے
اور ان رنگوں میں اک گہری اداسی ہے
یہ جتنے رنگ بکھرے ہیں
مجھے بس اس لیے بھاتے ہیں
ان رنگوں سے وابستہ
تمھاری یاد کے پل ہیں
سنو جاناں
اداسی کی قبا اوڑھے
دبے پاؤں دسمبر آگیا ہے
اور ہر جانب
اداسی چھا گئی ہے

☆☆☆☆

آصف ہمایوں

دریا

سوچتا ہوں
اب میں دریا کا کیا کروں
لہریں گنتے گنتے ساری گنتی بھول گئی ہے
سوچتا ہوں
کیوں نہ کوئی پتھر ہی، دریا میں پھینکوں
شاید کچھ لہریے بنتے دیکھ پاؤں
زندگی ایک دائرہ ہی تو ہے
سورج ابھی، لہروں کی کشتیوں میں اپنی نارنجیاں بیچتا ہے
اک ذرا دیر میں دریا کا پانی کالا ہو جائے گا
اک ذرا دیر میں مانجھی لوٹے گا
آج کا آخری گیت گاتا ہوا
شاید ابھی گلہری
پاس کے پیڑ سے ایک بار اور کودے
شاید گھر کو لوٹ کر جانے والا پرندہ
آج پھر مرے سر کے اوپر سے گزرے
میں چاند کے نکلنے تک شاید کچھ دیر اور
درد کے پتھر پر بیٹھ رہوں
ویسے اب میری آنکھیں
دریا پار کے رینگتے ہوئے سایوں پر لگی ہیں
میرے کان دریا پار سے آتی مبہم صداؤں کو
سننے کی کوشش میں لگے ہیں

☆☆☆☆

اخلاق عاطف

پھول میں کتاب

فروغِ حُسنِ آرزو
محبتوں کی تاب ہے
ملاحتوں کے اَبر میں
صبیحِ ماہتاب ہے
بہار کی سفیر ہے
صبا کی ہم رکاب ہے
بس ایک رُت؟
نہیں نہیں!
سبھی رُتوں کا خواب ہے
مرقعِ جمال ہے
خزینۂ شباب ہے
کہ پھول تو کتاب میں
ملے ہیں بارہا، مگر
وہ پھول میں کتاب ہے!!

☆☆☆☆

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

وطن کے لیے

(جشن آزادی پر)

دریا دریا بہنا ہے اب پاکستان کے ساتھ
مرتے دم تک رہنا ہے اب پاکستان کے ساتھ

خوشیوں میں تو اس کے ساتھ ہی جھومر ڈالے ہم نے
ہر اک دکھ بھی سہنا ہے اب پاکستان کے ساتھ

سبز ہلالی پرچم، میری چنری میرا آنچل
ہر ملبوس اور گہنا ہے اب پاکستان کے ساتھ

ہر مصرعے میں رنگ ہیں اس کے، ہر مصرعے میں خوشبو
ہر مصرعے میں کہنا ہے اب پاکستان کے ساتھ

☆☆☆☆

قاسم یعقوب

رات اور رنگوں کی روشنی

چاندنی رات میں گھر کی تاریکی بڑھ جاتی ہے
جب روحیں سو جاتی ہے تب جسم کے ایندھن پر کوئی پھونکنی مارتا ہے
تھکا بدن تب روح کے بستر پر آنکھیں ملتا جاگ اُٹھتا ہے
کمرے کی سب کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں
دروازے کی چٹخنی چڑھتے ہی تنہائی انبوہ سے معانقہ کرنے آگے بڑھتی ہے
تاریکی اور گھٹن میں تازہ سانسیں لینے کی ضرورت جاگتی ہے
بجلی کی تختی کا چوکھٹا کمرے کا روزن بن کر سامنے آتا ہے
جس سے پھوٹتے رنگوں کی بدبو پھیل کے سارے کمرے کو مہکانے لگتی ہے
ٹوٹے پھوٹے رنگوں کے دھبوں سے کوئی نقش نہیں بنتا
آنکھیں تنہائی کا رونا روتی چپ ہو جاتی ہیں
بجلی کی تختی پر پھیلی دنیا
کمرے کی تنہائی کو بے معنی ہونے کی لا حاصلی دیتی ہے
نا آسودہ خواہشیں کمرے میں سر پھوڑتی ہیں
بدبوؤں سے جسم کی لذت کو جگانے کی کوشش کرتی ہیں
اپنے آپ سے باتیں کرتی تحریریں
چہروں کی تنہائی کا مداوا بننے لگتی ہیں
تختی جیسے روزن سے بھی جب آنکھوں کا دم گھٹنے لگتا ہے
تو کھڑکی کھول دی جاتی ہے اور دروزے کی چٹخنی کھلتی ہے
باہر چاندنی رات کی لَو

کڑوے کسیلے رنگوں سے پاک اُجالا بن کر
گھر کے صحن میں جھانک رہی ہوتی ہے
جس کے آہستہ خرام سے نیند آنے لگتی ہے
اب جسم شکستہ مرنے لگتا ہے
آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں
گہری نیند کا خواب بدن پر حملہ کرتا ہے
اور رسیلے ہونٹوں کو نیند آ جاتی ہے

☆☆☆☆

امجد بابر

رات

رات میرے باطن میں چھپی بیٹھی ہے
وقت کا کاکروچ باسی خوابوں کا ناشتہ کر کے
ساحلِ سمندر کی ریت پر
کچھ اَن کہے لفظوں کے نشاں ڈھونڈتا ہے
نا رسائی کے سائبان تلے
لہروں کی تال میل سے بنی آواز گونجتی ہے
میری خواہش کی آب دوز ڈوب گئی

کوئی میرے خیال کے ٹکڑے اکٹھے کرے
اور مجھے بھوک کی چمنیوں کے دھویں سے بچا کر
کسی نا دیدہ نخلستان کے ریوڑ میں چھوڑ آئے
تاریخِ انسانی میں طبعی عمر کی خراشیں
کبھی زخموں سے خالی نہیں ہوتیں

محبت کے نقش و نگار
پیوند کاری کے ذائقے سے محروم ہو جائیں
تب آنکھیں ٹیڑھی ہو جاتی ہے
سانسیں اُکھڑنے لگتی ہیں
گیان میں
چند تصویریں رہ جاتی ہیں
یا پھر آنسو بارش بن کر گرتے ہیں

☆☆☆☆

مہناز انجم

دسمبر گزر جائے گا

ایک تصویر تھی
جو کہیں کھو گئی ہے
دسمبر سے آگے گزرنے کی خواہش
کہاں سو گئی ہے؟
بچھڑتے ہوئے کہہ رہا ہے دسمبر
محبت کے رستے میں کیسا سموگ آ گیا ہے؟
بروگ آ گیا ہے
وفاؤں کی حدت سے
برفیلا موسم پگھلنے دو
منظر نکھر جائے گا
پھر سے چمکیلا سورج نکل آئے گا
آنے والے نئے سال میں
پھر سجانا وہ تصویر اسی کارنس پر
جہاں رات کو آ کے جگنو چمکتے تھے
سورج کی کرنوں کے سنگ تتلیاں اُڑتی آتی تھیں
چڑیاں چہکتی تھیں
روشن دنوں کی نئی آرزوئیں مہکتی تھیں

☆☆☆☆

عالیہ مرزا

میری گواہی دینا

تم عینی شاہد ہو
میری گواہی دینا
کہ میں اپنی آنکھیں
سبز جھیلوں پر کھلنے والے سفید پھولوں میں چھوڑ آئی ہوں
میری بصارت ان سے آگے نہیں جا سکتی تھی
میری گواہی دینا
کہ میری زباں کو سچ کہنے کی عادت تھی
سو مجھے سرِ عام قتل کر دیا گیا ہے
گواہی دینا
کہ میں نے سچ کے سوا کچھ نہیں کہا تھا
تم عینی شاہد ہو
جانتے ہو کہ
گولیوں کی بوچھاڑوں میں بھی
امن کے خواب مرا نہیں کرتے

☆☆☆☆

محمد حمید شاہد

چین کے سدا بہار شہر کُن منگ میں

پہلے نیپال کے ڈاکٹر جیویندرا دیوگری کی سنائی ہوئی ایک اسطورہ؛ اس کے بعد میں چین کے ثقافتی شہر کن منگ میں ہونے والی ادبی کانفرنس کا قصہ سناؤں گا جس میں مجھے شرکت کا موقع ملا ہے۔ ڈاکٹر دیوگری نے اس کانفرنس میں ایک موقع پر نیپال بھر میں مشہور اسطورہ سناتے ہوئے بتایا تھا کہ کوئی دوہزار سال پہلے جب کھٹمنڈو وادی محض پانی کا ذخیرہ تھی۔ منجوشری چین سے وہاں پہنچا، اُس کے ہاتھ میں شعلے اُگلتی ہوئی تلوار تھی۔ منجوشری پانی کی اس وسیع جھیل کے جنوبی حصے کی طرف گیا اور وہاں چوبھار پہاڑ پر اپنی تلوار سے وار کیا۔ یہ وار بہت کاری تھا کہ پہاڑ کا ایک تودا وہاں سے کٹ کر اُڑا اور دور جا گرا۔ بس پھر کیا تھا، جھیل کا سارا پانی شراٹے بھرتا بہہ نکلا اور کھٹمنڈو کی زمین انسانی رہائش کے قابل ہوگئی۔ ڈاکٹر دیوگری کے مطابق سلک روڈ کی تاریخ اور اس کا توسیعی ادبی تصور پھر سے دنیا کے اس علاقے کو انسان کے لیے تہذیبی سطح پر رہنے کے قابل بنانے کا عمل ہے۔

اس علاقے کو پھر سے تہذیبی سطح پر رہنے کے قابل بنانے کے لیے چین کے صوبہ ینان کے خوب صورت شہر کن منگ میں ۱۸ تا ۲۲ ستمبر ۲۰۱۶ء میں منعقد ہونے والی کانفرنس کا موضوع تھا “نئی ادبی شاہراہ ریشم: سماجی ترقی اور تہذیبی وثقافتی روایات۔” اس کانفرنس میں شرکت کے لیے حکومت پاکستان نے اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین ڈاکٹر قاسم بگھیو کی سربراہی میں جو وفد تشکیل دیا اُس میں تربت یونیورسٹی بلوچستان کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر کے ساتھ اس خاکسار کا نام بھی شامل تھا مگر ہوا یہ کہ وفد کے رخصت ہونے سے پہلے ڈاکٹر بگھیو علیل ہو گئے۔ علیل کیا ہوئے دِل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہسپتال جا پہنچے۔ اگرچہ دِل کو تازہ کروا کے وہ خوش باش گھر پہنچ گئے تھے مگر اُن کے طبیبوں نے کہا، صاحب یہ دِل کا معاملہ ہے، اسے گھر ہی میں لگائیں کہ ہوائی سفر میں یہ مچل کر بے قابو ہو سکتا ہے۔ یوں ہم دونوں اکادمی کی طرف سے تحائف لے کر چین کی جانب روانہ ہو گئے۔

اسلام آباد سے کن منگ کے لیے براہ راست فلائیٹ نہ تھی۔ ہمیں تھائی لینڈ کے معروف شہر بنکاک کے سوونا بھومی انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر رُک کر فلائیٹ بدلنا تھی گویا سفر جتنا تھا اس سے بھی کہیں طویل ہو گیا تھا۔ خیر، ڈاکٹر صابر دلچسپ آدمی نکلے، کُھل کر ہنس سکتے تھے اور ہر موضوع پر بات کرنے کو تیار، لہٰذا سفر خوب رہا۔ اگلی صبح جب ہمارا جہاز بنکاک کے اُوپر چکر لگا رہا تھا تو بادلوں کے گالوں سے نیچے

اترتے کے بعد پورا شہر میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں شہر کے وسط میں دور تک جاتی اس سڑک کو دیکھ سکتا تھا جو ہمیں کئی سال پہلے ایئر پورٹ سے گرینڈ پریزیڈنٹ ہوٹل لے گئی تھی۔ غالباً اس سڑک کا نام کامفنگ فیٹ روڈ تھا۔ جہاز ائرپورٹ پر اُتر رہا تھا اور میں ماضی کی دھند میں ڈوبے ہوئے لمحوں میں۔ تب میں ایک بنکار کی حیثیت سے اس شہر میں آیا تھا۔ یہ ایئر پورٹ نیا نیا بنا تھا اور جب ہم اس سے باہر نکلے تھے تو تجی سنوری تھائی لڑکیوں نے ہمیں پھولوں کے گلدستے اور خوب صورتی سے پیک کیے گئے تازہ پھلوں کی تھیلیاں پیش کی تھیں۔ میں یاد کرنا چاہتا ہوں کہ پھول کیسے تھے اور پھل کون کون سے، تو یاد نہیں کر پا رہا، تاہم تھائی لڑکیوں کی دلنواز مسکراہٹ ابھی تک نہیں بھول پایا ہوں۔ گرینڈ پریزیڈنٹ ہوٹل اور رائل پریزیڈنٹ ہوٹل جیسے بڑے ہوٹل پاس ہی پاس تھے لہٰذا ٹرمینل ایکس سے اس طرف جانے والی سڑک پر خوب رونق رہتی تھی۔ مجھے تو کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے وہ سڑک ہمارے لاہور کا ترقی یافتہ شاہی محلّہ تھا۔ ہمارا وہاں چلنا تک محال ہو جاتا تھا کہ جگہ جگہ پر لونڈے خوب صورت لڑکیوں کی تصاویر پر مشتمل البم اٹھائے ہمیں ان میں سے ایک پسند کرنے پر اُکسانے لگتے تھے۔ کئی تو اتنے لیچڑ اور چپکو ہو جاتے کہ چاہے لاکھ 'نو، نو' کہو اور چلتے جاؤ، وہ تصویر والی لڑکیوں کے جسمانی اوصاف سناتے دکھاتے ہوٹل تک پہنچ جاتے۔ اسی سڑک پر کئی مساج گھر تھے اور ان میں تھائی لڑکیاں برائے نام لباس پہنے تیز روشنیوں تلے کھڑی راہگیروں کی توجہ کھینچتی رہتی تھیں۔

مجھے یاد ہے جب ہم ہوٹل میں چیک اِن ہونے کے لیے لابی میں اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے تو میں نے یونہی وہاں کا ایک اخبار الٹنا پلٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس اخبار میں، میں نے ایک رنگین تصویر دیکھی، جو اخبار کے نچلے تہائی حصے میں تین یا چار کالموں کو گھیرے ہوئے تھی۔ یہ تصویر عقب سے بنائی گئی تھی اور اس میں عورتوں کے پیرہن ایک طرف ڈھیر نظر آئے تھے۔ غالباً لباس کا جو حصہ اس ڈھیر میں نہیں تھے، وہ ان کے زیر جامے تھے جو وہ فضا میں لہرا رہی تھیں۔ اگرچہ تصویر عقب سے لی گئی تھی مگر اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ وہاں نعرے بازی میں مگن تھیں۔ تصویر کے نیچے اطلاع دی گئی تھی کہ یہ پیشہ ور عورتیں حکومت کی جانب سے اپنے 'کاروبار' پر اضافی ٹیکس کے خلاف گرینڈ پیلس کے سامنے اِحتجاج کر رہی تھیں۔

جہاز بنکاک کے ہوائی اڈے پر اتر گیا اگرچہ تھائی ایئر والوں نے ہمیں بنکاک سے کن منگ جانے والی فلائٹ کے لیے بورڈنگ کارڈ اسلام آباد ہی میں دے دیے تھے لیکن ان پر گیٹ نمبر کے خانے خالی تھے۔ ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی فلائیٹ کے لیے گیٹ نمبر کی معلومات حاصل کیں۔ پھر چل سو چل۔ ہم اگر مغرب میں تھے تو ہمیں دوسری طرف یعنی شرق میں آخر تک جانا تھا، اور وہ بھی گراؤنڈ فلور سے تیسری منزل پر، جتنا وقت ہمیں میسر تھا وہ اسی بھاگ دوڑ، اور قطار میں لگنے میں صرف ہو گیا۔ میں بنکاک کے ایئر پورٹ پر کئی سال بعد اترا تھا مگر یہاں اترتے ہی اس کا سارا حسن بھک سے اُڑ گیا تھا۔

بنکاک سے جہاز اُڑا اور تھائی لینڈ کے ہی ایک اور ثقافتی شہر چھیانگ مائی میں اتر گیا۔ ایک بار پھر اپنے اپنے بیگ اُٹھائے ہم جہاز سے باہر تھے۔ خیر یہاں زیادہ نہ رکنا پڑا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ اب چین کے کن منگ میں جا کر ہی اتریں گے۔

وہ چین جو ہمارے ہمسائے میں ہے، اس کی دوسری طرف پہنچنے کے لیے ہندوستان، بنگلہ دیش اور سمندر کے پانیوں کے اوپر اُڑے اور براستہ تھائی لینڈ، کوئی اُنیس گھنٹے کی کھچل کے بعد اُس کی فضاؤں میں آخر کار داخل ہو گئے۔ ہم چین کے خوب صورت شہر کن منگ کے اوپر اُڑ رہے تھے۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا، دور دور تک بادل یوں ٹکڑیوں کی صورت اُڑ رہے تھے جیسے کوئی دُھنیا روئی دھنتے ہوئے گالے فضا میں اُڑا رہا تھا۔ ایک خوب صورت جدید طرز کا بہت بڑا شہر، جو سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا ان بادلوں کے اندر سے دور تک جھانکنے لگا تھا۔ چنگ شوئی انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر ہی چائنا رائٹرز ایسوسی ایشن کی طرف سے ہنو وئی ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ ایئر پورٹ سے نکلتے ہی یخ ہواؤں کے جھونکے بھی ہمارے بدنوں پر استقبالی بوسے دے کر بہہ رہے تھے۔

جب ہم شہر کی جانب جا رہے تھے تو کئی منزلہ عمارتوں کی مسلسل قطار کے پیچھے سے جھانکتے سرسبز پہاڑی قطعوں کو دیکھا۔ پہاڑوں کو عجب سلیقے سے اِن کی مختلف سطحیں ہموار کر کے قابلِ کاشت بنا لیا گیا تھا۔ ہماری گاڑی ہونگ کیاؤ روڈ سے کئی منزلہ سڑکوں کے جال سے نکل کر رین من روڈ کی طرف ہو لی۔ وہاں سے ہم ہوان ٹونگ اسٹریٹ پر پہنچ گئے جس کا نام اس سڑک کے دائیں طرف موجود ایک عظیم الشان ٹیمپل کے نام پر رکھا گیا تھا۔ صوبہ یُنان کے اس خوب صورت شہر کی بابت ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس صوبائی دارلحکومت میں بہار کے موسم کا مستقل قیام ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق ہمارے قیام کے دنوں میں ہی ہو گئی کہ وہاں بادل ہر دم برسنے کو تیار رہتے اور ہم چھتری بنا باہر نہ نکل سکتے تھے۔ کُن منگ، میں محض رِکن مِن رِکن مِن نہیں ہوتی، بارش ٹوٹ کر برستی تھی۔ اور وقفے وقفے سے برستی رہتی تھی۔ اسی نے وہاں کے موسم کو بہت دلکش اور حسین بنا دیا تھا۔

ہم لئن یُن ہوٹل پہنچے تو لی جن چی اور دوسرے چینی ادیب ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ ہمیں ہوٹل پہنچتے پہنچتے ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ پروگرام کے مطابق چھ بجے استقبالی عشائیہ وہاں کے ایک قدیم ثقافتی ہوٹل میں طے تھا لہٰذا جلدی جلدی ہم کمروں میں اپنا اپنا سامان پھینک کر نیچے لابی اکٹھے ہو گئے۔ لابی ہی میں ہماری ملاقات نیپال کے وفد سے بھی ہو گئی۔ یہ وفد ایک روز پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔ عشائیے کے لیے جب ہم شی چنگ ہوئی گوان ہوٹل پہنچے چینی لڑکیوں نے ایک کورس کی شکل میں گا کر ہمیں خوش آمدید کہا۔ آگے بڑھے تو ایک خوب صورت لڑکی، جس نے قدیم چین یُنان کا روایتی لباس پہن رکھا تھا، وہاں کی روایتی موسیقی زی ہنگ کی دھنیں فضا میں بکھر دیں۔ ہم کچھ لمحوں کے لیے وہیں کھڑے

موسیقی کی مدھر تانیں سننے پر مجبور تھے۔ ہوٹل دو منزلہ تھا اور چاروں طرف سے گھرا ہوا، جس کے وسط میں صحن تھا۔ ہم اس صحن میں کھڑے ہو کر چاروں طرف کمروں میں جھانک سکتے تھے۔ جس میں ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ یوں لگتا ہے چینی سگریٹ بہت شوق سے پیتے ہیں کہ لگ بھگ ہر کمرا دھواں اُگل رہا تھا۔ ہم اپنے لیے مخصوص نشستوں پر بیٹھ چکے تو دیکھا ہر نشست پر بیٹھنے والے کے نام کی تختی پہلے سے موجود تھی۔ یہ نام ہمارے لیے انگریزی میں تھے اور چینیوں کے لیے اُن کی اپنی زبان میں۔ ہمیں بتایا گیا کہ روایت کے مطابق میزبان کو سامنے کی نشست دی جاتی ہے اور یہ بھی کہ دعوت کا آغاز خاص مشروب سے ہوتا ہے۔ وہاں ایسا ہی ہوا، ہمارے سامنے نہ صرف مشروب رکھ دیا گیا، لی جن چی اُٹھے اور ایک ایک کی نشست پر جا جا کر جام صحت تجویز کرتے رہے۔ پینے پلانے کے اس مرحلے سے میں بہ مشکل با عافیت گزرا تو جو روایتی کھانے ہمارے سامنے میز پر ایک ایک کر کے لائے جا رہے تھے وہ کم از کم مجھے تو بوکھلا کر رکھ دینے کے لیے کافی تھے۔ لی جنگ چی سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ مجھے گماں گزرا کہ جب گزشتہ برس وہ لاہور میں اکادمی کی پاک چائنا کانفرنس میں آئے تھے تو وہاں اُنہوں نے ہمیں چکن شوق سے کھاتے دیکھا ہوگا، تب ہی تو چین کے روایتی کھانوں کے پہلو بہ پہلو کچھ زیادہ ہی تلی ہوئی مرغی بھی موجود تھی۔ پلیٹ ہم دونوں پاکستانیوں کے سامنے پہنچا دی گئی۔ لی نے کہا: ''چکن چکن حلال حلال'' مجھے یاد آ گیا میرے داماد سائق نے کہا تھا کہ چینیوں کے نزدیک شاید پاکستانی صرف سور کو حرام سمجھتے ہیں۔ اور یہ کہ اُن کے حلال حرام کا تصور بہت گڑبڑ ہے۔ سائق چین میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ لہٰذا اُن کی بات میں نے پلے باندھی ہوئی تھی؛ فورا سبزی خور ہو گیا۔ ڈاکٹر صابر کو بھی یہی حیلہ کارگر لگا۔ نیپال کے گوبند راج بھٹیاری، لگتا ہے پہلے سے ویجی ٹیرین تھے۔ بس ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کر لیا کرتے تھے کہ کس ڈش کی طرف ہاتھ بڑھانا ہے اور کس کی طرف نہیں۔ کھانے کے اسی مرحلے کے دوران ہم ایک دوسرے سے متعارف بھی ہو رہے تھے۔

کانفرنس کا باقاعدہ آغاز اگلے روز اسی ثقافتی شہر کے لِن یُن ہوٹل کی ایک اور عمارت میں ہوا۔ تقسیم کیے گئے طبع شدہ پروگرام کے مطابق افتتاحی اجلاس میں چین کے صوبہ ینان کے رائٹرز ایسوسی ایشن کی خاتون نائب صدر یوہانگ چنگ لنگ، نیپال اکیڈمی کے سیکرٹری جیویندرا دیوگری اور اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو کو موضوع کے حوالے سے کلیدی گفتگو کرنا تھی، اُن کے فرائض نبھانے کے لیے میں نے ڈاکٹر عبدالرزاق صابر، وائس چانسلر تربت یونیورسٹی کا نام تجویز کر دیا تو منتظمین نے بہ خوشی پروگرام میں ردوبدل کر لیا۔ تاہم اس موقع پر لاہور میں منعقد ہونے والی، اکادمی ادبیات پاکستان کی پاک چین ادبی کانفرنس کو بہت یاد کیا گیا۔ لی جن چی، جو اس کانفرنس کے منتظمین میں سے تھے، اکادمی ادبیات کی لاہور والی کانفرنس میں شرکت کی تھی اور وہاں سے اچھی یادیں لے کر لوٹے تھے۔ ان یادوں کا چرچا وہاں رہا اور اُنہوں نے ڈاکٹر بگھیو کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

کانفرنس کے آغاز میں ہی تحائف کا تبادلہ ہوا اور لی جن چی نے بتایا کہ چین کے مختلف صوبوں سے آنے والے شرکاء میں سے کوئی افسانہ نگار ہے تو کوئی ناول نگار اور کوئی شاعر۔ اس کا اندازہ ہمیں بہت جلد وہاں کانفرنس میں پیش کیے گئے مقالات اور گفتگوؤں سے ہو گیا کہ لگ بھگ سب ہی کانفرنس کے لیے طے شدہ موضوع کو اپنے اپنے تخلیقی عمل سے جوڑ کر بات کر رہے تھے۔ کانفرنس میں ہماری گفتگو کو چینیوں تک پہنچانے اور چینیوں کا کہا ہمیں بتانے کے لیے مترجمین کا انتظام تھا۔ وقفے وقفے سے ہمارے سامنے موجود قہوے کی پیالیاں بھر دی جاتیں، جو ہم پانی کی طرح، مگر گھونٹ گھونٹ پیتے رہے۔ خاتون نائب صدر فیڈریشن برائے ادب وثقافت صوبہ ینان، ہوانگ ایگ لنگ نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ سلک روڈ محض وہ نہیں ہے جس کے ذریعے علاقائی اقتصادی ترقی کے امکانات وسیع تر ہوتے چلے گئے ہیں مل کہ یہ تو فرد سے فرد کے رابطے اور تہذیبی رشتوں کے قیام کی شاہراہ کا نام بھی ہے اور یہی رشتے مستحکم اور دیرپا ہو سکتے ہیں۔ محترمہ کے مطابق ہم ادیب ینان میں جمع ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو جان سکیں، تہذیبی اشتراکات کو نشان زد کر سکیں اور بہت گہرائی میں جا کر ادبی کام کو سمجھنے کے علاوہ ایک دوسرے سے تخلیقی سطح پر اخذ کر سکیں۔

نیپال سے معروف نقاد اور نیپال اکادمی کے سیکرٹری ڈاکٹر جیویندرا دیوگری نے کہا، چین کے ادیبوں کی طرف سے جس ادبی سلک روڈ کا تصور سامنے لایا گیا ہے، یہ اس لیے بھی قابل عمل ہے کہ اس کی بنیادیں پہلے سے موجود ہیں۔ یہی وہ حقیقی شاہراہ ریشم ہے جو مختلف زبانوں میں لکھنے والے ادیبوں کو تہذیبی سطح پر قریب تر لا سکتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین کا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں ثقافتی تنوع میں انسانی حقوق کی موجودہ صورت حال اور سول سوسائٹی کے تحرک اور ابلاغی اداروں کے کردار کو زیر بحث لانے کے بعد عالمی سطح پر ادیبوں کے باہمی رابطوں کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صابر نے اپنے الگ مقالے میں پاکستان کے ثقافتی تنوع پر مفصل بات کی۔ ڈاکٹر صابر نے اس موقع پر بتایا کہ چین کی طرف سے گوادر پورٹ کے لیے جو تعاون پاکستان کو حاصل ہے اس سے سب آگاہ ہے، بلوچستان کے اسی اہم شہر گوادر میں اُن کی تربت یونیورسٹی نے اپنا کیمپس کھول دیا ہے اور بہت جلد وہ چاہیں گے کہ چین اور پاکستان کے ادیب وہاں ایک کانفرنس منعقد کریں۔

چائنا رائٹرز ایسوسی ایشن میں تخلیقی فنون اور رابطہ کاری کے شعبہ کے ڈائریکٹر اور ادبی نقاد ہنگ شوے منگ نے کہا ہم چین کے لوگ بھی قسمت پر یقین رکھتے ہیں، اور یہ ہمارے نصیب میں تھا کہ ہم پھر سے ملیں گے، تو ہم یہاں اکٹھے ہیں، پاکستان سے، نیپال سے اور چین کے مختلف صوبوں کے ادیبوں کا یوں مل بیٹھنا عام واقعہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے نیپال کے ایک گزشتہ سفر کے تجربات، بہت دلچسپ

پیرائے میں سنائے اور پھر چین کے ادب کے حوالے سے بہت اہم تجزیہ پیش کیا۔ انھوں نے چین کی ادبی ایسوسی ایشن کے بارے میں بھی مفصل بتایا اور اپنی بات اس جملے پر ختم کی کہ اب تو چین میں ادب تخلیق کرنا مسرت کا حصول اور اپنے خوابوں کے ساتھ جینے کا نام ہوگیا ہے۔

نیپال کے اس کالر پروفیسر پریم کمار کھتری، جو وہاں تری بھوان یونیورسٹی کے شعبہ ثقافت میں پڑھاتے رہے ہیں، نے سلک روڈ کی تاریخ، سلک روڈ کے عہد جدید میں عملی صورت، ملکوں کے درمیان رابطوں سے آگے بڑھ کر ایک ملک کے شہری کے دوسرے ملک کے شہری سے تعلق کی ضرورت اور تہذیبی، ثقافتی اور ادبی سطح پر اس کی مختلف صورتوں پر بات کی۔ پروفیسر کھتری نے کہا عالمی سطح پر امن اور تہذیبی بقا کے لیے ضروری ہے کہ تہذیبیں ایک دوسرے کو سمجھیں، اسی سے تشدد کی نئی لہر کے مقابل بند باندھا جا سکتا ہے۔

چین کے ناول نگار اور رائٹرز ایسوسی ایشن صوبہ ینان کے ایگزیکٹو وائس پریزیڈنٹ فان وین نے کہا ہم ینان کے لکھنے والوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے قدموں تلے کی وسیع زمین کو، اور اس وسعت میں پھیلے ہوئے اور بسے ہوئے لوگوں کیسے شناخت کریں۔ چین کے وسیع لینڈ سکیپ میں رکھ کر دیکھیں تو صوبہ ینان میں چھپن مختلف نسلی گروہ ہیں اور لگ بھگ پچیس متنوع تہذیبیں ہیں اور ان سب کو ایک تیز تبدیلی کے دھارے کا بھی سامنا ہے۔ انھوں نے کہا، سماجی ترقی کے نام پر تہذیبی ترقی اور روایات کو کیسے قربان کر دیا جائے۔ ابھی اس خوب صورت زمین کے تاریخی اور ثقافتی خزانوں کی پوری طرح سامنے نہیں لایا جا سکا ہے، ادب ہی اس مشکل سے ہمیں نکال سکتا ہے اور اس خزانے کو انسانیت کی جھولی میں ڈال سکتا ہے۔

ناول نگار، شاعر اور چین کے صوبہ چونگ کینگ کی رائٹرز ایسوسی ایشن کے نائب صدر ہاجو شوئے نے کہا ادب دل کا گیت اور جذبوں کی اُڑان کا نام ہے لہٰذا زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ہر فرد اس کی طرف لپکتا ضرور ہے۔ تسلیم کہ صرف ادب ہی زندگی نہیں ہوتا اور یہ بھی درست کہ یہ زندگی کی کسی شاہراہ کا نام نہیں ہے مگر ہمارے دلوں کے اندر، ہمارے لہو میں اس کی طلب موجود رہتی ہے۔ انھوں نے کہا تہذیب اور روایت کو لے کر لکھا جانے والا قدیم ادب ہو یا تبدیل ہو جانے والے زمانے کا جدید ادب یا پھر مشرق مغرب والا ادب، اس کا معاملہ انسانیت سے، انسانی اقدار سے اور انسانی دل سے ہوتا ہے اور جہاں دوسری وسائل رکاوٹ بن رہے ہوں، تو ادب ہی ایسا وسیلہ ہے جو ترسیلی فریضہ سنبھال لیتا ہے کہ آخر دل کا دل سے معاملہ ہوتا ہے۔

ناول نگار اور چین کے گوانگسی صوبے کی ادبی ایسوسی ایشن کے نائب صدر ژوشین یو کا کہنا تھا کہ ''ایک ادیب کے لیے بچپن کی یادیں سرمائے جیسی ہوتی ہیں۔ میں نے اپنا بچپن کانٹون اور گوانگسی کی سرحد پر واقع ایک گاؤں میں گزارا ہے۔ گاؤں کی زندگی محدود، سادہ اور آہستہ گام تھی۔ تب میں نے اپنے

باپ سے تین بادشاہتوں کی رومانوی کہانیاں سنیں اور وہ فلمیں دیکھیں جو کبھی کبھار گاؤں میں آکر دکھائی جاتیں اور جن میں سویت یونین، ہانگ کانگ، بنکاک اور تائیوان کو دکھایا جاتا تو محسوس ہوا کہ اس سب کا ہمارے گاؤں سے کوئی تعلق ہے اور نہیں بھی۔ یہی میرا ادب سے پہلا تعارف تھا، میرا ادب گاؤں کی زندگی، محبت، سائنس، فکشن، حقیقت اور خواب کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ میرا باپ دنیا چھوڑ گیا، زمین ویسی نہ رہی جیسی تھی۔ کسی ادیب کا کہا سناتے ہوئے انھوں نے کہا، ادب تبدیل ہوتی دنیا میں معدوم ہوتی اور نسیان کا حصہ ہوتی چیزوں، جذبوں اور روایات کی بازیافت کا نام ہے۔ ادیب وہی ہے جو آگے بڑھتے ہوئے اپنے آغاز کو فراموش نہ کرے۔

نیپال کی معروف نقاد اور تری بھوان یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر گوبندا راج بھٹیاری ایک زمانے میں کراچی کی آغا خان یونیورسٹی میں بھی پڑھاتے رہے ہیں۔ انھیں اپنی بات کہنے کا موقع دیا گیا تو شستہ اور پرمغز گفتگو سے سماں باندھ کر رکھ دیا۔ سلک روڈ کے حوالے سے ان کی فراہم کردہ معلومات قیمتی تھیں اور تجاویز قابل عمل۔ انھوں نے آخر میں کہا نیپال مقفل زمین والا ملک ہے۔ اس پر بھی ایک متبادل دروازہ کھلنا چاہیے۔ 'انڈو نیپال' نام کا صرف ایک دروازہ اس کی معاشی اور سماجی ترقی کے حوالے سے ہمیشہ ایک اندیشے کی صورت رہا ہے۔ اکلوتے دروازے کی لگ بھگ پچھلے چھ ماہ کی بندش کے بعد متبادل راہ کی تلاش کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا ہے کہ ہم پر چین کی سمت اور چین کی ہماری سمت راہ کھلنی چاہیے۔

چینی شاعر اور صوبہ گوزہو کی ادبی تنظیم کے نائب صدر ہوانگ جیان یونگ نے ادب اور شاعری میں بدلتی ہوئی صورت حال میں تہذیبی شعائر کی تکریم کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا اور کہا کہ بہ طور خاص ایشیا کے ترقی پذیر ممالک میں یہ سوال بہت اہم ہو گیا ہے کہ ''ہم اپنی تہذیب اور روایات سے کس طرح کا تعلق رکھیں؟'' اور ''ہم اسے کیا کریں جو ہماری شعری ادبی روایت کی عطا ہے؟'' نئی ادبی شاہراہ ریشم کے حوالے سے منعقدہ اس کانفرنس میں یہ سوال بہت توجہ مانگ رہا ہے۔ دیہات میں بہت تبدیلی آرہی ہے۔ صنعتی ترقی سب کچھ بدل دینا چاہتی ہے۔ دیہات کی سادہ زندگی پر آگے کا راستہ بند ہے مگر ہمارے کلچر کا کیا ہوگا؟ جب کہ کسی قوم کی ثقافتی تقدیر اس قوم کے مقدر سے جڑی ہوئی ہوتی ہے اور ایک مضبوط ملک کی اپنی ثقافت کو بہر حال پائیدار رہنا چاہیے۔

چین کے صوبہ سی چوان کی ادبی تنظیم کے نائب صدر اور تنقید نگار لنو یوانگ نے جدید ادبی دنیا کے کئی حوالے دیتے ہوئے کہا کہ ادب کو اپنی تہذیب اور روایات میں بہت گہرائی میں اُترا ہوا ہونا چاہیے اور ہوتا بھی ہے۔ ہمیں اپنا تجربہ دنیا کے سامنے رکھنا ہوگا زمین سے جڑا ہوا تجربہ۔ چینی زبان کے شاعر اور صوبہ گینشو کی رائٹرز ایسوسی ایشن کے نائب صدر گوئے کوائے نے نیپال میں جانے اور وہاں کے انسانی

زندگی کے تجربات کو اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھا اور بتایا کہ اپنی آنکھوں سے ایک معاشرت کو دیکھ کر جس طرح سمجھا جا سکتا ہے اسے معلومات اکھٹا کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسروں کو سمجھنے کے لیے مشاہدہ کرنا، چھو کر دیکھنا اور مکالمہ کرنا بہت اہم ہے۔ اسی سے احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ گوئے کوائے نے اس موقع پر ایک نظم سنائی، جس کا عنوان تھا: ''جھکنا اور سر کو بلند کرنا''

''میں بجھاتا ہوں
ایک شاہین کو کہ وہ بلندیوں کی سمت اُڑتا چلا جائے
اور ایک شاہین مجھے بجھاتا ہے
کہ میں نیچے رہوں، زمین پر
ایک شاہین مجھے سکھاتا ہے
کہ آسمان کو یوں دیکھا جا سکتا ہے
اور میں نے شاہین کو سکھایا
کہ زمین بھی اس طرح دیکھنے کے لیے ہوتی ہے۔''

گوئے کوائے نے کہا اس مختصر نظم میں باہمی اعتماد اور ایک دوسرے سے سیکھنے کا درس ہے اور ادب ہمیں یہی سکھاتا ہے۔ اس موقع پر صوبہ ینان کی ادبی ثقافتی تنظیم کے نائب صدر اور ناول نگار ہوشنگ ننگ نے ایگریکلچرل سولائزیشن کے انڈسٹریل سولائزیشن میں ڈھلنے اور انسان اور قدرتی مظاہر کے درمیان آہنگ کو موضوع بنایا جب کہ وانگ شن بن (جو کہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ چین کے صوبہ چونگ کینگ کی رائٹرز ایسوسی ایشن کی پریزیڈیم کے ممبر بھی ہیں) نے ''لفظوں کے آفاق پر گرج چمک'' کا عنوان جما کر قدیم چینی شاعری کو نئی صورت حال میں رکھ کر گفتگو کی۔ انھوں نے اپنی بات کو یوں مکمل کیا: ''وہ چینی شاعر ہو یا دنیا کے کسی بھی ملک کا کوئی شاعر، وہ شاعری پر صرف نیلا آسمان نہیں دیکھتا، اپنی روح پر طلوع ہونے اور چمکنے والے سوج کو بھی دیکھتا ہے۔''

چینی ناول نگار اور صوبہ ینان کے وائس پریذیڈنٹ جھانگ جنگ کنوا نے علاقائی ادب کو موضوع بنایا اور بطور خاص اپنے صوبے کے ادب پر بات کی، جب کہ نوجوان ناول نگار اور جیھو یاگ رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر ژیو جیا تنگ ہونگ نے اپنی ناول نگاری کو اپنی سماجی صورت حال کے اندر رکھ کر مکالمہ قائم کیا۔ نائب صدر پراونشل رائٹرز ایسوسی ایشن گوانگ ژی اور ناولسٹ پان ہونگری نے بھی علاقائی ادب کو موضوع بناتے ہوئے کہا کہ ادب پہلے مقامی ہوتا ہے مگر آخر کار دوسری تہذیبوں سے مکالمہ کرنے لگتا ہے۔

اختتامی اجلاس میں مجھے گفتگو کرنا تھی، لہٰذا اس اجلاس میں، میں اس سرخ نکٹائی کے ساتھ گیا، جو چین کے ادیبوں نے مجھے افتتاحی اجلاس میں تحفے میں دی تھی۔ میں نے لکھا ہوا مقالہ ایک طرف

رکھ دیا اور پہلے پاکستان چین کی دوستی کے پس منظر پر کچھ کہا، پھر اس کے سمندر سے گہرے ہونے، پہاڑوں سے بلند ہونے، سٹیل سے مضبوط ہونے والے اس جملے کو دہرایا جو پاکستان میں دونوں ملکوں کی دوستی کے حوالے سے عوامی سطح پر دہرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد لٹریری ٹائمز کے ساتھ تحفے والی سرخ نکٹائی کا ذکر چھیڑا تو ٹائی کی تکرار پر ہنستے ہنستے مترجم لڑکی نے میری ساری گفتگو کا چینی میں ترجمہ کر دیا۔ اس پر سب نے گرمجوشی سے تالیاں بجائیں۔ یوں خوش گوار فضا میں مجھے موقع ملا کہ میں سماجی ترقی اور ادب و تہذیب کے موضوع پر کچھ کہوں۔ میں نے اکنامک کاریڈور کا ذکر کیا اور اس اکھاڑ پچھاڑ کا بھی جو سماجی، صنعتی اور معاشی ترقی کے لیے لازم ٹھہرتی ہے پھر ادب اور اس کے وظیفے کی بات بھی ہوئی۔ مجھے خوشی ہے کہ میری بات کو نہ صرف توجہ سے سنا گیا، فآن ون، جب اُن اہم نقاط کو سمیٹ کر ایک لحاظ سے کانفرنس کی سفارشات کی صورت میں رکھ رہے تھے تو میری گزارشات کو بار بار دہرایا بھی، بطور خاص میرے اس نقطے پر تو وہ بہت وضاحت سے بولتے رہے کہ بے رحم معاشی اور صنعتی ترقی ہمیشہ تہذیب اور ثقافت کو لتاڑ کر اور فالتو شئے گردان کر آگے بڑھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں ایسا ہوا وہاں تہذیب اور ثقافت کو محض آرکیالوجی کا حصہ ہونا پڑا کہ وہاں قدیم ثقافت کا زیاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کی ہمارے ہاں بہت اہمیت ہے ہماری زبان بھی اسی سے پیوست ہے۔ انھوں نے میری اس بات کو بھی دہرایا کہ ہمارے پاس زندہ ثقافت اور تہذیبی شعائر موجود ہیں، انھیں ممی بنانے کے بجائے انھیں سمجھا جانا چاہیے، اور انھیں سے رشتہ قائم رکھ کر شہر کی مادی زندگی میں آگے کی سمت قدم بڑھانے چاہئیں۔

جس روز ہم سارا دن مقالات سنتے سناتے اور کانفرنس کے موضوع پر بحث مباحثہ کرتے رہے، اُس کی شام کا قصہ بھی سُن لیجیے۔ چین میں کھانے کے جو اوقات ہمارے تجربے میں آئے، بس یوں سمجھے ہمارے ہاں کے پرانے وقتوں کے دیہات والے تھے، صبح چھ بجے ناشتہ، دوپہر ایک بجے کھانا، شام چھ بجے عشائیہ اللہ اللہ خیر صلا۔ عشائیہ ہو چکا تو اتنی جلدی کمرے میں جا کر لیٹ جانا اچھا نہ لگا، میں نے ڈاکٹر صابرہ کو ساتھ لیا اور ہوٹل سے باہر ہو لیے۔ ہمارے نیپالی ساتھی ڈاکٹر جیویندرا دیوگری بھی ہماری طرح باہر گھومنا چاہتے تھے، سو ہم وہاں سے پیدل ہی نکل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر دیوگری کا ملنا ایک لحاظ سے اچھا ہوا کہ وہ ہم سے ایک روز پہلے پہنچ کر شام کی چہل قدمی کا تجربہ کر چکے تھے سیدھا وہاں چوئی ہو پارک کی طرف لے گئے۔ اسے صرف پارک نہ کہیں کہ یہاں ساری رونق ایک کنول جھیل کی وجہ سے ہے جس کے چاروں طرف ایک میلہ سا سجا ہوا ہے۔ ہم ہوٹل سے نکلے اور یوآن ٹونگ اسٹریٹ پر آئے۔ رات قدرے گہری ہونے لگی تھی مگر پورا شہر روشنیوں سے نہایا ہوا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے اسٹورز تھے، بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے ہاں کے بڑے شہروں کے پوش علاقوں میں مقبول برانڈز نے اسٹورز کھول رکھے ہیں۔ فٹ پاتھ پر چلنے والوں کا ہجوم تھا۔ ایک اسٹور پر (جو غالباً عورتوں کو زیر جاموں کی کوئی اعلیٰ کوالٹی فراہم

کرتا تھا)، ایک خوب صورت چینی لڑکی کی مختصر ترین لباس میں قد آدم تصویر پورے شوکیس پر جلوے کی صورت موجود تھی۔ مجھے اس جانب دیکھتے ہوئے ڈاکٹر دیوگری نے کہا، نیا چین مارکیٹ کے سارے حربے سیکھ چکا ہے۔ ڈاکٹر صابر نے اضافہ کیا کئی سال پہلے جب وہ چین آئے تھے تو یہ جو سڑکوں پر ایک رو میں اسکوٹرز پر لڑکیاں لڑکے جا رہے ہیں، یہ منظر تب بھی ایسا ہی ہوتا تھا بس فرق تھا تو یہ کہ تب اسکوٹرز نہیں تھے سائیکلیں تھیں۔ جہاں اب اسکوٹرز کے لیے پارک کرنے نشانات بنائے گئے ہیں تب وہاں سائیکلیں پارک کی جاتیں۔ وقت بدل گیا ہے اور چین بھی بدل گیا ہے۔ مجھے لگا وہاں کی معیشت کے تیور بھی بدل گئے تھے۔

جس فٹ پاتھ پر ہم چل رہے تھے، وہاں مخصوص قسم کی دھاری دار ٹائلیں ایک لکیر چلتی تھی اور جوں ہی کوئی موڑ آتا وہاں ایک دو ٹائلوں کا نمونہ دھاری سے ڈبے دار ہو جاتا۔ فٹ پاتھ پر یہ الگ سے ٹائلیں نابیناؤں کی سہولت کے لیے لگائی گئی تھی، اور ایسا محض اس فٹ پاتھ پر نہیں تھا، شہر میں ہم جہاں کہیں گئے اس کا اہتمام ملا، یہ سلیقہ لگ بھگ زندگی کے ہر شعبے کے حوالے سے وہاں ہم تجربہ کر رہے تھے۔

چوئی ہو پارک میں تھوڑا سا آگے گئے تو وہاں ایک بوڑھا میوزک آرگن بجا رہا تھا اور اس کے گرد بڑی عمر کے چینیوں کی بڑی تعداد سرمستی میں جھوم رہی تھی۔ اس پارک کی ہر روش بہت سلیقے سے سنواری گئی تھی۔ ایک ایک درخت کو کس رُخ بڑھنا ہے، اس کی پہلے سے منصوبہ بندی کی گئی تھی کہ لگ بھگ ہر درخت کا رُخ متعین کرنے کرنے کے لیے اس کو ادھر ادھر سے سہارے لگائے گئے تھے۔ پارک میں روشنی زیادہ نہ تھی، نہ ہی اتنی کم کہ کچھ سجھائی نہ دے۔ اس مناسب مقدار کی روشنی نے پارک کا ماحول بہت خواب ناک سا بنا رکھا تھا۔ ہم دیر تک اس پارک میں رہے خاموش رہ کر اس ماحول کو محسوس کیا۔ پھر چلتے چلتے ان دکانوں تک گئے جن پر یہاں کی روایتی اشیاء فروخت ہو رہی تھیں۔ پارک سے جب ہم واپس ہو رہے تھے تو موسم کے تیور بھی بدل رہے تھے

اگلے روز پروگرام کے مطابق ہمیں شی لن دیکھنے جانا تھا۔ شی لن کو انگریزی میں سٹون فارسٹ کہا جاتا ہے۔ یہ سنگی جنگل کن منگ سے کوئی پونے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم صبح ناشتے کے بعد نکل کھڑے ہوئے۔ شہر سے نکلتے نکلتے ہی ہمیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ راستے میں دور تک ٹنل فارمنگ کے خوب صورت مناظر دیکھے۔ حد نظر تک گرین ہاؤسز کا دیکھنا میرا زندگی کا انوکھا تجربہ تھا۔ شاید ہی زمین کا کوئی ٹکڑا ہو جو بے کار پڑا ہو۔ پہاڑی علاقہ تھا اور راہ میں چھوٹی بڑی پانچ سرنگیں آئیں جو پہاڑ کھود کر بنائی گئی تھیں۔ ایک دو سرنگیں تو اتنی لمبی تھیں کہ ایک طرف سے ہم داخل ہوئے تو دوسری طرف سے باہر نکلنے کا راستہ نظر آتا نہ وہاں سے اندر آتی روشنی۔ چین والوں کی اس ترقی کو سراہتے سراہتے ہم ایلیانگ کاؤنٹی پہنچ گئے۔ یہاں ہماری گاڑی شوئی چونگ ریسٹورنٹ کے سامنے رُکی اور جوں ہی ہم ہوٹل میں داخل ہونے لگے لڑکیوں کا گروپ آگے بڑھا ہاتھ سامنے باندھے اور جھک کر یک زبان ہو کر کچھ کہا۔ ہمارے استفسار

پر چینی ترجمان نے بتایا کہ وہ ہمیں خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ شوئی چونگ بہت بڑا ریسٹورنٹ ہے جس میں اس وقت بھی بہت بڑی تعداد میں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ یہ محض ریسٹورنٹ نہیں تھا، ایک میوزیم بھی تھا۔ وہاں ایک بڑے ہال میں لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے قد آور مجسمے اور دوسرے ثقافتی نمونے شوکیس کیے گئے تھے۔ اس ریسٹورنٹ کے سارے فرش چوبی تھے اور اسی طرح دیواروں کو بھی چوبی کام سے سجایا گیا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا دلکش تھا کہ ہم داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

ہمیں کھانے کے لیے ایک الگ طعام گاہ میں لے جایا گیا۔ پھر وہی چینی کھانوں کی حسب روایت ای ایک کر کے آمد کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ہاں یوں ہے کہ کھانے پر محفل جمی۔ اور یہ کوئی ہم انوکھا نہیں کر رہے تھے، یہ بھی چینیوں کی روایت ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے چاپ سٹکس سے کھاتے ہیں، بل کہ کہہ لیجیے کھانے سے ان چوبی ڈنڈیوں کے ذریعے دیر تک کھیلتے رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بالعموم وہ پرچ جتنی پلیٹ اور ایک چھوٹے سے پیالے میں چاپ سٹکس کی مدد تھوڑا سا کھانا ڈالتے ہیں اور کھانے کے لیے لگ بھگ اس پر جھک جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صابر کو چاپ سٹکس سے کھانے کا کچھ تجربہ تھا، مگر میں جب بھی انھیں جوڑ کر پلیٹ میں سے کچھ اُٹھانے کی کوشش کرتا تو ٹھیک ٹھاک تردد کرنے پر بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو پاتی۔ میزبانوں کو میری مشکل کا اندازہ ہو گیا تو کن منگ میں کہہ کہلوا کر ہوٹل والوں سے چمچ کانٹے کا اہتمام کرا ہی لیا۔ مجھے یاد ہے گزری شام جب میں چمچ کانٹے سے خوشی خوشی کھانے بیٹھا تھا تو سامنے بیٹھی دو چینی لڑکیاں پہلے تو غور سے میری حرکات دیکھتی رہیں اور جونھی میں چمچ منہ تک لے گیا وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھیں۔

ہم کن منگ سٹی میں نہیں، ایک کاؤنٹی میں تھے اور مجھے یہاں پھر چاپ سٹکس سے کھانا کھیلنا تھا۔

چینی کھانوں کا ذکر چل نکلا ہے تو بتاتا چلوں کہ چینیوں کے کھانے میں یوں تو بہت کچھ ایسا ہے جو ہم یہاں کھانے کا تصور تک نہیں کر سکتے، بس یوں سمجھئے کہ وہ یہ سب کچھ نہ کھا رہے ہوتے، تو جتنی بڑی آبادی چین کی ہے بھوکوں مر جاتی، تاہم لطف یہ ہے کہ وہ ہماری طرح کھانوں کو چٹ پٹا بنانے کے لیے تل بھون کر اس کا ناس نہیں مارتے۔ ہمارے ہاں یہ جو رواج چل نکلا ہے کہ کھانے کی میز پر سوڈے کی بوتلیں ہوں یا یخ پانی، مگر وہاں ایسا نہیں ہے۔ کسی کو میں نے یہ طلب کرتے ہوئے دیکھا بھی نہیں۔ آپ کی میز پر پانی کے لیے پیالیاں موجود ہیں، جن میں سبز چائے کی پتیاں ڈال دی گئی ہوتی ہیں۔ گرم پانی کی ایک چینک آپ کی میز پر فراہم کر دی جاتی ہے۔ یہی گرم پانی پیالی میں سبز چائے کی کومل پتیوں پر انڈیل لیں اور گھونٹ گھونٹ پیتے رہیں۔ شاید یہی سبب ہوگا کہ چینیوں کی توندیں نکلی ہوئی نہیں ہوتیں۔

میں نے چینیوں کے ہاں سویا بین کو کھانے کے اہم جزو کے طور پر دیکھا ہے۔ جونھی ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے، وہاں چائے اور کافی کا انتظام ہوتا۔ اب آپ اگر کافی میں دودھ ڈالنا

چاہتے ہیں تو یہ طوفو کا ہوگا۔ طوفو سے مراد سویا بین ہی ہے۔ میں نے یہ دودھ چکھا مجھے اس کا ذائقہ بالکل مختلف اور نامانوس سا لگا تاہم جب اس دودھ کے فوائد سنے تو سانس روک کر اسے پینے لگا تھا۔ کھانوں میں طوفو کا آئل بھی استعمال ہوتا ہے اور اسی طوفو کا سوپ بھی وہاں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ یوں تو وہاں ڈک اور چکن کا گوشت میسر کیا جاتا رہا اور اس کا سوپ بھی جو دیکھنے میں بھلا اور چینیوں کے مطابق ہمارے لیے ’حلال‘ تھا، مگر ہم نے اسے اپنے اوپر حلال نہیں کیا اور سارا زور اُبلے ہوئے چاولوں یا اُبلی ہوئی سبزیوں کے کھانے پر رکھا۔ خیر انھی سبزیوں یا پھر چاول کا سوپ بھی ہماری بھوک چمکانے کے لیے موجود تھا۔ چاول کا سوپ اور کچھ نہیں تھا، مجھے تو یوں لگتا ہے، یہ وہ پیچ تھی جسے ہمارے ہاں خواتین کپڑوں کو کلف لگانے کے لیے، اُبالے گئے چاولوں سے نکال لیا کرتی تھیں۔ یوں تو کھانے کو وہاں مچھلی بھی تھی مگر طوفو کے تیل میں کچھ زیادہ ہی گلی ہوئی مچھلی تیرتے دیکھ کر ہمارا جی بھی تیرنے لگتا تھا۔ ہاں، کچھ چیزیں وہاں ہم نے مزے لے لے کر کھائیں۔ مثلاً اُبلے ہوئے آلو، اُبلی ہوئی مونگ پھلی اُبلی ہوئی شکر قندی اور اُبلی ہوئی سبز پھلیاں اور پھلوں میں تربوز اور ناشپاتی۔ تربوز کاٹ کر اور ناشپاتی سالم پیش کی جاتی تاہم ناشپاتی اتنی نرم اور رس دار ہوتی کہ دانت رکھتے ہی رس پھوٹ بہتا تھا۔

کھانے کے بعد ہم پھر منزل مقصود کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ سٹون فارسٹ کے استقبالی علاقے میں ایک روایتی طرز کی عمارت میں لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو وہاں سے داخلے کا ٹکٹ لے رہے تھے۔ سٹون فارسٹ کو دیوار چین کے بعد ایک بڑا اگر قدرتی عجوبہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اندازاً پانچ سو مربع کلومیٹر علاقے میں پھیلا ہوا جنگل ہے۔ ایک حیرت کدہ، اس وسیع علاقے میں پتھر یوں اُگے ہوئے ہیں جیسے درخت اُگتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی دو سو ستر ملین سال پہلے، لائم سٹون کے اس علاقے میں قدرتی طور پر کٹاؤ کے عمل سے عمودی چٹانوں کا یہ جنگل بنتا چلا گیا۔ ہمارے ہاں کالاش کی کافر لڑکیاں جس طرح کا لباس پہنتی ہیں، اس سے ملتا جلتا لباس پہنے وہاں کی قدیم تہذیب کی امین لڑکیاں آنے والوں کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں اس اسٹون فارسٹ کی عجب عجب کہانیاں سناتی رہیں۔

ان ہی کی سنائی ہوئی ایک کہانی کے مطابق اسی علاقے میں آشا نامی لڑکی پیدا ہوئی تھی، جسے جوان ہو کر ایک لڑکے سے محبت ہو گئی تھی۔ آشا چینیوں کے ہاں ایک رومانی اسطورائی کردار کی طرح ہے جسے فلم کا موضوع بھی بنایا جا چکا ہے۔ میں ایک ایسی فلم کئی برس پہلے دیکھ چکا تھا لہٰذا بہت توجہ سے یی نامی قبیلے سے تعلق رکھنے والی اس بہادر بچی کا قصہ سننے لگا۔ تب قصہ سنانے والی نے سامنے ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کیا اور کہا وہ رہی اشما۔ میں نے سامنے دیکھا ایک پہاڑ جتنی چٹان ایک ایسی لڑکی کی طرح نظر آنے لگی تھی جس کی پشت پر ایک ٹوکری بندھی ہوئی تھی، چہرہ قدرے آسمان کی سمت اٹھا ہوا تھا اور اس نے انھی قصہ سنانے والیوں کی طرح کا روایتی لباس پہنا ہوا تھا۔ بارش میں بھیگتے بھیگتے ہم اس جنگل کے اندر تک گھس

گئے اور پیچ دار راستوں سے ہوتے اوپر چوٹی پر بنائی گئی ایک چوکی سے دور دور تک قدرت کے اس شاہکار کا نظارہ کیا۔

رات کا کھانا ہم نے لوٹ کر کن منگ میں کھایا اور کچھ دیر کے لیے ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ ہم چلتے چلتے ہوان ٹونگ ٹیمپل کے سامنے پہنچ گئے۔ اس ٹیمپل کے سامنے، سڑک پار، بڑی بڑی دکانوں پر بدھ تہذیب کے نوادرات ہماری توجہ کھینچ رہے تھے مگر ہمارا دامن وہاں سڑک پر بیٹھے قسمت کا حال بتانے والے بھی کھینچ رہے تھے جنھوں نے اپنے سامنے ایک کاغذ بچھا رکھا تھا جس پر کئی خانے بنے ہوئے تھے۔ کہہ لیجیے یہ ہمارے ہاں کے کسی دربار کے باہر والے منظر سے کچھ الگ منظر نہیں تھا۔

اگلے روز ہمیں کہیں اور جانا تھا اور اس خدشے کے پیش نظر کہ کل بھی اتنا ہی چلنا پڑے کا جتنا ہم سٹون فارسٹ میں چلے تھے، چاہا کہ خوب نیند لے کر خود کو تیار کر لیں۔ سونے کو میں جلد بستر میں گھس گیا اور آنکھ بھی لگ گئی مگر کچھ ہی وقت گزرا ہوگا کہ بادلوں کی شدید گڑگڑاہٹ اور کڑکتی بجلی کے بعد بارش کی شدید بوچھاڑ نے آلیا۔ اگر چہ یہ سب کچھ کھڑکی سے باہر ہو رہا تھا مگر یوں لگتا تھا بجلی کڑکتے چمکتے اندر تک گھس آتی تھی۔ میں اُٹھ کر کھڑکی تک گیا، کھڑکی کے شیشوں پر جیسے کوئی بالٹیاں بھر بھر کر پانی پھینک رہا تھا۔ بجلی ایک مرتبہ پھر کڑکی تو میں نے ادبدا کر شیشوں پر پردے گرا کر برابر کر دیے۔ اگر چہ میں نیند پوری نہ کر سکا تھا مگر حسب عادت میری وقت پر آنکھ کھل گئی۔ بدن پر عجب کسمساہٹ تیر رہی تھی۔ میں غسل خانے میں گھس گیا اور رات کی بے آرامی کو شاور کے نیچے قدرے زیادہ دیر رہ کر دھو ڈالا۔ اب میں اگلے دن کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

سٹون فارسٹ کی طرح، یہ دن ایک اور عجوبہ دیکھنے کا دن تھا۔ ہم کن منگ کے نواح میں ایک ایسی جھیل دیکھنے جا رہے تھے جو کئی سو کلومیٹر علاقے پر پانی کا عظیم ذخیرہ رکھتی تھی اور جس کے نواح میں ایک خوب صورت شہر بسایا جا رہا تھا۔ اس جھیل کا ایک نام ڈیان چی بھی ہے۔ یہ صوبہ ینان کی سب سے بڑی جھیل ہے تاہم مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ چین کی آٹھویں بڑی جھیل بنتی ہے۔ یہ علاقہ ایک زمانے میں چو آن کی قدیم سلطنت کا دارالحکومت تھا تب اسے کن چو آن کہتے تھے۔

کہتے جب چین میں انقلاب آیا تھا تو اس طرح کے سارے قدیم مظاہر ملیا میٹ کر ڈالے گئے تھے، مگر اب ہم دیکھ رہے تھے کہ انھیں ایک سلیقے سے اور قدیم ناموں کے ساتھ پھر سے تعمیر کیا جا رہا تھا۔ وہاں جو پیلس تعمیر کیا جا چکا تھا اور اسے اب سجایا جا رہا تھا وہ بھی یہاں پہلے سے موجود ایک محل کے نام پر تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہر کہیں رنگے ہوئے شیروں کے ماڈل رکھے ہوئے تھے، پوچھنے پر پتا چلا کہ قدیم زمانے میں یہاں کے لوگ شیر کو قوت کی علامت سمجھ کر اس کی توقیر کیا کرتے تھے۔ یہ محل، جس کی پشت پر پہاڑ اور سامنے جھیل تھی، یوں لگتا تھا جیسے ایک بہت بڑی کشتی کے اندر بنایا گیا تھا۔ ہم پہاڑی کے اوپر سے

اتر کر گہرائی میں جھیل کے اندر تک گئے۔ پانی کے اندر وسط تک روشیں بنائی گئی تھیں، کشتی رانی کا انتظام تھا، صاف شفاف پانی میں مچھلیوں کی اٹھکیلیاں تک نظر آ جاتی تھیں۔ وہیں پانی کے اندر ایک پلیٹ فارم پر بچوں کے لیے پارک، ایک عالیشان ہوٹل، سائیکل چلانے کے لیے ٹریک غرض آنے والوں کی توجہ کھینچنے کا ہر سامان موجود تھا۔ جھیل کے اندر جن راہداریوں سے ہم گزر رہے تھے وہ بانس موڑ کر باندھنے سے بنائی گئی تھیں۔ ہم جھیل سے نکل کر کنارے کی طرف آئے تو وہاں ایک طویل چھتے ہوئے قطعے میں لوگوں کا ہجوم دیکھا، بالکل ویسا ہی جیسا ہمارے ہاں سستے بازاروں میں لگتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ اس موسم کا جھیل سے مچھلیاں پکڑنے کا آخری دن تھا، اور وہاں سے مچھلی اکٹھی کر کے مارکیٹ میں لے جائی جا رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے وہیں ایک ہوٹل میں کھایا۔

ڈاکٹر صابر کی خواہش پر چینی میزبانوں نے ہمارے لیے اگلے روز کن منگ کی یونیورسٹیاں دکھانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا ایک الگ تجربہ رہا۔ وہاں ہم اساتذہ سے ملے اور طالب علموں سے بھی۔ یونیورسٹیوں کے اس دورے کے دوران میں جگہ جگہ ایسے مظاہر دیکھنے کو ملے جو خبر دیتے تھے کہ چین آگے بڑھنا چاہتا ہے، لیکن اپنے ماضی اور تہذیبی آثار کو طاقِ نسیاں پر رکھنے کر نہیں، انھیں ساتھ لے کر۔ انقلاب کے زمانے میں جن طلبا نے قربانیاں دیں، ان کے مدفن ہوں یا ان اساتذہ کے مجسمے جو اس راہ میں قربان ہوئے، انھیں بڑے بڑے تختوں پر پورے تاریخی کوائف اور تحسینی عبارتوں کے ساتھ نئی نسل کو منتقل کیا جا رہا تھا۔ کن منگ میں واقع ینان یونیورسٹی، چین کے اس حصے کی قدیم ترین اور بڑی یونیورسٹی ہے، گزشتہ آٹھ دہائیوں سے ایک دعویٰ کے مطابق اس کی تعلیمی خدمات کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح بارہ ماہی موسم بہار والے شہر کن منگ کی ایک اور یونیورسٹی کا نام اس صوبے کے نام پر، ینان نارمل یونیورسٹی ہے۔ اس نے بھی اپنی خدمات کے عوض بہت نیک نامی کمائی ہے۔ نوبیل انعام یافتہ ڈاکٹر یانگ زننگ اور ڈاکٹر زہنگ ڈاؤ سمیت کئی معروف سکالرز اس یونیورسٹی کے کیمپس سے منسلک رہے۔

یونیورسٹوں کے اس دورے کے دوران میں، جب ہم ینان یونیورسٹی کے زہنگ گونگ ہال کے سامنے پہنچے، تو میں نے ایک بوڑھے اور ایک بڑھیا کو دیکھا جو وہاں نوجوانوں کے سے جوش و جذبے کے ساتھ ورزش کرنے میں مصروف تھے، ان سے ذرا فاصلے پر لگ بھگ اتنی ہی عمر کا ایک اور بوڑھا ہاتھ اکڑائے اور ایک ٹانگ دہری کر کے 'سپر سلوموشن' میں یوں حرکت کر رہا تھا جیسے ہم اُسے وہاں حقیقت میں نہ دیکھ رہے تھے، کوئی منظر سکرین پر دکھایا جا رہا تھا۔ ہمارے چینی دوستوں نے بتایا کہ یہ یہاں کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ہم کوئی دو گھنٹے بعد واپس اسی مقام پر آئے تو تب ہم بھی یہ تینوں بوڑھے اسی جوش و جذبے سے مصروف تھے۔ یہ منظر ہمیں حیران کرنے کے لیے کافی تھا۔

شام، ہم نے بغیر کسی گائڈ کے شہر کا اندرون دیکھنے اور یہاں کے کسی بڑے شاپنگ مال جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا کیوں کہ وہاں چینی کے علاوہ کسی اور زبان میں مکالمہ، اور وہ بھی ٹیکسی ڈرائیوروں، دکان داروں اور راہ گیروں سے ممکن ہی نہ تھا۔ خیر، ڈاکٹر صابر نے ایک بڑے شاپنگ پلازہ کا نام اپنے چینی ترجمان سے چینی زبان میں لکھوالیا، ہوٹل کا کارڈ جیب میں رکھا اور نکل کھڑے ہوئے۔ اِدھر اُدھر کئی گنجان آبادی والے علاقوں کی طرف نظر کی اور اُن گلیوں میں تاکا جھانکی کی جہاں سے سڑکوں پر ریڑھی لگا کر پھل بیچنے والے، ٹیکسی ڈرائیور، قدیم ٹیمپل کے سامنے قسمت کا حال بتانے والے اور دوسرے محنت کش طبقے کے لوگ صبح ہی صبح سڑکوں پر اُمل پڑتے تھے۔ یوں تاکنا یہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ نئے سرمایہ داری نظام کا جبڑا یہاں بھی خوب پڑا تھا جس کی وجہ سے نچلے، درمیانی اور اونچے طبقات کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ ٹیکسی والے کو ہم نے وہ چٹ دِکھائی جس پر مال کا نام لکھا ہوا تھا۔ اُس نے یہ نام پڑھ کر اثبات میں سر ہلایا اور ہمیں سیدھا وہاں لے گیا۔ کئی منزلوں پر مشتمل مال ہر طرح کی اشیا سے بھرا پڑا تھا اور سارا کاروبار عورتوں کے ہاتھ میں تھا۔ عورتیں نہ کہیں لڑکیاں کہیں، کہ بیشتر جواں سال تھیں اور لگ بھگ ویسا ہی لباس پہنے ہوئے تھیں جیسا میں کئی سال پہلے بنکاک میں تھائی لڑکیوں کو پہنے دیکھ چکا تھا۔ ہمیں بہت جلد اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں ہمیں خریداری کا وہ تجربہ ہمارے کام آئے گا، جو یہاں گلیوں میں قالین بیچنے والے افغانیوں کی عطا تھا، یعنی وہ بیس ہزار مانگیں تو یقین رکھو وہ پانچ میں بھی دے کر منافع کما لیں گے۔ ہم چینی جانتے تھے نہ وہ کوئی اور زبان؛ لہٰذا سودے بازی کا حیلہ ہم نے یہ کیا کہ مطلوبہ چیز پر ہاتھ رکھتے اور کیلکولیٹر کی طرف اشارہ کر دیتے۔ سیلز گرل کیلکولیٹر پر ایک ہندسہ لکھ دیتی؛ گویا یہ اس کی ڈیمانڈ تھی۔ ہم فوراً اُسے چار پر تقسیم کر کے ہندسہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے۔ وہ کھلکھلا کر یوں ہنستی، جیسے ہم نے کوئی بے وقوفی والی حرکت کی ہو، اور ہاتھ کے اشارے سے ‘نہ نہ’ کرتی۔ ہم بھی ہتھیلیوں کا رُخ اس کی طرف کر کے ذرا جھٹکا دے کر اِدھر اُدھر کرتے کہ جو کہا جا رہا تھا بس وہی قیمت ٹھیک تھی۔ وہ کچھ گھٹا کر لکھ دیتی۔ ہم ویسے ہی ‘نہ نہ’ کرتے جیسے اُس نے کیا تھا۔ رقم اس ‘نہ نہ’ کے بیچ گھٹتی چلی جاتی۔ پھر ہم ایک اور حیلہ کرتے اور اپنے آپ کو مایوس ظاہر کر کے وہاں سے چلنے لگتے۔ بس یہی وہ مرحلہ ہوتا تھا کہ اکثر اس رقم پر ہی سودا ہو جاتا تھا جو ہم نے کیلکولیٹر پر پہلی بار لکھی ہوتی تھی۔ خیر ہم خوب بیگ بھر کر بہ خیریت ہوٹل پہنچ گئے تو شام ایک بار پھر ہم شی چنگ ہوئی گوان جیسے قدیم ہوٹل میں الوداعی کھانا کھا رہے تھے۔

ہم نے چین کے اس دورے میں ترقی کی طرف گامزن چین کو اپنی تہذیب کو ساتھ لے کر چلنے کی یہ عملی صورتیں دیکھیں۔ نئی ادبی شاہراہ ریشم اور تہذیب وثقافت کو موضوع بنانے والا یہ سہ ملکی سیمینار بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اس سیمینار کے موقع پر جس محبت سے چین کے ادیب ہمارے ساتھ ساتھ مکالمے میں رہے، اہم مقامات دکھاتے رہے، مہمان نوازی کی، اس سب کا تجربہ ایسا ہے کہ جسے ہم بھول

نہیں پائیں گے، اور ہاں لطف کی بات یہ ہے کہ چین کے ادیب بھی اس تجربے کو بھولنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا اس موقع پر جو گفتگو ہوئی، جو مقالات پڑھے گئے انھیں انگریزی اور چینی زبان میں ایک کتاب کی صورت انھوں نے اپنی ملک بھر کی تنظیموں کے لیے فراہم کر دیا ہے۔ مختلف صوبوں سے آئے ادیب اور اپنی اپنی تنظیموں کے ذمہ داران یہ کتابیں اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔ واقعی ڈاکٹر دیوگری نے خوب کہا تھا، نئی ادبی شاہراہ ریشم ہمارے اس علاقے کے انسانوں کو تہذیبی سطح پر رہنے کے قابل بنانے کا عمل ہی تو ہے۔

☆☆☆☆

خالد صدیقی

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

جب سے مرزا غالبؔ کا یہ مصرعہ ہمارے ذہن میں دبے پاؤں داخل ہوا ہے مسلسل کروٹیں لینے کی حالت میں ہے۔ سکون اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا اِس بنا ہمیں ذوقِ نظر کے اُدھیڑ بُن میں اُلجھائے رکھتا ہے۔ ہماری دانست میں ذوقِ نظر ایسا ہیولیٰ ہے جو پل بھر میں نظر کو پریشان اور تڑپا کر رکھ دیتا ہے۔ ہم کافی عرصہ تک اِس اُدھیڑ بُن میں رہے کہ ذوقِ نظر ماپنے کا معیار کیا ہے۔ اندازہ یہ ہوا کہ ہر ذی ہوش نے اِس معاملہ میں اپنا معیار خود متعین کیا ہوا ہے۔ کسی کے لیے جھیل جیسی آنکھیں اُس کے ذوقِ نظر کی کمزوری ثابت ہوتی ہیں۔ کوئی دراز گیسو دیکھتے ہی ہواس باختہ ہو جاتا ہے۔ کوئی گندمی رنگ کے حسین نقش دیکھتے ہی اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ کوئی مست ہرنی والی چال پر نظر پڑتے ہی لوٹن کبوتر ہو جاتا ہے۔ کوئی دراز قد فربا اندام کو اپنی نظروں میں سمیٹتے ہی باولا ہو جاتا ہے۔ کوئی کمان جیسے ابرو، مرمریں اُنگلیاں اور پالش والے لمبے ناخن دیکھتے ہی اِختلاجِ قلب کے دوروں کا مزہ لینے لگتا ہے۔ ہم ایک ایسی شخصیت کو جانتے ہیں جنھوں نے شاعرانہ مزاج اور نازک طبیعت پائی ہے۔ اُن کو کوئی چھو کر گزر جائے تو بے وزن ہو کر گر پڑتے ہیں اور اگر اُن کے نزدیک سے کسی خوبرو کا معطر جھونکا گزر جائے تو وہ فوراً انٹا غفیل ہونے والی کیفیت میں آجاتے ہیں۔ اُن کے دلِ ناتواں اور بلڈ پریشر کے معائنے کے لیے ایک نگران مختلف قسم کے خمیروں سمیت اُن کے ہمراہ رہتا ہے۔

یہ تو قدرتی اَمر ہے کہ اچھی صورتیں آنکھ کو بھاتی ہیں اور وہ اُن صورتوں کے تعاقب میں رہتی ہے۔ بُری صورتوں سے نظر میل کھانے سے اِجتناب کرتی ہے۔ مگر کیا کیا جائے قدرت نے خوبصورت اور بدصورت کو پیدا کر کے اِس دُنیائے چمن کو گلہائے رنگ رنگ سے آباد کیا ہوا ہے۔ ہر شخص کی نگاہ خوش صورت اور جاذب چہروں کو فوراً مرکزِ توجہ بناتی ہے، درمیانے اور نچلے درجے والوں کو یک دم نظر انداز کر دیتی ہے۔ پہلے کہنہ مشق اُستاد محبوب کی تعریف و توصیف میں لمبی لمبی بحروں میں غزلیں کہا کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محبوب اپنی خودی میں اکڑ کر سخت ہو گیا۔ بقول غالبؔ

چال جیسے کڑی کمان کا تیر

ذوقِ نظر کی تسکین کا راز تو حُسن کی سادگی، فطری معصومیت اور قدرتی رنگ و بُو میں مخفی ہے۔ آج کے دور میں آپ کسی شادی کی تقریب میں چلے جائیں یا کسی نمائش میں موجود ہوں، بیوٹی پارلروں کی مصنوعی جادوگری چغلی کھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک خاتون کا یہ جملہ ہمیں بہت دلچسپ اور بھلا لگا کہ وہ جتنی دفعہ بھی

اپنے چہرے کو فیشل کرانے بیوٹی پارلر گئیں مگر چہرے پر موجود پھٹکار نے کسی طرح اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔

پُرانے زمانے میں حُسن چلمن کی اُوٹ سے اپنی شوخی اور اٹھکھیلیوں کی بدولت اچھے اچھے تقدس مآب کھوسٹوں کو تڑپایا کرتا تھا۔ چلمن ہی کے پیچھے سے نظروں ہی نظروں میں معاملاتِ عشق طے پاتے تھے۔ مگر آج کے جدید دور میں اُردو، انگریزی میں شیریں لہجے کی گٹ پٹ کے ذریعے ایسا سماں باندھا جاتا ہے کہ دل ریش کو بھی اپنا دل ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پُرانے زمانے کے حُسن پر جب صنفِ قوی کی نظر پڑتی تھی تو شرم و حجاب سے نگاہیں جُھک جایا کرتی تھیں۔ بقول شاعر

وہ ہوں گے بے حجاب پردہ کریں گے ہم

اور اسی چیز میں ذوقِ نظر کی تسکین کا رازِ نہاں تھا۔ مگر اب تو حُسن ترقی پسند ہو گیا ہے۔ کسی سیر، سوا سیر یا پاؤ بھر کی مردانہ شخصیت پر نظر پڑتے ہی ظرافت میں گوندھا ہوا شریر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ گمان ہے کہ ظرافت نگاری نے اِنھی تبصروں سے جنم لیا ہوگا۔ پچھلے دنوں مردانہ فیشن اسٹائل میں قوس نُما مونچھوں، چکنے گنجے پن اور درازیِ زُلف کی آمد دکھائی دی جو ماہ وشوں کے ہلکے پھلکے ظریفانہ تبصروں کا باعث بنی۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ حُسن کی نگاہ کسی درویشانہ مونچھ یا گنجے کے سر سے پھسل کر رجعتِ قہقری کر گئی یا پھر مردانہ زلفوں کی درازی ماپتے ماپتے زمین میں گڑ گئی۔

ہمارے ایک دوست میر صاحب جو ذوقِ نظر کے معاملے میں کافی جدت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اُن کی تسکینِ نظر کا راز ناشپاتیوں میں مخفی ہے۔ ناشپاتیاں دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتے ہیں اور اُن کی طرف لپکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے اِس ضمن جب اُن سے اِس کی وجہ جاننے کی کوشش کی تو وہ اُلٹا ہم پر برہم ہوئے۔ فرمانے لگے ناشپاتی اپنی بناوٹ میں قدرت کی مصوری کا ایک حسین نمونہ ہے۔ اِس کی بناوٹ میں شاعرانہ حُسن بھی بہ درجہ اُتم پایا جاتا ہے۔ یہ اعزاز کسی اور پھل کو نصیب نہیں۔ اِسے دیکھتے ہی بقول اُن کے وہ تصورات کے حسین لمحوں میں جھومنے لگتے ہیں اور محبوب کے تخیلاتی پیکر سے لُطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ مزید فرمانے لگے، اُنھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ناشپاتیوں کی جمالیاتی حُسن کی وجہ سے جی رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے گھر میں ناشپاتیوں کے موسم میں اُن کی ریل پیل ہوتی ہے۔ مہمانوں کا دل بھی اُن ہی سے بہلایا جاتا ہے۔ ایک دن اُن کی بیگم اُن سے گویا ہوئیں کہ مارکیٹ میں ناشپاتی کے علاوہ کوئی اور پھل بھی ملتا ہے یا نہیں۔ فرمانے لگے کہ ہاں اِس کا نعم البدل انور ریٹول (آم) کی شکل میں موجود ہے جو موسمِ گرما میں آپ کے ذوق کی زینت بنتا ہے۔ اُن کی بیگم فرمانے لگیں کہ آم کی تو کئی قسمیں ہیں، یہ انور ریٹول ہی کیوں۔ کہنے لگے کہ یہ سیرت و صورت میں لاثانی ہے۔ آپ کی نظروں کے تعاقب میں رہتا ہے۔ جوں ہی آپ کی نظریں اِس سے چار ہوتی ہیں یہ بہ آسانی آپ کا ہو جاتا ہے اور آپ کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ آپ کی ذوقِ طبع کو پہچانتے ہوئے آپ کے منہ میں آنے کے لیے چونچلے کرتا ہے۔ آپ کو اِردگرد سے بے نیاز کر کے اپنی

مٹھاس سے آپ کا دل بہلاتا ہے۔

میر صاحب ایک دن ہمیں پینٹنگ کی ایک نمائش میں لے گئے۔ ایک پینٹنگ کے سامنے اُن کے قدم رُک گئے۔ یہ پینٹنگ مصور کی مصوری کا شاہکار تھی۔ اِس پینٹنگ میں مصور نے دوشیزہ کی دوشیزگی کا بھرپور رُوپ دکھایا تھا۔ میر صاحب فرمانے لگے کہ مصور نے اِس پینٹنگ میں قوسوں کا جو اُبھار دکھایا ہے اِس سے مصور کا فن واقعی بولتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ذوقِ نظر کا موجب ہے۔

ہمارے ایک اور دوست ہیں کلّو میاں۔ باہر سے کالے اندر سے پیارے اور ذوقِ نظر کے متوالے ہیں۔ ایک دِن وہ ہمارے گھر ہم سے ملنے آئے۔ ہم نے خیریت پوچھی۔ کہنے لگے گزشتہ رات عجب قصہ ہو گیا۔ میں ایک محفلِ موسیقی میں مدعو تھا۔ شب کو بھی دِن کا سماں تھا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ آسمان کی حوروں نے ساقی کا میخانہ آباد کیا ہوا ہے۔ نظروں کے مسحور کُن جام کا دور چل رہا تھا۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق پی کر مست ہو رہا تھا۔ ہم نے پوچھا کہ آپ اپنا حال سُنایے۔ فرمانے لگے کہ میں اپنے اردگرد ناوکِ مژگاں کی زد میں تھا۔ نظروں کے تیر سے مسلسل گھائل ہو رہا تھا اور اپنے دل کی دھڑکنیں گن رہا تھا۔ محفل کا اختتام دیر سے ہوا لہٰذا میں دیر سے گھر پہنچا۔ بیگم صاحبہ میرا انتظار کرتے کرتے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ میں نے تین، چار دفع بیل دی تو بادلِ نخواستہ مین گیٹ کھولا۔ اُن کا غصّے سے لبریز چہرہ میری نظروں سے ٹکرایا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آپ کے بتائے ہوئے نسخے پر عمل کیا۔ فوراً شعر کا پتہ پھینکا تا کہ اُن کے غصہ کا ٹمپریچر کچھ کم ہو۔

شک نہ کر مُجھ پہ مری جان سے پیاری ممتاز
پڑھ رہا تھا کسی مسجد میں تہجد کی نماز

بیگم صاحبہ کا غصہ کسی طرح نیچے آنے پر آمادہ نہ ہوا۔ میں نے اپنی تسکینِ جاں کے لیے دوبارہ اِن شعروں کا سہارا لیا۔

پھول اِک روز ترے پیار کے توڑے میں نے
کھائے والد سے ترے عشق میں کوڑے میں نے
مر مریں ہاتھ ترے پھر بھی نہ چھوڑے میں نے
بحرِ سسرال میں دوڑا دیے گھوڑے میں نے

شکر ہے اِن شعروں نے اپنا کام دکھا دیا اور میں گھر میں عزت سے داخل ہو گیا۔ ہمارے ایک جاننے والے ڈالر کی صورت دیکھتے ہی اُس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور ذوقِ نظر کا جام پینے لگتے ہیں۔ ڈالر کے سامنے اُن کی رال اِس حد تک ٹپکنے لگتی ہے کہ اُن کی قمیص کی جیب میں جگہ پا کر براجمان ہو جاتی ہے۔ خوشی کے مارے اُن پر ہونّق پن طاری ہو جاتا ہے۔ گمان یہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ نوٹنکی سرکس شروع نہ کر دیں۔ اُن کا بس

چلے تو وہ ڈالر کو اپنے سے جُدا نہ ہونے دیں بل کہ رات کو سوتے وقت بھی اپنے جسم سے لپٹا کر رکھیں۔ اُن سے بات کرتے ہوئے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ ڈالر اُن کے حلق میں پھنسا ہوا ہے اور باہر آنے کا نام نہیں لے رہا۔ وہ ڈالر کی رٹ لگا لگا کر ڈالری پہلوان کے طور پر مشہور ہو گئے ہیں۔ وہ ہر جگہ اُسے اپنے سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں اور اُس کا سکہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈالر نے اُنھیں اپنا ایسا گرویدہ بنا لیا ہے کہ اب وہ اپنے اوپر ترقی یافتہ کا لیبل لگائے پھرتے ہیں۔ پُرانے رنگ ڈھنگ سے اُنھیں چڑ ہونے لگی ہے۔ فیشن کے جرائد میں شامل ماڈلز کا گہرا مشاہدہ کرنا اُن کا معمول بن گیا ہے تاکہ ذوقِ نظر کی دُختِ رز رقصاں رہے۔ ہر فیشن شو میں شرکت کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ کسی وجہ سے وہ شرکت نہ کر سکیں تو بستر پر پڑ جاتے ہیں اور ہائے ہائے کا ورد شروع ہو جاتا ہے۔ اِن حالات میں مرزا غالبؔ کی رُوح کیا سوچتی ہو گی۔ اچھا ہوا وہ اِس دور میں نہیں پیدا ہوئے ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اگر فیشن کی غلامی کا یہ ڈھنگ اور چال چلن رہا تو لوگ سوچ میں پڑ جائیں گے اور کہیں گے

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

☆☆☆☆

قندیل بدر

شکستہ ہے مگر ڈوبا نہیں ہے
گھڑا میرا ہے سوہنی کا نہیں ہے
یہاں تو ریت کے ٹیلے کھڑے ہیں
یہاں بہتا کوئی دریا نہیں ہے
سے مٹھی میں لمحے قید میں ہیں
مگر پھر بھی تجھے روکا نہیں ہے
مسیحائی پہ تیری مجھ کو شک ہے
یہ میرا گھاؤ کیوں بھرتا نہیں ہے
یہ پتلے سارے مٹی کے ہیں ان میں
بہت ڈھونڈا تجھے پایا نہیں ہے
دھواں اٹھنے لگا ہے ان گھروں سے
جہاں چولھا کبھی جلتا نہیں ہے
وہ بچی ہوں جو اتنا بھی نہ سمجھے
کھلونا ٹوٹ کر جڑتا نہیں ہے
سمندر، چاند، کشتی، ریت، سیپی
یہ منظر مجھ سے کیوں بنتا نہیں ہے
ستارے کانچ کے ہیں چاند کچ کا
یہی اک خواب تو ٹوٹا نہیں ہے
کبوتر اڑ گئے محلوں کی جانب
مزاروں پر کوئی آتا نہیں ہے

☆☆☆☆

قندیل بدر

شکستہ ہو گئی میں بھی انا بھی
کہیں رویا نہ ہو میرا خدا بھی

چپک جاتے ہیں جا کر آسماں سے
مری آنکھوں کے آنسو بھی دعا بھی

ہوا بھی چل رہی ہے رات بھی ہے
سرہانے جل رہا ہے اک دیا بھی

یہ کس موسم کا جھرنا بہہ رہا ہے
پرندے گا رہے ہیں اور فضا بھی

مری الجھی لٹوں میں راکھ بھر کر
دکھایا جا رہا ہے آئنہ بھی

مرے قدموں کو باندھا جا رہا ہے
نچایا جا رہا ہے راستہ بھی

ردا میری مصلیٰ ہو گئی ہے
عبادت بن گئی میری حیا بھی

☆☆☆☆

حماد نیازی

یہ کس جنوں کا شرارہ لہو میں ڈھل آیا
بدن نے آہ بھری روح میں خلل آیا

ہمارے گھر میں سبھی لوگ خواب دیکھتے تھے
میں ایک خواب میں آیا تو بر محل آیا

میں اپنے باپ کے سینے سے پھول چنتا تھا
سو جب بھی سانس تھمی سیر کو نکل آیا

تجھے خبر ہی نہیں بارگاہِ حسن مآب
ترے حضور کوئی ایڑیوں کے بل آیا

ذرا سی دیر کو برسا وہ ابرِ دیرینہ
دھلی دھلائی جبینوں سے دن نکل آیا

بہارِ وقت نے خاشاک کر دیا حمّاد
خزاں کے دور میں جن شاخچوں پہ پھل آیا

☆☆☆☆

حماد نیازی

اس صحیفہ رو کی پیشانی کو جب چوما گیا
آنکھ سے چشمہ بہا اور دشت تک بہتا گیا

ننھی ننھی انگلیوں کا لمس پھولوں کی طرح
میری مرجھائی ہوئی شاخوں کو پھر مہکا گیا

روشنی کی سطر کوئی لکھ رہا تھا سانس پر
اک مقدس لمس میرے آئینے چمکا گیا

اجنبی سے کچھ پرندے اس پہاڑی سے اڑے
آسماں پر پھر صدا کا سائباں بنتا گیا

اپنے اندر غسل کرتی چند پوریں دیکھ کر
آج پانی تھرتھرایا اور پھر شرما گیا

دیر تک منظر کو دیکھا اور آنکھیں بند کیں
یک بہ یک منظر مری آنکھوں کے اندر آ گیا

سخت نوکیلی چٹانوں پر ہری بیلیں اگیں
اور وادی میں صدا گونجی، سنو! وہ آ گیا

☆☆☆☆

سید عقیل شاہ

ترا کرم کہ میں جب مات تک پہنچ جاتا
تو کوئی ہاتھ مرے ہاتھ تک پہنچ جاتا

میں اُس کی بزم میں چپ چاپ ہی رہا کرتا
مگر وہ پھر بھی مری بات تک پہنچ جاتا

میں بھاؤ تاؤ اگر کرتا تو وہ خواب فروش
قیاس ہے مری اوقات تک پہنچ جاتا

اگر نہ ملتا مجھے شام ماہِ آوارہ
یقین مانو میں گھر رات تک پہنچ جاتا

میں اپنے بھائی کو پردیس کیوں بلاتا عقیل
وہ اس طرح مرے حالات تک پہنچ جاتا

☆☆☆☆

سید عقیل شاہ

ستم کے راج میں، میں پاشکستہ کیا کرتا
کھڑا نہ رہتا اگر دست بستہ ، کیا کرتا

حدِ نگاہ تلک دوسرا نہیں مسکن
جو میرے گھر بھی نہ آتا تو رستہ کیا کرتا

خرید لیتا کسی شاہ کا جلال مجھے
اب اپنے آپ کو اتنا بھی سستا کیا کرتا

اُسے تو رزق کمانا تھا چھوٹی عمر سے ہی
سو وہ کتاب ، قلم اور بستہ کیا کرتا

جواب ہمتِ سالار دے چکی تھی عقیل
پہنچ بھی جاتا اگر تازہ دستہ، کیا کرتا

☆☆☆☆

فیضان ہاشمی

کوئی خزانہ چھپا ہے کہ آئنہ ہے مرا
تمھاری آنکھ کے صحرا میں ایسا کیا ہے مرا

میں پہلے شور کو سنتا ہوں پھر مچاتا ہوں
شجر کے نیچے ٹھکانا بنا ہوا ہے مرا

یہ قصہ پھر کبھی تم کو سناؤں گا پھر سے
تمھیں بھی جانا ہے اور گھر بھی آ گیا ہے مرا

وہ عکس سطح پہ پانی کے ساتھ ساتھ ہی ہے
ندی کی تہہ میں کہیں سایہ بہہ رہا ہے مرا

میں اپنی خوشیاں اکیلے منایا کرتا ہوں
یہی وہ غم ہے جو تجھ سے چھپا ہوا ہے مرا

نصیب میں تھی جو نیکی بدی وہ کر لی ہے
زمیں پہ آیا ہوں منصوبہ سیر کا ہے مرا

☆☆☆☆

فیضان ہاشمی

سامنے ہوتے تھے پہلے جس قدر ہوتے تھے ہم
جب یہ نظارے نہیں تھے تب نظر ہوتے تھے ہم

تب نیا مٹی سے اٹھا تھا محبت کا خمیر
ہر کسی کوزے میں دو اک گھونٹ بھر ہوتے تھے ہم

جس پری پر مر مٹے تھے وہ پری زادی نہ تھی
بعد میں جانا کہ اس کے دونوں پر ہوتے تھے ہم

تب کسی دیوار سے کوئی تعارف تھا نہیں
اُن دنوں کی بات ہے جب در بدر ہوتے تھے ہم

سامنے آتے تھے جب تو ڈھونڈتے تھے کشتیاں
چار آنکھوں سے بنی اک جھیل پر ہوتے تھے ہم

یوں بنا دیتے تھے جیسے شعر ہو جاتے ہیں اب
حرفِ کُن کا بھی کبھی دستِ ہنر ہوتے تھے ہم

اک گھڑی ایسی بھی آتی تھی ملاقاتوں کے بیچ
تم اُدھر ہوتے تھے جھکے اور ادھر ہوتے تھے ہم

☆☆☆☆

نصراللہ حارث

آوازوں کو قید نہ کرتے، باتیں کرتے
دیواروں سے ڈرتے ڈرتے باتیں کرتے
اگلے وقتوں میں ہوتے تو میلوں چل کر
میٹھے کنوئیں سے پانی بھرتے، باتیں کرتے
مارے جاتے تلواروں کی جنگ میں دونوں
خون میں لت پت مرتے مرتے باتیں کرتے
خواب میں ملنے کی تیاری ہوتی رہتی
رات گئے تک بنتے سنورتے، باتیں کرتے
گونگی آنکھیں دھند کا شکوہ کرتی رہتی
ہم آنکھوں کے پار اترتے، باتیں کرتے
آگ اگلتی دوپہروں میں سوئے رہتے
جاڑے میں جب جسم ٹھٹھرتے، باتیں کرتے
گاڑی کے دھندلے شیشوں میں گم ہو جاتے
جتنی دیر میں عکس ابھرتے، باتیں کرتے
گھر کے صحن میں بچوں جیسا شور مچاتے
گلیوں سے جو لوگ گزرتے، باتیں کرتے
جھینگر ہر سُو شور مچاتے، ہم ہنس دیتے
ویرانی پہ کان نہ دھرتے، باتیں کرتے
اپنی اپنی دھوپ اٹھا کر شانوں پہ ہم
اک دوجے پہ سایہ کرتے، باتیں کرتے

☆☆☆☆

نصراللہ حارث

میں وہ نہیں ہوں کہ دل سا وبال دوں تجھ کو
خدانخواستہ مشکل میں ڈال دوں تجھ کو

یہ سنگِ سخت ترے کام کا نہیں گڑیا
کچھ اور مانگ کہ حسبِ سوال دوں تجھ کو

ابھی میں گوندھ رہا ہوں چراغ کی مٹی
ابھی اندھیرے سے کیسے نکال دوں تجھ کو

مرے حسین سوالی یہی تو مشکل ہے
تُو طفل ہو تو کھلونوں پہ ٹال دوں تجھ کو

شراب جیسے کئی ذائقے زبان میں ہیں
تو سانس لے تو میں کوئی مثال دوں تجھ کو

بھٹک رہے ہیں کئی سانپ آستیوں میں
تمام عمر کہاں دیکھ بھال دوں تجھ کو

بہت سی مورتیں رکھی ہوئی ہیں سینے میں
جو تو کہے تو انھی میں سنبھال دوں تجھ کو

☆☆☆☆

تہذیب حافی

یہ شاعری یہ مرے سینے میں دبی ہوئی آگ
بھڑک اُٹھے گی کبھی میری جمع کی ہوئی آگ

میں چھو رہا ہوں ترا جسم خواب کے اندر
بجھا رہا ہوں میں تصویر میں لگی ہوئی آگ

خزاں میں دور رکھو ماچسوں کو جنگل سے
دکھائی دیتی نہیں پیڑ میں چھپی ہوئی آگ

میں کاٹتا ہوں ابھی تک وہی کٹے ہوئے لفظ
میں ناپتا ہوں ابھی تک وہی بجھی ہوئی آگ

یہی دیا تجھے پہلی نظر میں بھایا تھا
خرید لایا میں تیری پسند کی ہوئی آگ

میں ایک عمر سے جل بجھ رہا ہوں ان کے سبب
ترا بچا ہوا پانی مری بچی ہوئی آگ

☆☆☆☆

تہذیب حافی

پرائی آگ پہ روٹی نہیں بناؤں گا
میں بھیگ جاؤں گا چھتری نہیں بناؤں گا

اگر خدا نے بنانے کا اختیار دیا
علم بناؤں گا برچھی نہیں بناؤں گا

فریب دے کے ترا جسم جیت لوں لیکن
میں پیڑ کاٹ کے کشتی نہیں بناؤں گا

گلی سے کوئی بھی گزرے تو چونک اٹھتا ہوں
نئے مکان میں کھڑکی نہیں بناؤں گا

میں دشمنوں سے اگر جنگ جیت بھی جاؤں
تو اُن کی عورتیں قیدی نہیں بناؤں گا

تمھیں پتا تو چلے بے زبان چیز کا دکھ
میں اب چراغ کی لو ہی نہیں بناؤں گا

میں ایک فلم بناؤں گا اپنے ثروت پر
اور اُس میں ریل کی پٹری نہیں بناؤں گا

☆☆☆☆

روبینہ شاد

نارسائی کی اذیت سے بہت ڈرتی ہوں
میں تری دید کی حسرت سے بہت ڈرتی ہوں

جانے کس وقت کہاں مجھ کو دغا دے جائے
زندگی تیری رفاقت سے بہت ڈرتی ہوں

اک گھروندا جو خیالوں کا بنا رکھا ہے
ٹوٹ جانے کی حقیقت سے بہت ڈرتی ہوں

اب تو خود پہ بھی بھروسہ نہیں ہوتا مجھ کو
اپنی اس سادہ طبیعت سے بہت ڈرتی ہوں

جاگ اُٹھے تو کہیں کا نہیں رہنے دیتا
جذبۂ عشق کی شدت سے بہت ڈرتی ہوں

مندمل ہو کے بھی رِستا ہی رہے خوں جن سے
ایسے زخموں کی جراحت سے بہت ڈرتی ہوں

☆☆☆☆

سید سلمان ثروت

آنکھ ہے اک کٹورا پانی کا
اور یہ حاصل ہے زندگانی کا

رائیگاں کر گیا مجھے آخر
خوف ایسا تھا رائیگانی کا

چل نکلتا ہے سلسلہ اکثر
خوش گمانی سے بدگمانی کا

درد بوتا ہوں زخم کھلتے ہیں
ہے بہت شوق باغ بانی کا

کیا ٹھکانہ غم وخوشی کا ہو
دل علاقہ ہے لامکانی کا

جا کے دریا میں پھینک آیا ہوں
یہ کیا ہے تری نشانی کا

جس کا انجام ہی نہیں کوئی
میں ہوں کردار اس کہانی کا

مدعا نظم ہو نہیں پایا
شعر دھوکا ہے ترجمانی کا

☆☆☆☆

سید سلمان ثروت

کئی سلسلوں سے جڑا ہوا یہ جو زندگی کا سفر رہا
نئی منزلوں کی تلاش میں یہ رہینِ راہگزر رہا

وہ جو لوگ میرے خلوص کا بڑا برملا سا جواز تھے
جو نگاہِ ناز کا زعم تھے میں انھی کا صرفِ نظر رہا

میں دیارِ یار میں اجنبی جہاں عمر ساری گزر گئی
جسے میں نے اپنا سمجھ لیا وہ نگر جہانِ دگر رہا

کبھی سازِ غم سے جو سُر ملے تو میں رقص گاہ میں جل اُٹھا
مرے بخت میں تھی جو نغمگی میں اُسی کے زیرِ اثر رہا

کسی ایسے خوف میں مُبتلا کہ بیاں کروں تو کروں بھی کیا
تھی جو مُمکنات سے ماورا مجھے ایسی بات کا ڈر رہا

مری آرزو کوئی خواب تھا سو میں رت جگوں سے اُلجھ پڑا
مری عافیت تھی خمار میں مجھے جاگنے میں ہنر رہا

کبھی گفتگو کا مآل ہے نہ سوال کر نہ جواب دے
یہاں شور وغل کے بہاؤ میں جسے چپ لگی وہ امر رہا

☆☆☆☆

محمد عتیق احمد

میں اپنی خاک کو جب آئینہ بناتا ہوں
تو اس کے واسطے دل بھی نیا بناتا ہوں

ہر اک پرند رہے تا ابد یہاں شاداب
اسی لیے میں شجر بھی ہرا بناتا ہوں

بھٹک نہ جائے کہیں شہرِ غم میں اپنا دل
سو تیرے خواب کو میں رہنما بناتا ہوں

میں پہلے بھرتا ہوں اس دل میں وحشتیں اور پھر
سوادِ دشت کو بھی ہم نوا بناتا ہوں

کرے نہ کیوں یہ تیرے دل میں گھر، مرے ہمدم
میں اپنے شعر کو درد آشنا بناتا ہوں

وہ فاعلات و مفاعیل کے نہیں بس میں
میں اپنے شعر میں جو زاویہ بناتا ہوں

تلاش کرتی ہیں خود منزلیں جسے احمد
میں دشتِ شوق میں وہ راستہ بناتا ہوں

☆☆☆☆

شمامہ اُفق

کسی بے تاب ساعت کی لپک ہے
مری چوڑی میں کچھ ایسی کھنک ہے

محبت سے اسے منسوب مت کر
میرے لہجے میں جو تھوڑی لچک ہے

کہاں تک آپ کو جانا ہے کہیے
نظر کا راستہ تو دل تلک ہے

میں اتنی دور بھی تم سے نہیں ہوں
ہمارے درمیاں بس یہ فلک ہے

یہ سرمایہ ہے اس بے مایہ شے کا
ستارہ ہو کہ آنسو بس چمک ہے

☆☆☆☆

شمامہ افق

نئے منظر بنانے پہ تلے ہیں
ہوا کے ساتھ پتے لڑ رہے ہیں

زمیں سورج کا چکر کاٹ آئی
ہماری تار پہ کپڑے پڑے ہیں

تمھاری آنکھ نے آواز دی تھی
ہمارے کان چھت پہ ہی کھڑے ہیں

ہمیں تو خیر وحشت کھا گئی ہے
تمھیں کس بات کے صدمے لگے ہیں

وہ جن کی شخصیت وزنی بہت تھی
ملے ہیں تو بہت ہلکے لگے ہیں

مرے بارے میں تم نے کیا اڑائی؟
سبھی رک رک کے مجھ کو دیکھتے ہیں

☆☆☆☆

عالم عجیب

تمام شہر ہی کرتا ہے احترام مرا
بس ایک شخص نہیں جانتا مقام مرا

جو میری بات پہ محفل میں منہ بناتا ہے
وہی اکیلے میں پڑھتا بھی ہے کلام مرا

مرا نشہ تو تجھے دیکھتے ہی پورا ہوا
پیا ہے دوستوں نے باقی ماندہ جام مرا

کہیں تو خود مری موجودگی بھی ہے بیکار
کہیں نکالتا ہے کام صرف نام مرا

نگارِ حسن کی تکمیل تک رہوں زندہ
میں آئینہ ترا پکڑوں تو قلب تھام مرا

عجیب اپنی جو تعمیر کر نہیں پائے
وہ دوست سوچتے رہتے ہیں انہدام مرا

☆☆☆☆

عالم عجیب

اجازت ہو تو میں آغاز کر لوں
تمھاری چاہتوں پہ ناز کر لوں

یہ کیا تم بے سبب جانے لگے ہو
ذرا ٹھہرو تمھیں ناراض کر لوں

محبت مہنگی ہوتی جارہی ہے
میں کچھ کچھ تم کو پس انداز کر لوں؟

حفاظت راز کی تنہا کروں کیا
میں اک دو دوست تو ہمراز کر لوں

اٹھائے شورِ محشر، خندۂ گل
اگر خوشبو کو میں آواز کر لوں

مری خواہش بھی ہے ترکِ تعلق
مگر میں کس طرح آغاز کر لوں

میں اس بیچارگی کا چارہ لے کر
عجیب اک شہر چارہ ساز کر لوں

☆☆☆☆

سعید شارق

اُداسی بھی تو کم ہوتی تھی جب سامان کم تھا
یہ گھر تنہا زیادہ تھا مگر ویران کم تھا

خموشی بھی کہیں لہروں میں شامل ہو گئی تھی
وگرنہ ناؤ کو آواز کا طوفان کم تھا

بہت پہلے کبھی سرمایہ کاری کی تھی ہم نے
یہ تب کی بات ہے جب نیند میں نقصان کم تھا

بٹھایا تھا جو تختِ دل پہ تازہ زخم تو کیا؟
رعایا ہی کچھ ایسی تھی کہ اک سلطان کم تھا

بہت روشن تھا آئینہ نظر پڑنے سے پہلے
یہ دُنیا خوبصورت تھی جب اپنا دھیان کم تھا

گزرتے تھے بہت سے قافلے اکثر یہیں سے
کبھی آنکھوں سے دل تک راستہ سنسان کم تھا

ہر اک سو دُھند تھی اور دُھند بھی اتنی تھی، شارق
کہ نظروں کے پلٹ آنے کا بھی امکان کم تھا

☆☆☆☆

سعید شارق

گھٹا بھی دھیرے دھیرے اپنے پَر پھیلا رہی ہے
بَلا کی تیرگی ہے اور مجھ میں چھا رہی ہے

کئی منظر بنے جاتے ہیں جزوِ کور چشمی
نظر کی اشتہا آنکھوں کی رونق کھا رہی ہے

بہت دن اوڑھے رکھا روشنی کے چیتھڑوں کو
اور اب اک شب مجھے اپنا بدن پہنا رہی ہے

کڑی دوپہر ہے اور حبس آلودہ ہوائیں
وہ بارش جو بچا رکھی تھی اب کام آ رہی ہے

کہاں اب وہ جزیرے ، کشتیاں ، ساحل ، سمندر
فقط اک لہر ہے جو آج تک بہلا رہی ہے

جگہ دے بیٹھی تھی کمرے میں آئینے کو ، شارق
سو اب تنہائی بھی میری طرح پچھتا رہی ہے
☆☆☆☆

وسیم تاشف

قُدرت نے جو بھی بَخت ہمارے بنائے تھے
نقشے ہمارے ہاتھ پہ سارے بنائے تھے

جو رات ہم نے ساتھ میں رہ کر بتائی تھی
اُس رات ہم نے چاند ستارے بنائے تھے

مضموں بھگو رہے تھے وہاں اُس کی آنکھ کو
میں نے کچھ ایسے خط میں اشارے بنائے تھے

اُن دوستوں نے سوچ پہ مجبور کر دیا
جو دوست میں نے جان سے پیارے بنائے تھے

شمشیرِ اقتباس بھی ہاتھوں سے گِر گئی
کاغذ پہ کس نے ہونٹ تمھارے بنائے تھے؟

ہٹ کر معاشرے کے تقاضوں سے، کچھ اصول
فاقہ کشوں نے بھوک کے مارے بنا رہے تھے

☆☆☆☆

وسیم تاشف

آدھے اُس کے، آدھے میرے ہوتے ہیں
ہم نے خواب جو مِل کر دیکھے ہوتے ہیں

ایسا نہیں کہ گھر میں کوئی اور نہیں
میں ہوتا ہوں اور پرندے ہوتے ہیں

اَمی! آپ کی باتیں کڑوی لگتی ہیں
جانتا ہوں مفہوم رسیلے ہوتے ہیں

کچھ لوگوں کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں
لیکن اُن میں خواب گھنیرے ہوتے ہیں

ایسے وقت میں چھاؤں کیسے بھائے یار!
ہم جب اُس کی دُھوپ میں ٹھہرے ہوتے ہیں

آوازوں سے بڑھ کر وجہ رکھتی ہے
خاموشی کے اپنے لہجے ہوتے ہیں

سب کی اپنی اپنی منزل ہوتی ہے
سب کے اپنے اپنے رَستے ہوتے ہیں

☆☆☆☆

نادر عریض

شعر کہنے میں خسارہ ہے مری نظروں میں
دام کم کام زیادہ ہے مری نظروں میں

کوئی موجود تھا شاید مرے دروازے پہ
اک پلٹتا ہوا سایہ ہے مری نظروں میں

دوسرے عشق میں نقصان کا خدشہ کم ہے
یہ سڑک اس سے کشادہ ہے مری نظروں میں

اس حویلی سے بہت گہرا تعلق تھا مرا
اس کا ایک اور بھی رستہ ہے مری نظروں میں

ہجر کے دکھ کا میں اندازہ لگا سکتا ہوں
ایک گرتا ہوا پتہ ہے مری نظروں میں

اس کو تصویر میں جو ساتھ لیے پھرتا ہوں
یہ سہولت بھی زیادہ ہے مری نظروں میں

میں محبت کے خد و خال سے واقف تو نہیں
اپنے ماں باپ کا خاکہ ہے مری نظروں میں

☆☆☆☆

نادر عریض

بولے تو اچھا، برا محسوس ہو
اس کی خاموشی سے کیا محسوس ہو

اس طرح دیوار پہ تصویر رکھ
آدمی بیٹھا ہوا محسوس ہو

رکھ لیا اخبار پیسوں کی جگہ
تا کہ بٹوا کچھ بھرا محسوس ہو

دیکھنا چاہوں اسے تو ہر کوئی
میری جانب دیکھتا محسوس ہو

پاس جانے پہ کھلے پیاسے پہ ریت
دور سے پانی کھڑا محسوس ہو

☆☆☆☆

احسان اصغر

اور اب تو دوست یہ کہنا بڑا مناسب ہے
ترا رویہ مرے ساتھ نا مناسب ہے

ہے جب کہ پہلے ہی منظر میں دھیان اٹکا ہوا
اب ایسے حال میں کیا دوسرا مناسب ہے

شدید خطرہ ہے افلاک سے بلاؤں کا
یہ وقت وہ ہے کہ جس میں دعا مناسب ہے

رواں ہے پانی نہیں خدشہ پاؤں پھسلنے کا
قدم بڑھایئے یہ راستہ مناسب ہے

نگارِ حسن! یہاں اس لیے ہیں ٹھہرے ہوئے
کہ تیرے شہر کی آب و ہوا مناسب ہے

☆☆☆☆

احسان اصغر

نئے دنوں میں محبت پرانی ہو جائے
دعا کرو کہ یہ دکھ یک زمانی ہو جائے

اس ایک لفظ کی خواہش میں لب سفید ہوئے
دلا! جو کہہ کے تری ترجمانی ہو جائے

مسافرت کی مشقت کا مول کیا ہو گا
یہ گردِ رہ تو ہماری نشانی ہو جائے

وہ جگنوؤں کے تعاقب میں مسکراتی ہوئی
بچے گا کیا جو یہ منظر بھی فانی ہو جائے

تری نظر کی ضمانت پہ آگئے ہم لوگ
اب اس سے آگے بھلے رایگانی ہو جائے

☆☆☆☆

اسامہ امیر

کتنے اسرار واہمے میں ہیں
ہم کہ مصروف کھوجنے میں ہیں

ہم سفر لامکان کو پہنچا
اور ہم پہلے مرحلے میں ہیں

تو ابھی تک دکھا نہیں ہے ہمیں
ہم ابھی تک مراقبے میں ہیں

یہ جو کھڑکی کے پار منظر ہے
مسئلے اس کو دیکھنے میں ہیں

اپنی اپنی ہی فکر ہے سب کو
اپنے اپنے ہی دائرے میں ہیں

واعظا! انتظار کر تھوڑا
شیخ صاحب تو مے کدے میں ہیں

بھید جتنے ہیں کائنات اندر
ایک نقطے کے سلسلے میں ہیں

☆☆☆☆

اسامہ امیر

اندر باہر ایک سا موسم ایک سی وحشت طاری ہے
تازہ تازہ شعر ہوئے ہیں سرشاری سرشاری ہے

دن نکلا ہے بستر چھوڑو اپنے کام پہ چل نکلو
سورج نے کپڑے بدلے ہیں میلی رات اتاری ہے

اس کو رخصت کرتے لمحے، اس کی ماں نے یہ بولا
بیٹا! اس کو خوش رکھنا تم، میری راج دلاری ہے

اپنی گاڑی ہو تو بندہ عیش سے آئے جائے بھی
دشت میں پیدل چل کر دیکھا چلنے میں دشواری ہے

☆☆☆☆

ذاکر رحمان

کوئی گھڑی ٹھہر بھی جائے خواب میں

بلا کے تیز گام ہیں
قدم کے بعد دوسرا قدم کہاں پڑے خبر نہیں،
جب آنکھ اک کنارے جھپک گئی
تو دوسرے کنار پر کوئی مہیب
روشنی لپک گئی
خیال گاہِ بے جہت سے
پھوٹتی ہیں
سبزگیں، گلاب رو شباہتیں
کہ جن کے جسم
رات دن اتارتے ہیں
اپنی اپنی کھال سے
گزشتگان شب کی ناتمام خواہشوں کی زرد رو نقاہتیں
یہ کون مستقر ہے
جس کہ فرشِ آب جو پہ
ایک دم پھسل گیا ہے
پاؤں ریگِ وقت کا
کوئی گھڑی
ٹھہر بھی جائے خواب میں
تو ساری عمر
جاگ کر گزارتے ہیں
ایک اضطراب میں

☆☆☆☆

ذاکر رحمان

نظموں سے خالی نظم کے لیے ایک نظم

اے جمالِ ریشمی ملبوس سن
ایک دن آئے گا جب
فصلوں کو بھی کھا جائے گا،
اپنی ہی مٹی کا گھن
اے صدائے نا زِ حرفِ نغمگیں
اک جہاں ایسا بھی ہے،
جس جہاں میں کوئی بھی بہرا نہیں
آواز پہ پہرا نہیں
ہاں مگر اس بے سری اقلیم میں
کوئی بھی آواز دینے پر کبھی ٹھہرا نہیں،
اے نگاہِ حسنِ بے مسند نشیں
تو بھی اپنے آپ میں کچھ ڈھونڈتی ہے یا نہیں!
ایک دن ہاتھ آئے گا تیرے ہماری
رایگانی کا یقیں
ہاں، مگر رونا نہیں
آنسوؤں کی تاب دلکش موتیوں
جیسی ہے لیکن
یہ کوئی سونا نہیں
اے خمارِ آبِ لالہ فام سن

کچھ خردمندانِ بے تسکین چن
زندگی کے پر تعفن جسم سے رستی ہوئی،
پیپ کے ذرات چن،
اے سخن کی دیوداسی ہوش کر
حرف مرتے جا رہے ہیں،
معنی و مفہوم کی
دریوزہ گر نسلوں کا مستقبل بہت تاریک ہے
لا، ہماری جھولیوں میں ڈال اگر
کچھ بھیک ہے

☆☆☆☆

ذیشان حیدر نقوی

قبراں اُتے پھُل

اَسی سال کی پونجی قبر کے کاسے میں رکھ کر جب لوٹے،
۔۔۔تو قدموں نے
۔۔۔اُس نے مٹی سے ہر اک رشتہ توڑ دیا
جب اُس کچی قبر پہ پہلا پھول کھِلا
تو قبر پہ سایہ کرتے رُکھ نے پیچھے ہٹ کر
آنے والی دھوپ کا رستہ چھوڑ۔۔۔۔دیا
۔۔۔قبر پہ کھِلنے والے پھول کی خوشبو
دور سمندر پار کہیں مزدوری کرتے شخص کے نتھنوں سے ٹکرائی تو
۔۔۔وہ رویا نہیں
پر یہ بھی سچ ہے
۔۔۔جتنے دن وہ پھول اُس قبر پہ ٹھہرا رہا!!!
۔۔۔وہ سویا نہیں

☆☆☆☆

فریحہ نقوی

ایک سو بیس صدیاں

ہم دسمبر میں شاید ملے تھے کہیں ۔۔۔۔!!
جنوری، فروری، مارچ، اپریل
اور اب مئی آگیا ۔۔۔۔
ایک سو بیس دن ۔۔۔۔
ایک سو بیس صدیاں ۔۔۔ گزر بھی گئیں
تم بھی جیتے رہے،
میں بھی جیتی رہی ۔۔۔۔
خواہشوں کی سُلگتی ہوئی ریت پر
زندگانی دبے پاؤں چلتی رہی
میں جھلستی رہی ۔۔۔۔
میں ۔۔۔ جھلستی ۔۔۔ رہی
خیر، چھوڑو یہ سب!
تم بتاؤ تمھیں کیا ہوا؟
کیوں پریشان ہو؟ ؟؟؟

☆☆☆☆

فریحہ نقوی

تمھارے لیے خط

یہ جو دامنِ عمر میں چند سانسیں بچی ہیں،
مجھے ٹوٹتی سی نظر آ رہی ہیں ----
تمھیں اس کی کوئی ضرورت نہیں
پھر بھی اس خط میں اپنے سبھی پاس ورڈ اور گھر کا پتہ لکھ رہی ہوں ----
اگر تم مرے بعد آؤ،
تو اس گھر کی رونق سے ہو کر ذرا میرے ویران کمرے میں جانا
وہاں رکھی الماری کے ایک خانے میں کچھ فلسفے کی کتابوں کے پیچھے ہرے رنگ کا فولڈر دیکھ لینا،
اسے کھولنا، اس میں برسوں پرانے تمھارے سبھی خط پڑے ہیں

اُدھر فولڈر سے پرے دائیں جانب رجسٹر پڑا ہے
وہی جس میں ''عبدل'' کے بارے میں تم نے کہانی لکھی تھی ----
کہانی کے صفحوں میں گجرے (جواب سرمئی ہو گئے ہیں) پڑے ہیں
کہیں پھول کی پتیاں بھی پڑی ہیں ----
اسی میں کہیں ٹوٹی مالا کے موتی ہیں
(مالا کبھی میں نے پہنی نہیں تھی تو پھر کیسے ٹوٹی؟ اگر یاد آیا تو یہ بھی لکھوں گی) ----
وہیں پیچھے اک ٹی سی ایس کا بڑا سا جوڈبہ پڑا ہے
(وہاں سترہ رنگوں کی وہ چوڑیاں ہیں کہ جب میں نے تم سے کہا تھا ''مجھے چوڑیاں بوجھ لگتی ہیں''
اور تم نے اگلے ہی دن بھیج دی تھیں)
اسے کھولنا مت کہ وہ تم سے شرمندہ ہوں گی،

کبھی میں نے پہنیں نہیں، کیوں کہ وعدہ یہی تھا کہ تم اپنے ہاتھوں سے ----

اور ہاں!! وہیں ایک خاکی لفافہ پڑا ہے
مری ابتدائی دنوں کی سبھی شاعری، اس میں بکھری پڑی ہے
وہ نظمیں جنھیں فون پر سن کے ہنستے تھے تم،
اور وہ غزلیں کہ جن میں غلط قافیے تھے (ابھی تک غلط ہیں)
یہ سب میں نے دل سے لگا کر رکھا ہے ----
مرے ہاتھ پر ہاتھ رکھو ذرا!
اور یہ وعدہ کرو تم یہ سب اپنے دل سے لگا کر رکھو گے
تمھیں آخری بار جی بھر کے دیکھوں یہ جی چاہتا ہے مگر میری جاں! اب یہ ممکن نہیں ہے
تمھیں یاد ہے نا کہ دو سال پہلے دسمبر کی وہ آٹھویں شام تھی ----

☆☆☆☆

عبادت حسین

عرضِ حال

بیچنے آئے ہیں ہم کوچہ و بازار میں جسم
چوڑیاں، پاؤں کی پازیب، نگاہوں کا طلسم
جو بھی آتا ہے فقط جسم ہی چاہتا ہے یہاں
جو بھی آتا ہے فقط دل ہی دکھاتا ہے یہاں
دل تو کعبہ ہے یہاں صرف خدا بستا ہے
تم خریدار ہو جس کے وہ بڑا سستا ہے
بے ردا ہم ہیں تو اب اس میں خطا کس کی ہے
موج میں آئے تو پھر موجِ ہوا کس کی ہے
ناوکِ چشمِ ہوس، تیرا نشانہ ہم ہیں
تُو جو بے گھر ہے تو اب تیرا ٹھکانہ ہم ہیں
کس کو معلوم کہ کچھ رنگ تہِ آب بھی ہیں
کس کو معلوم کہ اس آنکھ میں کچھ خواب بھی ہیں
داغ دامن کو یہاں کون بھلا صاف کرے
اب بھلا کون ہمارا ہے جو انصاف کرے
حکمراں فیصلے کرتے ہیں تو ایوانوں میں
اور ہم بیچ دیے جاتے ہیں بیگانوں میں

☆☆☆☆

محمد عباس

صدمہ

یہ میری پیدائش سے بھی بہت پہلے کی بات ہے جب ہمارے گھر سے ان کا تعلق بنا تھا ۔ امی کی باتوں سے اتنا جانتی ہوں کہ جب ہمارا بھائی فوت ہوا تھا، ان دنوں پہلی بار اماں اور لاڑھے ماموں کی جان پہچان ہوئی تھی ۔ خود وہ بھی بتاتے تھے کہ جب انھوں نے پہلی بار اماں سے اسپتال میں ان کی ساری بپتا سنی تھی، تبھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مختتی عورت کی جو بھی مدد ممکن ہو سکے، ضرور کریں گے ۔

بھائی سات سال کا تھا جب اسے ہیضہ ہو گیا تھا اور اماں اسے لے کر جہلم کے سول اسپتال میں ایڑیاں رگڑ رہی تھی ۔ وہاں کی بھیڑ اور بھاگ بھاگی ۔ ایک مسکینی سی عورت کو کوئی کیا پوچھتا ۔ کافی دیر کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ صرف اتنا ہی جان سکی تھی کہ بھائی کو چیک کرانا کس کے پاس ہے ۔ پرچی بنوانے کے بعد گھنٹوں وہ بھائی کو اٹھائے کھڑی رہی تھیں لیکن ڈاکٹر کے پاس پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ۔ وہاں اس کی باری کیسے آئے گی، یہ وہ نہیں جانتی تھی ۔ آخر تھک ہار کر بیٹھ گئی ۔ ایسے میں ماموں وہاں کہیں گزر رہے تھے، انھوں نے جب دیکھا کہ ان کے گاؤں کی بہو وہاں چیتھڑا ہوئی پڑی ہے تو فوراً پاس آئے اور سارا معاملہ پوچھا ۔ اماں اس قدر گھبرائی تھی کہ ساری بات بھی نہ بتا سکی ۔ صرف یہی بتاتی رہی کہ بھائی کی جان بہت خطرے میں ہے ۔ اگر اسے ڈاکٹروں نے نہ دیکھا تو کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے ۔ اماں خود بتاتی ہے کہ تب وہ انھیں جانتی بھی نہیں تھی ۔ انھوں نے آگے بڑھ کر معاملے کو ہاتھ میں لے لیا ۔ تھوڑی ہی دیر بعد چیک اپ بھی ہو گیا تھا اور بھائی کو بیڈ بھی مل گیا تھا ۔ بعد میں تین دن، جو اماں نے وہاں بھائی کے ساتھ گزارے، تینوں دن وہ اماں کے پاس جاتے رہے ۔ کھانا اپنے گھر سے بنوا کے لے جاتے اور دوائی کی ضرورت ہو تو وہیں سے لے دیتے ۔ بھائی کے پورا ہو جانے پر اماں کو تو ہوش ہی نہ رہا تھا، ماموں نے ہی اسپتال کی ساری کاغذی کاروائی پوری کروائی تھی اور پھر واپس گاؤں آ کر فوتگی کی ساری رسومات بھی نبھائی تھیں، باوجود کہ بھائی اللہ نے واپس لے لیا، مگر اماں ان کی ممنون رہیں کہ جو انھوں نے کیا تھا، وہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا ۔ خود ان کے شوہر سے تو اتنا ہی نہ ہوا تھا کہ کسی دن اسپتال آ کر اپنے بیٹے کو دیکھ ہی جاتا ۔

ساری بات بھی میرے ابے پر ہی آ کر ختم ہوتی تھی ۔ اگر ان میں کچھ روح رحمت ہوتی تو ہمیں کسی اور کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ بالکل ہی سادہ لوح آدمی تھے ۔ اتنی تو ہمارے یہاں لڑکیاں بھی نہیں ہوتیں ۔ اماں اکثر کہا کرتی تھیں کہ اس شخص کا کیا ہے، بھلے کھونٹے پر بندھا رہے یا چور لے جائیں، ہمارے لیے ایک ہی

بات ہے۔ ان کا بھولا پن اتنا تھا کہ ہر اہم موقعہ پر اماں کو تو غصہ آتا ہی، ہم بہنوں کو بھی کبھی کبھی بہت طیش آجاتا تھا۔ بازار سے دھنیا تک لانا ان کے لیے معرکے کا کام تھا۔ چار بندے گھر آجائیں تو ان سے بھلے لوگوں کی طرح بات نہیں ہو پاتی تھی۔ بھینس کو ایک کھونٹے سے کھول کر دوسرے پر باندھنے کا کہہ دیں تو سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ ان کے مرنے پر کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی کہ آج دنیا سے کون رخصت ہوا۔ ابا کے جنازے کی صفیں بھی کہ ہمارے ہاں مرنے والے کی اہمیت اور عزت کا اندازہ اس کے جنازے کی صفوں کی تعداد سے ہوتا ہے (جیسا کہ ماموں کی انیس صفیں بنی تھیں اور لوگ آج تک یاد کرتے ہیں) شاید تین کا ہندسہ پار نہ کر سکیں۔

اماں اپنے میکے سے بہت کھاتی پیتی نہ تھیں۔ اسی لیے جب ابا کا رشتہ ان کے لیے گیا تو باوجود اتنی دور اور اتنے غریب ہونے کے قبول کر لیا گیا تھا۔ اماں کو شادی کے فوراً بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ انھیں اپنی پوری زندگی خود اپنے ہی بل پر کرنی پڑے گی، ان کے شوہر کے پاس ایسا کچھ نہیں ہے کہ زندگی میں انھیں کسی فکر پریشانی سے روک سکے۔ سوہاوہ کے گورنمنٹ کالج میں مالی تھے اور ہمارے کوٹ سے وہاں تک بیس کلومیٹر کا فاصلہ بنتا تھا۔ پہاڑی راستوں پر سائیکل دھروتے وہ روزانہ کالج جاتے آتے تھے۔ اتنی طویل پیڈل ماری کے بعد جب واپس لوٹتے تو آتے ہی چارپائی پر گر جاتے۔ نہ گھر کا کوئی کام نہ رشتہ داروں سے کوئی خاص میل ملاقات۔ ایک لاشے کی طرح پڑے رہتے۔ اماں کھانا پکا کر دیتیں تو اٹھ کر کھاتے، پھر گر رہتے۔ گھر میں ان کا کوئی کردار نہ تھا سوائے ہر مہینے کی دوسری تیسری کو پوری تنخواہ اپنی ماں کے ہاتھ دے دیتے تھے۔

اماں بتاتی ہے کہ انھوں نے شادی کے پہلے سال ہی تاڑ لیا تھا کہ ان کے شوہر کو اس کے گھر والے بکری کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ جب پٹھے کھلانے ہوئے تو باہر کھول دیا، دودھ دوھنا ہوا تو گھر پکڑ لائے۔ تنخواہ اُن کی ساری دادی کے کھیسے میں چلی جاتی، اور باقی پورا مہینہ ابا کو طعنے ملتے رہتے کہ وہ کرتا ہی کیا ہے۔ بھائیوں کی نسبت انتہائی کم تر کھانا ملتا اور کمیوں کا سا سلوک۔ اماں سیانی تھی، جانتی تھی کہ عورت اور اس کی اولاد کی عزت گھر والے سے ہوتی ہے، جب سسرال میں اس کے شوہر کی یہ عزت ہے تو پھر اس کی اور اس کی اولاد کی حالت بھی بے اجرت مزدوروں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ساری زندگی ان کے لیے کام کرتے رہے پھر بھی کسی کو ہماری قدر نہیں ہوگی۔ اماں نے بھائی کے پیدا ہونے سے پہلے ہی الگ گھر کے لیے واویلا مچا دیا تھا۔ ایسا کرنے سے پہلے انھوں نے اپنے شوہر کو پوری طرح اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ابا ان کی ایک بات پر دوسری نہ کرتے تھے (جیسا کہ اماں کے مرتے وقت تک ہم نے بھی دیکھا...... ہاں، سوائے ایک بار کے) اماں کی یہ بات سنتے ہی اماں کے سسرال میں کافی ہنگامہ ہو گیا تھا۔ کوئی مانتا ہی نہ تھا... بل کہ دونوں دیور اور دونوں نندیں مرنے مارنے پر تل گئے تھے۔ لیکن جب بھائی کی عمر چھ ایک مہینے ہو گئی، تب تک اماں کی مسلسل کوشش کی وجہ سے ابا قائل ہو چکے تھے کہ ان کی زندگی اکیلے رہ کر ہی بنے گی۔ انھوں نے مانگ تانگ کر کہیں سے قرض لیا

اور اپنے حصے میں آنے والی زمین کے ایک ٹوٹے پر دو کمروں کا ایک گھر تیار کر لیا (اور آج جب میں بہت بعد میں پیدا ہونے والی بھی جوان ہو چکی ہوں، ابھی تک وہی دو کمرے ہیں۔ ایک اینٹ بھی ابا مزید نہیں لگوا سکے)

نئے گھر میں آتے ہی اماں نے اپنی عقل کو گھر چلانے میں لگا لیا۔ ابا کی گریڈ ون کی تنخواہ ہوتی ہی کتنی تھی کہ اماں اسے بیٹھی چاٹتی رہتی۔ اماں سلائی کڑھائی جانتی تھی، ایک مشین خرید لی، اور لگی کمر دہری کرنے۔ سارا دن بیٹھی کترتی بیترتی رہتی۔ ہاتھ کی مشین، پورا دن نچڑوانے کے بعد ایک شلوار قمیص سلوا ہی دیتی تھی۔ جتنی ابا کی تنخواہ تھی، اماں اتنے روپے ماہانہ مشین سے اتار لیتی۔ اماں نے علاحدہ ہوتے ہی ابے کے حصے میں آنے والی ڈیڑھ بیگھا زمین کا بھی مطالبہ کر دیا تھا۔ جب مل گئی تو وہاں ٹریکٹر والے سے کہہ کر کاشت بھی وہی کرواتی اور کاٹتی بھی خود۔ ابا نے کبھی تنکا بھی توڑ کر دہرا نہ کیا۔ بارانی زمین کیا دے سکتی تھی، دو سال بعد دس من گندم، من ڈیڑھ باجرا..... پھر بھی ایک اضافی آسرا ہو گیا تھا۔

تب بڑی باجی بھی آ گئی تھی۔ گھر غریب تھا، تین سے چار پیٹ ہو گئے اور اماں کو مزید ہاڑ اپڑ گیا۔

اگر آمدنی زیادہ نہ ہوئی تو یہ اولاد جوان کیسے ہو گی ان دنوں، اماں بتاتی تھی کہ وہ روز اٹھتے بیٹھتے ابا سے کوئی اور دھندا بھی کرنے کا کہتی تھی، کوئی ایسا کام جس سے دو چار دھیلے اور مل جائیں لیکن ابا ٹھہرا سدا کا کمر ٹوٹا، اپنی سرکاری ڈیوٹی سے لوٹنے کے بعد (ڈیوٹی بھی خاک دیتے ہوں گے، عمر بھر مالی رہے، آج بھی تین پودوں سے اوپر کا نام نہیں بتا سکتے) ان میں چلنے کی بھی سکت نہ رہتی تھی، کام خاک کرتے۔ ایسے میں اماں نے یہ حل نکالا کہ اپنے باپ کی منت کر کے ان سے ایک جھوٹی ☆ لے آئیں۔ وہ کھونٹے پر آ بندھی تو اماں کی ذمہ داری اور بڑھ گئی۔ ابا تو اس کو بالٹی بھر کے پانی تک نہ پلا پاتے تھے۔ اس کی خاطر خدمت بھی اماں ہی کرتی تھی۔ پٹھے لانے، پانی پلانا، دونوں وقت کھرلی بھرنا، گوبر ٹھکانے لگانا، سردیوں میں اس کے بیٹھنے کی جگہ کے لیے خشک مٹی لانا بھی اماں کے ذمے تھا۔ حتیٰ کہ بھینس کو سردیوں میں رکھنے کے لیے جو چھپر بنایا گیا اس کے لیے سروٹ، کانے اور بانس بھی اماں نے ہی کاٹ کر جمع کیے تھے۔ خود ہی دو پڑوسنوں کو ملا کر چھپر کھڑا کیا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد بھینس سُو پڑی جس سے باجی اور بھائی کے دودھ کا مفت بندوبست بھی ہو گیا اور دودھ مکھن بیچنے سے ہر ماہ چار پیسے بھی مل جاتے۔ بھینس کو سنبھالنے سے ہٹ کر جو وقت باقی بچتا، اماں سلائی کر لیتیں۔ گھر اچھا چلنے لگا تھا۔

اماں بتاتی تھی کہ شادی کے پہلے سال ہی وہ ابے کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئی تھی، جانتی تھی کہ گھر کی ذمہ داری انھیں ہی پوری کرنی ہے، ابا اس جوگے ہیں ہی نہیں۔ میکے جانا ہوتو انھیں اکیلے ہی جانا پڑتا۔ چھوٹے سے ہمارے بھائی کو اٹھائے وہ میلوں پیدل چلتی اور بسوں میں خوار ہوتی۔ ابا تو چھٹی کے دن بھی نہ

☆ جھوٹی: بروزن موٹی۔ ایسی بھینس جو ابھی جوان ہو۔

کہتے کہ میں سائیکل پر سوہاوہ شہر تک ہی چھوڑ آؤں، ان کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ہفتے بعد تو ایک چھٹی ملتی ہے، ڈٹ کر سونے کے لیے، تمھارے ساتھ کون خوار ہوتا پھرے۔ بعد میں جب اماں نے بھینس رکھ لی تو پھر اس کی وجہ سے ان کے لیے میکے جا پانا مشکل ہو گیا۔ فاصلہ اس قدر اور بسوں کے اوقات کچھ اس طرح تھے کہ ساری دیہاڑی واپس آنا ممکن ہی نہ تھا اور اماں رات میکے گزار نہ سکتی تھی کہ پیچھے اپنے گھر میں بھینس کو سنبھالتا کون۔ جب کبھی بہت مجبوری ہوئی تو کسی پڑوسن کو محض ایک رات اور اگلی صبح بھینس دوہنے کا کہہ جاتی اور اگلے دن لوٹ کر اس کے پٹھے خود ہی لاتی۔ بعد میں جب باجی بھینس سنبھالنے کا قابل ہو گئی تو پھر اس کے آسرے پر بھینس چھوڑ کر دو تین دن بھی میکے رہ آتی تھی۔ بچوں کے لیے دوائی لانی ہو، انھیں سکول داخل کروانا ہو، بال منڈوانے ہوں، سبھی کام اماں کے ہاتھ میں تھے۔ جہاں تک اماں کے بس میں ہوتا، کرتی رہتی۔ لیکن اماں کی اس ساری مستعدی کے باوجود، اماں خود بتاتی تھی، سول اسپتال میں ان کا حوصلہ ہار چکا تھا۔ ایک تو بیٹے کی پریشانی، دوسرے اس کو اٹھائے اٹھائے پھرنے کی تھکن، اس پہ خالی پیٹ، اماں بے حال ہو کر ایک برآمدے میں پاؤں پسار کر پڑ رہی تھیں، جب ماموں کا وہاں سے گزر ہوا تھا۔

ماموں اچھے خاصے رعب دار مرد تھے۔ گاؤں میں ان کا خاصا دبدبہ تھا۔ تحصیل تو کیا، ضلع میں بھی ان کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ روز ہی جہلم کو نکلے ہوتے تھے، سارا دن گزار کر واپس لوٹ آ پہنچتے۔ گاؤں میں ان کی خاصی زمین تھی، کوئی پچیس بیگھے تو رہی ہوگی۔ دو بھائیوں اور ایک بہن میں سب سے چھوٹے تھے۔ گھر کے بھی لاڈلے اور اپنی شخصیت کی وجہ سے باہر کے بھی۔ ’لاڑھا‘ کے نام سے مشہور تھے۔ ہمیشہ صاف ستھری کیٹی یا بوسکی کی شلوار قمیض میں ہوتے، سر پر بھورے رنگ کا صافہ تو ان کی شناختی علامت تھا۔ خاص طور پر جب موٹر سائیکل پر بیٹھتے تو صافہ ضرور باندھتے تھے۔ تب گاؤں میں تو تین ہی لوگوں کے پاس موٹر سائیکل تھا جن میں ایک وہ بھی تھے۔

اپنے گھر کا زمیندارہ ماموں کے ذمے ہی تھا۔ دونوں بڑے بھائی دوبئی ہوتے تھے۔ وہ خود سارا دن زمین داری کے کاموں میں لگے رہتے، مگر جس دن بھی فرصت ہوتی، موٹر سائیکل پر بیٹھ جہلم جا پہنچتے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور جاتے تھے۔ عمر کے آخری دنوں تک ان کا یہ معمول برقرار رہا۔ کہتے تھے کہ جہلم میں ایسے ایسے دوست ہیں کہ ملنے نہ جاؤں تو پریشان ہو کر یہاں آ پہنچیں گے۔ ان سب کو پریشان کرنے کا فائدہ؟ جہلم سے جب لوٹتے تو اپنے دونوں بیٹوں کے لیے کھانے کو پھل، مٹھائی ضرور لاتے۔ بعد میں جب ہمارے ساتھ بھی باپ بیٹیوں کا سا تعلق بن گیا تو ہمارے لیے بھی کبھی کبھی لے آتے۔

ماموں نے ہی ایک دو بار بتایا تھا کہ جب وہ ہسپتال میں منزہ سے ملنے اور کھانا وغیرہ دینے جاتے تھے تو وہاں اس کی ساری دکھ کہانی سنی۔ جس طرح اپنے بوتے پر وہ جی رہی تھی، سن کر انھیں حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ انھوں نے ایسی حوصلے والی عورت کو سچے دل سے بہن مان لیا اور کہا کہ زندگی میں جب کبھی بھی

مشکل وقت آئے، بلا تکلف اپنے بھائی لاڑھے کو آواز دے لینا۔ میں جس حال میں بھی ہوا، آ پہنچوں گا۔ انھوں نے بہن کہا تو پھر مانا بھی۔ جب بھی اماں کو کوئی مسئلہ ہوا، انھوں نے حل کیا۔ جو ضرورت ہوتی، چپ چپیتے دے جاتے اور کبھی یہ نہ چاہا کہ اماں دوسروں کے سامنے فخر سے ان کے دیے کا ذکر کرے۔ ہمیشہ کہتے کہ جو دیتا ہوں، اپنی بہن کو دیتا ہوں، کوئی احسان نہیں کرتا، چپ کر کے لے لیا کرو، تمھارا اپنا ہی تو مال ہے۔ زندگی کے ہر اہم موڑ پر انھوں نے اماں کا ساتھ دیا۔ کبھی انھیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان کا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔

اماں کے ایک بھائی اور ایک بہن تھے لیکن وہ دونوں میکے گاؤں میں ہی رہتے تھے۔ ماموں اور خالو دونوں بھی مزدوری تھے لیکن ذرا سا جگاڑ لگنے پر دوبئی سعودیہ نکل گئے تھے اور اب ان کے گھر خوشحال تھے۔ کوئی فکر فاقہ نہ تھا۔ اس سہولت کی وجہ سے انھیں اپنی پیچھے رہ جانے والی بہن کا کوئی خاص خیال نہ تھا۔ یہ تو اماں ہی تھی کہ ان کی محبت میں مری جاتی تھی۔ اگر ماموں کے گھر کوئی بکری بھی مری تو اماں وہاں افسوس کرنے ضرور گئی.....لیکن ہماری طرف کوئی جیے یا مرے، انھیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ مجھے خود اچھی طرح یاد ہے کہ جب باجی کی شادی ہوئی تو میں نے پہلی بار مامی اور ماموں کے بیٹے کو اپنے گھر دیکھا تھا۔ ان کی خوشحالی کی وجہ سے بیاہ مرن پر ان کے ہاں کچھ زیادہ ہی خرچ ہوتا تھا۔ اماں کی پوری خواہش ہوتی کہ وہاں نمایاں طریقے سے حصہ لیں۔ ابا کی تنخواہ سے تو پیٹ تک نہ بھرتا تھا، ایسے خرچوں کی گنجائش کہاں سے نکلتی۔ ایسے میں ہمیشہ لاڑھا ماموں آگے آتے اور دوسرے ہاتھ کو خبر ہوئے بغیر اماں کی ہتھیلی پر کھل کر خرچنے کو رکھ جاتے۔ اماں کی اپنے میکے میں جو تھوڑی بہت عزت بنی ہوئی تھی وہ ماموں ہی کی بدولت تھی ورنہ تو اماں نے اگر میکے جانا ہو تو بھی صرف کرائے کے بارے میں سوچ سوچ کے مری جاتی تھیں۔

ماموں بڑے شرم و حیا والے تھے۔ اپنی عزت کے ساتھ ساتھ اماں کی عزت کا بھی بڑا خیال تھا انھیں۔ اماں بتاتی تھی کہ بھائی کے مرنے کے چھ مہینوں بعد جب پہلی بار عید آئی تو ان کے گھر آئے۔ چھ مہینے میں یہ پہلی دفعہ تھی کہ وہ دوبارہ ان کے گھر آئے تھے۔ اماں نے ان کی دل سے خاطر کی اور بڑے ہی مان سے کہا کہ بھائی صاحب آپ کبھی کبھار ہماری طرف بھی آ جایا کریں، میرا بھائی ادھر پاکستان میں نہیں ہے، آپ آئیں گے تو مجھے ان کا ہی گمان ہوگا۔ اس پر وہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ کھیر کھا لینے کے بعد اماں اور ابا دونوں کو مخاطب کر کے بولے تھے کہ تم دونوں بہت ہی سیدھے سادھے ہو۔ تمھیں نہیں معلوم کہ دنیا کو دو دھاری کیوں کہا جاتا ہے۔ میں نے تمھیں بہن کہا ہے، دل سے مانا ہے اور زندگی میں کبھی اپنی اس بات سے نہیں پھروں گا۔ اگر صادق سے بڑھ کر تمھارا بھائی نہ ثابت ہوا تو کہنا۔ لیکن دنیا کو تم نہیں جانتی۔ اگر میں یہاں کبھی کبھار آنے لگا تو لوگوں کے ہاتھ کہنے کو بات آ جائے گی۔ سن کر خوامخواہ تمھیں اور تمھارے گھر والے کو تکلیف ہوگی۔ اس لیے میں تمھارے گھر بہت کم آیا کروں گا۔ سوائے کسی خاص ضرورت کے کبھی نہیں۔ ہاں، عید کے دن اپنی بہن کو عید دینے ضرور آیا کروں گا۔ ہر عید پڑھنے کے بعد پہلے تمھارے گھر آیا کروں گا۔ باقی تمھیں جب بھی

ضرورت ہو، مجھے پکار لیا کرنا۔ اب تمھارے دو بھائی ہیں۔' ان کی بات سے اماں تو ایک طرف، ابا بھی متاثر ہو گئے تھے اور ان کی بات پر حرف نہ رکھا۔

اس کے بعد جیسا کہ اماں بتاتی تھی کہ تیرہ چودہ سال تک وہ ہر عید پر عید پڑھتے ہی سیدھے ہمارے گھر آ پہنچتے۔ بہن کی حیثیت سے بڑھ کر عیدی دے جاتے۔ جب چھوٹی باجی اور میں جنمیں، تب بھی اتنا کچھ دیا کہ اماں سنبھال نہ سکی۔ لیکن کبھی بے موقع وہ ہمارے گھر نہیں آئے۔ دنیا سے نہ ڈرتے تھے، دنیا سے انھیں کوئی خوف کبھی محسوس ہی نہ ہوا تھا لیکن ڈرتے تھے تو اماں کی رسوائی سے۔ سو اماں نے بھی انھیں کبھی مجبور نہ کیا۔

جب بڑی باجی شادی کے قابل ہوئی تو اماں کو فکر ہو گئی اسے جلدی جلدی رخصت کرنے کی۔ اماں کے بھائی اور بہن اچھا کھانے پہننے لگے تھے، بھلا اپنی بھوکی ننگی بہن کے گھر رشتہ کیا ٹھیلتے۔ اماں یہ بات جانتی تھی، اس لیے کبھی ان کی منتظر نہ رہی۔ بات تک نہ کی۔ البتہ اپنے میکے گاؤں میں ہی ایک جگہ رشتے کی بات چلائی۔ ابھی بات چل رہی تھی کہ لاڑھے ماموں کو پتا چل گیا، فوراً ہمارے گھر آ پہنچے۔ ان دنوں مَیں نے کچھ ہوش سنبھالا ہوا تھا اور یہ باتیں مجھے بھی کسی حد تک یاد ہیں۔ انھوں نے اماں اور ابا کو الگ بٹھایا اور کافی طویل بحث کی۔ وہ پوچھنا یہ چاہتے تھے کہ لیلیٰ کو اپنی برادری میں ہی بیاہنا ہے یا کسی اچھی جگہ، جہاں وہ خوش بھی رہے اور خوش حال بھی۔ اماں نے سو طرح کے حیلے کیے کہ برادری کے یہ فائدے ہیں، وہ فائدے ہیں، میرا دل نہیں مانتا کہ بیٹی کو غیروں کے ہتھے چڑھا دوں، پتا نہیں کیسے لوگ نکلیں۔ اس پر وہ ذرا تحکمانہ لہجے میں بولے تھے کہ اگر اس بات کے ڈر سے برادری کے باہر رشتہ نہیں کرنا چاہتی تو اس کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ لڑکی کبھی کوئی شکایت لے کر تمھارے پاس نہیں آئے گی۔ اچھے اور خاندانی لوگ ہیں، چاہتے بھی صرف یہی ہیں کہ کسی لڑکی کا رشتہ مل جائے۔ کمینے نہیں ہیں، مطالبہ کوئی بھی نہیں رکھیں گے۔ تم جو اپنی لڑکی کو دے دو گی، انھیں کچھ اعتراض نہیں ہوگا۔ ایک بار رشتہ دیکھ لو، بعد میں جو بھی طے کرنا۔ اگر زیادہ ضمانت کی ضرورت ہو تو ان سے نکاح کے وقت جتنے پیسے زیور، مکان کہو گی، لکھوا دوں گا۔ اس پر اماں لرز گئی اور کہا کہ میں نے لڑکی بیچنی نہیں ہے، بیاہنی ہے، لکھواؤں گی کچھ نہیں۔ آپ کے کہے پر اعتبار ہے۔ صرف ایک بار گھر ضرور دیکھوں گی۔

اماں ماموں کے بتائے پتے پر ایک پڑوسن اور چھوٹی باجی کے ساتھ گئی۔ واپس آئی تو چہرے پر مسرت کا چھلکاؤ ہی بتا رہا تھا کہ لیلیٰ کا رشتہ یہیں ہوگا۔ باقی سب معاملات ماموں نے طے کیے۔ رشتہ طے ہو گیا۔ دن طے ہونے کے موقع پر لڑکے والوں کو میں نے بھی دیکھا۔ ان کے برتاؤ سے عیاں تھا کہ بہت سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ شادی طے ہو گئی۔ باجی کا جہیز خریدنے کی باری آئی۔ اماں نے پہلے سے ہی کافی کچھ کر رکھا تھا۔ پھر بھی فرنیچر اور اسی طرح کی بڑی چیزیں ابھی لینی تھیں۔ گاؤں سے یہ سامان کب مل سکتا تھا۔ اس کے لیے سوہاوہ ہی جانا پڑنا تھا۔ ابا تو رہے بیل کے بیل۔ صرف اپنی لکیر پر چلنے والے۔ عمر سوہاوہ کالج میں گزار دی لیکن آج تک شہر میں کسی ایک دکان دار سے بات نہ بنا سکے تھے۔ اماں خود ہی دو تین دفعہ گئی لیکن جو بھی چیز پسند

آتی، جیب اس کے سامنے چیں بول جاتی۔ ماموں کو پتہ چلا تو انھوں نے مطلوبہ چیزوں کی فہرست اور پیسے لے لیے۔ شادی سے دو دن پہلے سارا جہیز گھر میں جمع تھا۔ اماں بڑی نکتہ چیں تھی لیکن اس میں کوئی نقص نہ نکال سکی۔ باجی بھی اپنے سامان پر ہاتھ پھیر پھیر تھکتی نہ تھی۔ شادی کی ساری تقریب بھی ماموں کی وجہ سے بڑے سلیقے اور شان سے ہوئی۔ ہمارے ننھیال والوں کو سمجھ ہی نہ آتی تھی کہ منزہ نے گھر والے کی "اتنی سی" تنخواہ میں یہ سب کچھ کیسے کرلیا۔ خیر قصہ مختصر کہ باجی رخصت ہوگئی اور پھر کبھی بھی کوئی گلہ شکوہ اپنی سسرال کا لے کر نہیں آئی۔ خوش باش اور سسرال کا مان بن کر رہتی ہے۔

باجی کی شادی کے وقت انھوں نے جس طرح کام کیا، ابا بہت راضی تھے۔ انھوں نے خود ہی ماموں کو مجبور کیا کہ وہ ان کے گھر کبھی کبھار آجایا کریں۔ اماں نے بھی کہا کہ آپ آتے ہیں تو بھائی صادق کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ماموں نے بہت انکار کیا۔ وہی دنیا والا عذر۔ لیکن اماں کے اشارے پر ابا نے انھیں کھل کر کہا کہ بندے کو پرکھنے کے لیے تیرہ سال بہت ہوتے ہیں۔ جب آپ ہمارے ساتھ اتنے مخلص ہیں تو پھر دنیا کی کسے پرواہ ہے۔ آپ کا جب جی چاہے، آجایا کریں، اگر کسی نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو ہم اسے خود ہی دیکھ لیں گے۔ ماموں مان گئے لیکن آخری شرط یہ رکھ دی کہ وہ جب کبھی آئیں گے، شام کو ہی آیا کریں گے جب ابا گھر پر ہوں گے، اس کے علاوہ نہیں۔

اس کے بعد وہ کبھی کبھار ہمارے گھر آنے لگے۔ جس دن شہر جاتے میرے اور چھوٹی باجی سدرہ کے لیے کھانے کو کچھ نہ کچھ لے آتے اور شام کو ہمیں تھما جاتے۔ معمول ان کا یہی تھا کہ آتے، کچھ دیر بیٹھتے، ابا کے ساتھ ایک کپ چائے پیتے، ایک آدھ سگریٹ پھونکتے، پھر چل دیتے۔ کبھی اتنے نہ بیٹھتے کہ ہمیں جماہیاں آنے لگیں۔ آدمی وہ خوب گپی اور رونقی تھے۔، ہر وقت ہنسنے والے لیکن ہمارا ابا سائیں چپ تھا۔ اماں کہتی تھیں "کِلے کی کٹی"۔ نہ بولتے نہ چالتے، شاید اس وجہ سے بھی وہ جلدی بور ہوکر چل دیتے تھے۔ ان کی آمد کا سلسلہ کبھی نہ رکا، کبھی اگر حالات مخالف ہوئے بھی تو وقفہ ضرور بڑھ گیا، سلسلہ ختم نہ ہوا۔

اس دوران میں انھیں دو صدمے بھی اٹھانے پڑے۔ ایسے صدمے کہ سوہاوہ کی چٹیل پہاڑیاں بھی شاید جھول جاتیں۔ ان کے دو جوان بیٹے تھے۔ خدا کی کرنی یا اس کی طرف سے کوئی آزمائش کہ دونوں بیٹے، دو سال کے اندر اس نے واپس لے لیے۔ ایک تو دوستوں کے ساتھ پہاڑی نالے میں نہا رہا تھا۔ ایک اونچے کنارے سے چھلانگ لگائی اور نیچے پانی میں گیا تو پھر واپس زندہ نہ نکلا۔ پہاڑی نالے کے بہاؤ میں اس کے بہتے جسم کو پکڑنا ساتھیوں کے لیے ممکن نہ ہوا۔ وہ اس کی لاش ایک کلومیٹر دور سے اٹھا کر لائے تھے۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ جب اس نے چھلانگ لگائی تو اس کی چھاتی کسی پتھر سے ٹکرائی تھی اور اس زور کے ساتھ کہ وہیں جان نکل گئی تھی۔

دو ہی سال بعد دوسرا بیٹا موٹر سائیکل پر سوہاوہ کالج جاتے وقت جی ٹی روڈ پر ایک بے قابو ٹرک کے

نیچے آ کر کچلا گیا۔ ماموں کے لیے یہ دونوں صدمے جان لیوا بھی ہو سکتے تھے۔ دو ہی بیٹے اور دونوں کی اس طرح ناگہانی موت۔ کم ہی کوئی والدین سنبھال سکتے ہیں۔ ماموں کی حالت پہلے دنوں میں تو بہت خراب تھی، بعد میں رفتہ رفتہ سنبھلتے گئے تھے اور آخر آخر تو کوئی فرق ہی نہ جان پڑتا تھا۔ یہ ہے کہ اب قہقہے نہیں لگاتے تھے، بس لبوں پر محض لکیر سی کھنچ جاتی تھی۔ جن لبوں پر قہقہوں کا ڈیرہ رہا ہو، وہاں محض ایک مسکراہٹ کا بسیرا اجنبی لگتا ہے، لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ ان کی مسکراہٹ سے بھی ایک طرح کی تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دفعہ اماں نے پوچھا بھی کہ جوان پتر مر گئے، اب مسکراتے کس بات پر ہو، دل ہے یا پتھر؟ تو انھوں نے مسکرا کر کہا تھا کہ صدمے تو واقعی بڑے تھے لیکن یہ میرا دل ایسی باتوں کو کھا پی جاتا ہے۔ جانے والے تو چلے گئے، میں جو بھی کروں، واپس تو نہیں آئیں گے۔

ماموں ہمارے گھر باقاعدہ آتے رہے، البتہ آتے صرف ابا کی موجودگی میں۔ اول تو آتے ہی شام کو تھے، جب ابا کی گھر میں موجودگی یقینی ہوتی تھی۔ دوسرے اگر آنے کے بعد انھیں پتہ چلے کہ ابا گھر نہیں ہیں تو پھر ہم بہنوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر لوٹ جاتے تھے، بیٹھتے ہرگز نہ تھے۔ لیکن ان کی اس ساری احتیاط کے باوجود کچھ زبانوں کو بولنے کے لیے موضوع مل گیا تھا۔ اندر ہی اندر گاؤں میں یہ بات پھیلتی گئی کہ لاڑھا منزہ کے گھر کسی خاص مقصد کے لیے جاتا ہے۔ ایک سے دو، دو سے چار لوگوں تک ہوتی ہوتی جب یہ بات پورے گاؤں تک جم گئی تو ظاہر ہے اماں تک بھی کسی نہ کسی طرح پہنچنی ہی تھی۔ ایک دن ایک منہ پھٹ پڑوسن سے طعنے بازی کے دوران میں اُس نے اماں کو کہہ دیا کہ ‘‘تمھیں تو روز آ کر لاڑھا...’’ اماں بھونچکی رہ گئی۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔ چپ چاپ کمرے کے اندر آ کر چارپائی پر گری اور رونے لگی۔ کافی دیر بعد رو رو کر جب ہلکی ہو گئی تو سینہ تان کر اٹھی اور پورے وقار سے چلتی اس پڑوسن کے گھر چلی گئی اور اس کو صاف لفظوں میں واضح کیا کہ لاڑھا میرا بھائی ہے جیسا کہ صادق ہے اور آئندہ اگر کبھی اس کے بارے میں ایسی بات کی تو جان سے مار دوں گی۔ وہ پڑوسن اماں کے چہرے پر ابلتے غضب سے سہم گئی اور اماں سے معافی مانگ لی۔

لیکن..... زبانیں ایک بار چل پڑیں تو کہاں رکتی ہیں۔ باتیں ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ ایک دن ہم دونوں بہنوں کو بھی سکول میں یہ کچھ سننے کو ملا، بہت غصہ آیا تھا۔ باجی تو ایک لڑکی کا دوپٹہ اس کے گلے میں کس کر اسے جان سے مارنے لگی تھی۔ مگر ہم دو تھیں، دوسری طرف پورا سکول۔ بہت مار کھائی۔ گھر جا کر اماں کو بتایا تو ہم تینوں مل کر روتی رہیں۔ پھر اماں نے ہمارے ساتھ مل کر عہد کر لیا کہ آج کے بعد جو شخص بھی یہ طعنہ دے، ہم سنیں گی ہی نہیں۔ کوئی ردعمل ظاہر نہیں کریں گی۔ بس ایک خاموشی ہے جو ہماری عزت رکھ سکتی ہے، جواب دینے یا جھگڑا کرنے کی کوشش کی تو مزید بےعزتی ہوگی۔

ان دنوں ہم نے دھیان نہیں دیا مگر ابا کا رویہ بھی بدل چکا تھا۔ پہلے ان کا معمول تھا کہ کالج سے واپس آ کر وہ کہیں نہ جاتے تھے البتہ کبھی کبھار اپنی ماں سے ملنے چلے جاتے تھے۔ گو کہ ہم نے دھیان نہ دیا تھا،

لیکن بعد میں جو غور کیا تو یاد آ گیا کہ اب کئی ہفتوں سے اپنی ماں کی طرف نہیں گئے تھے۔ ایک دن اماں کسی کام سے سسرال جانے لگی تو ابا نے روک لیا اور وہاں جانے سے منع کر دیا۔ اماں نے حیران ہو کر وجہ پوچھی تو ابا نے دھیمے سے بتایا کہ ان کی ماں نے کہہ دیا ہے "اب ہمارا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے، تم اور تمھاری بیوی بے غیرت ہو گئے ہو، تم ہی لوگوں کی باتیں سنو، ہم لوگوں کو بدنام نہ کرو۔" ابا بھی خوب تھے اتنی بڑی بات اکیلے ہی اپنے خون میں ملا کر پی رہے تھے۔ کسی کو بتایا تک نہ تھا۔ خود ہی جھیلتے رہے۔ اماں نے سنا تو پھٹ پڑی۔ ابا سے کہا کہ میں ابھی جا کر ان سے بات کرتی ہوں لیکن ابا نے روکے رکھا۔ کیا بات کرو گی۔ جو کہنا تھا انھوں نے، وہ تو کہہ دیا۔ اب بحث کرنے کا کوئی فائدہ ہے کیا؟ ہماری طرف سے جائیں جہنم میں۔ انھوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے تو کیا ہوا؟ وہ میرے رشتہ دار ہیں۔ مجھے ہی تکلیف ہوگی، ہونے دو، تمھارا تو ان سے کوئی رشتہ نہیں نا؟ تم خاموش رہو۔ اماں نے دلائل دینے کی کوشش کی لیکن ابا شاید اتنے دن چپ چاپ لہو پیتے پیتے اپنے ماں باپ پر غصے ہو چکے تھے جنھوں نے دوسروں کی سنی سنائی پر اس قدر ظالمانہ فیصلہ دے دیا تھا۔ اب اگر خود ان کے ماں باپ بھی آ جاتے تو شاید وہ نہ مانتے۔

ہمیں تو ظاہر ہے اتنی جلدی خبر نہ ہو سکتی تھی لیکن ادھر ماموں کے گھر بھی یہ آگ پہنچ چکی تھی۔ کافی مدت کے بعد اماں کے علم میں یہ بات آئی کہ ماموں کے گھر والے اس بات پر ماموں سے ناراض ہیں اور آج کل گھر میں انھیں خاصی پریشانی کا سامنا ہے۔ ان کی بیوی نے جو ویسے بھی خاصی جھگڑالو مشہور تھی، کہہ دیا تھا کہ تو ہے ہی رنڈی باز، تیرے گناہوں کی سزا میں تو میرے دونوں جوان بیٹے مارے گئے ہیں۔ اب کیا بیٹیوں کو بھی مروانا ہے۔ ماموں کی بیوی، بھابھیاں اور بہن سبھی اس معاملے پر متفق تھیں اور انھیں واضح گناہ گار سمجھتی تھیں۔ ماموں اس پر کتنے اذیت میں تھے، انھوں نے ہم پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ان دنوں تین چار بار جو آئے تو کافی وقفے کے بعد آتے تھے، تھوڑی دیر بیٹھتے اور معمول کی گپ شپ کر کے چلے جاتے۔

اس دوران میں چھوٹی باجی کی شادی بھی جوت دی گئی۔ ماموں نے ہی رشتہ تلاش کیا۔ پہلے جیسا نہ تھا مگر کوئی عیب ان لوگوں میں بھی نہ تھا۔ جہیز اور بارات کے انتظام میں ماموں پہلے سے بڑھ کے کام آئے۔ سارا معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا۔ لیکن شادی کے سارے معاملات میں ان کا عمل دخل دیکھنے والوں کو پھر اٹکا۔ نئی کہانیاں کھلنے لگیں، زبانیں سرگوشیوں کے بجائے آوازے بننے لگیں۔

ہمیں تو خیر کیسے علم ہوتا، ماموں ایسی باتیں ہمیں بتاتے ہی کب تھے۔ ان کے گھر والے اب باقاعدہ جھگڑے پر اتر آئے تھے۔ باہر سے ان کے بڑے بھائی نے بھی انھیں کہلوا بھیجا تھا کہ منزہ کے گھر جانا چھوڑ دو، ہمارے خاندان کا نام برباد مت کرو۔ گھر میں تو صرف عورتیں ہی تھیں، اور سب جانتے ہیں کہ ہم عورتوں کا کام طعنے دینے کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے۔ ہر روز انھیں پتا نہیں کیا کیا کچھ سننا پڑتا تھا کہ تنگ آ کر انھوں نے گھر سے اپنا ذاتی سامان اٹھایا اور ٹیوب ویل پر ڈیرہ لگا لیا۔ وہاں کبھی کبھار رات گزارنے کے لیے

ایک کمرہ بنا ہوا تھا، ماموں اسی کمرے میں رہنے لگے۔ گھر کی طرف سے وہ بالکل بیگانے ہو گئے تھے اور گھر والے ان کی طرف سے۔ ہاں البتہ کھانا تینوں وقت ان کے بھتیجے پہنچا آتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا گھر سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ بھائیوں نے کہلوا بھیجا تھا کہ جہاں مرضی مرے، اب گھر میں کبھی نہیں گھسنے دیں گے۔

ہمارے گھر وہ اب بھی کبھی کبھار آ ہی جاتے۔ باوجود کہ پورا گاؤں ان کی نیت پہ انگلی رکھ رہا تھا لیکن وہ اندر سے کھرے تھے، کبھی چہرے پر ندامت کی دھند تک نہ آئی۔ ایسے ہی آتے، آرام سے بیٹھ کے چلے جاتے۔ ایک دن مجھے البتہ ضرور کہا کہ میں آئندہ ان کے گھر، اگر کوئی کام ہو تو بالکل نہ جاؤں۔ پتا نہیں وہ لوگ کیسا سلوک کریں۔ ہمیں بھی ان کے گھر بدر ہونے کے علم ہو چکا تھا لیکن کبھی ان کے سامنے ذکر نہ کیا تھا، پر اس دن اماں کو موقع مل گیا اور بات چھیڑ دی۔ اس پر وہ ذرا چڑ گئے۔ اماں نے پھر پوچھا کہ آپ نے اپنا پورا خاندان میری وجہ سے ناراض کر لیا ہے، آپ ان کی بات مان لیں، ہم سے تعلق ختم کر لیں، اور اپنے خون سے ناتا نہ توڑیں۔ وہ تپ کر بولے تھے کہ وہ چور نہیں ہیں کہ منہ چھپاتے پھریں۔ جب کچھ ایسا کام کیا ہی نہیں ہے تو پھر ان کی بات کیوں مان لوں؟ خواہ مخواہ اپنے دل پر بھی بوجھ آ رہے گا۔ ابھی تک تو بے فکر ہوں۔ کیا فائدہ ایسے گھر والوں کا جو پینتالیس سال ساتھ رہنے کے بعد بھی آدمی کو سمجھ نہ سکیں۔ اماں نے کہا کہ پھر بھی، آپ کے بھائی ہیں، بیوی ہے، آپ کا اَور ہے کون، دنیا میں کس کے لیے جئیں گے؟ ان کا جواب وہی تھا۔ ایسے رشتے دار نہ بھی ہوں تو فرق نہیں پڑتا۔ وہ کیا سمجھتے ہیں کہ میں کمزور دل ہوں، ان کے بائیکاٹ پر ہار مان جاؤں گا؟ نہیں، میرا دل صاف ہے، میں کبھی ہار نہیں مانوں گا۔ میری طرف سے مر جائیں وہ۔ میں دنیا میں ان کے بغیر بھی رہ لوں گا۔ اماں بھونچکا رہ گئی تھی۔ ایسا سخت دل آدمی؟ کیا واقعی اس کے دل پہ ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا؟

ماموں کو گھر چھوڑے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ سردی نے ماحول پہ قبضہ جمانا شروع کر لیا تھا۔ پتا نہیں ماموں وہاں ٹیوب ویل پہ کس طرح سوتے ہوں گے۔ سردی کا کیا علاج کرتے ہوں گے۔ اماں ماموں کی صحت کا سوچ سوچ کے پریشان ہوتی رہتی لیکن انھیں ذرا اثر نہ ہوتا تھا۔ کہتے تھے کہ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ میں کسی نہ کسی طرح زندہ رہ لوں گا اور ان گھر والوں کے بغیر تو بڑا سکھی رہ لوں گا۔

اماں کے لیے بھی ٹینشن بڑھتی جا رہی تھی۔ جانے کب برداشت سے باہر ہو گئی۔ بس ایک دن اماں سلائی کرتے کرتے سر پہ ہاتھ رکھ کر چیخنے لگی۔ میں جو گھر میں اب اکیلی ہوتی تھی، گھبرا گئی۔ پہلے تو تھوڑا بہت چارا کیا، پھر کچھ نہ سوجھا تو ماموں کو بتانے کو دوڑی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے۔ گاڑی کا بندوبست کیا اور اماں کو جہلم سول ہسپتال لے گئے۔ اماں سات دن وہاں رہیں۔ ماموں نے ہی اس دوران میں ان کا خیال رکھا۔ اتنے دن ابا کو تو ایک بار بھی جانے کی توفیق نہ ہوئی، میں البتہ ماموں کے ساتھ دو دفعہ وہاں گئی۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ کسی سخت سوچ نے ان کے ذہن پر اس قدر دباؤ ڈالا ہے کہ دماغ تھک گیا ہے۔ ایک ہفتے میں

ڈاکٹروں کی کوشش سے اماں تقریباً پہلے جیسی ہو کر واپس آ گئی۔ البتہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ابھی کچھ عرصہ اس بی بی کو کوئی ٹینشن نہیں ہونی چاہیے۔ زیادہ لوگوں سے بات نہ کرے اور ایسی جگہ جانے سے پرہیز کرے جہاں بھیڑ بھاڑ ہو، بس میں سفر نہ کرے، بازار نہ جائے، سلائی کا کام کہ اس سے ذہن پر بہت زور پڑتا ہے، بالکل چھوڑ دے، سر پر وزن نہ اٹھائے..... اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ۔ مختصر یہ کہ اماں پہلے جیسی نظر تو آتی تھی، پہلے کی طرح کوئی کام کاج نہ کر سکتی تھی۔ بس چارپائی پر لیٹی رہتی، بھینس جو پہلے والی کی بیٹی تھی، اماں نے باوجود پیاری ہونے کے، اس کا کام نہ کر سکنے کی وجہ سے ایک بیوپاری کو تھما دی۔ سلائی کا کام ختم، گھر کے سب کام بند۔ دکان سے بھی کچھ لانا ہوتا تو میں ہی خرید کر لاتی یا کبھی کبھار ماموں سوہاوہ سے لوٹتے ہوئے ہمارے گھر کا سودا بھی لے آتے۔

وہ جو لوگوں کی زبان پر آرے لگے تھے، ان کی دھار میں جان لیوا کاٹ انھی دنوں میں آئی۔ واقعہ ہی ایسا تھا کہ گاؤں کے سخت ماحول میں کسی صورت برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہوا یوں کہ ادھر اماں کے میکے میں نانی سخت بیمار ہو گئی۔ اماں کو خبر ملی تو نانی کے پاس جانے کے لیے ان کا دل مچلنے لگا۔ بس پر جانے سے ڈاکٹر نے منع کر دیا تھا۔ اب جائیں تو کیسے؟ فاصلہ بھی ستر کلو میٹر سے زیادہ۔ ابا سے دو تین بار کہا کہ مجھے کسی طرح اماں کے پاس لے چلو لیکن ابا بھلا کبھی ایسے موقعے پر کام آئے تھے، جو اَب آتے۔ یہی کہا کہ میرے پاس پجارو تو ہے نہیں کہ لے چلوں، سائیکل ہے اور یہ صرف سوہاوہ تک کھینچتا رہوں تو بہت ہے۔ پڑی رہو یہیں۔ وہ کون سا تمھارے بیمار پڑنے پر تمھیں یہاں دیکھنے آئے تھے..... ہسپتال میں ایک چکر لگا گئے تو بڑا احسان کیا۔ لیکن اماں کا دل کہاں ماننے والا تھا، پڑی پھڑکتی رہتی۔ ایک دن ابا کے کالج جانے کے بعد مجھے کہا کہ جا کر ماموں کو بلا لاؤ۔ میں بلا لائی۔ انھیں دیکھتے ہی اماں نے کہہ دیا کہ مجھے اپنے سکوٹر پر اماں کے پاس لے چلو۔ ماموں راضی ہو گئے۔ اماں نے ایک دوپٹہ سر کے گرد کسا۔ ایک لوئی کی بکل مار کر موٹر سائیکل پر ماموں کے پیچھے بیٹھیں اور نانی کے گاؤں چلی گئیں۔

ان کی واپسی شام اندھیرا پڑنے کے بعد ہوئی تھی لیکن تب تک گاؤں میں بہت سا غبار اڑ گیا تھا۔ بھلا گاؤں کے لوگ یہ گوارا کر سکتے تھے کہ ایک عورت غیر مرد کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر یوں دن دیہاڑے کہیں نکل جائے۔ شاید کئی لوگ یہ بھی رائے رکھتے ہوں کہ لاڑھا منزہ کو بھگا کر لے گیا ہے۔ ابا جب کالج سے لوٹے تو پتہ نہیں کن لوگوں نے انھیں راستے میں ہی خوب بھر کر بھیجا۔ گھر آئے تو مزاج عجیب سا بدلا ہوا تھا۔ وہ سائیکل کھڑی کر رہے تھے کہ میں نے قریب جا کر معمول کے مطابق کہا: ”ابا جی! آ گئے ہو؟“

دے تھپڑ میرے منہ پر مارا۔ ”اندھی ہے، دیکھتی نہیں کہ آ گیا ہوں۔ کنجری کی اولاد۔“ کہہ کر سائیکل پھینک پھر باہر چلے گئے۔ میں ہکا بکا رہ گئی۔ واقعی یہ میرا ہی ابا تھا؟ آج تک تو ایسا نہ ہوا تھا تو پھر اب کیا ہو گیا؟ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا تو اندر پڑ کر رونے لگی۔

شام کو ابا لوٹے اور اسی طرح منہ سُجائے آ کر صحن میں پڑی ایک چارپائی پر چپ چاپ لیٹ رہے۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہے۔ جب ماموں کی موٹر سائیکل دروازے کے آگے آ کر رکی، تب بھی ذرا نہ ہلے جلے۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل واپس مڑ گئی اور اماں ہولے ہولے چلتی اندر آ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اماں کو تھاما اور سہارا دے کر کمرے تک لا کر ابے کی چارپائی کے ساتھ والی چارپائی پر لٹا دیا اور رضائی اوڑھا دی۔ اتنے سفر کے بعد لگتا تھا کہ اماں مرتک گئی ہے۔ ہاتھ پیروں میں بالکل ہی جان نہ رہی تھی۔ میں اماں کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگی۔ ابا تھوڑی دیر اماں کو گھورتے رہے پھر جیسے یک دم ابل پڑے۔

”چھوڑ گیا تمھیں تمھارا خصم؟“

شاید اسی کو تراہ نکلنا کہتے ہیں۔ کہاں اماں سے سر ہلا پانا بھی مشکل تھا اور کہاں اماں اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ منہ سے جیسے ان سوچے ہی لفظ نکل پڑے۔ ”کیا کہا؟“

”وہی جو تم نے سنا؟ ...... کہاں گئی تھی خصم کے ساتھ ...... کسی کنجری کی ......“ ابا کی آواز پھٹنے لگی تھی۔

”بس اب آگے کچھ مت کہنا تم سے بھی بات کر لیتی ہوں۔ ثوبیہ تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔“

میں چپ چاپ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ لیکن آواز وہاں بھی آتی تھی۔

”ہاں اب بول۔ تمھیں تو اچھی طرح پتا ہے کہ میرا خصم کون ہے؟ اٹھائیس سال ہو گئے تمھارے ساتھ۔ کبھی تمھارے علاوہ کسی کی طرف دیکھا بھی ہے۔ بول، دیکھا بھی ہے۔“ اماں کی آواز اونچی ہونے لگی تھی۔

”پر اب تو یہ ہو رہا ہے نا ...... میں نہیں، پورا گاؤں کہہ رہا ہے۔“

”پورے گاؤں کی ماں کو کتے لے جائیں۔ وہ کون ہوتے ہیں۔ بات میرے اور تمھارے بیچ ہے۔ اگر میں نے یہی کرنا ہوتا تو جوانی میں نہ کر لیتی؟ اب بڑھاپے میں بیاہی بیٹیوں کو لاج لگانی ضروری تھی۔ بول کمینے ...... تو مجھے کبھی بھی روک سکتا تھا؟“ اماں کی آواز گو کہ بہت اونچی نہ تھی مگر کھردری بہت تھی، لگا وہ ابے کا گلا دبوچ کر بھنچی بھنچی آواز میں انھیں کوس رہی ہیں۔ اگر میں ایسا کچھ کرنا چاہتی تو کیا ساری زندگی تمھاری کمائی ہوئی سوکھی روٹی کو میں خود اپنے وخت (مشقت) سے چوپڑتی رہتی؟ بس یہی سوچتی رہی کہ تم اور تمھاری اولاد کا لقمہ آسانی سے حلق میں اتر جائے۔ اور آج تم مجھے یہ سب کہہ رہے ہو، کیا آسان نہ تھا کہ میں ایک یار بنا لیتی اور ڈٹ کر کھاتی رہتی۔ پورے بدن کو توڑ کر اسی عمر میں ناکارہ تو نہ ہو جاتی۔ تم میں اتنی ہمت تھی کہ مجھے روک سکتے؟ اگر کچھ نہیں کیا تو یہ میری اپنی شرافت تھی۔“

”تو اب کہاں گئی تمھاری شرافت، اب کیوں یار کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھومتی ہے۔“

ابا کو بھی نہ جانے کس نے آج اتنا بھر کے بھیجا تھا۔

”گئی تھی، اپنی ماں کو دیکھنے۔ تمھیں کتنی دفعہ کہا تھا، مجھے لے چلو ...... لے کے گئے؟ گئے تھے لے

کر؟ اب باتیں کیوں کرتے ہو۔ اگر تم کچھ کر سکتے تو مجھے دوسروں کی منت ہی کیوں کرنی پڑتی۔ ساری زندگی کوئی کام کیا ہے کبھی؟ کالج میں دو گھنٹے کیاریاں کیا کھود لیتے ہو، سمجھتے ہو ہماری پشتوں پر احسان کیا ہے۔ تمھیں کچھ خبر بھی ہے کہ دو کڑیاں کس طرح جوان کر کے بیاہ دی ہیں؟ کوئی اندازہ ہے؟ تمھیں تو اپنے جوائیوں کا نام بھی ٹھیک طرح یاد نہیں ہوگا۔ کسی کو یہ بھی ثابت کرنے جوگے نہیں کہ اپنی کڑیاں کسی کو بیاہ کر دی ہیں یا کسی انجانے کے ساتھ نکل بھاگی ہیں۔ تم مجھے طعنہ دینے کے قابل ہوئی کب؟''

''چلو ٹھیک ہے۔'' ابا ٹھنڈا ہونے لگا۔ اماں کے غصے کے سامنے ابے کی حیثیت کیا تھی۔ وہ جیسا کہ اماں کہہ رہی تھی، اماں کے سامنے بولنے جوگے تھے ہی کب۔ اماں نے دو چھینٹے مارے نہیں کہ دودھ کے ابھار کی طرح بیٹھ گئے۔ ''پر آئندہ اس طرح اس کے ساتھ نہ جانا۔ لوگ بہت گندی باتیں کرتے ہیں۔''

''لوگ کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ لوگوں کے ساتھ میرا کیا معاملہ۔ میرا پیکا (میکا) دور ہے۔ بیٹیاں اتنی دور بیاہ دی ہیں۔ مجھے تو ان سب کے پاس جانا پڑتا ہے۔ آئندہ بھی اگر ضرورت پڑی تو جاؤں گی اپنے بھائی کے ساتھ۔ تم کون ہوتے ہو روکنے والے۔ اگر اتنا ہی شوق ہے مرد بننے کا تو تم مجھے چھوڑ آیا کرنا۔ میں تمھیں دلوا دیتی ہوں ایک موٹر سائیکل۔ چھوڑ آیا کرو گے؟ پھر میں بھائی کے موٹر سائیکل کی طرف دیکھ بھی گئی تو کاٹ کر پھینک دینا۔'' اماں رونے لگی۔ ''ارے میں تو اپنی مجبوری سے گئی تھی، میری ماں ادھر پڑی مر رہی ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا۔ ساری عمر بسوں میں دھکے کھاتے ہی جاتی رہی ہوں۔ اب بھی جا سکتی ہوں، پر کہیں رستے میں ہی لیٹ رہی تو کیا بنے گا میرے گھر کا۔ ایک آخری کڑی رہ گئی ہے۔ اسے بھی اپنے گھر کا کر لوں تو پھر مجھے کوئی ڈر نہیں۔ مر بھی گئی تو خیر ہے۔ پر اَب مر گئی تو ساتھ یہ بھی مر جائے گی۔ تم تو اسے کنویں میں دھکا بھی نہیں دے سکو گے۔ میری مجبوری ہے، مجبوری نہ ہو......''

اماں کا رونا ابے سے دیکھا نہ گیا۔ ابا اٹھ کر اماں کی چارپائی پر چلا گیا اور اماں کو چپ کرانے لگا۔

نانی بیمار پڑیں تو اٹھنے کا نام نہ لیا۔ ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ ان کی سناؤنی آ گئی۔ جس وقت اماں کے میکے گاؤں کا نائی ان کے مرنے کی خبر لے کر پہنچا، میں اور اماں ہی گھر پر تھے۔ ابا کالج گئے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ابا نے بھی جانا تھا لیکن اماں سے صبر نہ ہو پا رہا تھا۔ پہلے تو اکیلی بیٹھی روتی پیٹتی رہی لیکن پھر اٹھی اور میکے جانے کو تیار ہو گئی۔ مجھے کہہ دیا کہ تم ابے کے ساتھ بس پر آ جانا۔ خود پہلے کی طرح ماموں کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چلی گئی۔ بعد میں مَیں اور ابا بھی وہاں پہنچ گئے۔ ماموں انھیں اتار کر واپس آ گئے تھے۔

اسی شام نانی کو دفنا دیا گیا اور اگلی صبح میں اور ابا واپس آ گئے۔ اماں کا آنا بنتا بھی نہ تھا۔ وہ وہیں رہی۔ مجھے بتا دیا تھا کہ ماموں سے کہنا کہ ساتویں کے دن آ کر انھیں لے جائیں اور پھر ساتویں کے دن ماموں جا کر انھیں لے آئے۔

جب وہ دونوں واپس پہنچے تو اکٹھے ہی گھر داخل ہوئے۔ اماں تو کمرے میں داخل ہوتے ہی تھک

کرگر پڑی۔ ماموں ابا کے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے چائے کا پوچھا تو انھوں نے حامی بھر لی۔ میں نے تینوں کو چائے بنا کر دی اور خود اماں کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔ خیال تھا کہ شاید سفر کی وجہ سے پھر سر دکھنے لگا ہو۔ ابا اور ماموں چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ جب کہ اماں بانہہ آنکھوں پر موڑے چت لیٹی رہی۔ چائے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ میں جب اس طویل چپی کو برداشت نہ کر سکی تو تنگ آ کر پوچھ ہی لیا کہ ہوا کیا ہے۔ کیا راستے میں کوئی حادثہ ہوا ہے یا ویسے ہی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔

اماں نے ماتھے پر سے بانہہ ہٹائی اور ابا کی طرف دیکھنے لگی۔ ابا کی نظریں بھی سوال بنی ہوئی تھیں۔

’’ہونہہ……راستے میں کیا ہونا تھا۔ جب وہاں سے چلتے وقت ہی کمر ٹوٹ گئی تھی۔‘‘

’’کیوں کیا ہوا؟‘‘ اب ابا نے سوال پوچھنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔

’’ہونا کیا تھا۔ وہی جو تمھاری ماں نے کہا تھا، آج میرے بھائی نے بھی مجھے کہہ دیا۔‘‘

’’کیا کہہ دیا صادق نے؟‘‘ ابا ذرا آگے کو جھک آئے۔

’’کہا تھوڑی ہی ہے۔ میرے نصیبوں پر مہر لگائی ہے۔ اچھا ہوا کہ بے بے مر گئی ورنہ کیا خبر وہ یہ لفظ سنتی تو بے موت ہی مر جاتی۔ کہتا ہے کہ تم جس طرح لاڑھے کے ساتھ موٹر سائیکل پر گھومتی ہو، اس سے ہماری عزت خراب ہو رہی ہے۔ آئندہ تم اور تمھاری بیٹیاں ہماری طرف نہ آؤ تو ہمیں خوشی ہو گی۔ ہمیں اپنی عزت پیاری ہے۔‘‘

ابا سن ہو کر رہ گئے۔ کافی دیر تو کچھ بول ہی نہ سکے۔ پھر یک دم جیسے غصے میں آ کر بولے۔ ’’بڑا کنجر آدمی ہے۔ تم کوئی شوق سے گھومتی ہو، اپنی مجبوری سے ہی تو گئی تھی۔‘‘

’’بس کیا کہہ سکتی ہوں؟ لوگوں کو پتا نہیں کیوں اپنی عزت اپنے رشتوں سے بڑھ کر پیاری ہوتی ہے۔ حالاں کہ عزت تو ایسی کتی چیز ہے کہ ساری زندگی کماتے رہو، ایک ذرا سی غلطی ہو جائے تو فوراً بھاگ نکلتی ہے۔‘‘ اماں بہت تھکی تھکی بول رہی تھی۔ ’’کہتا ہے ہماری عزت خراب ہوتی ہے۔‘‘

’’ایسے بھائی پر تو لعنت بھیجنی چاہیے۔‘‘ ابا اسی طرح غصے میں تھے۔

اماں لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھی۔ ’’خبردار اگر یہ لفظ منہ سے پھر نکالا تو۔ وہ میرا بھائی ہے۔ تمھارے بھائیوں کی طرح کمینہ نہیں ہے۔ کیا ہے جو اس نے یہ کہہ دیا ہے تو۔ غلطی بھی تو میری ہی ہے نا؟ میں کیوں ان کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ نہ جاتی تو وہ کبھی ایسی بات کہہ سکتا تھا؟‘‘

’’چلو اگر وہ تمھیں بہن ماننے میں شرم محسوس کرتا ہے تو کیا؟‘‘ ماموں نے آہستہ سے کہا: ’’میں جو ہوں۔ میں بھی تو تمھارا بھائی ہی ہوں نا۔ مجھے تم زیادہ عزیز ہو، اپنی عزت سے بھی بڑھ کے۔‘‘

’’آپ بھی ہیں، پر وہ تو سگا بھائی ہے نا! آپ کی وجہ سے……‘‘

ماموں کا چہرہ مجھے دیکھنے کی بالکل تاب نہ ہو سکی۔ اماں تو چپ ہو ہی گئی، مجھے بھی احساس ہو گیا تھا

کہ اماں نے جو کہہ دیا ہے، انھیں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر بات کہہ دی جائے تو پھر اس کو پلٹنا کیسے ممکن ہوتا ہے، میں نہیں جانتی تھی۔ سو خاموش بیٹھی رہی۔ اماں بھی یقیناً اپنے الفاظ پہ نادم ہو کر واپس لیٹ رہی تھی۔ اب کی بار اوندھی ہو کے۔ ابا اور ماموں دونوں دم سادھے بیٹھے رہے۔ کافی دیر بیٹھے رہے لیکن آپس میں دو چار جملے ہی بولے ہوں گے۔ پھر ماموں آرام سے اٹھے اور حسبِ معمول میرے اور اماں کے سر پہ ہاتھ پھیر کر چل دیے۔ تھوڑی دیر بعد ان کا موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور یہ آواز کم ہوتے ہوتے گم ہو گئی۔

آج جب اماں بھی نہیں رہی، میں اکثر یہ سوچتی ہوں کہ اس رات ماموں کے دل نے، جو بڑے بڑے صدمے ہنس کھیل کے کھا پی جاتا تھا، یہ صدمہ برداشت کرنے کی کس کس طرح کوشش کی ہو گی، آخر سردیوں کی رات بہت طویل ہوتی ہے۔ سنبھلنے اور سنبھالنے کا کون کون سا جتن نہ کیا ہو گا کہ جن کے باوجود معاملہ خرابی کی طرف بڑھتا گیا تھا۔ ان کے دل نے تو آخری سلام اس وقت کیا تھا جب وہ صبح سویرے ٹیوب ویل سٹارٹ کرا رہے تھے لیکن آخر اس طویل رات کو انھوں نے کیسے گزارا ہو گا۔

میں گئی تھی ان کے ماتم پر بھی۔ ایک بار موقع بھی ملا تھا ان کا چہرہ دیکھنے کا۔ اتنی گہری نظر سے دیکھا تھا کہ آج تک وہ چہرہ نظروں کے سامنے نقش ہے۔ جتنی بار بھی اس چہرے کو دیکھتی ہوں، غور سے اس پر اس تکلیف کے آثار ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہوں جو محض رات بھر میں انھیں چاٹ گئی تھی لیکن وہاں کچھ بھی نہیں ملتا، سوائے ایک پتلی سی مسکراتی لکیر کے۔

☆☆☆☆

عثمان عالم

ہرج

وہ میرا قاتل تھا اور میں شاید مقتول ۔۔۔۔ یا میں اُس کا قاتل تھا اور شاید وہ میرا مقتول ۔ وہ مجھے گلی کے نکڑ پر ملا ۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت کے کئی رنگ دیکھے جا سکتے تھے ۔ بعض اوقات وہ اتنے قریب آ جاتا کہ میں اُس کی آنکھ کی پتلیوں کو پھیلتا اور سکڑتا بھی دیکھ پاتا ۔ میں اُسے نہیں جانتا کہ وہ کون تھا البتہ اُس کی مشکوک چال اور ہاتھوں کی حرکت مجھے وہم میں ڈالتی کہ میری ذات کو اُس سے خطرہ ہے ۔

اِسی اثنا میں ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اپنے مخصوص سائرن کے ساتھ برق رفتاری سے بے ہنگم ٹریفک اور لوگوں کو چیرتی ہوئی بڑے چوک کی جانب بڑھیں ۔ شاید اُس جانب کسی خودکش حملہ آور نے اپنے آپ کو اُڑایا تھا ۔

میں سوچ رہا تھا کہ ابھی صبح ہی کسی چھاونی کے قریب خودکش دھماکہ ہوا تھا لیکن اِس چوک کے قریب تو کوئی چھاونی نہیں تو پھر آج کی تاریخ میں یہ دوسرا دھماکہ، دوسرا یا چوتھا یا پانچواں ۔۔۔۔ میرے ذہن میں کئی دھماکے ایک ایک کر کے ہوتے چلے گئے پھر یاد آیا کہ تھوڑی دیر قبل جب میں نہانے کے لیے غسل خانے گیا تو ایک زوردار گرج سے در و دیوار کانپ اُٹھے تھے ایک ساعت کے لیے نل سے نکلتا ہوا پانی منجمد، جسم پر ملا ہوا صابن خشک اور مثانہ میں جمع شدہ فاضل مادے غیر ارادی طور پر خارج ہونے لگے تھے غسل خانے کا اکلوتا اُدھ قلی اُترا شیشہ دھمک سے ٹوٹتے ہوئے زمینی کشش کی طرف جھکاؤ کرنے لگا تھا ۔

میں گلی کے نکڑ سے نکل کر بڑے چوک کی جانب قدم بڑھانے لگا دھماکے والی جگہ سے چیخوں و پکار اور آہ و بکا کی آوازیں اور سسکیاں بلند ہو رہی تھیں ۔ زیادہ تر آوازیں اور چیخیں اِن لوگوں کی تھیں جو دھماکے کی گرج کو سُن کر آئے تھے ۔ جو لوگ اپنے حواس میں تھے وہ لاشیں اور زخمیوں کو سمیٹنے لگے پگھلے ہوئے جسموں کی باس ناک کے نتھنوں کی اندرونی دیوار کے ساتھ اُوپر چڑھتے ہوئے دماغ کے کسی کونے میں دُبک کر جلے ہوئے ماس اور تڑختی ہوئیں ہڈیوں کی بُو کے چھلکے اُتارنے لگیں ۔

چوک کی دیوار کی جانب مُنھ کیے دو درمیانی عمر کے آدمی کسی پر کھینچا تانی کرتے دکھائی دیے ۔ میں خون سے رنگی ہوئی سڑک اور بکھرے انسانی اعضاء کے درمیان قدم بڑھاتے ہوئے اُن آدمیوں کے قریب پہنچا جو ایک انسانی بازو پر گدِھوں کی مانند چھپٹے ہوئے تھے کُہنی سے اُوپر کٹا یہ بازو جس کے کونوں سے خون اب بھی رِس رہا تھا اور ایک بڑی اور واضح رگ نیلاہٹ کا شکار ہوئے پھڑک رہی تھی ۔ وہ دونوں آدمی اِس بازو کی

کلائی سے کچھ اُتارنے کی تگ و دُو میں اتنے منہمک تھے کہ انھیں میری وہاں موجودگی کا بالکل بھی احساس نہیں رہا۔ ہاتھ کی ہتھیلی پھٹ کے کھل چکی تھی اور انگوٹھا اپنی جڑ سے کھسک کر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ اِس نسوانی بازو سے کنگن اُتارنے میں دشواری ہو رہی تھی یا اُن کے اندر کا خوف تھا جو اُن کے ہاتھوں کی انگلیوں تک اُتر آیا تھا یا وہ جلدی میں تھے کہ کوئی اور حصہ دار نہ بن بیٹھے۔ کچھ تھا جو اُن کو اِس کلائی میں دھنسے کنگنوں کو اُترنے میں وقت پیدا کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ میں اِن کی مدد کر کے اِس میں حصہ دار کیوں نہ بن جاؤں۔۔۔ بجلی کے دو ماہ کا بل۔۔۔ آٹا راشن، سگریٹ، اماں، ادویات، بہنا، پٹرول، ایک لامتناہی ضروریات کا سانپ میرے خالی بٹوے میں پڑی غیرت کو ڈسنے لگا کہ کسی گوشے میں پڑے زخمی کی آواز میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔

میں اُس آواز کی جانب لپٹا جہاں پر ایک راہ گیر کسی جھلسے ہوئے شخص کے قریب کھڑا اپنے منھ میں دبی ہوئی چیخ کو ہونٹ سے پھسلا دینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ جھلسا ہوا شخص اُوندھے منھ زمین پر پڑا مشکل سے سانس لے رہا تھا میں نے اُسے سیدھا لیٹایا اُس کے چہرے کے ایک طرف جو قدرے قابلِ شناخت تھا میرے لیے اذیت کا باعث بن گیا یہ تو میرا اپنا لنگوٹیا شفیق تھا۔۔۔ ش ش شفیققق۔۔۔ ش ش ف فقق۔۔۔ میں جنونی حالت میں اُسے زور زور سے جھنجھوڑنے لگا۔ اِسی کھینچا تانی میں اُس نے میرے ہاتھوں میں آخری دبا دبا سانس لیا۔ میرے معدے کی چکی میں لگے بلیٹ زور زور سے رگڑ کھانے لگے۔

اتنی رگڑ کہ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے اور سر بھاری ہونے لگا اور خوراک کی نالی میں پھنسا ہوا مادہ اُبکائی کی شکل میں میرے منھ سے نکل کر جھلسے ہوئے شفیق پر کسی گندے برساتی نالے کی طرح بہنے لگا اور میرے سارے وجود کی گندگی میرے منھ کے راستے اُس کے جسم پر کفن کے مانند لپٹ گئی۔ میرے ناک اور آنکھوں سے بہتا ہوئے پانی میں اُس اجنبی کی شکل اُبھرنے لگی۔ جو مجھ سے کچھ فٹ کی دُوری پر کھڑا اپنے منھ پر مکروہ مسکراہٹ بکھیر رہا تھا۔ جس کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے خنجر کی نوک مجھے اپنے سینے کی سخت جلد پر محسوس ہوئی اتنے میں پولیس کے جوان اپنی گاڑیوں سے بھاری بوٹوں کی چاپ پیدا کرتے ہوئے اُس جگہ کے ارد گرد نشان زد کرنے لگے اور انھی نشانات کے پیچھے وہ اجنبی کہیں تحلیل ہونے لگا۔

میں گھٹنے پر اپنے ہاتھوں سے سارے وجود کا بوجھ ڈالتے ہوئے اُٹھا اور اِس انسانی چمڑے کی بُو سے دُور نکلنے کی کوشش میں پتلی اور لمبی گلیوں سے ہوتے ہوئے دوسری جانب کھلی اور کشادہ سڑک پہ نکل آیا۔ جہاں بازار کھلے اور کاروبار اپنے عروج پر تھا۔

شام کے دھندلکے زرد سائے کی شکل میں پھیل رہے تھے۔ بازار، بازار نہیں کسی طوائف کی گلی لگتا تھا۔ جہاں مردوں کے قدم ڈگمگاتے اور راہ چلتی عورتوں پر گرتے اور وہ گرتے گرتے اُن کے جسموں کے ساتھ لپٹ جاتے۔ ایک بجلی کے بوسیدہ کھمبے کی مرجھائی روشنی کے نیچے دُو انسانی بدن ایک دُوسرے میں سرِعام

تحلیل ہوتے نظر آئے۔ راہ گیر اِن جسموں کی تحلیل کا تماشا دیکھنے کے لیے کچھ دیر کو رُکتے اور پھر آگے ایسے بڑھ جاتے جیسے یہ اُن کے لیے روز کا کوئی تماشہ ہو میں بھی تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اِس کُھلے بندوں جسمانی اور نفسانی تماشے کے تماشائیوں میں شریک ہو گیا ایک مرد ایک عورت کی پیٹھ پر سوار تھا لوگ مُنھ سے ہوس کی لیس دار رالیں ٹپکا رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے عدسے پر ایک دھندلی سی شبیہہ بنی مجھے لگا کہ وہ عورت جس پر مرد سوار ہے وہ کوئی اور نہیں میری اپنی بہن ہے۔ میری آنکھوں میں غیرت کے ڈورے رینگنے لگے خون کھولنے لگا گالوں کے پٹھے پھڑ پھڑانے لگے۔ میں اُسے مارنے کے لیے قریب بڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ کوئی اور ہے پھر وہ کون تھی میری غیرت اور جوش مارتا ہوا خون نارمل ہونے لگا میں بالکل اُس عورت کے سر پر جا کھڑا ہوا اُس کے چہرے کے قریب اپنی آنکھیں لاتے ہوئے اُسے شناخت کرنے لگا یا خدایا---یہ کیا---یہ تو میرے لنگوٹیے شفیق کی بیوی اور بیوہ تھی۔ جسے میں پچھلے چوک میں مردہ چھوڑ آیا تھا۔ میں پھیپھڑوں کے زور سے چیخنے لگا اور چیختے چیختے اُسے بتانے لگا کہ تیرا میاں دھماکے کی نذر ہو گیا اور تو اِدھر سرِ عام سڑک کنارے---لیکن وہ تو میری بات سُنی اَن سُنی کر گئی۔ میری ساکت اور دہشت زدہ آنکھوں میں اُس نے کسی فاحشہ کی طرح جھانکا کہ میرے جسم کے چھوٹے بڑے بال گناہ زدہ ہوتے محسوس ہوئے۔ میں کسی کنوارے کی بیتی ہوئی بے چین راتوں کی طرح اُس کی پیٹھ پر سوار ہونے کے لیے تڑپنے لگا۔ ذہن سے ایک لمحے کے لیے شفیق لنگوٹیا اور اُس کا مردہ بدن میرے تحت الشعور کے نچلی اور تاریک تہوں میں اُترتا چلا گیا۔

میں اُس کے ننگے وجود سے جونک کی مانند چمٹے مرد کو کھینچ کر اُتارنے لگا اور وہ مرد مرد نہیں وہ اجنبی تھا میرا قاتل اور میں اُس کا مقتول یا شاید میں قاتل اور وہ میرا مقتول---

میں اُس تماشے کو چیرتا ہوا بلند مینار سے پیدا ہوتی اذان نما آواز کی سمت بڑھنے لگا اور اُس مسجد کے مرکزی ہال میں جا کر دَم لیا۔

یہاں بھی لوگوں کی بھیڑ تھی جیسے کوئی تماشا ہو۔ منبر پر بیٹھا ریشمی جبہ پہنے وہ امام اپنے مُنھ سے ایسے الفاظ نکالتا کہ اُس کے قدموں میں بیٹھے ہوئے مقتدی غصے اور جوش سے بھر جاتے اور مسجد کی دیواروں سے فتنہ زدہ نعرے گونجنے لگتے۔ ایک نوجوان سر پر رکھی کھجور کی چھال سے بنی ٹوپی اور بکھری ہوئی داڑھی کے ساتھ گھٹنے کے بل اوپر کو اُٹھتا اور ایک ایسا نعرہ بلند کرتا کہ جس کا جواب اُسے اُسی جوش و خروش سے ملتا بس مجھے اتنا سمجھ آیا کہ یہ مسجد، امام اور مقتدی مجھ سمیت نجانے کتنے لوگوں کو کافر قرار دے چکے ہیں---جنونی مقتدی نجانے کس جنت کے حصول کے لیے اپنے دلوں میں بغض لیے میرے قتل کے لیے آگے بڑھے۔

جب میں بھاگتا ہوا گلی کے باہر گرا تو مجھے اُٹھانے والا کوئی اور نہیں وہ ہی اجنبی تھا جس کی آنکھوں میں میرے لیے دہشت اور خوفناکی تھی۔ مجھے نہیں پتا کہ اگلے لمحے میں، وہ میرا قاتل تھا اور شاید میں اُس کا مقتول یا وہ میرا مقتول تھا اور شاید میں اُس کا قاتل۔

آدم شیر

عالمِ تمثال

وہ، جس کے کئی نام ہیں، ایک رات پلنگ پر چت لیٹا زیرو واٹ کے بلب کی پیلی مدھم روشنی میں چھت کو سوچیلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے کئی تصویریں دکھائی دے رہی تھیں جو اُس نے کبھی بنائی تھیں اور چند ایسی بھی نگاہوں میں پھر رہی تھیں جو اُس نے نہیں بنائی تھیں۔

یہ کیفیت پہلے بھی طاری ہو چکی تھی اور وہ نجات کے لیے خود کو کسی کام میں الجھا لیتا تھا یا لمبی تان کر سو جاتا تھا۔ تصویریں جب اُس کے حواس پر حملہ کرتی تھیں تب بے مائیگی کا احساس بڑھ جاتا تھا اور ناقدری کچوکے لگاتی تھی مگر اُسے یہ خیال بھی آتا تھا کہ ابھی برش کی وہ صفائی نہیں دکھا پایا جس کے بعد تسلی سے ہاتھ دھو لے۔

اُس کی چھت سے نظر ہٹی تو سامنے دیوار پر جا ٹکی اور جانے اُسے کیا سوجھی کہ غبار کا غلبہ دبانے کے لیے ماتھے پر ہتھیلی زور زور سے رگڑ کر کسی فاتح کی طرح پلنگ کو تخت جان کر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے چھوٹے سے کمرے کی ہر دیوار کو غور سے دیکھا۔۔۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ سر پر دونوں ہاتھ لے جا کر انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر سوچتا رہا۔۔۔ دیر تک سوچتا رہا۔

اگلے دن وہ بازار گیا اور رنگوں کے کئی ڈبے اور بُرش اٹھا لیا۔ اُس نے ایک ڈبے کا ڈھکن اُتارا اور مخصوص بالٹی میں آدھا انڈیل دیا۔ پھر تیل ملایا اور ایک بڑے سے برش کو اچھی طرح ڈبو کر شمالی دیوار پر پھیرنے لگا۔ دائیں سے بائیں، اوپر سے نیچے، قلعی کرنے والے کی طرح مگر اس سے کہیں بہتر ہاتھ چلایا کہ صفائی دیکھ کر کسی کا بھی جی عش عش کر اُٹھے اور اُس پر بھی مسرت کے چھینٹے لحظہ بھر پڑے مگر اُسے اچھی طرح محسوس ہونے سے پہلے خشک ہو گئے۔

تین دن وہ اُس دیوار کو دیکھتا رہا جس پر پینٹ چمک رہا تھا۔ کہیں بدنما نشان یا ٹیڑھی میڑھی لکیر نظر نہ آتی تھی۔ وہ قمقمہ جلاتا تو روشنی چوگنا معلوم دیتی تھی لیکن اسے چین نہ پڑا۔ ایک رنگ میں رنگی دیوار، جو پہلے بھلی لگتی تھی، اُسے اُکتانے لگی۔ اُس نے بے حد سوچ بچار کے بعد پہلے سے مختلف رنگ کا ڈبا کھولا، پھیرنے کے لیے تیار کیا اور رات بھر جاگتا رہا۔ سحری کے وقت جب چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور مرغ بانگیں دے دے کر دانے دُنکے کے لیے خود ساختہ مالکان کو اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ بھاری پپوٹوں کے ساتھ دھندلی نگاہوں سے دیوار دیکھ رہا تھا جو اُسے آگے پیچھے جھولتی نظر آ رہی تھی۔

اُس کا دل پھر ٹوٹ گیا اور خوبصورت دکھائی دینے والی دیوار کو دو دن بعد دیکھنا تک محال ہو گیا۔ اُس نے پوچھا کہ سب سے اچھا رنگ چڑھایا، پھر کیوں نہیں بھایا؟ اور خود کو تسلی دی کہ ممکن ہے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو۔ دونوں دفعہ سوچ سمجھ کر، محسوس کر کے، رنگوں کا انتخاب کیا لیکن گمان ہے کہ جمالیاتی حس کو متاثر نہیں کر پائے۔ یہ جان لینا آسان نہیں کہ آدمی کیا چاہتا ہے اور کیا اُسے واقعی چاہیے۔ اُس نے اپنی بہترین تصویروں کو دیکھا، ان میں موجود نمایاں رنگوں پر غور کیا اور ایک رنگ میں ڈوب گیا۔ کئی دن اُس کے ساتھ تخیل کے لچکیلے برش سے اندر باہر خط کھینچتا رہا۔ غیر مرئی پنجرہ بنا کر خود کو اُس میں قید کر لیا اور ایک دن اپنے کو آزاد کر کے بازار سے نیا ڈبا خرید لایا۔ اُس نے رنگ تیار کیا اور دوپہر سے شام تک پسینہ پسینہ ہوتا رہا۔

افسوس کہ اِس بار بھی وہی ہوا اور اُسے سمجھ بھی نہیں آیا کہ غلطی کہاں ہوئی ہے؟ سوال اُٹھا کہ ہاتھ میں لرزش ہے، برش کے تاروں کے کنارے ٹیڑھے ہیں یا رنگ کے انتخاب میں خطا کی؟ اُس نے اپنی کن پٹیوں پر انگوٹھوں سے دباؤ ڈالتے ہوئے جواب دیا کہ تینوں باتیں ایک وقت میں ایک ساتھ غلط نہیں ہو سکتیں لیکن سوال بدستور جواب طلب رہا کہ کیوں تیسری دفعہ بھی تین دن بعد پلنگ پر بیٹھ کر دیوار کو دیکھنا مشکل ہو گیا ہے؟ کہیں میرے دماغ میں کچھ اپنی جگہ سے ہل تو نہیں گیا جو مَیں صحیح فیصلہ نہیں کر پا رہا؟ سوچ کی برق کوندی کہ ایک شے ایک دور میں اچھی ہوتی ہے مگر دوسرے زمانے میں بُری قرار پاتی ہے اور میں وقت کی ضرورت نہیں جان سکا جبھی بظاہر بے چینی حصے میں آئی۔ وہ اور بھی کئی سوال خود سے پوچھتا رہا اور جواب دیتا رہا لیکن تسلی بخش جواز ایک نہ ڈھونڈ سکا۔

چوتھی دفعہ اُسے گھر سے نکلنے میں کافی وقت لگا اور وہ اپنے تئیں بہت غور و فکر کے بعد بازار گیا۔ پہلے سے زیادہ بڑی دُکان سے انتہائی قیمتی رنگ خرید لایا جس کی قیمت چکانا اس کے لیے مشکل بھی تھا۔ اِس بار تبدیلی یہ آئی کہ اُس نے دیوانوں کی طرح جٹ جانے کے بجائے ٹھنڈے پانی سے نہا دھو کر دیوار کا اچھی طرح جائزہ لیا جس پر مختلف رنگوں کے پے در پے استعمال سے ایک نیا رنگ نمودار ہو چکا تھا جو بے رنگ تھا لیکن وہ نئے منظر میں کچھ نیا ڈھونڈ نہ سکا اور پوری دل جمعی سے پُرانا عمل دہرانے لگا۔ جب کام ختم کر چکا تو کنکھیوں سے بڑے کینوس کو دیکھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ نیا منظر جو پرانا ہو چکا تھا، ایک اور الجھاوے کے ساتھ اُس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اُس نے دماغ میں جاری جوڑ توڑ روکنے کی بہتیری کوشش کی لیکن آخر ہار کر اُس نے برش دیوار پر دے مارا اور پلنگ پر منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ کب نیند آئی، اُسے پتا بھی نہ چلا۔

صبح اٹھا تو دیوار پر پونچھا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس نے زمین پر زخمی پڑا برش پکڑا اور اِس کے کھردرے، مڑے تڑے، گھسے ہوئے بال کچھ دیر تکتا رہا۔ پھر اِسی شکستہ برش کو مختلف رنگوں کے ڈبوں میں ڈبو ڈبو کر دیوار پر آڑھا ترچھا پھیرنے لگا، کبھی چھینٹے اُڑاتا اور کبھی زور زور سے ضربیں لگاتا۔ اُس نے کئی

دن یہ عمل وقفے وقفے سے جاری رکھا اور جب اُسے محسوس ہوا کہ دیوار پر غبار پر مزید نہیں نکال سکتا تو گھر سے آوارہ گردی کے لیے نکل پڑا۔

بستی بستی خاک چھان کر لوٹا تو دیوار دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں کہ اُس کے لیے پرانے منظر میں نیا چہرہ نمودار ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک اَنجانی مسرت کے ساتھ پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں کہ اَن دیکھے جہاں میں پہنچ جائے لیکن خیال کی وادی میں دیکھے مناظر اُمڈ آئے اور اُسے صحراؤں کے بیچوں بیچ نخلستان، سمندروں میں سانس لیتی مخلوقات، پہاڑوں کے غار اور آبی ڈھلوانیں، سبزے سے ڈھکی چٹانیں، ہری اور پیلی کھیتیاں، نگر نگر میں بھانت بھانت کی بولیاں، کچے پکے مکان، کنکریٹ کے منتظر اونچے نیچے راستے، فضا میں اُڑتے جہاز، نظر کی پکڑ میں نہ آنے والی ریل کی پٹڑیاں اور ٹیڑھی میڑھی سڑکیں، اِن پر دوڑتی، رعب جماتی، چمچماتی گاڑیاں، مال بردار ٹرک اور ٹرالے اور زندگی کا بوجھ ڈھوتے چھکڑے یاد آئے۔ اُس نے لاشعوری رو میں سر اٹھا کر نیلا آسمان دیکھا جسے وہ آوارہ گردی کے دوران میں رات بھر تکتا تھا کہ اِس پر چاند اور ستارے چمکتے تھے۔ کبھی کالی گھٹائیں چھا جاتی تھیں اور کبھی صاف شفاف پس منظر میں طرح طرح کے پرندوں کی اڑان دلکش پیش منظر بن جاتی تھی۔ نیلی چھتری کے سائے میں مختلف اشکال بناتے، ہلکورے کھاتے، پانی کے غبارے لبھاتے تھے لیکن یک رنگ آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے اپنا بیش بہا تحفہ بانٹتے ہوئے دیکھا نہیں جاتا تھا اور اُسے یاد آیا کہ جب ہر طرف سیاہ چادر تن جاتی تھی تو اُس کا جی گھبراتا تھا۔

وہ ایک نئے عزم کے ساتھ بازار میں دُکان دُکان پھر رہا تھا اور رنگ اکٹھے کر رہا تھا۔ اُس نے چھوٹے بڑے برش بھی خریدے اور واپس آ کر پوری دیوار پر سفیدی پھیرنے کا آغاز کیا۔ اُسے کئی بار کوٹ کرنے پڑے تب جا کر پچھلے نشان چھپے، دیوار گوری گوری نظر آنے لگی اور وہ جوش سے بھر گیا۔ اُس نے برش ہاتھ میں پکڑے رنگوں کے ڈبوں کو دیر تک دیکھا جیسے چناؤ کر رہا ہو۔ پھر ایک ڈبے میں ڈبو کر دیوار کے ٹھیک درمیان میں دائرہ بنا دیا جس کی گولائی سنوارنے میں بنانے سے بھی زیادہ محنت کی۔ دائرے کے ساتھ دوسرے رنگ سے ایک چوکور خانہ بنایا جس کے چاروں ضلع مقدار میں برابر اور زاویے قائمہ رکھے اور اِس مربع کے گرد چار متوازی خطوط کھینچ دیے۔ یہ عمل اختتام ہوا تو وہ دائرے اور خانے کو سر پر دایاں ہاتھ رکھے بغور دیکھتا رہا۔ تسلی ہونے پر اُس نے کسی اور رنگ سے چوکور کے کناروں کے ساتھ کنارے جوڑ کر برابر حجم کا مربع بنایا، خطوط بھی کھینچے اور اِسی طرح رنگ بدل بدل کر ایک دوسرے کے ساتھ ملا ملا کر ایک سی لمبائی، چوڑائی کے خانے بناتا رہا، روغنی خطوط کھینچتا رہا، ٹھہر ٹھہر کر دیکھتا رہا۔ جب وہ چھت کے قریب پہنچا تو اُس نے قدرے بڑے خانے نچلوں سے یوں جوڑ کے بنائے کہ بڑوں کی چھوٹوں کے بغیر موجودگی بے معنی معلوم دیتی تھی اور چھوٹوں کا بڑوں کے بغیر حسن ماند پڑتا تھا۔ اس کے بعد وہ دیوار کے

نچلے نصف پر خانے بناتا رہا اور جب فرش کے قریب پہنچا تو مربع جات ایک دوسرے سے یوں جوڑے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود برا معلوم دے۔ پھر اس نے ژرف نگاہی سے دیوار دیکھی، اطمینان سے پلنگ پر لیٹا اور چند لمحوں بعد کمرے میں خراٹے بے سرا الاپ دے رہے تھے۔

اُسے حیرانی ہوئی کہ اِس مرتبہ اُسے تیسرے ہی دن اکتاہٹ کا دورہ کیوں نہیں پڑا؟ لیکن وہ ہر رات سونے سے پہلے ایک دائرے اور چھوٹے بڑے رنگ برنگے خانوں سے سجی دیوار کو دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ یہ فرحت بخش احساس مہینوں اُس کے ساتھ رہا لیکن ایک دن دوبارہ اُس کی انگلیوں میں بے چینی ہونے لگی تو اُس نے برش پکڑا اور دیوار کے سامنے کھڑا سوچتا رہا۔۔۔ دیر تک سوچتا رہا۔ تھک گیا تو پلنگ پر آ بیٹھا لیکن زیادہ دیر ٹِک نہ سکا کہ اُس کی بڑی سی کھوپڑی کی چھوٹی سی کھڑکی پر خیال نے دستک دی اور اُس نے ایک چھوٹا برش لے کر خانوں میں خوب صورت بیل بوٹے اِس اہتمام کے ساتھ بنانے شروع کیے کہ تمام کی خوش نمائی ایک سی ہو۔ اِس عمل میں اُس کے کئی دن صَرف ہوئے تب جا کر جاذبِ نظر نقاشی مکمل ہوئی لیکن جب اس نے پوری دیوار کو تنقیدی نظر سے دیکھا تو اُسے کچھ کمی محسوس ہوئی اور اُس نے چند خانوں میں گُلکاری بڑھا دی۔ اب صرف دائرہ یک رنگ تھا، اِس میں کوئی بیل تھی نہ بوٹا تھا اور یہی بات اسے پریشان کر رہی تھی کہ کیا کرے؟ کبھی خیال آتا کہ اِسے یونہی خالی رہنے دے اور کبھی صدا پڑتی کہ اس میں ایک پیڑ بنائے جس کی شاخیں پھلوں سے جھکی ہوئی ہوں اور ڈالیوں پر طرح طرح کے مہکتے پھول بھی ہوں لیکن وہ جھجکتا رہا اور ڈرتا بھی رہا کہ کہیں کُل محنت چھوٹی سی غلطی سے رائیگاں نہ چلی جائے۔ کئی روز اسی مخمصے میں گزر گئے تو ایک رات اسے نیند میں کیا دکھائی دیا کہ یک رنگ دائرے میں کئی مدور رونما ہو چکے ہیں اور جب بیدار ہوا تو وہ حیران ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں مَلتے ہوئے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہو کر مختلف زاویوں سے جائزہ لیا تو اطمینان اور خوشی کی لہر اندر باہر دوڑ گئی اور اُس نے برش اور رنگ سنبھال کر رکھ دیے۔ اُس نے خود کو یقین دلا دیا کہ اب اِن کی مزید ضرورت نہیں، فن پارہ تخلیق ہو چکا ہے جس میں تنظیم ایسی ہے کہ ہر خانہ دوسرے سے اِس طرح جڑا ہے جیسے ایک بدن کے اعضا، رنگوں کا امتزاج کہ قوسِ قزح کا شائبہ ہوتا ہے اور توازن یوں ہے کہ ایک نکتہ اور ایک چھوٹی سی لکیر بھی سارا حسن غارت کر سکتی ہے۔

اُس دن کو بیتے اک مدت ہو چکی ہے، برش اور رنگ الماری میں پڑے ہیں مگر وہ، جس کے کئی نام ہیں، انھیں کبھی کبھی اچھی طرح دیکھ لیتا ہے کہ کہیں خراب نہ ہو جائیں گو وہ خود کو تسلی دیتا رہتا ہے کہ ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆☆☆☆

طیب عزیز ناسک

ادھورا آدمی

وہ آفس سے گھر آ رہا تھا، اسے محسوس ہوا اس کے بائیک میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ ہائی وے پر تیز رفتار ٹریفک سے بچتے بچاتے اس نے بائیک روک لی اور ٹینکی کو ہلانے لگا۔۔۔ پھر موبائل نکال اس کی روشنی میں اندر جھانک کر دیکھنے لگا۔۔۔ پٹرول تو ہے لیکن کم ہے۔۔۔ وہ صحیح اندازہ نہیں کر پایا اور پھر بائیک پر سوار ہو گیا۔۔۔ تھوڑی دیر میں جب اس نے اگلا اشارہ کراس کیا تو محسوس ہوا جیسے اس کا انجن بہت گرم ہو رہا ہے، اس نے پاؤں سے حرارت کو محسوس کیا۔ اسی اثنا میں اس کی نظر اس دھویں پر پڑی جو اس کی بائیک سے نکل رہا تھا، وہ گاڑیوں کی روشنی میں اس دھویں کو فضا میں پھیلتے دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں میں اشارہ کھل گیا اور وہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ سامنے والی مارکیٹ تک آ گیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ انجن آئل ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بار ہا یاد کرنے پر بھی اسے یاد نہ آیا کہ اس نے آئل کب ڈلوایا تھا۔ اس نے خیال کی جست بھری اور مارکیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔

اسے کچھ چیزیں بھی خریدنی تھیں اس کے ذہن کے پردے پر مختلف اشیا چلنے لگیں۔ وہ مارکیٹ میں داخل ہو گیا۔ اسے لگا جیسے مارکیٹ سے تمام چیزیں غائب ہو گئی ہیں۔ وہ دکانوں کے ناموں اور بڑے بڑے اشتہاروں اور فرنیچر سے دکانوں کا اندازہ کرنے لگا۔ اس نے ایک دکان دار سے پوچھا۔ یہ مارکیٹ چیزوں سے خالی کیوں ہو گئی ہے۔ دکان دار نے اپنی دکان کی طرف دیکھا اور کہا: ”بھائی کیا خریدنا ہے آپ کو؟“

وہ مختلف اشیا کے نام گنوانے لگا۔۔۔ ”آگے جاؤ۔“

اس نے دکان دار کی طرف حیرت سے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

آگے دکانیں تو تھیں لیکن ان میں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ گاہک خالی دکانوں میں مٹر گشت کر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دکان داروں کے پیٹ بیٹھے بیٹھے پھول گئے تھے جس کی وجہ سے وہ دکانوں سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اسے فکر ہونے لگی کہ اشیا نہ ملیں تو کیا ہوگا۔ اسے کئی اشیائے خورونوش اور دیگر ضروریات زندگی یاد آنے لگیں۔ جو صبح آفس جاتے ہوئے اس کی بیوی نے اسے یاد دلائیں تھیں۔ اس نے بیوی کی بتائی ہوئی

چیزوں کو یاد کرتے ہوئے دکانوں کی طرف دوبارہ نظر دوڑائی تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں چیزیں موجود ہیں لیکن گاہک کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ ’’ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟‘‘ اس نے سوچا اور سامنے والی دکان پر جا کر مختلف چیزیں دیکھتا رہا اور پھر جیسے ہی کوئی چیز اٹھانے لگا تو اسے محسوس ہوا یہ تو پتھر ہیں، وہ انھیں پوری قوت سے کھینچنے لگا۔۔۔

’’بھائی کیا چاہیے آپ کو؟‘‘ دکان دار نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

’’گھی، چاول اور آٹا۔‘‘

دکان دار نے اس کی طرف دیکھا۔ ’’بھائی یہ تمھارے لیے نہیں ہیں۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’یہ سب کوئی پہلے خرید چکا ہے، تم کہیں اور جاؤ۔‘‘

’’ایسا کیسے ممکن ہے؟‘‘

ساری دکان ہی کوئی خرید چکا ہے۔

اس نے خیال کی جست بھری تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے گھر کے قریب آچکا ہے۔ وہ بائیک سے اترا اور اس نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔۔۔ لیکن وہاں دروازہ نہیں تھا۔ ’’دروازہ کہاں گیا۔‘‘ اس نے سوچا۔ تھوڑی دیر اپنے دماغ پر بوجھ ڈالنے پر اسے یاد آیا دروازہ دوسری طرف ہے۔ ابھی وہ بائیک سٹارٹ کر ہی رہا تھا کہ اس کی بیوی باہر آ گئی اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ دوبارہ بائیک سے اترتے ہوئے بیوی سے مخاطب ہوا: ’’ابھی تو یہاں کوئی دروازہ موجود نہیں تھا۔‘‘

’’اندر آ جائیں، کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔‘‘

وہ اندر آیا تو بیوی نے سودا سلف کا تقاضا کیا۔ ’’کب تک ایسے چلے گا۔‘‘ بیوی نے کہا۔

’’دکانوں سے چیزیں غائب ہو گئی ہیں، جو چیزیں مل رہی تھیں وہ پتھر ہو گئیں ہیں۔‘‘

بیوی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔۔۔

’’آج بھی پیسوں کا بندوبست نہیں ہوا۔۔۔ آفس والوں نے بھی کچھ نہیں دیا؟‘‘

بیوی اس کی خاموشی کو بھانپ گئی۔۔۔ وہ اپنے بوجھل سر کے ساتھ لیٹ گیا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ آہستہ آہستہ چیزیں گھر سے غائب ہو رہی ہیں۔۔۔ صرف چیزیں ہی نہیں دیواروں سے پلستر اور ایک ایک کر

کی ائیتیں بھی ۔۔۔اور وہ چٹیل میدان میں لیٹا ہوا ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔۔۔اتنے میں اسے ایک خوفناک جھٹکا لگتا ہے۔ زمین پھٹ جاتی ہے اور وہ خود کو ایک گڑے میں موجود پاتا ہے۔۔۔کچھ ہی دیر میں وہ خیال کی تہ لگانے میں کامیاب ہو گیا اور سنا۔۔۔اس کے کمرے کے دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی ہے۔۔۔۔

”خدا کے لیے باہر نکل آؤ ہمارا نہیں تو ان معصوم بچوں کا ہی خیال کر لو۔۔۔بیٹا تیرے سوا ہمارے بڑھاپے کا سہارا کون بنے گا۔۔۔“

مسلسل دستک ہوتی رہتی ہے۔۔۔خیال کی تہ دوبارہ سے کھلتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ آدھے دھڑ کے ساتھ اسی گڑھے سے نکل رہا ہے اس کے قریبی لوگ اس سے خوف کھانے لگے ہیں۔

☆☆☆☆

ابنِ مسافر

نیا دل

بہت آگے یا شاید تھوڑا آگے کی بات ہے۔۔۔

امریکہ، ہاسپٹل، آپریشن تھیٹر۔۔۔

کہانی کے راوی کے مطابق مفتی صاحب کے دل کا آپریشن کامیاب ٹھہرا تھا اور وہ اپنے ملک لوٹ آئے تھے۔ لیکن جب سے آئے تھے پریشان، مضطرب، گم سم اور جز بز سے ہو کر رہ گئے تھے۔ گویا اپنا دل امریکہ میں ہی چھوڑ آئے ہوں۔۔۔ اور یہ سچ بھی تھا۔ ہارٹ ٹرانسپلانٹ سرجری۔۔۔

گویا واقعی وہ اپنا دل محاورتاً نہیں بل کہ حقیقتاً وہیں چھوڑ آئے تھے۔ ان کے دن پریشان اور راتیں بھاری ہو گئیں تھیں۔ آپریشن سے تھوڑا پہلے ڈاکٹرز نے ان سے چند مخصوص روایتی کاغذات پر دستخط لیے تھے۔ دستخط کرتے وقت مفتی صاحب کا ہاتھ باقاعدہ لرز رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹرز کے چہروں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی اور اپنے مریض کے کامیاب آپریشن کے لیے سنجیدگی تھی اور دل میں نیک نیتی بھی۔۔۔

لیکن یہاں ایک الجھن ہے۔ کیوں کہ ایک دوسرے راوی کے مطابق مفتی صاحب نہ تو پریشان تھے، نہ مضطرب اور نہ گم صم یا جز بز۔ بل کہ وہ تو امریکہ سے ہشاش بشاش ہو کر لوٹے تھے اور اِس راوی کے یقینی قیاس کے مطابق مفتی صاحب کے دن کی پریشانی یا راتوں کا بھاری پن شاید آپریشن کے آفٹر شاکس جیسا کچھ تھا۔ اور یہ بھی کہ دستخط کرتے وقت مفتی صاحب کا ہاتھ کچھ عرصہ سے طاری ہو رہے رعشہ کی وجہ سے لرز رہا تھا۔ اسے کسی اور بات پر محمول نہ کیا جائے۔ راوی کا والہانہ اصرار تھا۔

خیر کہانی کے پہلے راوی کے بیانات کی روشنی میں آپریشن سے پہلے اور دستخط کرنے کے بعد مفتی صاحب نہ جانے کیا کچھ سوچتے رہے تھے۔ اُن پر عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی۔ شاید ہر مریض کچھ ایسی ہی صورتحال سے گزرتا ہو گا۔ لیکن مفتی صاحب کے لیے یہ صورتحال شاید دوسروں سے کچھ الگ اور اپنے آپ میں انوکھی بل کہ انتہائی خوفناک تھی۔۔۔

وہ اندر ہی اندر شاید کانپ رہے تھے؟ اور نہ جانے کیا کچھ سوچ رہے تھے۔۔۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ دل بدل جانے سے کیا وہ بھی بدل جائیں گے؟ ان کی سوچیں، باتیں، احساسات، جذبات؟

کیا جو کچھ خدا کے راستے پر ان کے دل نے کمایا وہ بھی دل کے ساتھ ہی چلا جائے گا؟ دل تو خدا کا گھر ہوتا ہے، تو کیا خدا اس نئے دل میں بھی ویسے ہی قیام کرے گا جیسے ابھی اِس پہلے دل میں ڈیرہ ڈالے

ہوئے ہے؟

اچھا تو مفتی صاحب یہ سوچ رہے تھے۔۔۔؟

لیکن یہاں بھی ایک الجھن ہے کیوں کہ ایک تیسرے راوی کے مطابق شاید ایسا نہیں تھا۔ یہ بچگانہ سوچیں مفتی صاحب کی پریشانی کی وجہ ہرگز نہیں ہوسکتی تھیں۔۔۔ بل کہ وہ تو پریشان تھے ہی نہیں۔ اور یہ اندر ہی اندر کانپنے والی بات تو سراسر قیاس آرائی ہے۔ گھبراہٹ اور خوف نا کی کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔

اس دوسری الجھن سے قطع نظر اور پہلے راوی کے بیان کی روشنی میں آگے بڑھتے رہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مفتی صاحب آپریشن سے پہلے اندر ہی اندر خود کو کوس بھی رہے تھے۔۔۔ یا پھر شاید اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔

لیکن اب اس دل کو اطمینان سے بھرنے کا کیا فائدہ۔ دل تو جانے والا تھا۔ اور اس کی جگہ ایک نیا دل آنے والا تھا۔۔۔

مفتی صاحب ابھی چالیس کے پیٹے میں تھے لیکن نہ جانے کیوں اُن کا دل دغا دے گیا تھا اور سینے سے جانے کو تھا۔۔۔ وہ دل کو تھامے اپنے نئے دل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔۔۔ پریشان، مضطرب، گم صم اور جز بز سے ہو کر۔

یہاں دوسرے راوی کے پہلے بیان یا اعتراض کو مدنظر رکھتے ہوئے پریشانی، اضطراب اور مفتی صاحب کے گم صم یا جز بز ہونے کا مکرر بیان راقم کو بھی کھٹک رہا ہے۔۔۔

بہر حال مفتی صاحب کو فیصلہ لینا پڑا تھا۔ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ آپریشن کا بر وقت ہونا انتہائی ضروری تھا۔ ورنہ زندگی ہی ہاتھ سے چلی جاتی جب کہ ابھی تو صرف دل سے ہاتھ دھونا پڑ رہے تھے۔۔۔ لیکن بدلے میں ایک نیا دل بھی تو مل رہا تھا۔۔۔ اُن کی ہر طرح کی دنیوی بہتری اب اسی میں تھی۔۔۔

یہاں بھی تیسرے راوی کو اعتراض ہے۔ اُس کے قیاس بل کہ یقین کے مطابق مفتی صاحب کا دنیوی بہتری سے کیا کام؟ اور مفتی صاحب کو یوں بیچارہ اور مجبور بنا کر پیش کرنا قابلِ اعتراض بل کہ سراسر زیادتی کے مترادف ہے۔۔۔ کیوں کہ مفتی صاحب کو صورتحال کا مکمل ادراک تھا۔۔۔

تیسرے راوی کی نکتہ چینی سے قطع نظر۔۔۔ مفتی صاحب یہ تو کہتے آئے تھے کہ زندگی تو آنی جانی چیز ہے۔۔۔ پر اب وہ خود کو یہ کہہ کر پرسکون کیسے کر سکتے تھے کہ دل تو آنی جانی چیز ہے؟ کیوں کہ ان کا دل محاورتاً نہیں بل کہ حقیقتاً جا رہا تھا۔ اور اُس کی جگہ ایک نیا دل آ رہا تھا جس کے بارے میں مفتی صاحب کی سوچ عجیب وغریب پلٹنیاں کھائے جا رہی تھی۔

جو بھی تھا بس انھی کو پتہ تھا۔۔۔

اور وہ کسی بھی طرح کسی اور کو پتہ چلنے بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔۔۔

یہ راز ان کے دل میں ہی دفن رہنا تھا اور ان کا دل اس راز کی قبر بنے صفحہ باطن سے مٹنے کو تھا۔۔۔
اور جلد ہی مٹ گیا۔۔۔

وہ وطن واپس لوٹ آئے، لیکن آپریشن کے بعد کی اُن کی حالت، وہی آپریشن سے پہلے اور دستخط کے بعد والی حالت جیسی ہی تھی۔۔۔ اگرچہ اب وہ صحت مند تھے۔ ان کے سینے میں ایک نیا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنی دھڑکنوں کو سننے کی کوشش کرتے۔۔۔ نہ جانے کیوں؟

ان کا خیال ہمہ وقت اُس نئے دل کی طرف رہتا۔۔۔ تلاوت، عبادت، وعظ، ذکر اذکار اور فتوی نویسی۔۔۔ دل، دل اور بس دل۔۔۔

وہ رات کو اپنے بستر پر دراز، سناٹے میں دل کی دھڑکنوں کو سنتے۔ جیسے پہلے والے دل کی دھڑکنوں سے مماثلت کا کوئی احساس اجاگر کرنا چاہتے ہوں۔۔۔

دوسرے اور تیسرے راوی کو ان قیاس آرائیوں بل کہ مبالغہ آرائیوں پر پھر سے سخت اعتراض ہے۔ دوسرا راوی جیسا کہ پہلے بھی بیان کر چکا ہے کہ مفتی صاحب وہاں سے آنے کے بعد بالکل ہشاش بشاش تھے۔ بل کہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر انداز میں معاملات مسند میں مشغول ہو گئے تھے۔ آپریشن کے آفٹر شاکس پر اس طرح کی قیاس آرائیاں موجب شرم ہونی چاہیے۔۔۔

چلیں اگر دوسرے اور تیسرے راوی سے اتفاق کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا جائے تو مفتی صاحب کو اپنے اندر کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ پہلے والے مفتی صاحب ہی تھے۔ گویا کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ دل بھی نہیں۔۔۔ لیکن سچ تو یہی تھا کہ ان کے سینے میں ایک نیا دل تھا لیکن اِس نئے دل نے ان کے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ وہ اپنا دھیان اپنے اِس نئے دل سے ہٹا ہی نہیں پاتے تھے۔

دستخط سے پہلے انھوں نے سوچا تھا کہ انکار کر دیں۔۔۔ ایسا ہرگز نہ ہونے دیں۔۔۔

لیکن وقت کی نزاکت کے آگے انھیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ اور کوئی میچ (match) بھی تو دستیاب نہیں تھا۔ اور اس سے بہتر تو بالکل بھی نہیں تھا۔۔۔ ویسے بھی اب یہ سب کچھ ایک عام سی بات تھی۔۔۔ ایک دن کی دیر بھی اُن کی زندگی کا چراغ گُل کر سکتی تھی۔۔۔

انھوں نے وہ سب کچھ سوچا جو ان کے حساب سے ضروری تھا لیکن اُس سے بھی بڑھ کر کچھ تھا۔۔۔ جس کی وجہ سے وہ اس ناگزیر فیصلے کو کرنے سے کترا رہے تھے۔۔۔ انھیں شاید ماضی قریب کے کچھ فتاوی یاد آ رہے تھے۔۔۔

آخر ایمان بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟ ہوتی ہے کہ نہیں؟

لیکن جان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے؟ جان بچانے کے لیے تو حرام کھانا بھی جائز ہے۔۔۔ اور ویسے بھی کھانے اور لگوانے میں فرق ہوتا ہے۔۔۔

پھر بھی مفتی صاحب کے لیے یہ آسان نہیں تھا۔ ان پہ کیا گزر رہی تھی یہ وہ جانتے تھے یا ان کا خدا۔۔۔

لیکن ان کا خدا تو ان کی مجبوری سے بھی واقف تھا۔۔۔ کوئی چارہ بھی تو نہیں رہ گیا تھا۔۔۔ انھیں دستخط کرنے پڑے۔ اور پھر ان کا دل ایک نئے دل سے بدل گیا۔۔۔

مفتی صاحب اپنے پرانے دل کو بہت یاد کرتے اور نہ جانے کیا کچھ سوچتے رہتے۔۔۔

کئی بار اُن کے پرانے دل نے چاہا کہ وہ اپنا سینہ چیر کے اِس نئے والے دل کو نکال پھینکیں۔ لیکن یہ سب مفتی صاحب کا وہم تھا۔ بھلا ان کا پرانا دل اب کچھ بھی کیسے چاہ سکتا تھا۔۔۔

کئی بار انھوں نے سوچا کہ وہ کسی سے اپنی اس پریشانی کو بانٹیں۔۔۔ تاکہ ان کا دل ہلکا ہو۔۔۔

دوسرے اور تیسرے راوی کے آفٹر شاکس والی تھیوری اور اصرار و اعتراضات کو اسی طرح مسلسل نظر انداز کرتے ہوئے کہانی کو چلنے دیں تو پتہ چلتا ہے کہ معاملہ تھا ہی کچھ ایسا کہ مفتی صاحب کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ آخر ان کی پریشانی کی حقیقی وجہ کیا ہے۔۔۔ کون جانتا تھا کہ وہ امریکہ کس لیے گئے تھے۔۔۔ وہ یہ تو بتا سکتے تھے کہ وہ اپنے اِس نئے دل کے باعث اس قدر تکلیف دہ ذہنی الجھنوں میں گرفتار ہیں لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ یہ نیا دل آخر ہے کس کا؟

کیوں کہ یہ نیا دل جس کا بھی تھا اُس کا نام تک لینا مفتی صاحب کے لیے گناہِ کبیرہ سے کم نہیں تھا اگرچہ اُن کی زندگی اور اُن کا وجود اب اُسی دل کے مرہونِ منت تھا۔۔۔

تینوں راویوں کے متضاد نوعیت کے بیانات کی روشنی یہاں ختم ہوتی ہے۔۔۔ اس سے آگے راقم کے قیاس کے مطابق کہانی کچھ یوں ہے:

کیسا وقت آ گیا ہے؟ یہ وقت بھی آنا تھا دنیا میں۔۔۔ استغفراللہ؟ مفتی صاحب اکثر سوچتے۔۔۔

اس سے اچھا تھا کہ قیامت آ جاتی۔۔۔ بے شک۔۔۔ قیامت تو آئی تھی لیکن مفتی صاحب پر۔۔۔ اور یہ قیامت اُن کی آخری سانس تک ٹلنے والی نہیں تھی۔۔۔

اب اُن کے پاس کسی اور دل کا کوئی آپشن نہیں تھا۔۔۔ گویا وہ کسی نئے دل کے لگوانے کے حوالے سے بانجھ ہو چکے تھے۔۔۔ اور اس سے بہتر، سستا اور گارنٹڈ حل موجود ہی نہیں تھا اور اب تو دنیا بھر کے صارفین کے لیے یہ ایک عام سی بات تھی اور انتہائی ضروری بھی بلکہ لازمی۔۔۔

ڈاکٹرز نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب اگر وہ جئیں گے تو اسی دل کے ساتھ جو ان کے سینے میں ایسا فِٹ آیا تھا گویا قدرت نے انھی کے لیے یہ دل کسی اور کے سینے میں رکھا تھا۔۔۔ کسی ایسے حیوانی وجود کے سینے میں جس کا نام لینے سے بھی مفتی صاحب اور ان کی قوم کی زبان پلید ہوتی تھی۔۔۔

☆☆☆☆

شاہ نواز

ادھوری داستاں

داستان گوہ کے مطابق یہ کہانی آریوں کہ ہندستاں پر حکومت کرنے کے ابتدائی زمانے کی ہے۔ اِس وقت بنگال پر ایک کھشتری راجہ حکومت کرتا تھا۔ راجہ کی بیوی برہمن تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کھشتری راجہ نے مہذب اور نیک برہمن گورو کی جان بچائی جس سے خوش ہو کر گورو نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی جو ایسی خوبصورت کہ جس کی مثال نہ تھی۔ بنگال کے راجہ سے بیاہ دی۔ یوں قسمت نے ہندوستان کے بہادر راجہ اور خوبصورت ترین عورت کو ایک چھت تلے اکٹھا کر دیا۔

ان کا پیدا ہونے والا راج کمار ہندوستان کا سب سے خوش قسمت شہزادہ تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرح سروقد، مسکراتا چہرہ، غزالی آنکھیں، لمبی پلکیں، باپ جیسا مضبوط جسم، دہشت ناک آواز اور مردانہ وجاہت کا حامل تھا۔ ان خصوصیات نے اسے ایسا بنا دیا کہ دیوتا بھی آسمان پر اس سے رشک کرتے۔ اگر کسی کی نظر اس پر پڑھتی تو وہ اس کے سحر سے بچ نہ پاتا۔ راج کمار کو رعایا دل سے پسند کرتی، جس کی بڑی وجہ راج کمار کا حسن نہیں اس کی بہادری تھا۔ راج کمار نے کئی راکھشسوں کو مارا اس کے مقابلے میں شیر کے سر والے، پرندوں کی طرح اُڑنے اور منہ سے آگ نکالنے والے متعدد ہاتھوں اور سروں والے راکھشس آئے، مگر کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ راکھشسوں سے رعایا کو محفوظ رکھنا کھشتریوں کا شوق ہی نہیں فرض بھی تھا۔

ان ہی دنوں بنگال کے جنگلوں اور دلدلی علاقوں میں ایک اور دنیا آباد تھی۔ راکھشسوں کی دنیا۔ اُن کے کئی قبائل تھے۔ جو اپنی طاقت، بربریت اور خباثت کی وجہ سے ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان قبائل میں سب سے خبیس، خوں خوار، خطرناک اور طاقت ور ناگ قبیلہ تھا۔ سب ہی راکھشس قبائل اس کی عظمت کا دم بھرتے تھے۔ ناگ راجہ گویا اُس اندھیری دنیا کا مہاراجہ تھا۔ یہ پلید مخلوق انسانوں کو مسلسل اپنے ظلم وستم کا نشانا بنائے رکھتی جس سے اِس کی طاقت اور بڑتی رہتی۔

جب سے راج کمار جوان ہوا اس نے اتنے راکھشس مارے کہ اب راکھشس انسان کی دنیا میں جانے سے گھبراتے تھے۔ اُن کے راجاؤں نے اپنے بہترین سورما راج کمار کی سرکوبی کے لیے بھیجے مگر ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ ان ہی دنوں راکھشسوں میں یہ خبر عام ہو گئی، کہ اب راج کمار اندھیری دنیا میں داخل ہو کر سب راکھشسوں کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ سب راکھشس ناگ راج کے پاس آئے اور اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی درخواست کی۔ سبھی راکھشس اور خود ناگ راج جانتا تھا کہ اس مسئلے کا واحد حل اُس

کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ناگ راج کماری ایسی اپسرا کہ جسے دیکھ کر بڑے بڑے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں، ایسا چمکتا چہرہ کہ چاند بھی شرمندہ ہو جائے، نسوانیت سے بھرپور جسم کے ساتھ طاقت ایسی کہ بڑی سے بڑی چٹان ایک ہی وار میں ریزہ ریزہ کر دے۔ راکھشسوں نے راج کماری کو جشن کہ بعد راج کمار کو قتل کرنے کہ لیے رُخصت کیا۔

ناگ راج کماری بنگال کے محل میں ہمالیہ کی شہزادی بن کر داخل ہوئی۔ جب رات گہری ہوئی تو وہ سانپ کے روپ میں با آسانی راج کمار کہ کمرے تک پہنچ گئی۔ راج کمار اپنے بستر پر بے خبر کھڑکی سے آنے والی چاند کی روشنی میں پڑا تھا۔ وہ رینگتی ہوئی اُس کے چہرے کے بالکل سامنے آئی۔ اِس سے پہلے کہ وہ اُس کی شہ رگ میں اپنا زہر اُنڈیلتی راج کمار کے حسن و جمال اور وجاہت کا تیر اُس کہ دِل کو زخمی کر چکا تھا۔ وہ خاموشی سے واپس آ گئی اور محل میں مہمان کہ طور پر رہنے لگی۔ وہ سارا دن ہرن کے بچے کی مانند ہنستی کھیلتی محل کے ایک کونے سے دوسرے کونے جاتی اگر راج کمار کبھی اُسے پکارتا وہ لاکھ کوششوں کے باوجود نظریں نہ اُٹھا سکتی۔ راج کمار راستہ روکتا وہ بت بنے مسکراتے ہوئے زمین کو گورتی رہتی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ راج کمار کو بھی ہمالیہ کی شہزادی کے حسن نے ڈس لیا تھا۔ چند دِنوں میں دونوں ایک دوسرے کو دِل و جان سے چاہنے لگے۔ اُن کے عشق کو شادی کے بندھن میں باندھنے کے لیے دن طے ہو گئے۔ راج کماری نے اپنے دل میں وعدہ کیا کہ اگر راج کمار کو اُس کی حقیقت پتہ چلی تو وہ چپ چاپ اپنی جان اس کے حوالے کر دے گی۔ جہاں اس خبر نے پوری راج دھانی میں دیوالی کا سما بنایا ہوا تھا وہیں اندھیر نگری اس کی تپش سے جلس رہی تھی۔ ناگ راج نے اپنے شاطر ترین وزیر کو راج کماری اور راج کمار کو سبق سکھانے کے لیے روانہ کر دیا۔

شادی والے دن دونوں محبت کرنے والے بہت پر جوش تھے۔ راج کمار سارا دن راج کماری کے وصل کے خیالوں سے معمور دل کے ساتھ مسکراتے لبوں سے مہمانوں کو ملتا اُن کا شکریہ ادا کرتے نہ تھکتا۔ جب جوڑے کو سونے چاندی اور ریشم سے مزین تخت پر بٹھایا گیا تو لوگوں کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا، کہ کون کس سے بہتر ہے۔ گویا دنیا کی ساری خوبصورتی، شرافت اور پیار دو آنکھوں کے سامنے تھا۔ شام پڑتے ہی رسم کے مطابق راج کماری کو گھونگھٹ میں چھپا کر راج کمار کے کمرے تک پہنچا دیا گیا۔ اب راج کمار کے لیے ایک ایک لحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے میں شاطر راکھشس وزیر مہمان کے روپ میں راج کمار کے گلے لگا اور ثبوت کے ساتھ راج کماری کا راز راج کمار پر کھول دیا۔

مضبوط قدم ڈگمگائے۔ راج کمار اپنا وزن برداشت نہ کر سکا اور دھڑم سے تخت پر بیٹھ گیا۔ اُس کا برہمنوں جیسا پاک، مہذب اور نرم دل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ شاطر راکھشس وزیر راج کماری کے پاس آیا اور اُسے بتایا کہ راج کمار تمھاری اصلیت سے واقف ہو گیا ہے۔ اب یہاں سے بھاگو یا اپنے دشمن کو ختم کر دو یا پھر موت کا انتظار کرو میں تو چلا۔ یہ کہتے ہی وہ وہاں سے غائب ہو گیا۔ راج کمار نے ایک نظر محل پر ڈالی اور دل

میں خیال کیا کہ وہ تو ایک راج کمار ہے۔ کمزوری اُس کے لیے پاپ ہے۔ اُس کی رگوں میں ایک کھشتری کا خون ہے۔ ایسے وقت میں اُسے اُس کی وحشت اور درندگی نے سہارا دیا۔ وہ تخت سے اٹھا اور دنیا کی سب سے خبیس اپسرا یا پھر اپنی محبوبہ کی طرف بڑھا۔ اُس کے ذہن میں دو ہی نتائج تھے، ایک اس راکھشس سے دھرتی کو پاک کر دوں یا پھر سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے، محبت کرنے والی بیوی کی آغوش سے محبتیں سمیٹوں۔ گویا ایک جنگ تھی جو محبت اور فرض یا پھر نفرت کے درمیاں جاری تھی-----

دوسری طرف ہمالیہ کی شہزادی کے بھیس میں ایک خبیس ناگن، قابلِ نفرت راکھشس تھی۔ وہ جس کی فطرت میں وحشت اور درندگی تھی۔ جس نے جنگلوں کے اندھیروں سے جہالت کو ہی سیکھا تھا۔ عجیب بات تھی اُس نے نہ جانے کیسے اپنے خبیس جذبات کو محبت کی چنگاری سے راکھ کیا۔ وہ حیوان بہ یک وقت نفرت اور محبت میں سے ایک ہی جذبہ رکھ سکتی تھی۔ وہ دبے قدموں کی چاپ سن رہی تھی۔ ابھی دروازہ کھلنے والا تھا۔ اُس کا معصوم دل تیز بہت تیز دھڑک رہا تھا----

اِس سے پہلے کہ داستان گو وہ کہانی کا اختتام سناتا کہتے ہیں ایک سانپ نے اُسے ڈس لیا اور وہ داستان کا اختتام سنانے سے پہلے ہی مر گیا۔ وہ مرنے سے پہلے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اُس کے تھرتھراتے ہونٹوں سے لوگوں نے جو نتائج نکالے وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

میں نے بہت کوشش کی مگر میں داستان کا واحد اختتام نہ لکھ سکا۔ یاد رکھنا۔ اِس کا اختتام اِن ہی دو باتوں میں ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ راج کمار نے فرض کو سامنے رکھا اور راج کماری کو قتل کر دیا یا پھر اُس نے اپنی محبت کہ آگے فرض کی بھینٹ چڑھا دی۔ ہر دو صورتوں میں ناگ راج کماری سہاگ کے پلنگ پر اپنی آنکھیں بند کیے راج کمار کا انتظار کر رہی ہے----!

☆☆☆☆

چنوا ایش بے
انگریزی سے ترجمہ: محمود احمد قاضی

فوق مافوق

جولیئس آبی اپنے ٹائپ رائٹر کو گھور رہا تھا، موٹا چیف کلرک جو کہ اس کا باس تھا، اپنی میز کے پاس بیٹھا خراٹے لے رہا تھا۔ گیٹ کیپر جس نے کہ سبز وردی پہن رکھی تھی باہر اپنی جگہ پر سو رہا تھا۔ لیکن آپ اس پر کوئی الزام نہیں دھر سکتے کہ تقریباً ایک ہفتے سے کسی ملاقاتی کا گزر اس دروازے سے نہیں ہوا تھا۔ وزن کرنے والی دیوہیکل مشین پر ایک خالی ٹوکری پڑی تھی۔ مشین کے گرد چند پام گیری پودے اداسی میں لیٹے پڑے تھے، وہاں صرف مکھیوں کی حکومت تھی۔

جولیئس اس کھڑکی کی طرف آیا جو نائیجر دریا کے کنارے پر موجود بڑی مارکیٹ کی نگرانی کرتی نظر آتی تھی۔ اگر چہ یہ قصبہ جو آبادی کی بڑھوتری اور پھیلاؤ کی وجہ سے ایک بڑی پام آئل بندرگاہ میں تبدیل ہوتے ہوئے ایک، آئے اور آفو تک بڑھ آیا تھا، ابھی تک اس کی یہ مارکیٹ نکووہی کہلاتی تھی، تاہم اپنی حد سے تجاوز کرنے کے باوجود یہ اپنے اصل نکوودن کے موقع پر اب بھی مصروف ترین ہی تھی کیوں کہ وہ دیوی جو قدیم زمانے سے اس کی ہم جلیس تھی وہ اپنے خاص دن پر اب بھی اس پر سحر طاری کیے رکھتی تھی تا کہ لوگ اس کے لوبھ میں پھلتے پھولتے رہیں۔ ایک کہاوت کے مطابق وہ مرغے کی بانگ سے کچھ ہی دیر پہلے مارکیٹ کے مرکز میں ایک بوڑھی عورت کے روپ میں ظاہر ہوتی تھی اور وہ کافی فاصلوں پر رہنے والے مردوں اور عورتوں کو مارکیٹ میں لانے کے لیے اپنے جادوئی پنکھے کو اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے زمین کے چاروں اطراف میں لہراتی تھی اور وہ لوگ اپنی زمینوں کی پیداوار، پام آئل اور مغزیات، کولا، اخروٹ، کیساوا، چٹائیاں، ٹوکریاں اور مٹی کے برتن اپنے ساتھ لاتے تھے اور اپنے گھروں میں بہت سے رنگین کپڑے، دھواں رنگ مچھلیاں، لوہے کے برتن اور پلیٹیں لے جاتے تھے۔ یہ جنگلوں میں رہنے والے لوگ تھے، دوسری آدھی دنیا جو عظیم دریاؤں کے کناروں پر آباد تھی وہ بھی ڈونگا کشتی میں آتی تھی اور اپنے ساتھ دھاگہ اور مچھلی لاتی تھی۔ بعض اوقات یہ ایک بڑی ڈونگا کشتی ہوتی تھی جس میں کہ ایک یا ایک درجن سے زیادہ لوگ ہوتے تھے اور بعض اوقات تیز بہاؤ والے انیم بارا کے ذریعے ایک چھوٹی کشتی میں اپنی بیوی کے ساتھ آنے والا کوئی اکیلا مچھیرا ہوتا تھا۔ وہ اپنی ڈونگا کشتی کنارے پر لنگر انداز کرتے اور خاص سودے بازی کے بعد اپنی مچھلی بیچتے۔ تب ان کی عورت دریا کے ڈھلوانی کنارے سے چل کر تیل اور نمک خریدنے کے لیے مارکیٹ کے وسط میں چلی آتی اور

اگر اس کا مال بہت اچھا بک گیا ہوتا تو تب وہ بہر حال تھوڑا سا کپڑا بھی لے لیتی اور گھر پر موجود اپنے بچوں کے لیے بین کیک اور مائی مائی خریدتی جو کہ اِگارا عورتوں نے تیار کیے ہوئے تھے۔ شام ہونے پر وہ دوبارہ اپنے پتوار پکڑتے اور غروب آفتاب کی روشنی میں ٹمٹماتے پانی میں کشتی کھینچنے لگتے اور ان کی ڈونگا کشتی دور جاتی ہوئی مختصر سے مختصر ہو کر پانی کی سطح پر ایک کالے چاند جیسی شکل اختیار کر جاتی اور اس میں سوار کالے جسم آگے پیچھے ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگتے۔ تب جنگل کے لوگوں کے لیے جو اگبو کہلاتے تھے اموروں کے ملنے کی جگہ ہوتی اور وہ اجنبی دریائی لوگ جنھیں اگبو لوگ اولو کہتے تھے ان کے آگے دنیا لامتناہی انداز میں پھیلی ہوئی تھی۔

جولیئس آبی امورو کا مقامی نہیں تھا۔ وہ دوسرے ان گنت لوگوں کی طرح ملک کے کسی دوسرے جھاڑ گاؤں سے آیا ہوا تھا، وہ ایک مشن اسکول سے چھٹے درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس طاقتور ترین یورپی ٹریڈنگ کمپنی کے دفاتر میں کلرک کے طور پر کام کرنے کے لیے امورو آیا ہوا تھا، جو پام گری کو خود اپنی طے کردہ قیمت پر خریدتی تھی اور کپڑا اور دھات کے برتن بھی اسی طرح اپنی من مرضی کی قیمت پر بیچتی تھی۔ یہ دفاتر اس مشہور مارکیٹ کے پہلو میں واقع تھے، اس لیے جولیئس کو اپنے پہلے دو یا تین ہفتوں میں اس کے خاص پیچ و تاب کھاتی جھنجھناہٹ میں گھرے ہوئے ماحول میں اپنے کام کو سیکھنا تھا۔ بعض اوقات جب چیف کلرک موجود نہ ہوتا تو وہ کھڑکی کی طرف آ جاتا اور جھک کر اس وسیع، ملکوڑا سرگرمی کو دیکھنے لگتا۔ وہ سوچتا، بہت سے لوگ کل یہاں موجود نہیں تھے پھر بھی مارکیٹ بھری ہوئی لگتی تھی۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو کہ اس طرح روز بروز اس کو مزید بھرنے کے لیے ادھر آنے والے تھے۔ بے شک ایک کہاوت کے مطابق وہ سارے لوگ جو یہاں ادھر اس عظیم مارکیٹ میں آتے تھے اپنا حقیقی وجود نہیں رکھتے تھے۔ جیٹ کی اماں، ماں نے ایسا کہا تھا۔

”خوبصورت عورتوں میں سے چند ایک جو ہجوم میں سے اپنا راستہ بنا رہی ہوتی ہیں وہ میری اور تمھاری طرح کے لوگ نہیں ہیں لیکن ہاں قیمتی ووتا لوگ ضرور ہیں جو کہ دریا کی گہرائیوں کے قریب موجود بستی میں رہتے ہیں۔“ اس نے کہا: ”تم ہمیشہ ایسا کہہ سکتے ہو کیوں کہ وہ ایسی خوبصورتی کے حوالے سے خوبصورت ہیں جو کہ بے عیب بھی ہے اور بے پردہ بھی۔ تم اپنی آنکھ کے پچھلے حصے سے ایسی کسی عورت کی جھلک دیکھ سکتے ہو، پر تم پلک جھپکتے ہوئے زیادہ مناسب طریقے سے بھی اسے دیکھ سکتے ہو لیکن وہ تو اس سے پہلے ہی ہجوم میں کہیں گم ہو چکی ہوگی۔“

جولیئس اس وقت کھڑکی کے قریب کھڑا خاموش اور خالی مارکیٹ کی طرف دیکھتا ہوا، ایسی ہی چیزوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کس کو یقین تھا کہ ایسی پرشور مارکیٹ، کبھی یوں ٹھنڈی بھی پڑ سکتی تھی؟ لیکن ایسی طاقت تو صرف کیتک پا کے پاس تھی جو چیچک کی طاقت کا مجسمہ تھا۔ صرف وہی تھا، جو لوگوں کو یہاں سے دھکیل کر باہر کر سکتا تھا اور اس مارکیٹ کو مکھیوں کے سپرد کر سکتا تھا۔

جب امورو، ابھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، تب ایک عمر رسیدہ شخص ہوا کرتا تھا جو گودن کے موقع پر مارکیٹ کے ہر ہر حصے کی صفائی کیا کرتا تھا لیکن ترقی نے اسے ایک غیر مملوکہ زمین اور لوگوں کے ہجوم سے بھری، چپت پڑی ہوئی اور ایک گندی معروف ترین دریائی بندرگاہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ جو اب زمین کے کے بیٹوں سے کہیں زیادہ لاتعداد اجنبیوں سے بھری پڑی تھی وہ زمین کے بیٹے، جو سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اپنی عبادت سے مجموعی طور پر انحراف کرتے ہوئے اپنے سروں کو ہلاتے جائیں۔ لیکن بے شک انھوں نے (اور اس کے لیے ان پر کون الزام دھرے گا) اپنے لیے بستی کے پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کی دعا ضرور کی تھی اور اس نے ترقی کر لی تھی لیکن ایک اچھی ترقی ہوتی ہے اور ایک بری۔ صرف شراب اور غذا سے ہی توند نہیں بڑھتی یہ ایک گندی بیماری کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے جو اس تکلیف میں مبتلا شخص کو گھر بدر کر کے ختم کی جا سکتی ہے حتیٰ کہ وہ ابھی مکمل طور پر مرا ہوا بھی نہ ہو۔

جو اجنبی امورو میں در آئے تھے وہ یہاں کسی قسم کے فرائض منصبی کی تلاش میں، جو کہ خود ان کے اپنے گاؤں میں (جو کہ ان کا گھر تھا) میں بھی وافر موجود تھے، نہیں آئے تھے بل کہ وہ یہاں دولت کے حصول اور تجارت کی غرض سے آئے تھے۔

کیوں کہ یہ کوئی اطمینان بخش بات نہ تھی اس لیے امورو مٹی کے جنے نوجوان بیٹے بیٹیاں جو اسکولوں اور گرجوں سے ترغیب پاتے تھے، ان کا سلوک، ان سے اجنبیوں سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے پہلے کے سارے سبق بھلا کر، ان سے صرف اپنی رقابت نبھا رہے تھے۔

تب بستی کی ایسی ہی حالت تھی جب کتک پا رے دیکھنا ور یہاں کے رہنے والوں سے جو زمینی دیوتاؤں کے مقروض و ممنون تھے، قربانی کا مطالبہ کرنے آیا تھا وہ یہاں کے لوگوں کے اوپر چھائی اپنی دہشت کے علم کے بھروسے پر یہاں آیا تھا۔ وہ بدی کا دیوتا تھا اور شیخی بگھارتا تھا۔ بقول اس کے جن کو اس نے مارا تھا کوئی تکلیف نہیں تھی کیوں کہ وہ مارے نہیں گئے تھے بل کہ وہ تو معزز بنا دیے گئے تھے اور اسی لیے کسی نے ان کے لیے رونے کی جرات نہیں کی تھی۔ اس نے دیہات کے درمیان اور پڑوسیوں کے آپس میں آنے جانے کا خاتمہ کر دیا۔ کسی نے کہا: ''کتک پا اس گاؤں میں موجود ہے۔'' اور فوری طور پر اس کا اپنے پڑوسیوں سے قطع تعلق ہو گیا۔

جولیئس غمگین اور منتظر تھا، کیوں جینٹ یعنی وہ لڑکی، جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا، اسے اس نے تقریباً ایک ہفتے سے نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے اسے بڑی نرمی کے ساتھ بتایا تھا کہ اسے ان لوگوں سے ملنے ابھی نہیں جانا چاہیے تا آں کہ یہوہ کی طاقت کے ذریعے یہ چیز ختم نہ ہو جائے۔'' (ماں ایک نو معتقد پارسائی عیسائی تھی اور وہ واحد وجہ جس کی بنا پر اس نے اپنی اکلوتی لڑکی کو جولیئس سے منسوب ہونے کی اجازت دی تھی وہ یہ تھی کہ وہ سی ایم ایس چرچ کے گانے والے طائفے میں شامل تھا)

“تمھیں خود کو اپنے اندر تک محدود رکھنا چاہیے۔” اس نے رازدانہ لہجے میں کہا کیوں کہ کیتک پانچتی سے شور اور اودھم کی مخالفت کرتا ہے۔ تمھیں نہیں معلوم کہ باہر تمھاری کس سے ملاقات ہو جائے۔ خاندان والوں کو معلوم ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی آواز اور دھیمی کر لی اور اس مکان کی طرف، پراسرار انداز میں اشارہ کیا، جو سڑک کی پرلی طرف واقع تھا اور جس کا دروازہ تاڑ کے زرد پتوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ “اس نے پہلے ہی ان میں سے ایک کو سجایا ہوا ہے اور جو باقی کے تھے وہ آج ایک بڑی حکومتی لاری میں یہاں سے کوچ کر گئے تھے۔”

جینٹ نے مختصر سے راستے کو جولیئس کے ساتھ طے کیا اور رک گئی تو وہ بھی رک گیا۔ لگتا تھا کہ ان کے پاس ایک دوسرے کو کہنے کے لیے کچھ نہ تھا تبھی وہ پس و پیش کر رہے تھے۔ تب لڑکی نے خدا حافظ کہا اور اس نے بھی خدا حافظ کہہ دیا اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ انھوں نے آپس میں ہاتھ ملائے بغیر جیسے کہ رات بھر کے لیے ان کا جدا ہونا کوئی نیا اور سنگین مسئلہ تھا۔

وہ سیدھا گھر کی طرف نہیں گیا کیوں کہ وہ نہایت مایوسانہ انداز میں اس عجیب جدائی کو بالکل اکیلے جھیلنا چاہتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا اس لیے وہ اس بات سے خوف زدہ نہیں تھا کہ کون اس سے راستے میں ملنے والا ہو سکتا تھا۔ وہ دریا کے کنارے تک چلا گیا اور وہ یہاں اوپر سے نیچے تک پھرتا رہا اسے یہاں پر آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہو گی کیوں کہ جب نائٹ ماسک کا لکڑی کا گانگ بجاتی اس وقت تک وہ ابھی وہیں تھا۔ وہ فوراً ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ چل بھی رہا تھا اور قدرے بھاگ بھی رہا تھا کیوں نائٹ ماسک تو ہم پرستی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ حقیقی تھے۔ وہ اپنی بدمستیوں کے لیے رات کا چناؤ کرتے تھے کیوں کہ چمگادڑوں کی طرح ان کی بدصورتی بھی عظیم تر تھی۔

جلدی میں اس کا پاؤں کسی چیز پر پڑ گیا جو کہ ہلکے سے مائع دھماکے کے ساتھ اس کے پاؤں کے نیچے ٹوٹ گئی۔ وہ رکا اور اس نے نیچے جھک کر فٹ پاتھ پر دیکھا۔ ابھی تک چاند نمودار نہیں ہوا تھا لیکن آسمان پر ایک مدھم روشنی موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ اس کے نظر آنے میں اب زیادہ دیر نہ تھی۔ اس آدھی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے انڈے کے اوپر سے گزرا تھا جو کہ قربانی کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ کوئی ایسا شخص جسے بدقسمتی نے آگھیرا تھا، اس نے شام کے وقت اسے، چوک میں بھینٹ کے طور پر رکھ دیا تھا اور اس کے اوپر اس کا پاؤں آ گیا تھا۔ وہاں پر اس کے اردگرد وہی عموی کم کمر تاڑ کے پودے تھے لیکن جولیئس نے اسے ایک مختلف انداز میں اپنے گھر کے طرف دیکھا جہاں کہ وہ ڈراؤنا آرٹسٹ اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس نے ریتلے راستے پر اپنے جوتے کے تلے کو صاف کیا اور اپنے ذہن میں ایک اور طرح کی دھندلی سی فکر کو لیے تیزی سے آگے بڑھنے لگا لیکن جلدی کرنا اب بے سود تھا کیوں کہ تیز قدم ماسک پہلے ہی آزاد ہو چکا تھا۔ وہ (ماسک) تیز چلنے پر شاید اس لیے مجبور تھا کہ چاند نمودار ہونے کا ڈر اس کے سر موجود تھا۔ ساکن رات کی خاموش ہوا میں اس کی صاف اور اونچی آواز شعلہ زن تلوار کے مانند تھی۔ یہ ابھی کافی دوری پر تھا لیکن جولیئس جانتا تھا کہ فاصلے

اس کے سامنے دم توڑ دیتے تھے۔ اس لیے اس نے سیدھا سڑک کے کنارے پر موجود ناریلوں کے فارم کا رخ کیا اور اس نے خود کو پیٹ کے بل گرا دیا۔ اس طرح اسے چوڑے پتوں کی آڑ مل گئی۔ اس نے بمشکل ہی ایسا کیا تھا کہ عین اسی وقت اس نے روح کے ساتھیوں کی گڑگڑاہٹ کو سنا اور ساتھ ہی اس نے اس کی پرشور ندی جیسی مجرمانہ مسائل پر مبنی تقریر کو بھی سنا، وہ کانپ کر رہ گیا، آوازیں اس پر بوجھ ڈالتے ہوئے اس کے چہرے کو تقریباً دباتے ہوئے نم زمین کے ساتھ لگا رہی تھیں اور اب وہ قدموں کی آواز کو سن سکتا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے بیس شیطان صفت لوگ اکٹھے بھاگ رہے تھے۔ وہ خوف سے پسینے میں نہا گیا اور وہ تقریباً اٹھ کر بھاگنے والا تھا، خوش قسمتی سے اس نے خود پر قابو پا لیا اور پلک جھپکنے میں زمین اور ہوا میں موجود یہ سارا فتنہ یعنی گڑگڑاہٹ اور موسلا دھار بارش، زلزلہ اور سیلاب گزر گیا اور سڑک کی دوسری طرف ایک فاصلے پر غائب ہو گیا۔

اگلی صبح چیف کلرک کے دفتر میں زمین کے ایک بیٹے نے گزری شب کے سرکشی نوجوان کے ذریعے برپا کیے جانے والے کینک پا کے اشتعال دلانے والے مظاہرے کو تلخی سے بیان کیا۔ نوجوان نے شور کرتے تیز قدم ماسک والا یہ مظاہرہ اپنے بڑوں کی مخالفت میں کیا تھا، جن کا کہنا تھا کہ یوں کینک پا بیخ پا ہو جائے گا اور تب ......

مصیبت یہ تھی کہ ان نافرمان نوجوانوں کو ابھی تک خود کینک پا کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ انھوں نے اس کے متعلق صرف سن رکھا تھا لیکن وہ جلد ہی اس کے متعلق جان لیں گے۔

اس وقت جب جولیئس کھڑکی کے قریب کھڑا خالی مارکیٹ کا جائزہ لے رہا تھا تو دوبارہ اسے اس رات والے خوف نے جکڑ لیا تھا حالاں کہ ایسا صرف ایک ہفتہ پیشتر ہی ہوا تھا لیکن پہلے ہی سے یہ ایک دوسری زندگی لگ رہی تھی جو کہ ایک وسیع خالی پن کے ذریعے موجودہ زندگی سے جدا کر دی گئی تھی۔ یہ خالی پن ہر گزرتے دن کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ اس طرف جولیئس کھڑا تھا اور دوسری طرف ماں اور جیٹ کھڑی تھیں جنھیں اس دہشت زدہ کرنے والے آرٹسٹ نے سنوارا تھا۔

☆☆☆☆

میکسم بادانووِک
انگریزی سے ترجمہ: ضیاءالدین نعیم

یہ جی میں ہے

یہ جی میں ہے
کسی خوش رنگ
خوے نزم سے سرشار شب کو
ملوں میں تم سے گلیوں میں کہیں آ کر
بتاؤں پھر----
عظیم الجثہ ہیں وہ جو ستارے
دیکھتے ہو نا؟
وہ جھرمٹ سا درخشندہ ستاروں کا
وہ ”ہرکولیس“ کا جھرمٹ----
اسی کی سمت ہے محوِ سفر
سورج ہمارا
زمیں بھی نقشِ پا پر ہی رواں ہے اپنے سورج کے
ہماری حیثیت ہی کیا؟
فقط ہم تو مسافر ہیں
فقط زایر کی صورت
آسمانوں میں ہیں سرگرداں----
تو پھر دکھ درد، یہ آپس کے جھگڑے
اور جنگیں کس لیے ہیں؟
کہ ہم سب کو یہاں رہنا کہاں ہے
ہماری آخری منزل
تو جھرمٹ ہے ستاروں کا

گبرئیل گارشیا مارکیز
انگریزی سے ترجمہ: محمد اسلم

وہ خواب دیکھتی تھی

دہکتے سورج میں صبح نو بجے جب ہم ہوانا ریوا ہوٹل کے ٹیرس پر ناشتہ کر رہے تھے کہ سمندر کی ایک بڑی لہر سمندر کے پشتے کے ساتھ بنی سڑک پر گاڑیوں اور اس کے کنارے پارک کی گئی کاروں سے ٹکرائی اور ان میں سے ایک کو ہوٹل کے پہلو میں دھکیل دیا۔ یہ ٹکراؤ گویا ڈائنامائٹ کا دھماکہ تھا نتیجتاً بیس منزلہ ہوٹل میں خوف وہراس پھیل گیا اور داخلی دروازہ دھول میں نہا گیا۔ لابی میں بیٹھے سیاح فرنیچر سمیت ہوا میں اچھلے اور کچھ کو شیشوں کی کرچیوں کے طوفان نے زخمی کر دیا۔ لہر کے زور کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ پشتے کے ساتھ کشادہ دو رویہ سڑک اور ہوٹل کے درمیان اچھلی اور کھڑکیوں کے شیشوں کو پاش پاش کر گئی۔ کیوبا کے زندہ دل رضا کاروں نے چھ گھنٹے سے کم وقت میں ملبہ صاف کیا۔ سمندر کے رخ گیٹ کو سیل کیا اور ایک اور دروازہ کھڑا کر دیا اور یوں ہر چیز معمول پر آ گئی۔ صبح کے وقت اس غلط فہمی میں کہ ہوٹل کے ساتھ دھکیلی ہوئی گاڑی شاید پارک کی گاڑیوں میں سے ایک تھی۔ لوگوں نے ادھر دھیان نہ دیا، لیکن جب اسے کرین سے اٹھایا گیا تو اس میں سیٹ بیلٹ سے بندھی سٹیئرنگ ویل پر ایک خاتون مردہ پائی گئی۔ دھچکا اتنا مہلک تھا کہ اس کی کوئی ہڈی ثابت نہ تھی۔ اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ اس کے بوٹ پھٹ چکے تھے اور اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ اس نے سانپ کی شکل کی انگوٹھی پہن رکھی تھی جس کی آنکھیں زمرد کی تھیں۔ پولیس کی چھان بین سے طے ہوا کہ وہ پرتگیز کے سفیر اور اس کی بیگم کی ملازمہ تھی۔ وہ پرتگیز سفیر کے ساتھ دو ہفتے پہلے ہوانا آئی تھی اور اس صبح ایک نئی گاڑی میں سودا سلف لینے نکلی تھی۔ اخبار میں اس کی خبر پڑھنے میں مجھے دلچسپی نہ تھی لیکن زمرد کی آنکھوں والا، سانپ کندہ کی گئی انگوٹھی، میرے لیے تجسس کا باعث بن رہی تھی۔ تاہم میں یہ نہ جان سکا کہ یہ انگوٹھی اس نے کس انگلی میں پہن رکھی تھی۔

یہ میرے لیے ایک اہم جان کاری تھی کیوں کہ وہ ایک ناقابل فراموش شخصیت تھی، جس کا اصل نام میں کبھی نہ جان سکا اور جو ایسی انگوٹھی اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتی تھی، جو ان دنوں آج کے دور کی نسبت زیادہ غیر معمولی تھی۔ میری اس سے ملاقات چونتیس برس پہلے ویانا میں ہوئی تھی۔ وہ تب ایک ایسی سرائے میں جہاں لاطینی، امریکہ کے طلبا اکثر آیا کرتے تھے، قیمہ اور ابلے آلو کھا رہی تھی اور ڈرافٹ بیئر پی رہی تھی۔ میں اس صبح روم سے آیا تھا اور مجھے اس کی چھاتی سے نکلتی گونج دار آواز اس کے کوٹ کے کالر پر لگا بے جان لگی کا

پھول اور سانپ کی شکل کی مصری انگوٹھی نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ عام ہسپانوی زبان بھاری لہجے میں سانس لیے بغیر بولتی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ چوبی لمبی میز پر واحد آسٹرین تھی لیکن نہیں وہ کولمبیا میں پیدا ہوئی تھی اور آسٹریا میں اوائل عمری میں دونوں بڑی جنگوں کے درمیان موسیقی اور صدابندی سیکھنے آئی تھی ۔ وہ تقریباً تیس سال کی تھی لیکن اپنا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے وہ خوبصورت نہیں تھی اور اپنی عمر سے بڑی لگتی تھی ۔ تاہم وہ ایک دلکش اور حیرت زدہ کر دینے والی عورت تھی ۔

ویانا حال ایک خسروی شہر تھا جو دوسری جنگ عظیم کی بدولت نا قابل مصالحت دو دنیاؤں کے درمیان جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے کالے دھندے اور جاسوسی کی جنت بن چکا تھا ۔ ایسے تارک وطن کے لیے اس سے اچھی جگہ کیا ہو سکتی تھی جو یہاں کے طلبا کی سرائے میں میز کے کونے پر بیٹھ کر اپنی جڑوں سے وفاداری کے وصف کھانا کھاتی تھی اور اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ مصاحبوں کا بل بھی خود ادا کرتی تھی اس نے اپنا اصل نام کبھی نہیں بتایا تھا اور ہم ویانا میں رہنے والے لاطینی امریکی طلبا ہمیشہ اسے قدیم جرمن میں زبان کو مروڑ دینے والی نام فرافریدا سے پہچانتے تھے ۔ میرا ابھی اس سے تعارف ہوا تھا اور میں نے خوش اخلاقی سے اسے اتنی دور افتادہ اور مختلف جگہ کوٹنڈیو کی چوٹیوں کی ہواؤں کو تج کر آنے کی وجہ پوچھنے کی گستاخی کی اور اس نے مجھے ہکا بکا کر دیا ۔ ''میں خواب بیچتی ہوں''

حقیقت میں یہی اس کا پیشہ تھا۔ وہ بارہ بچوں میں سے تیسری اولاد تھی اور قدیم کالڈاس میں ایک متمول دکان دار کے ہاں پیدا ہوئی تھی اور جوں ہی بولنے کے قابل ہوئی اس نے اپنے خاندان میں ناشتے سے پہلے جب کہ استخارے کی خوبیاں اپنی خالص ترین شکل میں ہوتی ہیں، خوابوں کے بارے میں بتانے کا رواج ڈالا ۔ جب وہ سات سال کی ہوئی تو اس نے اپنے بھائی کو سیلاب کی نذر ہوتے دیکھا۔ اس کی ماں نے مذہبی توہمات کی بنا پر لڑکے کو نالے میں نہانے کے محبوب مشغلے سے منع کر دیا لیکن فرافرید کا خوابوں کی تعبیر کا اپنا مخصوص انداز تھا۔

''اس خواب کا مطلب ہے۔'' اس نے کہا: ''یہ نہیں کہ وہ ڈوب جائے گا بل کہ یہ کہ اسے مٹھائی سے دور رکھا جائے۔''

پانچ سال کے بچے کو جو مٹھائیوں سے دور نہیں رہ سکتا تھا اس کی پیش گوئی لغو لگی کیوں کہ ماں فرا کی استخارے کی خوبیوں کی قائل تھی۔ اس نے اس تنبیہ پر سختی سے عمل کیا لیکن ماں کی ذرا سی غفلت ہوئی ۔ چوری سے کھاتے ہوئے کیرامل اس کے حلق میں پھنسا اور لڑکا نہ بچ سکا۔

ویانا کی بے رحم سردیوں کی بدولت جب تک زندگی کی ضرورتوں نے اس کے گلے پر ہاتھ نہیں ڈالا وہ سمجھتی تھی کہ اس کی یہ قابلیت اس کی زندگی کی ضرورتوں کے لیے کافی نہ تھی ۔ جب کام ڈھونڈنے پر اسے ایک گھر میں کام ملا اور اس سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کر سکتی ہے تو اس نے سچ بولا: ''میں خواب دیکھتی ہوں۔'' ہر گھر

کی مالکن کو فرا کی وضاحت کافی لگی اور اسے ایسی تنخواہ پر رکھ لیا گیا جو اس کے معمول کے اخراجات کے لیے بس کافی تھی۔ ایک عمدہ کمرہ اور تین وقت کا کھانا اس کے علاوہ ناشتہ خاص طور پر اہم تھا جب اہل خانہ کو اپنے مستقبل قریب کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا تھا۔ گھر کا مالک مالیتی امور سے واقف، مالکن رومانوی موسیقی کی دلدادہ اور دو بچے، جن کی عمریں گیارہ اور نو سال تھیں۔ وہ ایک مذہبی خاندان تھا اور یوں پرانے توہمات کی طرف راغب۔ انھیں فرا کو جس کا صرف یہ کام تھا کہ وہ انھیں ان کے خوابوں کی بنیاد پر روزانہ تقدیر کے بارے میں آگاہ کرے...... ملازمت دے کر خوشی ہوئی۔

فرا بھی اپنا فرض خوب نبھا رہی تھی۔ خاص طور پر جنگ کے دنوں کے درمیان جب حقیقت ڈراؤنے خواب سے زیادہ کڑوی تھی۔ صرف ناشتے کے وقت فیصلہ کرتی تھی کہ اس دن گھر کے ہر فرد کو کیا کرنا چاہیے۔ کیسے کرنا چاہیے اور یوں اس کی پیش گوئیاں گھر میں حکم کا درجہ بن گئیں۔ وہ خاندان پر مطلقاً حاوی ہو گئی۔ میرے ویانا کے قیام کے دوران میں ہی مالک فوت ہو گیا اور فرا کے نام جائیداد کا کچھ حصہ اس شرط پر کر گیا کہ جب تک اسے خواب آتے رہیں گھر کے افراد کے لیے استخارہ کرتی رہے گی۔

میں ویانا میں دوسرے طلبا کے ساتھ وقت کی سختیاں جھیلتے ہوئے گھر سے آنے والی رقم کے انتظار میں ایک ماہ سے زیادہ ٹھہرا رہا۔ سرائے میں فرا فریدا کی غیر متوقع اور فیاضانہ آمد غریبی سے لڑتے ہم جیسے طلبا کے لیے جشن کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک رات اس نے میرے کان میں شراب کے خمار ہی کی ترنگ میں ایک فوری نوعیت کی بات کا انکشاف کیا۔

‘‘میں تمھیں تمھارے بارے میں گزری رات دیکھا خواب بتانے آئی ہوں۔’’ اس نے کہا: ‘‘تم فوراً ویانا سے چلے جاؤ اور پانچ سال سے پہلے ادھر مت لوٹنا۔’’

اس کی بات ایسی حقیقت تھی کہ میں نے دیر نہیں کی اور اسی رات روم کو جانے والی آخری ٹرین میں سوار ہو گیا اور اس کے بعد میں اپنے آپ کو ایک ایسا شخص تصور کرنے لگا جو کسی ان دیکھی آفت سے بچ نکلا تھا اور ابھی تک ویانا لوٹ کر نہیں گیا تھا۔

ہوانا میں ہونے والے اس حادثے سے پہلے میں نے غیر متوقع اور ناگہانی طور پر فرا فریدا کو بارسلونا میں دیکھا کہ مجھے یہ ایک راز لگا۔ اس دن خانہ جنگی کے بعد والپاریزو جاتے ہوئے ایک طویل بحری سفر کے بعد پابلو نرودا اسپین میں رکا۔ اس نے ہمارے ساتھ پرانی کتابوں کی تلاش میں دکانیں کھنگالنے میں ایک دن گزارا اور پورٹر پر ایک نہایت خستہ جلد کے بغیر ایسی کتاب خریدی جس کی قیمت اس کی رنگون میں کونسلیٹ کے دفتر میں دو ماہ کی تنخواہ کے برابر تھی۔ وہ ہجوم میں ایک اپاہج ہاتھی کی طرح چیزوں کی اندرونی حقیقت جاننے کے لیے ایک بچے کے تجسس کے مانند دیکھتا پھرا کیوں کہ اسے دنیا ایک کھلونے کی طرح لگتی تھی جو زندگی کی ایجاد تھی۔

وہ نشاۃ ثانیہ کے پوپ کی طرح تھا۔ بہت پیٹو اور شائستہ۔ اپنی مرضی کے خلاف وہ ہمیشہ کھانے کی

میز پر سربراہ بن کر بیٹھتا۔ اس کی بیوی میٹالڈا اس کی گردن کے گرد بب باندھتی جو ڈائننگ ہال سے زیادہ نائی کی دکان سے منگوائی ہوئی لگتی لیکن اسے چٹنی میں ڈبکی لگانے سے بچانے کا یہی طریقہ تھا وہ کارویلز پر ایک معمول کا دن تھا۔ اس نے تین لابسٹر سرجن کی مہارت کے ساتھ کھائے اور ساتھ ہی نگاہوں سے دوسروں کے کھانے پر ہاتھ صاف کرتا رہا۔ وہ تھوڑا تھوڑا ہر ایک کے کھانے سے چکھتا رہا اور یہ سلسلہ جاری رہا اس نے گلیشیا کے کلیم کنٹریا سے ملز ایلیکانٹے سے پران اور کوسٹا براوے سے بحری ککڑی۔ اس دوران میں وہ فرانسیسیوں کی طرح کھانے کی دوسری ذائقہ دار چیزوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ خاص طور پر چلی کی قبل از تاریخ شیل فش کے بارے میں جو اس کے دل میں جاگزیں تھیں۔

اچانک اس نے کھانا روک دیا۔ لابسٹر کے اینٹینا کو درست کیا اور آہستہ سے مجھے بتایا۔

"میرے پیچھے کوئی مسلسل مجھے دیکھ رہا ہے۔"

میں نے اس کے کندھے سے پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ صحیح تھا، تین میزوں کے فاصلے پر ایک جری عورت پرانا وضع کا ہیٹ اور گہرے جامنی رنگ کا سکارف گلے میں لپیٹے پبلو پر ٹکٹکی باندھے آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ میں نے اسے فورا پہچان لیا۔ اگر چہ وہ بوڑھی اور فربہ ہو چکی تھی اپنی درمیانی انگلی پر سانپ والی انگوٹھی پہنے فرا فریدا تھی۔ وہ نیپلز سے پبلو نرودا اور اس کی بیوی کے ساتھ بحری سفر کر رہی تھی لیکن انھوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اسے اپنی میز کی طرف کافی کے لیے بلایا اور پبلو کو حیرت زدہ کرنے کے لیے اسے خواب بتانے کے لیے کہا۔ پبلو نے کوئی توجہ نہ دی کیوں کہ وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اسے استخارے پر یقین نہیں تھا۔

"صرف شاعری غیب دان ہے۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم رمبلا ز پر چہل قدمی کرنے لگے۔ میں دوسروں سے بچ کر فرا کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے پیچھے رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ اگرچہ آسٹریا میں اس کی جائیداد تھی تاہم وہ پورٹو پرتگال میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہی تھی اور ایک ایسے گھر میں رہتی ہے جو پہاڑی پر ایک نقلی محل سے مماثلت رکھتا تھا اور جہاں سے آپ امیریکاز (Americas) تک پھیلا ہوا سمندر دیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ اس نے بتایا تو نہیں تاہم اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ خوابوں کے ذریعے اس نے اپنے ہی خوابوں کی ویانا کی ساری جائیداد ہتھیا لی تھی۔ مجھے اس بات سے حیرت نہ ہوئی کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اس کا خوابوں کی تعبیر کا فن جائیداد ہتھیانے کا ایک دھوکہ تھا اور یہ بات میں نے اسے بتا دی۔

وہ کوشش کے باوجود اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ "تم ہمیشہ کی طرح ضدی ہو۔" اس نے کہا اور خاموش ہو گئی کیوں کہ گروپ کے دوسرے لوگ نرودا کی چلین (Chilean) لہجے میں رمبلا ڈی لا پچاروں پر طوطوں سے باتیں ختم کرنے کے انتظار میں رک گئے تھے۔ جب ہم نے دوبارہ باتیں شروع کیں فرا فریدا نے موضوع تبدیل کر لیا۔ تاہم اس نے کہا: "اب تم ویانا جا سکتے ہو۔"

تب مجھے احساس ہوا کہ ہم تیرہ سال کے بعد ملے تھے۔

”اگر تمھارے خواب جھوٹے بھی ہیں، میں ویانا واپس نہیں جاؤں گا۔“ میں نے اسے بتایا” کیا پتہ ......“ تین بجے ہم پہلو کے ساتھ قیلولہ کے لیے فرا سے بچھڑ گئے۔ یہ قیلولہ وہ ہمارے گھر میں اس سنجیدگی سے کرتا جیسے کہ جاپانیوں کی چائے کا اہتمام۔ اس کے قیلولہ کے لیے کچھ کھڑکیاں بند کی جاتیں۔ کچھ کھولی جاتیں، کچھ سمتوں سے روشنی کا انتظام ہوتا اور مکمل خاموشی نرودا فوراً سو گیا اور خلاف توقع بچوں کی طرح دس منٹوں کے بعد اٹھ گیا اور کمرے لیونگ روم میں تازہ دم ہو کر آ گیا۔ اس کے گال پر تکیے کے غلاف کا مونوگرام چھپ گیا تھا۔

مجھے خواب بتانے والی عورت کا خواب آیا۔

اس نے کہا مٹالڈا کی خواہش تھی کہ وہ اسے وہ خواب بتائے۔

میں نے دیکھا کہ وہ میرے بارے میں خواب دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔

”یہ تو بورجز Borges والی بات ہوئی۔“ میں نے کہا۔

اس نے میری طرف غیر یقینی انداز میں دیکھا۔ ”اس نے اس کے بارے میں لکھا ہے؟“

”نہیں لکھا تو کبھی نہیں لکھے گا۔“ میں نے جواب دیا۔ اس کے لیے یہ الجھا ہوا معاملہ ہوگا۔

اس شام چھ بجے کے بحری جہاز میں سوار ہونے سے پہلے ہم سے جدا ہوتے ہی وہ ایک تنہا میز پر بیٹھ کر سبز روشنائی میں لکھنے لگا۔ اس روشنائی سے وہ لوگوں کو کتابیں دیتے وقت اس پر پھول مچھلی اور پرندے بناتا تھا۔ ”تمام لوگ جہاز میں آ جائیں۔“ کی صدا پر نرودا کو خدا حافظ کیے بغیر وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے ہم نے فرا کو ڈھونڈا اور آخر کار اسے Tourist ڈیک پر پایا۔ وہ اپنے قیلولے سے ابھی لوٹی تھی۔

”میں نے شاعر کے بارے میں خواب دیکھا۔“

فرا نے دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر میں نے اسے اپنا خواب بتانے کو کہا۔

”میں نے دیکھا کہ وہ میرے بارے خواب دیکھ رہا تھا“ اس نے کہا اور میرے چہرے پر حیرت دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ ”تم کیا توقع کر رہے تھے۔ بعض اوقات میرے خوابوں کا اصل کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔“

اس کے بعد میں نے نہ اسے دیکھا اور نہ ہی مجھے اس کا خیال آیا۔ یہاں تک کہ میں نے ہوانا یورا کی تباہی میں سانپ کی شکل والی انگوٹھی پہنے عورت کی موت کا سنا۔ کچھ ماہ بعد پرتگیزی سفیر سے ملاقات کے وقت اپنا تجسس نہ چھپا سکا۔ سفیر اس کے بارے میں بڑے جوش اور تعریفی انداز میں بولا۔ ”آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کتنی غیر معمولی عورت تھی۔ آپ اس کے بارے میں کہانی لکھیں۔“

اور پھر اسی لہجے میں بات کرتے ہوئے محیر العقول تفصیلات بتانے لگا لیکن اس تمام کے باوجود میں کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ ”اصل سوال تو یہ ہے۔“ آخر کار میں نے کہا: ”کہ وہ کرتی کیا تھی؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں: کہا” وہ خواب دیکھتی تھی۔“

اتالوکالوینو

انگریزی سے ترجمہ: خالد فرہاد دھاریوال

اکیلا ایمان دار

یہ ایک ایسے ملک کی بات ہے جہاں سب کے سب چور تھے۔

اندھیرا ہوتے ہی ہر کوئی جعلی چابیاں اور مدھم جلتی لالٹینوں کے ساتھ گھر سے نکلتا اور کسی پڑوسی کے گھر میں چوری کر لیتا۔ چوری کے سامان سے لدے پھندے صبح جب وہ اپنے گھر آتے تو دیکھتے کہ ان کا اپنا گھر ہی لوٹا جا چکا ہے۔

اس طرح سب ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں تھا کیوں کہ پہلا دوسرے کی چوری کر رہا تھا، دوسرا تیسرے کی، تیسرا چوتھے کی اور اس طرح آپ اس آخری آدمی تک پہنچ سکتے تھے جس نے سب سے پہلے گھر پہ ہاتھ صاف کیا ہو۔ اس ملک کی تجارتی سرگرمیوں میں خریدنے اور بیچنے والے، دونوں کی جانب سے دھوکا لازمی شرط تھی۔ اس ملک کی حکومت ایک مجرمانہ تنظیم تھی جو اپنی عوام سے سرِ عام چوری کرتی تھی اور اپنی طرف سے ملک کے باشندے بھی حکومت کو چونا لگانے سے باز نہیں آتے تھے۔ اسی طرح سب کی زندگی بسر ہو رہی تھا۔ نہ کوئی امیر تھا اور نہ ہی کوئی غریب۔

ایک دن، ہمیں نہیں معلوم کہ کس طرح، یوں ہوا کہ ایک ایمان دار شخص اس ملک میں گزر بسر کرنے چلا آیا۔ رات کو تھیلے، چابیاں اور لالٹین لے کر نکلنے کے بجائے وہ سگریٹ پینے اور ناول پڑھنے کے لیے گھر پہ ہی رُکتا تھا۔ چور آئے، اس گھر میں روشنی دیکھی تو اندر گئے ہی نہیں۔

کچھ دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ تب سب مل کر اس اجنبی کو سمجھانے گئے کہ اگر وہ بغیر کچھ کیے دھرے جینا چاہتا ہے تو جیے، لیکن یہ تو کوئی ایسی وجہ نہیں کہ دوسروں کو بھی اپنا کام کرنے سے روکا جائے۔ ہر رات اس کے گھر پہ رہنے کا ایک مطلب یہ تھا کہ اگلے روز ایک نیا ایک خاندان بھوکا رہتا۔

ایسے دلائل کے سامنے وہ ایمان دار ڈھیر ہو گیا۔ رات کو باہر رہنے اور علی الصبح واپس آنے کی بات تو اس نے قبول کر لی لیکن چوری کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ایمان دار تھا، اس میں میری اور آپ کی کیا غلطی ہے۔ وہ حد سے حد پل تک جاتا اور نیچے بہتے پانی کو ساری رات دیکھتا۔ جب وہ گھر لوٹتا تو جان لیتا کہ چوری ہو چکی ہے۔

ہفتے سے بھی کم وقت میں وہ آدمی پائی پائی کا محتاج ہو گیا۔ سارا گھر اس طرح خالی ہوا کہ اس کے پاس کھانے تک کے لیے کچھ نہ بچا۔ لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا کیوں کہ یہ سب اس کا ہی کیا دھرا تھا، اصل مشکل

یہ تھی کہ اس کے رویے سے سارا کاروبار اُلٹ پلٹ گیا۔ چوں کہ اس نے خود کچھ چرائے بغیر اپنا سارا اسباب چوری ہونے دیا تو ہر صبح ایک نہ ایک شخص، اپنے حصے کی چوری کرتے ہوئے گھر لوٹتا اور دیکھتا کہ اس کے گھر کا سامان ان چھوا پڑا ہے۔ یہ وہ گھر ہوتا تھا جس میں اصولاً اس ایمان دار آدمی کو نقب لگانی ہوتی تھی۔ اب جس کے یہاں چوری نہیں ہوئی اسی لحہ وہ آدمی دوسروں سے امیر ہو جاتا تھا۔

اس نئے امیر کی چوری والی خواہشات بھی جاتی رہیں۔ معاملات تب اور بگڑتے گئے جب ایمان دار آدمی کے گھر چوری کرنے گئے لوگ کچھ نہ پا کر خالی ہاتھ واپس آنے لگے؛ اب وہ غریب ہوتے جا رہے تھے۔

اسی درمیان جو نو دولتیے تھے وہ رات کے وقت ایمان دار آدمی کی طرح پُل تک جانے لگے تھے اور دیر تک اس کے نیچے بہتے پانی کو دیکھتے تھے۔ ان حرکتوں سے شکوک بڑھتے گئے کیوں کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت سے لوگ امیر ہوتے جا رہے تھے اور بہت سے غریب۔

ایسے میں، امیروں کو لگا کہ ہر رات پُل پر جاتے رہے تو جلد ہی وہ غریب ہو جائیں گے۔ پھر انھوں نے سوچا، ’کچھ غریبوں کو نوکر رکھ لینا چاہیے جو ہمارے بدلے چوری کر سکیں۔ مِل جُل کر انھوں نے دستاویزات تیار کیں، تنخواہیں طے ہوئیں، حصے طے کیے۔ لیکن چور تو وہ اب بھی تھے اس لیے ہمیشہ ایک دوسرے کو رگڑا دینے کی کوشش میں لگے رہے۔ پھر بھی، جیسا کہ ہوتا آیا ہے جو امیر تھے وہ امیر سے امیر تر ہوتے گئے اور جو غریب تھے وہ غریب سے غریب تر ہوتے گئے۔

کچھ رئیس تو اس قدر رئیس ہو گئے کہ امیر بنے رہنے کے لیے انھیں نہ تو خود چوری کرنے کی ضرورت تھی نہ ہی چوری کروانے کی۔ لیکن اگر وہ چوری بند کر دیتے تو غریب ہو جاتے کیوں کہ باقی کے غریب تو مسلسل چوری کر رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے سب سے زیادہ غریب لوگوں کو اس بابت تنخواہیں دینا شروع کر دیں تا کہ وہ دیگر غریبوں سے ان کی جائیداد کی حفاظت کر سکیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پولیس تھانوں اور جیل خانوں کی تعمیر شروع ہو گئی۔

اس طرح، اس ایمان دار آدمی کے سامنے آنے کے کچھ ہی سالوں میں حال ایسا ہو گیا کہ لوگ اب لوٹنے اور لٹے جانے کی بات کرنا چھوڑ، صرف امیر اور غریب کی بات کرنے لگے۔ لیکن اب بھی وہ سب چور ہی تھے۔ اکلوتا ایمان دار وہی تھا جو شروع شروع میں یہاں آیا تھا اور وہ جلد سے بھی پیش تر بھوک کی وجہ سے مر گیا تھا۔

☆☆☆☆

کیٹ چوپن

انگریزی سے ترجمہ: عنبرین صلاح الدین

ایک گھنٹے کی کہانی

یہ جانتے ہوئے کہ مسز میلرڈ کو دل کا عارضہ لاحق ہے، اسے اس کے جیون ساتھی کی موت کی خبر سنانے میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا۔

یہ اس کی بہن جازفین تھی کہ جس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اسے بتایا؛ چھپے ہوئے اشاروں میں جو ادھورا اظہار کر رہے تھے۔ اس کے پاس اس کے جیون ساتھی کا دوست رچرڈز بھی تھا۔ وہ اس وقت اخبار کے دفتر میں موجود تھا جب ریل گاڑی کے حادثے کی خبر ملی، جس میں برینٹلے ملرڈ کا نام مر جانے والوں میں سرِفہرست تھا۔ اس نے بس اتنا ہی وقت لیا کہ وہ ایک دوسرے ٹیلی گرام کی وصولی کے ذریعے خود کو اس خبر کی سچائی کا یقین دلا سکے۔ اس کے بعد اس نے بہت عجلت برتی تاکہ کہیں یہ دکھ بھرا پیغام کسی غیر ذمہ دار اور سخت دل دوست کے ہاتھ نہ لگے۔

اس نے یہ کہانی دوسری عورتوں کے مانند نہیں سنی، جو بے دست وپا کم ہمتی کی کیفیت میں ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتیں۔ وہ اچانک، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بہن کے بازوؤں میں رو پڑی۔ جب غم کا یہ طوفان ذرا تھما تو وہ اکیلی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کسی کو اپنے پیچھے نہیں آنے دیا۔

وہاں، کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے، ایک آرام دہ، بڑی کرسی رکھی تھی۔ وہ اس میں دھنس گئی، اس جسمانی تھکن کے بوجھ تلے، جس نے اس کے جسم کو قبضے میں لے رکھا تھا اور اس کی روح تک پہنچ رہی تھی۔

اس نے اپنے گھر کے صحن میں درختوں کے سروں کو نئی بہار میں جھومتے ہوئے دیکھا۔ بارش کا مزے دار تنفس ہوا میں موجود تھا۔ نیچے گلی میں پھیری والا اپنا سامان اٹھائے موجود تھا۔ دور سے کسی گانے والے کے گیت کے بول ہلکے ہلکے سنائی دے رہے تھے، اور چھتوں پر بے شمار چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

مغرب میں اس کے کھڑکی کی طرف منہ کیے اوپر نیچے دھرے ہوئے بادلوں میں سے نیلے آسمان کے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔

وہ بے حس و حرکت اپنا سر کرسی کی گدی سے ٹکائے بیٹھی تھی، سوائے اس لمحے کے جب اچانک کوئی سسکی اس کے حلق تک پہنچتی اور اسے ہلا دیتی، جیسے کوئی بچہ روتے روتے سو جائے اور خواب میں سسکیاں لیتا رہے۔

وہ ایسی جوان عورت تھی جس کا چہرہ اتنا شفاف اور پرسکون تھا کہ اس کی لکیریں ایک دباؤ اور کسی حد تک مضبوطی کا پتا دیتی تھیں۔ مگر اب اس کے آنکھوں میں منظر بجھا ہوا تھا، اس کی نظر دور موجود آسمان کے ان ٹکڑوں میں سے ایک پر جمی ہوئی تھی۔ وہ کوئی سوچتی ہوئی نگاہ نہیں تھی، بل کہ ایک ذہین فکر کے التوا کا اشارہ تھی۔

کوئی چیز اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور وہ خوف میں مبتلا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ کیا تھا وہ نہیں جانتی تھی؛ یہ دھندلا اور لطیف سا تھا جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا لیکن اس نے اسے آسمان سے باہر آتے ہوئے، ہوا میں رچی بسی آوازوں، خوشبوؤں، رنگوں میں سے گزرتا ہوا محسوس کیا۔

اب اس کا سانس اوپر نیچے ہو رہا تھا، وہ آنے والی چیز کو قبضے میں لینے کے لیے پہچان رہی تھی، اور وہ اپنے ارادے سے اسے پچھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ اتنی کمزوری سے جتنے اس کے دو سفید نازک ہاتھ ہو سکتے تھے۔ جب اس نے اپنے آپ کو چھوڑ دیا، اس کے ادھ کھلے ہونٹوں سے سرگوشی کے انداز میں ایک چھوٹا سا لفظ برآمد ہوا۔ اس نے منہ ہی منہ میں اس لفظ کو کئی بار دہرایا، آزاد، آزاد، آزاد!۔ وہ نگاہوں کا خالی پن اور اس کے بعد آنے والی خوف کی لہر اس کی آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی۔ وہ روشن اور پرجوش تھیں۔ اس کی نبضیں تیز تھیں، اور بہتا خون اس کے پور پور کو گرم اور پرسکون بنا رہا تھا۔

اس نے رک کر پوچھا تک نہیں کہ یہ کوئی بہت بڑی مسرت ہے یا نہیں کہ جس نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ ایک شفاف اور عظیم ادراک نے اسے اس مشورے کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے ٹھکرانے کی صلاحیت بخشی۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ ان رحم دل نرم ہاتھوں کو موت میں لپٹا ہوا دیکھے گی؛ اس چہرے کو جس نے اسے محبت کے سوا کبھی کسی نگاہ سے نہ دیکھا تھا بے حس وحرکت اور مردہ دیکھے گی تو دوبارہ رو دے گی۔ مگر اس نے اس کڑوے لمحے کے اس پار ان برسوں کی طویل قطار دیکھی جو اب صرف اس کے ہوں گے۔ اس نے انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے اپنے بازو کھولے اور پھیلا دیے۔

ان آنے والے برسوں میں اسے کسی کی خاطر زندہ نہیں رہنا ہوگا؛ وہ اپنے لیے جیے گی۔ اب کوئی مضبوط ارادہ اس کے ارادے کو نہیں موڑ سکتا، اس اندھی تقلید کے تحت جہاں مرد اور عورتیں یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس اپنے ذاتی ارادے کو اپنے ساتھی پر لاگو کرنے کا حق ہے۔ جب آگہی کے مختصر سے لمحے میں اس نے غور کیا تو اسے اپنا یہ عمل اچھی یا بری نیت ہر دو صورتوں میں ایک جرم سے کم نہیں لگا۔

وہ کبھی کبھار اس سے محبت کرتی تھی، اکثر نہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے! محبت جیسے سربستہ راز کی، اس خود اختیاری کے حصول کے سامنے کیا اہمیت ہے جسے اس نے اپنی ذات کی مضبوط ترین خواہش کے طور پر پہچانا تھا۔

آزاد! روح اور جسم آزاد!، اس نے سرگوشی کی۔

جوزفین بند درازے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی اور چابی کے سوراخ پر ہونٹ رکھے اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ لوئزے، دروازہ کھولو! مہربانی کرو دروازہ کھولو۔۔۔ تم بیمار پڑ جاؤ گی، کیا کر رہی ہو لوئزے؟ خدا کے لیے دروازہ کھولو۔

چلی جاؤ، میں بیمار نہیں پڑ رہی'' نہیں؛ وہ تو کھلی کھڑکی سے زندگی کا امرت پی رہی تھی۔

اس کی خوش خیالی آنے والے دنوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بہار کے دن، اور گرمیوں کے دن، اور ہر طرح کے دن جو صرف اس کے ہوں گے۔ اس کے دل سے زندگی کی طوالت کی دعا نکلی۔ کل کی بات ہے جب اس نے ایک اچانک کپکپاہٹ سے سوچا تھا کہ کہیں زندگی طویل نہ ہو۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی بہن کے پکارنے پر دروازہ کھول دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بخار زدہ فتح تھی اور وہ اپنے آپ کو غیر ارادی طور پر فتح کی دیوی کی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس نے اپنی بہن کا سہارا لیا اور دونوں سیڑھیاں اتر گئیں۔ رچرڈز نیچے کھڑا انتظار کر رہا تھا۔

کوئی چابی سے سامنے کا دروازہ کھول رہا تھا۔ یہ برینٹلے میلیرڈ تھا جو کچھ سفر کے آثار لیے، سامان اور چھتری سنبھالے ہوئے داخل ہوا۔ وہ حادثے کے مقام سے دور رہا تھا، اور اسے اس کے ہونے کی خبر بھی نہ تھی۔ وہ۔۔۔ جوزفین کی تیز چیخ اور رچرڈز کی اسے اس کی بیوی کی نظروں سے بچانے کی حرکت پر حیران کھڑا تھا۔

ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ دل کا دورہ پڑنے سے مر گئی ہے۔۔۔ ایسی خوشی جو مار دیتی۔

☆☆☆☆

تخلیق وترجمہ: نیلم مومل

لوکل بس

ایک بار مجھے بس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا...... معاف کیجیے گا بس میں سوار ہونے کا...... ایسی قسمت کہ بندہ بس میں بیٹھے۔

کنڈیکر کی آواز آئی...... “تھوڑا آگے، تھوڑا آگے...... خالہ جان...... کوشش، کوشش......”

بس میں بیٹھی ایک خاتون کو غصہ آ گیا اور بولی...... “بھائی بس کی کھڑکی کھولو ہم وہیں سے لٹک جاتے ہیں، جگہ تو ہے نہیں......”

....

یہ قصہ کچھ عرصے قبل کا ہے جب میں نے اپنی دوست بلی (بوڑھی خاتون) کو اپنے ہمراہ لیا......
آپ یہ مت سوچیے گا کہ وہ کوئی بیگانی ہے...... بلی جان تو میری بہترین دوست ہے پر کبھی کبھی وہ چالاکی بہت کرتی ہے......

ہاں تو ہم بس میں سوار ہونے کے لیے لوکل اسٹاپ پر کھڑے تھے کہ کب یہ سواری باد بہاری تشریف لاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بس پر نظر پڑی جو کہ لرزتی، بجتی، سسکتی، بیل گاڑی کی طرح کئی آوازیں نکالتی نمودار ہوئی۔ بس کی یہ عجیب وغریب آوازیں اور میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ بس ہمارے قریب آ کر رکی ہم دونوں بڑی بے بسی اور مسکینی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

اچانک کنڈکٹر کی چبھتی ہوئی آواز آئی۔ وہ چیخ کر بولا...... “جلدی کرو نانی، جلدی کرو خالہ...... جلدی چڑھو۔”

پہلے تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہیں کوئی ہمیں بس میں سوار ہوتے دیکھ تو نہیں رہا کیوں کہ یہ بھی بڑی شرمندگی کی بات تھی کہ ایک بڑی شخصیت چار روپے والی بس میں بیٹھے، میرا مطلب ہے چار روپے کرایہ دے۔ میں تو لوگوں کے ساتھ بڑی بڑی باتیں کیا کرتی تھی کہ میرے رکشے کا کرایہ دن کا پانچ سو سے ہزار تک کا ہے اور جن دوستوں کے ساتھ ڈینگیں ماریں تھیں اگر انھوں نے بس میں سوار ہوتے دیکھ لیا تو بڑی شرمندگی ہوگی۔

خیر یہ تو بعد کی بات تھی، بس روانہ ہونے لگی تو میں نے اللہ اکبر کہہ کر اپنی چادر خوب اپنے اردگرد لپیٹی...... ادھر سے مسلسل منشی اور کنڈکٹر کی آوازیں...... “ہمت کرو خالہ، ہمت کرو نانی...... جلدی کرو...... چھلانگ مار گاڑی میں...... جگہ بہت۔”

اب بلی نے بھی اپنا چشمہ اتارا اور مجھے پکڑوا کر کہنے لگی۔ ''میرا ہاتھ پکڑو، میں بھی تمھارے ساتھ دوڑنے کی پریکٹس کرتی ہوں۔''

میں نے کہا...... ''ٹھہرو پہلے دیکھو کہ میں کیا تیر مارتی ہوں، تم بوڑھی ہو کیا دوڑ سکتی ہو۔''

بلی نے کہا...... ''کیوں پچھلی بار یاد نہیں جب ہم خلی گئے تھے پھر دونوں نے دوڑ لگائی تھی اور میں تم سے پہلے درخت پر چڑھ گئی تھی۔''

میں نے کہا...... ''بلی جان وہ دوڑنے کا مقابلہ نہیں تھا مل کہ ہم دونوں کتوں کے ڈر سے بھاگے تھے اور تم چالاک، مجھے چھوڑ کر درخت پر چڑھی تھی، کتوں نے صرف مجھے کاٹا اگر میں بروقت نہ پہنچتی تو آج ہم دونوں یوں ساتھ نہ ہوتے۔'' خیر اب پرانی یادیں پرانی باتیں کیا کریدوں۔

سب دوستوں نے بس کے پیچھے دوڑ لگائی...... بس آہستہ ہوئی...... پھر تیز چلنے لگی...... کیوں کہ کنڈکٹر نے سیٹی بجادی تھی۔

بلی نے بھی کوشش کی کہ وہ سیٹی مار کر بس کو روکے مگر بتیسی گرنے کے ڈر سے اپنا ارادہ بدل دیا۔

میں بس کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی تھی اور بلی سائے کی طرح دگ دگ میرے پیچھے۔ میں نے کنڈکٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا ''بھائی جان ہمت کرنا...... تھوڑا مدد کرنا......''

کنڈکٹر نے ہاتھ بڑھایا تو اس کے ہاتھ بلی کی چوٹیاں آ گئی، بلی نے چیخ ماری...... ''ہائے میں مر گئی......''

میں نے آخرکار بڑی کوشش کے بعد بس کے پائے دان پر پاؤں رکھ ہی لیا۔

بلی نے دیکھا کہیں مول چلی نہ جائے...... اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی میں نے جلدی سے بلی کی چادر کا ایک کونا پکڑا اور دوسرا کونا کنڈکٹر کے ہاتھ میں آ گیا، اب میں نے دیکھا کہ دس ازائے صفا صفا موت...... انگریزی کا یہ اثر ہوا کہ کنڈکٹر نے کہا...... ''استاد روکو، روکو۔''

بس سڑان ءِ اسلام، کیا بتاؤں...... جب تک گاڑی روکی...... بلی گھسٹتی رہی اور اسے دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی...... چادر کا ایک کونا میرے ہاتھ میں اور دوسرا کونا کنڈکٹر کے ہاتھ میں...... بلی کی آنکھیں مینڈک کی طرح باہر۔

میں نے پکارا...... ''ہے کوئی مسلمان جو بلی جان کو بچائے، اسے اٹھائے۔''

بلی جان اب زمین پر لیٹی گھسٹتی ہوئی جا رہی تھی...... اس کے سڑے ہوئے سینڈل پہلے سے ختم تھے، اب خدا خیر کرے...... میں نے بڑی مشکل سے پاکستانی ہیروئن کی طرح بس سے چھلانگ لگائی......

کنڈکٹر نے جو مجھے یوں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا تو کہا...... ''میڈم گئی...... یہ تو کوئی پاکٹ مار چور لگتی ہے، خواتین اپنے اپنے پرس چیک کر لو۔''

میں گرتے ہی پہلے تو سجدے میں گئی، مطلب سجدے کی صورت گری..... میرے کانوں میں آواز آئی ..... ”لگتا ہے میڈم دنیا سے اٹھ گئی۔“

ان باتوں کو نظر انداز کر کے میں نے بلی کی طرف توجہ دی..... بلی بچاری دور جا گری تھی ..... میرے گھٹنے..... میری ہتھیلیاں سب زخمی ہو گئی تھیں۔

ویسے بھی فلمی ہیروئن بننے کا انجام یہی ہوتا ہے ورنہ آج تو میرا بچنا مشکل تھا، خیر بس ہمیں اسی حالت میں چھوڑ کر کب کی جا چکی تھی ..... پہلے تو میں تھوڑا سسکی ..... میں نے دیکھا کہ بلی بچاری بے جان چیز کی طرح پڑی ہوئی تھی اس کی آنکھیں باہر کو ابلی پڑی تھیں۔

بلی کو دیکھ کر میں نے سوچا..... واہ رے بلی تمھاری بھی کیا جوانی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ اب کیا کرو..... دل میں سوچا کوئی گدھا گاڑی ہی دیکھ لو..... اسے ہسپتال لے جاؤں ..... پہلے میں نے سوچا کہ بلی جاں کو دیکھ تو لوں اگر دار فانی سے کوچ کر گئی ہے تو کیوں خرچ و خرافات کروں سیدھا سے گھر لے جاتی ہوں۔ جب بلی کے قریب پہنچی تو بے چاری گٹھڑی کی طرح پڑی ہوئی تھی ..... اس کی آنکھیں تھوڑا ہلیں ..... تو میں نے پوچھا..... بلی زندہ ہو..... چپ..... خاموشی ..... ۔

پھر پوچھا..... بلی جان کیا خیال ہے گھر یا ہسپتال ..... خاموشی یا اللہ خیر ..... میں پریشان ہو گئی کہ اب کیا کروں ..... میں نے ایک راہ گیر کو مدد کے لیے بلایا ..... میں نے کہا ..... لالہ اس مرحومہ کو سڑک سے اٹھا کر تھوڑا ادھر فٹ پاتھ پر کرنا ہے، کہیں کسی گاڑی کے نیچے نہ آ جائے ..... میری بات سن کر دوسرے لوگ بھی لپکے، پھر کیا تھا..... یہ بوڑھیا تمھاری کیا لگتی ہے..... کیا لاوارث ہے..... کس نے مارا اسے..... کب مری ..... کیسے مری..... مارنے والا گرفتار ہوا..... گولی لگی یا کلاشن سے مارا ہے..... یا چاقو سے مارا ہے..... تم نے کیا کیا..... پولیس کہاں ہے..... مجرم پکڑے گئے..... اب جتنے لوگ اتنے سوالات ..... میں پہلے سے مجروح..... بلی بے ہوش و مدہوش پڑی تھی ..... بلی تھوڑا ہلی ..... میں پریشان کھڑی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی کہ کہیں سے ایک ملنگ آ نکلا..... میرے پاس آ کر کہا..... بابا اللہ کے نام پر کچھ دے دو، کل سے بھوکا ہوں ..... دو روپے دے دو بابا۔

میں نے کہا، میرے پاس تو ایک دھیلا تک نہیں، ٹھہرو میں اس مریضہ کی جیب ٹٹولوں کچھ مل جائے ..... جیسے ہی میں نے ہاتھ بڑھایا، بلی نے اپنی جیب کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور بولی ..... ملنگ کے ہاتھ میں بہت سے پیسے ہیں اور تم میرے پیسوں کے پیچھے پڑی ہو، اسے کہو پہلے وہ خرچ کرے۔

بلی کی یہ بات سن کر ملنگ نے اپنی راہ لی، کہیں بلی میرے ہی پیسے نہ لے لے۔

بلی اٹھ کر بیٹھ گئی..... کافی زخمی ہو گئی تھی ..... میں نے اسے تھوڑی بہت تسلی دی، پھر ہم دونوں زخموں سے چور گھر پہنچے۔

بکی بے چاری پہلے سے بڑی خوبصورت تھی اب جو زخمی ہوئی تھی بس میرا دل نکالنے کی کسر رہ گئی تھی ......اس میں اور چڑیل میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بکی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گئی...... بے ہوشی میں بڑبڑانے لگی ......کبھی منشی تو کبھی کنڈکٹر کی آوازیں نکالتی رہی ......چلو خالہ چلو ......تھوڑا آگے ......آنٹی یہاں بیٹھو ......تھوڑا آگے خالہ تمھیں دیکھ کر گراہک بھاگ جائیں گے۔

گھنٹے ڈیڑھ کے بعد بکی کو ہوش آگیا اور وہ توبہ کرنے لگی کہ اسے گدھا گاڑی پر جانا منظور ہے مگر بس میں نہیں جاؤں گی۔

بکی کی باتیں سن کر میرے کانوں میں بھی وہیں آوازیں وہی باتیں گردش کرنے لگی...... بچے آپ کھڑے ہو جاؤ......چلو جان کوشش ......تھوڑا ادھر اڑے......ان کو چھت پر چڑھاؤ......استاد ساڑھے ستائیس منٹ ہوئے ہیں......اڑے تم سیٹی مارو......استاد وہ نیا انڈین کیسٹ تو لگاؤ......۔

من ہی من میں سوچنے لگی کہ......لوکل بس کا حال بالکل ہم عوام جیسا ہے......لوکل بس ہم جیسے عام لوگوں کی روزانہ کی زندگی کا ایک عکس ہو جیسے۔

وہ دھکم پیل ......وہی شور وغل ......وہی بے ترتیبی ......

لوگوں کو اپنی منزل پر پہنچنے کی خواہش ملتے دھکے، کتنی ذلت لاتی ہے۔

عام آدمی کی روزانہ کی زندگی لوکل بس کی سواری اور اس کی خواری کی بہترین شکل ہے۔ بکی اور میں ایک عام آدمی ہیں، جن کو زندگی کی اس دوڑ میں چلنے اور منزل تک پہنچنے کے لیے سسٹم کی لوکل بس پر چڑھنا اور دھکے کھانا لازم ہے۔

میرے خیالوں کی ترتیب ٹوٹی دیکھا کہ......

بکی سو گئی تھی اور نیند میں بھی لوکل بس کے منظر کو یاد کر کے بڑبڑا رہی تھی ......

اللہ مارے بکی کو، نیند میں بھی مسخرہ پن نہیں چھوڑا ......!

☆☆☆☆

منیر احمد بادینی

بلوچی سے ترجمہ: شرف شاد

دہشت

بس چلنے لگی تھی مگر پھر دھیرے دھیرے رُک گئی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا ایک مسافر دُور سے لمبے ڈگ بھرتا بس کی طرف آ رہا تھا۔ شاید ڈرائیور نے اُسے دیکھا ہو تو اُس کے لیے بس روک دی ہو۔ اوپر آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئی تھیں اور بس کے روانہ ہونے سے کچھ لمحے پہلے بوندیں بھی پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ مجھے خوف نے آ گھیرا۔ اگر یہ بارش اس طرح برستی رہی تو اپنی منزل پر پہنچنا میرے لیے ناممکن ہوگا۔ کیوں کہ میں وادی کے گاؤں اور اس کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کتنے ندی نالوں سے ہوتا ہوا ایک کچا راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہُوا وادی تک جاتا تھا۔ برسات کے موسم میں یہ راستہ کبھی کبھی ہفتوں تک بند رہتا تھا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ خُدا وسیلہ ساز ہے۔ یہ بارش جو خاران زور زور سے برس رہی ہے، شاید وہاں وادی میں ہو ہی نہ رہی ہو، کون کہہ سکتا ہے؟

جنوری کے آخری دن تھے۔ سردی زوروں پر تھی۔ مسافروں نے گرم پوشاکیں پہنی ہوئی تھیں۔ بس کی حالت بھی ایسی تھی کہ اس کی ایک بھی کھڑکی یا دروازہ اس حالت میں نہیں تھی جہاں سے سرد ہوا اندر نہ آتی ہو۔

وہ شخص جس کے لیے بس رکی تھا اب بس میں داخل ہو کر اپنے جسم کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹتا مختلف سیٹوں کے سرہانوں پر ہاتھ رکھتا ہوا آ کر میرے بائیں طرف بیٹھ گیا۔ بس کی یہی ایک سیٹ خالی تھی جس پر میں اکیلے بیٹھا تھا۔ اُس کے وہاں بیٹھنے سے مجھے خوشی ہوئی کیوں کہ سفر میں کوئی بات چیت کرنے والا مل گیا تھا۔

وہ ایک جوان آدمی تھا اور ڈیل ڈول سے صحت مند اور طاقتور دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے تمام بال داڑھی سمیت کالے تھے۔ البتہ اُس کی داڑھی کچھ لمبی تھی شاید کافی مُدت سے اُسے بنانے کا اُسے موقع نہ ملا ہو۔ اُس کے کمبل اور کلائی میں بندھی گھڑی سے لگ رہا تھا کہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنی خُو بُو سے وہ خاموش اور منکسر المزاج دکھائی دیتا تھا۔ جیسے بیٹھتے وقت اُس نے مجھ سے پوچھا تھا آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے۔؟ اُس کا یہ کہنا مجھے اس لیے کھٹکا کہ کہیں میں خود اُس شریف آدمی کے لیے باعثِ تکلیف تو نہیں ہوں ....!

جب بس روانہ ہُوئی تو اُس نے اپنے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سُلگایا۔ اپنی بڑھی ہوئی

داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سر جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ شاید بارش کا نظارہ اُسے پسند نہیں تھا۔ دوسروں سے بات کرنا بھی۔ اس لیے میں نے اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

جب بس تین چار گھنٹے سفر کے بعد مین روڈ کو چھوڑ کر وادی کے کچے راستے پر اُتر گئی تو ایک ایک کر کے بس کے بہت سے مسافر راستے میں آنے والے دیہاتوں میں اُترتے گئے۔ اب بس میں قصبے کے اکا دکا مسافر رہ گئے تھے۔ اُس کو بھی شاید وہاں تک جانا تھا جس کا اُس نے ابھی تک اظہار نہیں کیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ آگے کسی گاؤں میں اُتر جائے کیوں کہ وادی ابھی کافی فاصلے پر تھی، بہت سے ایسے مسافر تھے جنھیں پہلے اُترنا تھا شاید ان میں وہ بھی ہو۔ میں دیکھ رہا تھا وہ کہاں اُترتا ہے؟

میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اُس کے پاس کوئی سامان نہ تھا سوائے ایک کمبل کے۔ کوئی بیگ نہ بستر نہ کوئی گٹھڑی وغیرہ۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ ڈیل ڈول اور اپنی حرکتوں سے اس علاقے کا نہیں لگ رہا تھا، کیوں کہ محکمہ تعلیم میں اپنی ملازمت کے ان چھ مہینوں میں، میں وادی کے تمام تر لوگوں سے واقف تھا۔ وہ سب غریب اور نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ یہ شخص جو میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اُن سے الگ تھا، لیکن وہ وادی میں کیوں جا رہا تھا؟

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید وہ وہاں نوکری کے سلسلے میں جا رہا ہو، لیکن وادی میں سرکاری نوکری بس ایک ہی تھی، وہ تھے مڈل سکول کے دو ٹیچر جن میں ایک وادی کا مقامی باشندہ تھا جو پرائمری سیکشن میں پڑھاتا تھا اور دوسرا سرکاری ملازم خود میں تھا اسی سکول کا ہیڈ ماسٹر۔ قلات سے میری پوسٹنگ چھ مہینے پہلے اُس وقت یہاں ہوئی تھی جب قصبے کے پرائمری سکول کو اپ گریڈ کر کے مڈل سکول بنایا گیا تھا۔ تین چار مزید پوسٹیں ابھی تک خالی تھیں جن کے لیے کوئی بھی وادی میں آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ خود میرے لیے بھی وادی ایک قید خانہ تھا لیکن بحالتِ مجبوری میں اپنے شب و روز گزار رہا تھا۔ اس لیے میں سمجھ نہیں سکا یہ آدمی وادی میں کیوں جا رہا ہے؟

بوندیں اب بھی برس رہی تھیں لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ ہلکی تھیں۔ ہلکی بارش سے پہاڑوں کا پانی دیر سے آتا تھا اس لیے راستہ بند ہونے کا خطرہ کم تھا۔

ایک دو مسافروں کے اترنے کے بعد اب بس کی آخری منزل قصبہ تھا، جہاں کے صرف تین مسافر رہ گئے تھے، میں، وہ شخص، اور ایک دکان دار، جو میری جان پہچان والا تھا۔ وہ گاؤں کی اکیلی دکان کا مالک تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا لیکن بادلوں کے گھیرے میں تھا۔ پہاڑیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اچانک جب ہماری بس ایک اُترائی میں اُتری تو ایک پھیلا ہوا میدان چھوٹی پہاڑیوں اور خالی زمین سمیت ہمارے سامنے تھا جو بارش کے غبار میں تاریک دکھائی دے رہا تھا ہم جان نہیں سکتے تھے کہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟

بس دندناتی ہوئی میدان کو پار کر کے پہاڑیوں اور ریت پر مشتمل وادی کے قصبے میں پہنچ گئی۔ سکول

کے سامنے اپنے اڈّے پر رُک گئی۔ دکان دار نے ہم سے ہاتھ ملایا اور اپنی راہ لی۔ سکول کا چپراسی میرا سامان سمیٹنے لگا۔ وہ شخص جس نے چُپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا تھا میرے ساتھ ہی اُتر گیا اور میں حیرت میں پڑ گیا کہ وہ کہاں جائے گا۔ کس کا مہمان ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟

جب میں سکول کی چار دیواری میں داخل ہُوا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ سکول کے تین کمرے تھے۔ دو کمروں میں کلاسیں لگتی تھیں۔ تیسرا میرے تصرّف میں تھا۔ ٹیچروں کی رہائش کے لیے الگ کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں اسی کمرے میں گزارا کر رہا تھا جو دراصل سکول کا اسٹور تھا۔ اب جو وہ نامعلوم آدمی میرا مہمان تھا تو اُسے بھی اسی کمرے میں جگہ دینی تھی۔ سکول کے چپراسی عرض محمد نے میرے سامان اور راشن کمرے کے ایک کونے میں رکھے۔ آتش دان میں آگ سُلگائی۔ لمحہ بہ لمحہ کُہر اور سردی کا زور بڑھ رہا تھا۔ آگ کمرے کے ماحول کو خوشگوار بنائے ہوئے تھی۔ عرض محمد نے لالٹین جلا کے انگیٹھی کے اوپر رکھ دی۔ میرا مہمان، اجنبی خاموشی سے آگ کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس کی نظریں مسلسل آگ کے شعلوں پہ لگی ہوئی تھیں۔ عرض محمد کبھی اُسے دیکھتا اور کبھی مجھے۔ شاید وہ مجھ سے جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے، اور کہاں سے آ رہا ہے۔ لیکن پھر وہ کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ کوئی موقع نہیں تھا کہ میں مہمان کے بارے میں اُسے بتاتا تھا۔

میں نے عرض محمد سے کہا کہ وہ مہمان کے لیے مُرغی کا انتظام کرے اور چاول بھی پکائے تاکہ ہم اُسے ایک اچھا کھانا کھلا سکیں۔

جب میں باہر کے کاموں سے نپٹ کر آیا تو آتش دان کے سامنے بیٹھ گیا جہاں عرض محمد دیگچی چھڑائے ہوئے تھا اور ہم دونوں (مہمان) اُسے دیکھ رہے تھے۔ دیگچی کے ایک کونے میں عرض محمد کیتلی بھی رکھے ہوئے تھا۔ وادی کے علاقوں پر اب رات کا خیمہ بادلوں کے ساتھ پوری طرح تنا ہوا تھا اور موسلا دھار بارش اب بھی جاری تھی۔

چائے پینے کے بعد عرض محمد نے دیگچی اُتاری اور روٹی پکانے کے لیے گاؤں چلا گیا۔ سکول کی عمارت گاؤں سے ذرا فاصلے پر تھی۔ جہاں عرض محمد کا گھر تھا۔ وہ روٹیاں گھر میں پکواتا تھا۔ جب عرض محمد چلا گیا تو لپکتی آگ کی روشنی میں اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا: ”تم کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟“

وہ پہلی بار مجھ سے نظریں ملانے کے بعد مسکرا کر کہنے لگا ”آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں، چھوڑو ان باتوں کو، بس میں تمھارا مہمان ہوں۔“

”لیکن یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔“ میں نے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ واضح ہو............
راستے میں بھی تم چُپ رہے اور میں نے بھی پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تم ایک مسافر تھے اور ہم دونوں کو اپنی اپنی راہ لگ جانا تھا۔ اس لیے سوال جواب کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا جب مجھے معلوم ہوا تمھیں اپنی منزل کی

خبر نہیں ہے اور تم میرے ساتھ ہی چلے آئے تو صاف بات ہے کہ میرے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات تو اُٹھتے ہی ہیں؟ ......'' میں نے کم ہوتی آگ کی تپش کو بڑھانے کے لیے کچھ کوئلے آتش دان میں رکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی وہ خاموشی سے سُنتا رہا۔ ''طور طریقوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم اس علاقے سے نہیں ہے، میرے سوالوں کے تسلی بخش جواب تمھارے پاس ہیں؟ ...... میں یہ سب کچھ اس لیے جاننا چاہتا ہوں تا کہ میں سکون کی نیند سو سکوں۔ اگر میں جان نہیں پایا تم کون ہو، کہاں جا رہے ہو تو میں ٹھیک طرح سو نہیں پاؤں گا۔

''ان سب چیزوں کو جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے؟'' اُس نے ایک اور سگریٹ جلایا اور کہنے لگا۔ ''لیکن میرے لیے یہ اطمینان بخش بات ہے کہ میں تمھارے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں کیوں کہ آپ ایک ٹیچر ہیں' اور میں ٹیچروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ...... ایک ٹیچر کا مہمان ہونا میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے!''

''میں تمھیں جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے اپنا پہلا سوال دُہرایا۔

''کیا کرو گے جان کر ...... آدمی جتنا جانتا ہے، اتنا ہی اپنے آپ کو خراب کرتا ہے۔ پریشان کرتا ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں اپنے بارے میں بات کروں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خود سمجھ لیں کہ میں کون ہوں ...... اب میں تمھارا مہمان ہوں تو آنے والے دنوں میں تم کو سب پتہ چل جائے گا۔ ......'' اُس نے سگریٹ ختم کرنے کے بعد آتش دان میں پھینک دیا۔ وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے وہ جواب کا منتظر ہو اور مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی جس میں نہ صرف شرافت اور سادگی تھی بل کہ اس میں فکر اور تعقل بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ اُس کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ لیکن مجھے اُس کا بغیر کسی سبب کے گھر سے نکلنا اور کسی انجان آدمی کا مہمان بننا بہت عجیب لگ رہا تھا۔ میں اس راز کی تہہ تک پہنچنے کا خواہاں تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک شخص اپنے گھر سے نکلے اور اُسے اس کا پتہ بھی نہ ہو وہ کہاں جا رہا ہے۔ اگر یہ سب ایک اسرار نہیں تھا تو کیا تھا پھر وہ بھی ایک ایسے شخص سے یہ سب کچھ سرزد ہونا، جو میرے نزدیک عقل اور شعور کا ایک پیکر نظر آ رہا تھا، یہ سب کچھ میری فکر اور سوچ سے بالاتر تھا۔ میں اس راز سے ہر حال میں پردہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ مہمان بھی اتنا اچھا تھا کہ بار بار اس کو تنگ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر وہ کیا سوچے گا کہ میں اُس سے اتنا کیوں پوچھ گچھ کر رہا ہوں ...... اس لیے میں نے سوچا، وہ میرے ہاں ہی ٹھہرا ہوا ہے کل صبح یا شام کسی وقت اس راز سے پردہ اُٹھ ہی جائے گا۔؟

عرض محمد نے کھانا لگا دیا تو میں نے مہمان کے ساتھ کھانا کھایا۔ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں نے اُس سے کہا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں کیوں کہ اپنے مہمانوں کی خدمت کرنا ہماری روایت میں شامل ہے۔

میں نے اُس کے لیے بستر لگایا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ جب کہ میں کمرے کے دوسرے کونے پر اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ بارش برس رہی تھی۔ دور گاؤں میں کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی اور اندھیرے کمرے میں مہمان کے بارے میں سوچتے ہوئے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صُبح مہمان اُٹھا تو میں نے اُس کے ساتھ ناشتہ کیا اور سکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔ بارش رُک چکی تھی۔ بادل دُور دُور بکھر گئے تھے کہیں کہیں نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ کبھی کبھی انھی ہلکے ہوتے بادلوں میں سورج جھانکتا تھا اور دُور گاؤں کے اُداس گھر، فصلیں اور جھونپڑیاں یوں نظروں میں واضح ہو جاتیں جیسے کوئی طاقتور کیمرے سے ان کا کلوز اپ شاٹ لے! سکول کے بچے بہتی ناک اور چمکتے چہروں کے ساتھ سکول میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے مہمان سے اجازت لی اور دوپہر تک بچوں کے ساتھ مشغول رہا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ساتھ کھایا۔ بادل ایک بار پھر چھا گئے تھے لیکن اس کے ساتھ گوریچ (موسمِ سرما میں چلنے والی سرد ہوا) کا ایک جھونکا آیا اور سارے بادلوں کو روئی کی طرح بکھیر کر پہاڑوں کے اُس طرف لے گیا اور چاروں طرف صرف اور صرف گوریچ کا راج ہو گیا۔ جس کا چلنا ایسے تھا جیسے کوئی اُسترے سے بدن کے گوشت چھیلے۔ ہم دونوں شام تک آتش دان کے سامنے بیٹھے رہے۔ پھر ہم باہر نکلے۔ سکول کے سامنے ٹیلوں کا ایک لامختتم سلسلہ تھا۔ جو حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ انھی ٹیلوں پر ریت آ کر جم جاتی جس سے وہ ریتوں کے نیچے دب جاتے۔ سورج کی روشنی میں رات کی بارش سے بھیگی ریت اب خشک ہو رہی تھیں جن کے نیچے دبے ہوئے ٹیلے چمک رہے تھے۔ مہمان اپنی شال اوڑھے، مسلسل سگریٹ پی رہا تھا۔ جب ہم سکول کے سامنے ایک بڑے ٹیلے پر پہنچے تو اُس نے اپنے سگریٹ کو پاؤں کے نیچے مَسلتے ہوئے میری جانب دیکھا اور شائستگی سے کہنے لگا: ”آپ کل سے مسلسل پوچھ رہے ہیں کہ میں کون ہو، کہاں جا رہا ہوں؟ آیئے میں آپ پر سب واضح کرتا ہوں …… یہ مناسب بھی نہیں ہے کہ میں آپ کے ہاں ٹھہرا ہوں۔ آپ کا کھانا کھا رہا ہوں، اور آپ کو پتہ بھی نہ ہو کہ میں کون ہوں؟ …… دراصل کچھ عرصے سے مجھے احساس ستا رہا تھا کہ میں کسی ایسی جگہ جاؤں جہاں مجھے زندگی کا کوئی خوف کوئی دہشت دامن گیر نہ ہو۔

بچپن سے ایک دہشت میرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ آپ اسے خوف نہیں کہہ سکتے، یہ خوف سے کچھ زیادہ ہی طاقتور شے ہے۔ خوف میں، آپ ایک بیرونی علت سے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو آپ بیرونی علتوں کو غلط معنی دیتے ہیں اور خوف تمھارے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ کچھ الگ ہے۔ یہاں آپ زندگی سے ایسا خوف محسوس کرتے ہیں۔ جیسے یہ آپ کو کھا رہی ہو۔ تمھیں نگل رہی ہو۔ ہڈیوں اور گوشت میں چھید ڈال رہی ہو۔ یہ ایک نہایت ہی عجیب احساس ہے۔ جب ایک بار آدمی اس کے شکنجے میں پھنس جائے تو وہ، پہلے جیسا نہیں رہ سکتا۔ اُس کے لیے دوسرے تمام احساسات ہیچ ہو جاتے ہیں۔ سوائے اسی ایک دہشت کے احساس کے …… پتہ نہیں مجھ سے کیا گُناہ سرزد ہوا ہے کہ زندگی کی دہشت نے مجھے شکنجے میں کس لیا ہے۔ شاید میرا خمیر کچھ اس طرح کا ہے کہ میں زندگی کو ایک الگ نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ حساس ضرور ہوتے ہیں۔ مگر اپنی انا کو خراب نہیں کرتے کہ وہ زندگی کو ایک دہشت سمجھیں۔ وہ خود کو حساس ظاہر کرتے ہیں لیکن اصلاً ہوتے انا پرست ہیں جب کہ زندگی کی دہشت سے

دوچار ہونے کے بعد آپ الگ راہ لگ جاتے ہیں جس میں کوئی انا پرستی نہیں ہوتی۔ زندگی تم کو ایک خوف میں مبتلا کرتی ہے، اور تم مجبوراً اس کی ہر چیز کو الگ ڈھنگ سے دیکھنے لگتے ہو...... اس کا مطلب ایک انا پرست کا حساس ہونا نہیں ہے۔ بل کہ اس میں زندگی کے معنی پوشیدہ ہیں ...... میرے مطابق اگر کوئی زندگی کی دہشت سے واقف ہے تو وہ خود زندگی سے واقف ہے۔ اگر وہ اس کے بارے میں نہیں جانتا تو وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ حساس ہونا، خوف میں مُبتلا ہونا نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم زندگی کو اس طرح قبول نہیں کرتے ہو جس طرح دوسرے لوگ قبول کرتے ہیں۔ بل کہ تم اس سے بلند ہونے کی کوشش کرتے ہو اور اس کی دہشت کا سامنا کرنے کے بعد تم سمجھ سکتے ہو کہ دراصل زندگی کیا ہے...... شاید تمھیں معلوم نہیں ہم کس قدر غلط چیزوں میں زندگی برباد کرتے ہیں؟...... آپ ایک ایک چیز کا نام لیں میں آپ کو بتا دوں گا۔ ہم وطن سے، لوگوں سے، قوم سے محبت کو، اپنے قبیلے کے جوش اور جذبے کو، اور دوسرے لوگوں سے میل ملاقات کو کس قدر غلط معنی پہناتے ہیں۔ جب کہ ہم اس معاملے میں بالکل کورے اور نا سمجھ ہوتے ہیں۔ صرف زندگی کی دہشت کو سمجھنے کے بعد ہی ہمیں احساس ہو سکتا ہے کہ وطن کیا ہے؟ قوم، قبیلہ کیا ہے؟ علم کیا اور عمل کیا ہے؟ فی الحال مختلف لوگوں کی دہشت ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ فلاں کام کرو گے تو تمھیں فلاں آسودگی ملے گی۔ سیاست دان ہمارے خارج کا اور مُلا ہمارے باطن کا استحصال اسی طرح سے کرتا ہے۔ سیاستدان اور مُلا دونوں ہمیں یہ موقع ہی نہیں دینا چاہتے ہیں کہ ہم زندگی کی دہشت کا سامنا کریں اور اپنی خودی کا سامنا کر کے اپنا مقام بنا سکیں۔ اپنا مالک آپ بنیں...... میرے بھائی، انسان کہنے سے کوئی اپنی زندگی کا مالک نہیں بن سکتا جب تک وہ زندگی کی دہشت سے دوچار نہ ہوا ہو اور اس کو سمجھ نہ سکا ہو...... جب تم اس کو جان گئے تو پھر ایک قوم ایک آدمی اور ایک سوسائٹی بن جاتے ہو، لیکن وہ لوگ جو زندگی کی اس دہشت سے ناواقف ہیں جس میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نہیں ہے...... تو وہ بس زندہ ہیں اور زندگی اُن کے لیے ایک وسیع میدان کی طرح پھیلی ہوئی ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اُن کی زندگی ہمیشہ اس طرح گزرتی ہے جو ہر قسم کی آسودگی سے خالی ہوتی ہے اور اُن کی اسی مفلسی اور بدحالی پر لوگ اپنی سیاست اور ملائیت کو چمکاتے ہیں اور وہ لوگ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ زندگی کی دہشت کو جان لیں اور اپنی زندگی تبدیل کریں...... مجھے بہت خوشی ہے کہ تم ایک ٹیچر ہو، تم اُن کو سکھا دو کہ زندگی کی دہشت کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب اپنے آپ کو جاننا ہے۔ باقی سارے نظریے، فلسفے سب فکری دھاگے ہیں جنھیں تم خود باندھتے ہو اور خود ہی توڑ دیتے ہو، صرف زندگی کی دہشت کا احساس لازمی ہے۔ یہ تمام فلسفوں سے بلندتر ہے۔ وہاں ایک فرد کھڑا ہو کر اپنے خُدا سے سوال وجواب کر سکتا ہے جس کے بعد سارے فکری سسٹم بے کار ہو جاتے ہیں۔ بس یہی ایک دہشت زدہ انسان جان سکتا ہے کہ اُس کے، سوسائٹی، قوم قبیلے کا مطلب کیا ہے...... تم اسی دہشت کے مالک ومختار رہو اور اس کو جان لو...... اور میں اس دور افتادہ علاقے میں اس لیے آیا ہوں کہ میں سمجھ سکوں کہ انسان زندگی کی اس دہشت سے بلند کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر اس کے بعد زندگی اس کے لیے دوستی اور محبت کے خوبصورت دروازے وا کرتی ہے اور وہ کینہ و نفرت اور جنگ و جدل سے دامن چھڑانے لگتی ہے...... کیوں کہ یہ تمام جذبے دہشت کے احساس کے دشمن ہیں یہ تمھیں پستی میں دھکیل دیتے ہیں۔ جب کہ دہشت کا احساس تمھیں بلند درجے پر فائز کرتا ہے۔ ابھی تک تم شخصیات کی تعریف و ثنا سے تھکتے نہیں ہو۔ ابھی تک تم زندگی کے ٹھوس حقیقت کی نشے میں اس قدر بدمست ہو کہ تمھارے لیے زندگی ایک گریز، ایک ناچاقی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے لیے تم سب کے سامنے جھکتے ہو۔ سب کا آداب بجالاتے ہو۔ ابھی تک تمھاری سوچ تم سے جھوٹ بولتی ہے کہ صرف خدا نے تمھیں زمین پر پیدا کیا ہے......... وہیں سے تمھارے سارے فیصلے ہوتے ہیں۔ تم چاہے کتنی بھی شدت سے اپنا مقدمہ بیان کرو۔ وہ کمزور ہوگا۔ کیوں کہ تم زندگی کی دہشت سے انجان ہو...... ابھی تک تم حیوانوں کی طرح زندہ ہو۔ تم نے سر اُٹھانا نہیں سیکھا ہے۔ تم اُن روایتوں کا پاسدار ہو جو نیست و نابود ہو رہی ہیں۔ مٹ رہی ہیں۔

اب اگر تمھیں زندہ رہنا ہے تو پھر زندگی کی دہشت سے دوچار بھی ہونا ہوگا کیوں کہ یہ وہ احساس ہے جس میں سارا قوم، قبیلہ، ملک اور وطن ایک ہیں۔ جس کا بھی سامنا اس دہشت سے ہوا ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ ان ساری چیزوں کا مطلب کیا ہے۔ زندگی یہ نہیں جو تمھاری نظروں کے سامنے ہے۔ زندگی کی ایک اور تصویر بھی ہے جس کا عکس میری اور آپ کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اس کا احساس تم کو اُس وقت ہو جائے گا جب تم زندگی کی دہشت کا سامنا کرو گے...... اور خُدا کرے کہ تمھارا سامنا اس دہشت سے ہو جائے۔ تا کہ تمھیں پتہ چل سکے کہ ان بوسیدہ روایتوں سے ہٹ کر بھی کوئی ایسی چیز ہے جس میں برداشت، علم، دوستی، شعور اور عقل کی بادشاہی ہے۔ تم ان چیزوں سے جتنا دور رہو گے اُتنی ہی یہ دہشت پروان چڑھے گی جوان کے سامنے مضبوطی سے استادہ ہے۔ پھر اس کے بعد تم اپنے آپ کو جان پاؤ گے اور دُنیا کو سمجھ پاؤ گے...... ابھی تک تمھارا ماضی اس احساس سے بھاگنے، اسے کھونے سے عبارت ہے۔ تمھارے مستقبل کی تاریخ اسی دہشت کا سامنا کرنے سے صحیح ہو سکتی ہے ورنہ تم اس طرح بے نام و نشان ہو جاؤ گے جیسے دوسری قومیں ہوئی ہیں!......"

سورج بلند پہاڑوں کے کوہانوں کے پیچھے چُھپ رہا تھا اور میں حیران ہو رہا تھا کہ میں کیا سُن رہا ہوں...... کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ یہ آدمی ولی، بُزرگ، یا کوئی صوفی ہے یا کوئی بھوت...... اور وہ کس سے مُخاطب ہے؟...... اُس کی باتوں میں کتنی طاقت ہے، کتنا زور ہے کہ میں اُن کو سمجھ نہیں پا رہا ہوں مگر میں اتنا جانتا ہوں یہ تمام باتیں اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہیں۔

میں نے سورج کو غروب ہوتے دیکھا تو مہمان کو اشارہ کرنا چاہا کہ وہ اُٹھے تا کہ ہم گھر جائیں لیکن مجھ پر اس کا سحر اس قدر طاری تھا کہ میں خود میں یہ جرات پا نہیں سکا کہ اُس کو اس طرح اُٹھنے کا کہہ سکوں۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر اُس سے کہوں کہ آپ یہاں سے مت جائیں۔ ہمیشہ کے لیے میرا مہمان بن جائیں۔ تا کہ میں آپ کی باتیں سُنتا رہوں، ہمیشہ، اسی طرح روانی سے......!! لیکن

اُس نے مجھے موقع نہیں دیا، پھر کہنے لگا: ’’کچھ دن پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں وادی میں جاؤں۔ یہ ہمارے مُلک کا ایک دُور افتادہ علاقہ ہے۔ کچھ دن میں وہاں کسی کا مہمان بن جاؤں۔ وہاں میں اُن معصوم اور ناسمجھ لوگوں میں رہوں۔‘‘ جب اُس نے سگریٹ سُلگایا تو میں نے پوچھا:

’’دہشت، دہشت گردی تو نہیں ہے۔‘‘

وہ مسکرایا جس طرح ہم آج کل دہشت گردی کے ماحول میں ہمیشہ دہشت گردی کے بارے میں بات کرتے ہیں، کہنے لگا: ’’دہشت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی ایک ایسا سفر ہے کہ اس میں ہر قدم، ہر لمحے میں ایک ہنگامیت ہے۔ ایک کرب ہے۔ اگر کوئی اس کو نظر انداز کرنا چاہے تو وہ نقصان میں ہے۔ اگر تم اس کا مقابلہ کرو گے تو تمھاری زندگی تمھاری ہو جائے گی، اس پر کسی فلسفے کا تسلّط ہو گا نہ کسی نظریے کی حکمرانی۔ تم ان سب سے بلند سوچنے لگ جاؤ گے یا بلند ہو جاؤ گے کیوں کہ عظمت صرف دوستی اور محبت، دوسروں کا خیال رکھنے، برداشت کرنے میں پنہاں ہے۔ ان کے علاوہ کوئی کوئی عظیم نہیں ہو سکتا نہ ہی کسی اور چیز سے بلندی کا رُتبہ پا سکتا ہے۔ باقی تمام چیزیں تمھیں پستی کی طرف لے جائیں گی۔ بلندی کی جانب کوئی راستہ جاتا ہے تو وہ دہشت ہی ہے کچھ اور تمھاری منزل نہیں ہو سکتی۔ یہ تمھاری کامیابی کا پہلا سبق ہے ...... میں یہ نہیں کہتا کہ تم دہشت کو اپنی منزل سمجھ لو بل کہ اس سے بلند تر ہو جاؤ...... انگریزی میں اس کو Tragic Sense Of Life کہتے ہیں جو Terrorism سے بالکل الگ چیز ہے۔ دہشت یا Tragic Sense Of Life تمھیں اس لیے آن گھیرتی ہے کہ زندگی کی کوئی حتمی معنی موجود نہیں ہے۔ بل کہ یہ ایک کرب مُسلسل ہے۔ جس کا علاج بس تمھارا عمل، کردار، حرکت ہے۔ زندگی کا مقصد ہی حرکت ہے۔ اس میں برداشت، محبت، خیال رکھنا سب شامل ہوتا ہے۔ ان کے بغیر تمھاری سب حرکتیں دہشت گردی (Terroism) کے زُمرے میں آتی ہیں۔ اس کے لیے تمھارے ہر فرد کو یہ سمجھنا پڑے گا تا کہ وہ اُس درجے تک پہنچ سکے کہ وہاں وہ زندگی کی عظمت پا سکے۔

’’لیکن یہ بہت دشوار ہے۔‘‘

’’مگر حتمی بات بھی یہی ہے۔‘‘ اُس نے کہا: ’’نہیں تو تم اُسی درجے میں رہو گے، جس درجے میں ابھی ہو تمھارا اگر یز، تمھارا قاچاق ہونا، تمھارا علم سے بے بہرہ ہونا اور دوسروں کے سامنے جُھکنا! یہ سب تمھیں پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔‘‘

وہ اُٹھا اور ہم سکول کی جانب روانہ ہوئے۔ رات کی خاموشی، گاؤں کا سناٹا اور اُس کی باتیں، مجھے خود سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار ایسی بے سروپا اور اُلجھی ہوئی باتیں سُن رہا تھا لیکن مہمان کی باتوں میں کس قدر اثر تھا، یا خُدا ...... یا خُدا یہ زندگی کیسے سمجھ میں آئے؟

رات، ہم دونوں بہُت دیر تک بیٹھے رہے، لیکن اب وہ بہت کم گفتگو میں حصہ لے رہا تھا۔ میں اُس

سے بہت سی باتیں پوچھ رہا تھا۔ جن کے وہ ہوں، ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ جیسے اُس نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب اُسے کچھ بھی کہنا نہیں ......! میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔

پھر ہم لیٹ گئے۔ میں سوچتا رہا۔ بہت سے سوالات میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ میں نے سوچا کل میں اُس سے کچھ اور پوچھ گچھ کروں گا کیوں کہ اُس کی باتوں کے بعد میرے ذہن میں بہت سے سوالات اُٹھے تھے جن کے جواب جاننا میرے لیے از حد ضروری تھا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو مہمان ندارد۔ میں نے عرض محمد سے پوچھا اُس کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا؟ میں آج کے دن تک منتظر ہوں کہ وہ لوٹ آئے اور مجھے میرے سوالوں کا تشفی بخش جواب دے۔

☆☆☆☆

عندلیب گچکی

بلوچی سے ترجمہ: محسن بالاچ

عورت

میں بھی ایک انسان ہوں
میرے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے
میرے جذبات بھی مری آنکھوں کے سمندر میں غوطہ زن ہیں
میں بھی ہواؤں میں اڑنا چاہتی ہوں
میں بھی دنیا کی خوبصورتیاں دیکھنا چاہتی ہوں
میں بھی دوسرے بچوں کی طرح کھیلنا چاہتی ہوں
میں بھی بہار کی کلیاں دامن میں بھرنا چاہتی ہوں
میں بھی عشق کی معراج حاصل کرنا چاہتی ہوں
(سُن) اے مرے ارمانوں کے قاتل
میں بھی اک انسان ہوں
میرے سینے میں بھی دل ہے دھڑکتا ہوا

☆☆☆☆

تخلیق و ترجمہ: غنی پہوال

الوداع

تمھیں یاد ہے۔۔۔!
وہ سحرانگیز شام، اڑتی مرغابیوں کا غول
اور دھند میں ڈوبی ہوئی جھیل
پھر اچانک اس حسیں منظر کے
سارے رنگ چرا کر
تمھارے چنچل ارمانوں کا
آ کر میری چاہت کے برہنہ سینے پر
سر رکھ کر آنکھیں میچ لینا
اور پھر کہرے کی طرح
اک تسلط جماتی مدہوشی میں
ہم دونوں کی شراکت داری قائم رہنا
طویل وقفے کے بعد
جب مجھے میرا اپنا پن نصیب ہوا
تو منظر بدل چکا تھا
ایک بوڑھا شخص
وقت کی شکستہ کشتی پر سوار
اپنے ابدی کھوج کے سفر پر رواں تھا
اور تم ساحل پر کھڑی اسے الوداع کہہ رہی تھی
مگر اے زندگی۔۔۔!

احساسات کے اس نامیاتی لمحے،
سحر انگیز شام، مرغابیوں کے جھنڈ
اور دھند میں لپٹی جھیل کے منظر کے ساتھ
تمھاری روح کے آنگن میں
میں ہمیشہ مہکتا رہوں گا
سدا بہار پھولوں کی طرح

☆☆☆☆

خوشحال خان خٹک

پشتو سے ترجمہ: سلطان فریدی

نعمتِ دنیا یہاں ہر رنگ ہے
کون سی دیدار کی ہم سنگ ہے؟

عشق وہ کرتا ہے جو مجنون ہو
نا بلد ہر صاحبِ فرہنگ ہے

عشق میں ہر چیز میں نے چھوڑ دی
جب کہ وہ شیدائے نام و ننگ ہے

میں نے سوچا حالِ دل دوں گا بتا
کیا کروں غماز اُس کے سنگ ہے

امن میں عاشق ہے جاتا کام سے
عشق تو پیوستِ حالِ جنگ ہے

دوسرا اورنگ ہو پیدا تو خوب
ورنہ غم ہے جب تلک اورنگ ہے

خاطرِ خوش حال ہے صیقل، مگر
اُس کے دل میں، لگتا ہے کچھ زنگ ہے

☆☆☆☆

نوٹ: عالمگیری دور میں خوشحال اڑھائی سال قلعہ رنتھمبور میں مقید رہے۔ وہاں خوشحال نے دو کتابیں: فراق نامہ اور دستار نامہ لکھیں۔

ہم سنگ: ہمسر
اورنگ: اورنگ زیب عالمگیر

اقبال حسین افکار

پشتو سے ترجمہ: ثمینہ قادر

تمنا

زندگی درد ہے لیکن حسین ہے
اسی کا نام حسنِ جاوید ہے
ازل سے دل میں تیرے جو بسی ہے
تمنا ہر کسی کی بس یہی ہے
دلِ دیوانہ کی بھی ہے تمنا
صنم رُخسار تیرے گُل کے مانند
سدا مسکائے تیرا پھول چہرہ
بدن تیرا تھرکتا اور لرزیدہ رہے
حُسن تیرا سدا بہار رہے
مہک تیری جہاں میں ہر سو پھیلے
دلِ نادان کی بس ہے یہ تمنا

☆☆☆☆

طاہر آفریدی
پشتو سے ترجمہ: زینت سلطانہ

خوف

گھر کی دیواریں اونچی کروانے کے باوجود خوف میرے دل میں پنجے گاڑ چکا تھا۔ دیواروں پر کانٹا تاریں لگوا کر میں تھوڑا مطمئن ہو گیا تھا کہ چلو اب کم از کم دیوار پھلانگ کر کوئی نہ آ سکے گا۔ اپنے مزید اطمینان کے لیے میں نے دروازے اور کنڈے مضبوط کروا دیے اور بڑے گیٹ پر ایک الیکٹرونک سسٹم بھی لگوا دیا تاکہ وہ خطرے کے وقت ہمیں باخبر کر سکے مزید یہ کہ چھت پر ایک مورچہ بنوا کر ایک تنومند شخص کو بطور چوکیدار بٹھا دیا جس کا انتخاب بھی میں نے بہت دیکھ بھال کر کیا تھا۔ یہ ایک سابقہ پنشن یافتہ فوجی تھا جو اپنی بہادری کے صلے میں کئی اعزازات حاصل کر چکا تھا، چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اور سینے پر تمغے سجائے لگتا تھا کہ ابھی دشمن پر یلغار کرتے ہوئے اس کے سینے میں گولیاں اتار کر آیا ہے۔ ہاتھوں کی سختی کو دیکھو تو ان میں بے رحمی اور وحشت نظر آتی ہے اس سے کسی بھی طرح کی رحم کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کا نام بہادر تھا اور اپنے نام ہی کی طرح وہ ایک بہادر انسان تھا۔ جب وہ اپنے فوج کے زمانے کے قصے مجھے سناتا تو میرے جسم میں جیسے خوف کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میدان جنگ میں اس کے ساتھ ہوتا تو شاید گولیاں چلائے بغیر مورچہ چھوڑ دیتا لیکن! نہیں میں اس وقت شاید اس کے ساتھ مقابلہ کرتا اور اپنی ہمت دکھاتا۔ میں اپنے گزرے وقت کو یاد کرتا ہوں تو خوفزدہ ہو جاتا ہوں کیوں کہ اس وقت میں بہت جرأت مند تھا اور بہادروں کے گروہ میں شامل تھا۔ اب جب کہ میں اپنا وہ زمانہ یاد کرتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ میں بھی ایک بہادر آدمی تھا اور ہر طرح کے خوف سے نا آشنا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت زندگی اس طرح کی تو نہ تھی جیسے اب ہے۔ اس زمانے میں رات کے اندھیرے میں تاروں کی روشنی میں سفر کے لیے نکل جایا کرتا تھا کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتا تھا......رات کو گھر کے آنگن میں اکیلا چارپائی پر لیٹ کر ستاروں کو دیکھا کرتا تھا اور آہستہ آہستہ نیند کی دیوی مہربان ہوتی تو سو جاتا جیسے کسی نے میٹھی آواز میں لوری سنائی ہو۔ اس وقت تو ہمارے گھر کی دیوار بھی نہ تھی اور نہ ہی گھر میں کوئی گدھا یا کتا وغیرہ ہوتا جو غل مچاتا نہ ہی کوئی ڈر تھا اور نہ ہی کوئی خوف۔ لوگ مجھے کہتے تھے کہ یار تم انسان ہو یا کوئی بلا.....تو میں لوگوں کی ان باتوں پر مسکرا دیا کرتا......لیکن اب یہ حال ہے کہ اگر چوکیدار اوپر سے کھانس دے تو میں سوتے میں ایسے ڈر جاتا ہوں کہ جیسے گھر میں ڈاکا پڑ گیا ہو یا کسی نے میرے سینے میں خنجر اتار دیا ہو...... پچھلا زمانہ مجھے سب یاد ہے۔ اب اس کی مثال ایک خواب یا سراب کی سی ہے اور خواب اور سراب کی کوئی

حقیقت نہیں ہوتی ...... ان دنوں میں جب رات کو ستاروں کی آنکھ مچولی اور چاند کی نرم سفید روشنی دیکھتا تھا تو دل ایک دم بے چین ہو جاتا اور میں گھر سے باہر دور ویرانے میں نکل جاتا اور کہیں ایک جگہ بیٹھ کر جھینگروں کی آوازیں سنا کرتا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ ویرانوں میں بھوت پریت ہوتے ہیں لیکن میری تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی بھوت مجھے ملے اور میں اسے اپنا دوست بنالوں مجھے کوئی ڈر نہ تھا لیکن یہ تو پرانی باتیں ہیں۔ اب تو اگر بجلی کی تیز روشنی ہو یا پنکھے کی ہوا سے کوئی اخبار یا کاغذ ہلنے لگے تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے کبھی تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آس پاس بہت سارے بھوت منڈلا رہے ہوں۔ وہ کیا دور تھا کہ جب سردی کی راتوں میں لحاف میں منہ چھپانے پر گھبراہٹ محسوس کرتا تو جا کر صحن میں سو جاتا اکثر رات کو بارش ہو جاتی تو صبح اٹھنے پر لحاف بھیگا ہوتا تھا۔ کیا خوب زندگی تھی! کتنی بے فکری اور بے پروائی تھی اور کتنا نڈر تھا میں! اصل زندگی بھی وہ ہی تھی، زندگی کے تمام مزے بھی اس وقت ہی تھے۔

اپنے ماضی کی تمام باتیں، لمحے مجھے یاد آتے ہیں تو میرا دل بے حد اداس ہو جاتا ہے ہے پھر بھی کیا کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ماضی تو ماضی ہے وہ پیچھے رہ جاتا ہے اور وقت آگے نکل جاتا ہے اور مستقبل دور سے اشارے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ البتہ مستقبل کے خواب تو میں اس وقت دیکھا کرتا تھا جب گھر میں ٹوٹے پھوٹے برتنوں اور ہانڈی چولہے اور مکڑی کے جالوں اور مٹی کے دیے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ اس وقت جب صبح کا سورج اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ میرے وجود کو تمازت بخشتا ہوا طلوع ہوتا تو میں ایک لمبی انگڑائی لیتے ہوئے بیدار ہوتا اور پاس رکھے مٹکے سے غٹاغٹ پانی پیتے ہوئے دور تک نظر دوڑاتا تھا ...... جب تک سلطانہ میرے گھر کی زینت نہ بنی تھی میں اسے روزانہ ایک نظر دیکھنے کے لیے دوپہر کی تپتی دھوپ میں کھڑا رہتا تھا، اس کی پائل کی جھنکار سننے کے لیے میرے کان ترس جاتے تھے۔ اس طرح سردیوں کی یخ بستہ راتوں میں بھی اسے دیکھنے کو میں بے تاب رہتا تھا، میرے بس میں ہوتا تو میں چاند کی ساری روشنی لے کر اس کے ماتھے پر سجا دیتا اس کے ہونٹوں کو پھولوں کی نرمی اور اس کے خوبصورت گالوں کو شفق سے سرخی چرا کر دیتا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے آپ کو پیار کی آگ میں جلا دیتا۔

اب جب کہ وہ میرے قریب میرے ساتھ ہے تو اس کی ہر بات میرے احساسات چکنا چور کر دیتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے میری زندگی میں یہ تمام تلخی صرف اس کے قرب کی وجہ سے آئی ہے، مجھے اب بھی اس سے محبت ہے لیکن اس میں وہ مٹھاس نہیں کیوں کہ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں اور وہ مجھے بغیر نمک کے کھانے کو روٹی دیتی ہے، انڈا بھی نمک کے بغیر ملتا ہے۔ گوشت اور گھی سے تو ایسے منع کرتی ہے جیسے وہ خوراک نہ ہو بل کہ کوئی زہر ہو۔ ڈاکٹر نے اسے یہ بتایا ہے کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے وہ مجھے چائے بھی پھیکی ہی پلاتی ہے کیوں کہ کافی عرصے سے مجھے شوگر نے گھیر رکھا ہے اور میں اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے ہاتھ مروڑتا

رہتا ہوں۔

مجھے کبھی ڈر خوف نہیں لگتا تھا اس لیے کہ میرا کوئی دشمن نہ تھا چور اور ڈاکوؤں سے بھی بے خوف، کیوں کہ نہ جیب میں کچھ تھا اور نہ ہی گھر میں مال و زر تھا۔ شوگر، بلڈ پریشر اور ہارٹ اٹیک کو میں نہیں جانتا تھا اور موت! موت اگر آ جاتی ہے تو میرا کیا لے جاتی۔

میرے گھر کے چاروں طرف نہ لمبی لمبی دیوارں تھیں نہ ہی گھر کا دروازہ ہوتا تھا، صندوق پر بھی تالا نہ تھا۔ ایک رات خوب بارش برسنے کے بعد بادلوں نے کسی طرف کا رخ کیا اور مٹی کی خوشبو نے ہمارے جسموں میں جیسے تازگی بھر دی ہو۔ اسی لمحے سلطانہ نے میرے پہلو سے سر اٹھایا اور بولی کل گھر واپس آتے ہوئے ایک تالا لیتے آنا۔ میں نے پوچھا کس لیے وہ بولی کے صندوق کو لگاؤں گی کیوں کہ اس میں کچھ قیمتی کپڑے اور زیور رکھے ہیں اور پھر خیر سے بچے آ جائیں گے تو ...... بچے آئیں گے کہاں سے! میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا تو اس نے اپنی جھولی میں شرم سے منہ چھپاتے ہوئے کہا کہ اتنا عرصہ ہو گیا۔ اب بھی نہیں سمجھے۔ میں نے اس کے کہنے پر اگلے دن صندوق کے لیے تالا خریدا، گھر کی دیواریں اونچی کروائیں اور کانٹا دار تار لگوا دیا، دروازے مضبوط کروا کر اوپر زنجیریں لگوا دیں اور ایک پہرے دار بھی اوپر مورچہ پر بیٹھا دیا جو ایک سابقہ فوجی ہے اور بندوق ہاتھ میں لیے بیٹھا رہتا ہے۔ آج جتنا میری جیب نوٹوں سے بھری ہے اور گھر میں مال و اسباب آ گیا ہے۔ اتنا ہی میرے خوف میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جتنی زیادہ مال کی ہوس بڑھ رہی ہے اتنی ہی پریشانی بڑھ رہی ہے اور ان دیکھی بلائیں ڈرا رہی ہیں۔ اب میں نے شام کے بعد باہر جانا چھوڑ دیا ہے، بے وقت کسی سے ملنا ملانا چھوڑ دیا ہے۔ گھر کے دروازے بند اور تالے لگا کر رکھتا ہوں ...... سلطانہ مجھے ہر وقت تسلی دیتی ہے، کبھی کبھی بزدلی کے طعنے بھی دیتی ہے اور مجھے پرانا وقت یاد دلاتی ہے لیکن اب میں کوئی پرانا آدمی نہیں رہا اور نہ ہی بن سکتا ہوں کیوں کہ اب میرا گھر مٹی کا پرانا گھر نہیں ہے۔ اب تو میرا گھر پکا اور مورچہ بند ہے۔ اب تو میرے گھر میں قیمتی قالین فریج، ٹی وی اور دوسرا ساز و سامان بھی موجود ہے۔ میرے گھر میں ہر کمرے میں بڑی بڑی الماریاں ہیں، جو قیمتی کاغذات سے بھری ہیں۔ پھر بھی ایک خوف ہے کہ جو میرے حواس پر بری طرح چھایا ہوا ہے۔

☆☆☆☆

سید ولی خیال

پشتو سے ترجمہ: سعید ساعی

تلاش اپنی کی، تو جہاں پاسکو گے
زمیں پہ رہو آسماں پا سکو گے

اگر منزلوں کی طرف چل دیے تم
اندھیرے میں گم کارواں پا سکو گے

جو پرواز اونچی نظر ہو عقابی
تو ظلمت کدے میں نشاں پا سکو گے

کیا فرق تُو نے جو باطل و حق میں
تو راہِ خطر میں اماں پا سکو گے

☆☆☆☆

مشتاق عاجز

پنجابی سے ترجمہ: خالد مصطفیٰ

لالچ کے الاؤ روشن ہیں ہم جن میں جلتے رہتے ہیں
پیسوں کے لیے ہم بھائی بہن آپس میں لڑتے رہتے ہیں

دن رات سلامی دیتے ہیں ہم طاقت دولت والوں کو
توحید کا کلمہ پڑھ پڑھ کے بُت خانے گھُوتے رہتے ہیں

ہم درد کے مارے دُکھیارے، ہم پیلے پات شجر کے ہیں
ٹہنی پہ رہنا چاہتے ہیں ٹہنی سے جھڑتے رہتے ہیں

ہم شہر اُجاڑنے والوں کو روکیں بھی تو روک نہیں پاتے
جاتا نہیں ہاتھ گریباں تک، دامن کو پکڑتے رہتے ہیں

سَر آیا لمحہ ٹالتے ہیں ہمیں اگلی رُت کی سوچ نہیں
ہم پنچھی گزرے موسم کے خوابوں میں پکڑتے رہتے ہیں

☆☆☆☆

تخلیق و ترجمہ: زاہد حسن

منصوبے کے تحت لکھی، کہانی

یہ کہانی پڑھنے، مجھ سے براہ راست یا پھر کسی اور سے سننے سے پہلے ایک وضاحت ضروری ہے کہ میں نے اردو میں سیدھی، کبھی کہانی لکھی نہیں۔ اردو میں سیدھی کہانی نہ لکھنے کا مطلب ہے کہ میں نے یا تو پنجابی میں لکھی ہوئی اپنی کہانیوں کو اردو میں 'اتارا' ہے یا پھر کسی دوسری زبان سے۔ یہ کہانی بھی پنجابی سے اتاری گئی ہے۔

''اتارنے کا سیدھا سیدھا مطلب بھی آپ یوں سمجھ لیں جیسے دریا کی زندگی سے نا آشنا کوئی مانجھی عین اس وقت کشتی دریا کی موجوں پر ٹھیل دے جیسے وہ طغیانی میں آیا ہو۔ ٹھیلنے کا ایک مطلب اتارنا بھی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے صفحات پر لفظوں کی شکل اختیار کرتی، اس کہانی کی تکمیل کے لیے پوری تیاری کر رکھی ہے اور ایک منفرد اور بے مثال کہانی لکھنے کے حوالے سے تین بڑے اصول پہلے سے لکھ کر اپنے سامنے رکھ لیے ہیں۔ اس طرح لکھنے کے عمل کے دوران میں خطا کھانے کے جملہ امکانات مسدود ہو چکے ہیں، (آپ یہاں لفظ ''مسدود'' کے استعمال سے ہی میرے تیور بھانپ سکتے ہیں)۔ خیر یہ تین بڑے اصول آپ کے سامنے محض اس لیے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کل کلاں آپ بھی ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ایک بڑی کہانی لکھنے کے اہل ہو سکیں۔

لکھنے والوں میں چوں کہ مجھے میلان کنڈیرا پسند ہیں اور انھیں ہرمن بروخ، لہٰذا کنڈیرا سے ہرمن بروخ کے ہم نوا ہو کر جو بات کہی ہے کہ ''فکشن کا کام انسانی وجود کی پوشیدہ جہات کو دریافت کرنا ہے۔'' (اصل میں انھوں نے تو یہ بات ''ناول'' کے حوالے سے کی تھی، میں نے اسے ''فکشن'' میں بدل دیا ہے۔) لہٰذا میں سب سے پہلے اپنے آپ کو انسانی وجود کی پوشیدہ جہات کو دریافت کے سلسلے میں کمر بستہ پاتا ہوں۔

مشہور یونانی فلسفی ایپی کوریئس کے مطابق ''تکالیف کا نہ ہونا ہی سکھ یا لذت ہے۔'' میں نے طے کیا ہے کہ ایپی کوریئس کے اس قول سے متضاد ایک کہانی نکالنے کے لیے سے ایپی کوریئس ضرور ٹکرلوں گا۔ یوں تضادات اور اختلافات سے کہانی میں جو شدت آئے گی پڑھنے اور سننے والوں کو اپنی گرفت میں رکھے گی۔

تیسرا اصول میرا اپنا دریافت شدہ ہے اور وہ ہے ''کہانی میں بیانیے کا زوردار ہونا۔'' لہٰذا کہانی میں موجود نحیف اور لاغر کرداروں کے منہ سے بلند آہنگ (بر وزن بلند بانگ) تبدیلی کے نعرے لگواؤں گا اور یہ شروع سے آخر تک رہے گا تا کہ کہانی کا بیانیہ زوردار رہے۔'' یہ چند ایسی باتیں ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ پہلے سے آپ کے علم میں ہوں تو ابہام اور الجھاؤ کی گنجائش کم سے کم رہ جائے گی۔

اور کہانی کاروں کی طرح مجھے بھی جو پہلا مسئلہ درپیش ہے وہ کرداروں کی تخلیق کا ہے......تاہم ذرا ساغور کرنے پر مجھے یاد آیا کہ میں نے کچھ دن پہلے ایک کردار تخلیق کیا تھا۔ مال روڈ پر چلتے چلتے۔ یہ مال روڈ بھی عجیب سڑک ہے۔ کسی روز ہلکی سنسانی میں (کہ موجودہ صورت حال میں، آبادی کے بڑھتے ہوئے اژدہام میں ہلکی سنسانی کا ہونا بھی غنیمت ہے) آپ اس پر چلنا شروع کر دیں تو کہانیاں یوں اگلنے لگتی ہے جیسے سکے بنانے والی مشین کام کر رہی ہو تو اس دوران میں میری ایک کردار سے ملاقات ہوئی جو وقتی طور پر کسی وی آئی پی شخصیت کے گزرنے کے باعث سائرنوں میں کھو گیا تھا۔ یہ کردار کیا تھا؟ کبھی کبھی تو لگتا ہے میں خود ہی ہوں۔ اس کردار نے اس وقت سنجیدگی کے ساتھ اپنے بارے میں سوچنا شروع کیا تھا۔ جب ایک بار اس کی بیوی نے اس سے غصے میں کہہ دیا تھا "دراصل تم انسان نہیں ہو بل کہ تمھیں وہم ہے کہ تم انسان ہو۔" بیوی کی یہ بات سن کر اسے یاد آتا ہے کہ بالکل یہی بات مختلف موقعوں اور وقتوں پر اس کا باپ، بھائی، بہن اور اس کے دوست اس سے کہہ چکے ہیں، ایک ماں ہے جو کسی انتہائی کیفیت میں بھی اس سے یہ بات نہیں کہتی۔ وہ اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ "اگر وہ انسان نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟" اس کا تعلق مخلوق خدا کے کس قبیلے سے ہے۔" یوں یہ کہانی میری گرفت میں آ جاتی ہے میں اپنے اس کردار کو جانوروں، پرندوں اور جمادات کے مانند حرکتیں کرتے دکھا سکتا ہوں۔ خوب نبھے گی اس سے......لیکن ایک بات ہے جسے آپ سب بھی تسلیم کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ یہ موضوع ہے خاصا طویل اور کردار بعد ازاں جن نفسیاتی پیچیدگیوں میں الجھ جاتا ہے انھیں محض ایک مختصر سی کہانی میں سمیٹنا آسان نہیں۔ اسے تو کسی بڑے ناول میں ہی کھپایا جا سکتا ہے تو پھر؟۔

ایک مختصر سی کہانی مجھے لکھنی تو ہے تو کیوں نہ دو مختلف کلچر رکھنے والے گروہوں کے درمیان کلچر میں بنیادی بعد اور تفرق کو موضوع بنایا جائے۔ یوں ایک تو یہ کہانی سیدھے سبھاؤ لکھی جائے گی، دوسرے بہت کچھ اس میں محفوظ ہو جائے گا۔ موضوع ہوگا: دو مختلف زبانیں بولنے والوں کے کلچر میں موجود اختلافی اجزا۔ مثال کے طور پر ایک کلچر میں بات چیت کا آغاز لفظ "ارے، او، بے" سے ہوتا ہے جب کہ دوسرے میں "بسم اللہ کراں" سے ہو رہا ہے......لیکن اس میں بھی ایک مسئلہ ہے چوں کہ ایک کلچر کا نمائندہ میں بذات خود ہوں اس لیے خواہ مخواہ تعصب در آئے گا۔ سو میں اس کہانی میں تعصب کو جگہ دینا نہیں چاہتا۔ نہیں تو ہوگا یہ کہ لوگ باقی سب اہم باتیں نظر انداز کر کے اس تعصب والے مسئلے کو پکڑ لیں گے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیں گے کیوں کہ بخیے ادھیڑنا آسان ہوتا ہے بہ نسبت سینے کے۔ تو طے یہ پایا کہ یہ کہانی نہیں لکھی جائے گی۔ یوں میں ایک ہی وقت میں دو اہم اصولوں سے کام لے رہا ہوں۔ پہلا اصول یعنی کنڈیرا کا ہرمن بروخ کا ہمنوا ہو کر یہ کہنا کہ فکشن کا کام انسانی وجود کی پوشیدہ جہات کو دریافت کرنا ہے اور تیسرا اصول جو کہ میرا اپنا دریافت کردہ ہے "کہانی میں بیانیے کا زور دار رہنا۔" "انسان ہونے اور نہ ہونے کے مابین شک کی بھینٹ چڑھا "انسان" (یاد رہے کہ یہ "انسان" انورٹڈ کوموں میں ہے) میرے ایک اگلے ناول کا موضوع قرار پایا جب

کہ کلچر کے حوالے سے لکھی جانے والی کہانی تعصب کے اندیشے کی نذر ہو گئی۔ اب لے دے کے ایک ہی اصول رہ جاتا ہے یعنی ابی کوریئس کا یہ کہنا کہ تکلیف کا نہ ہونا ہی سکھ یا لذت ہے۔ تو آیئے اس میں کوئی کہانی لکھنے کے لیے طبع آزمائی کرتے ہیں۔ کہانی سے پہلے ایک واقعہ سنیے۔ کئی ایک ناقدین نے یہ بھی کہہ رکھا ہے کہ کہانی بذات خود مختلف واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے تو یہ واقعہ چوں کہ ابھی ابھی رونما ہوا ہے۔ اس لیے واقعات کی کڑی سے کڑی کا ملنا بعید از قیاس دکھائی دیتا ہے۔ فی الحال واقع کی تفصیل سنیے۔ کہانی ذرا آگے آئے گی، میں جس گھر میں کرایہ دار ہوں وہ نا آسودہ لوگوں کے ایک ایسے محلے میں ہے جس کو چو پھیر میں بکھری گلیاں، گھیر گھار کے شام گئے وہیں لا کھڑا کرتی ہیں، جہاں مالک مکان نے بنیادیں کھدوا کر اسے تعمیر کروایا تھا اور اگر آپ کا خیال ہے کہ گھر میں، میں بطور کرایہ دار رہائش پذیر ہوں، گھومتا گھامتا رہتا ہے تو یہ خیال درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ میں خود بہت گھومتا پھرتا رہتا ہوں۔ تو اس گھر کے عین سامنے کریانہ کی ایک دکان ہے۔ میں جب اوبڑ کھابڑ گلی سے گزرتے ہوئے اس دکان پر پہنچتا ہوں تو تیز مسالوں، بوریوں کے پیچھے سے سر نکالے چوہوں کے ساتھ دکان دار کی مستقل اونگھتی ہوئی شخصیت میرے سامنے ہوتی ہے۔ سنا ہے دکان دار کو کالا یرقان ہے۔ ایک بار میں نے اس سے، اس سلسلے میں بات کی تھی۔ اس کا ماننا یہ ہے کہ گاہکوں نے چیک اپ نہیں کروایا، جو پانی ہم پی رہے ہیں، میرے خیال میں تو سبھی کو یرقان ہونا چاہیے اور اس کے بعد اس نے اپنی بات پر زور سے ہنسنا چاہا لیکن ہنسی حلق میں ہی پھنسی رہ گئی۔

اس روز دکان پر میں اور وہ بیک وقت پہنچے تھے۔ گندمی رنگت والی تیں اکتیس سالہ عورت جس نے سیاہ اور سرخ رنگ کے کپڑے اور ہلکے نیلے رنگ کی چپل پہن رکھی تھی۔ ہم دونوں کچھ خریدنے آئے تھے لیکن جیسے ہی ایک دوسرے کو دیکھا، دیکھتے رہ گئے۔ یہ احساس تو البتہ نہیں ہوا کہ پہلے بھی ایک دوسرے کو دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اس وقت دیکھتے رہنا چاہتے تھے۔ دکان دار کی نظریں ہم پر تھیں۔ گہری چپ میں دانے کترتے چوہوں کی آوازوں پر دکان دار کی آواز اوپر چھاتی ہوئی سنائی دی۔

“کیا لینا ہے؟” اس کا مخاطب میں تھا۔

میں نے سوجی اور چینی خریدی، گھر آ کر حلوہ بنوایا اور گرم خوشبو دار حلوے کی بھاپ میں اس “کشش” کے بارے میں سوچا، جو کچھ لمحے کے لیے ہمارے تماشے کا سبب بن گئی تھی...... اس کے بعد بھی ایک دو بار ہمارا سامنا ہوا لیکن ہم دونوں دکان دار پر، یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ دونوں بہت جلدی میں ہیں، اپنا اپنا سامان خرید کر پلٹ جاتے ہیں وہ یقیناً نا آسودہ لوگوں کے اس محلے میں نئی نئی آئی ہے۔ میں نے اسے سرخ اور سیاہ رنگ کے کپڑوں اور ہلکے نیلے رنگ کی چپل میں اکثر دیکھا ہے اور ایک بار تو اس دیکھنے کو میری بیوی نے بھی دیکھا۔ جس کا وہ اظہار کیے بنا نہیں رہ سکی۔ تو آیئے ابی کوریئس کے قول کی جانب پلٹتے ہیں۔ ابی کوریئس یعنی اس مشہور یونانی فلسفی کے کہنے کے مطابق “تکالیف کا نہ ہونا ہی سکھ یا لذت ہے۔” یہ اقتباس میں نے

جوں کا توں درج کر دیا ہے جیسا میں نے پڑھا یا جیسا لکھنے والے نے لکھا تھا۔ آپ کو اگر اس سے کچھ غرض ہے کہ میں نے اسے کہاں پڑھا اور یہ کہ اسے کس نے درج کیا تو یقین جانیے کہ مجھے آپ سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو محض اس تکلیف کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو مجھے اس قولِ محال کے پڑھنے سے ہوئی۔ آپ اس کو ابی کوریئس کا ڈسکورس قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن اس ڈسکورس کا زمانہ بھی تو دیکھیں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ڈسکورس کا لفظ بھی کچھ زیادہ پرانا نہیں۔ اس کی دریافت تو ابھی ماضی ہی میں ہوئی ہے۔ تاہم انسان اپنی تن آسانی کے باعث جیسے جیسے بہت سے لفظ اپنی زندگی سے بے دخل کرتا جاتا ہے۔ نئی مصروفیات، نئے لفظوں کا جامہ پہن کر اس کے یہاں در آئی ہیں۔

ابھی صبح ہی کے وقت کہ جب میری بیٹی مجھے چھت پر کھانستی ہوئی سنائی دے رہی تھی اور میری بیوی نے نوتراشیدہ ابروؤں پر انگلی پھیرتے ہوئے ایک بار پھر سے مجھے اس امر کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ سرمہ آ ہی جاتا تو اچھا تھا۔ جسے لانے کے لیے وہ کتنے دنوں سے مجھے کہہ رہی ہے۔ آنکھوں میں نیند کی حرارت چھوڑ جانے والے اس حبس بھرے موسم میں سرمہ ہی ہے جو اپنی ٹھنڈک سے ہمیں اس غیر پسندیدہ احساس سے نجات دلا سکتا ہے۔

"اگر حکیم کے مطب سے ثابت ڈلی لے آؤ اور اسے میں کچھ دنوں مٹی کے کورے برتن میں رکھ کر خود پیس لوں تو اس کی ٹھنڈی تاثیر میں اور بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔" وہ مجھ سے کہنے لگی۔ میں بیوی کی سرمے کے فوائد کے سلسلے میں کی گئی بات اور اسے لانے کی تاکید کو نظر انداز کرتا ہوں اور ریحانہ کے بارے میں سوچنے لگ جاتا ہوں، ریحانہ جو اس شہر میں میرے نئے نئے وارد ہونے کے ساتھ ہی میرے وجود کے زیرِ تعمیر گھر کی چھت پر کھڑی ہمیشہ سرمہ لگاتی نظر آتی۔ پھر ایک روز وہ سارے ضابطے اور اخلاقیات نظر انداز کرتے ہوئے میرے پاس، میرے بوسیدہ سے کرائے کے گھر کی چھت پر چلی آئی تھی اور میں اس کی سرمگیں نگاہوں کی تعریف کرنے، اس سے اظہارِ عشق کرنے کے بجائے، ایک ایسے شاعر کی نظمیں پڑھ کر سناتا رہا۔ زندگی میں جس کی کوئی محبت پروان نہ چڑھ سکی تھی۔ یوں ریحانہ سے میری محبت بھی اس ادھورے خواب کے مانند تھی جو چھت پر سوئے ہوئے، ساون کی بے یقینی بارشوں میں آنکھ کھل جانے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ریحانہ میری آنکھوں میں اب ایک ایسے رستے ہوئے زخم کے مانند ہے، جسے کسی بھی حکیم یا مطب سے لایا ہوا، مٹی کے گھڑے میں دنوں تک پڑا رہنے والا اور بن چھان کر پیسا ہوا کوئی بھی سرمہ مندمل نہیں کر سکتا۔

خیر بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں تو ابی کوریئس کے اس ڈسکورس سے متفق نہ ہونے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ جس میں اس کا کہنا تھا کہ "تکالیف کا نہ ہونا ہی سکھ یا لذت ہے۔" ادھر میں نہایت مسرت کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ میرے لیے اب سکھ اور لذت تکلیفوں اور صرف تکلیفوں میں ہی باقی ہے۔ بعض بے حد دلچسپ تجربات کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ جن میں سے اکثر کیا، کبھی کوئی

ایک بھی محض اتفاقاً آپ کی زندگی میں وقوع پذیر نہیں ہوا ہوگا...... میری شادی طے شدہ منصوبے کے تحت ہوئی۔ یعنی اس میں محبت اور پسندیدگی وغیرہ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ خیال یہ تھا کہ رفتہ رفتہ برسوں کی رفاقت، محبت میں بدل جائے گی۔ ایسا ہوا نہیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ رفاقت، رقابت کا روپ دھارتی چلی گئی اور برسوں کے اس روکھے پھیکے تعلق کا الٹا نقصان یہ ہوا کہ وہ جو کسی وقت کوئی اچھا سا موقع اور مناسبت دیکھ کر نئی محبت شروع کرنے کا منصوبہ تھا، جس کے ذریعے اس شادی شدہ زندگی کی بے لذتی کا احساس بھی ختم ہو جائے گا اور کچھ نیا بھی ہونے لگے گا۔ وہ ساری طاقتیں جو اس سلسلے میں کارگر ثابت ہو سکتی تھیں، وقت نے سلب کر لیں۔ یوں نیا بھی کچھ نہ ہو سکا۔ ریحانہ کی سرمگیں یادوں کا جو نیلا آسمان سر پر چھت کی طرح تھا وہ بھی معدوم ہو گیا۔ اب یہ ہے کہ کبھی کبھار مہینوں اور برسوں بعد سکھ اور لذت کا احساس کر کے اس تکلیف کو جگانے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ تکلیف کو از سرِ نو کوئی صورت دے سکوں اور اس بات کا ذاتی طور پر تجربہ کروں کہ میں زندہ ہوں، باقی رہی چھت پر بیٹی کے کھانسنے کی آواز، تو یہ آواز بھی سمجھو کہ تکلیف کے حصول میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اب اس کے الٹ آپ دیکھ لیں۔ آپ میں سے بہت سے دوست جیم کو جانتے ہی ہوں گے۔ اگر نہیں جانتے تو میں بتا دیتا ہوں۔ اپنی اٹھاون سالہ زندگی میں اس انسان نے محبت تو کیا، عورت کی شکل کبھی غور سے نہیں دیکھی ہاں البتہ کبھی کبھی رو میں آ کر بتاتا ہے کہ ایک بار تھائی لینڈ میں کسی سوئمنگ پول پر نہاتے ہوئے کچھ لڑکیوں کو ضرور دیکھا تھا۔ بعد میں نقد پیسے دے کر مساج بھی کروایا تھا۔ جیم اب زیادہ تر وقت خود کلامی اور سہکنے میں گزارتا ہے۔ ایک بات البتہ اس کی مختلف ہے۔ زندگی میں تکلیف کو شامل کرنے کے بجائے، زندگی کو مسلسل تکلیف میں مبتلا رکھتا ہے جس سے اس کے اردگرد کا ماحول بھی بری طرح ''مبتلا'' نظر آتا ہے اور یہ لفظ ''مبتلا'' بھی انورنڈ کوموں میں ہے۔ یوں ایبی کورینس کی یہ بات اس پر سچ دکھائی دیتی ہے کہ تکالیف کا نہ ہونا ہی سکھ یا لذت ہے، یہ خود کئی لوگوں کے لیے اب تکالیف کا سبب بن چکا ہے۔ لہٰذا مسئلہ یقیناً ہمارے تیسرے دوست کی زندگی سے حاصل ٹھوس تجربے سے ہی حل ہوگا۔ ہمارے اس تیرے دوست نے محبت کی شادی کی، دس سال نبھی، دو بچے بھی ہو گئے۔ اس نے اپنی بیوی کی تعلیم مکمل کی۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ تعلیم مکمل کروائی اور ایک ادارے میں ملازم بھی کروا دیا۔ درس و تدریس سے متعلق اس ادارے میں ٹھیک ایک سال بعد اس کی بیوی کو اپنے ایک طالبِ علم سے بارِ دگر محبت ہو گئی۔ اب وہ اس کے ساتھ اندرون شہر میں غلاظت اور بے ترتیبی سے اٹے ایک گھٹے گھٹے کمرے میں رہتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سکھ کی سانس لیتی ہے، بچے اپنے والد کے ساتھ اس امید پر دن رات گزارتے ہیں کہ کسی وقت بھی والدہ سے ملنے جائیں گے۔ عدالت دونوں کی پرامن اور بقائے باہمی کی حامل علاحدگی کے حق میں پہلے ہی فیصلہ دے چکی ہے۔ ان دونوں میں کسی کو کوئی تکلیف نہیں، ان کے بچوں کے حوالے سے میں دکھ محسوس کرتا رہتا ہوں۔ ابھی دو دن پہلے میں اپنے اس دوست کے گھر گیا۔ اس کی چھوٹی بیٹی چھت پر موجود تھی اور کھانس رہی تھی۔ واپسی پر میں نے پنساری کی ہٹی سے سرمے

کی ڈلی خریدی، کمہار کی دکان سے کورا گھڑا اور پتا نہیں کیوں بہت دور پڑتی ریحانہ کے گھر کی ٹیڑھی میڑھی گلی سے گزرتا ہوا گھر واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ میری بیوی اپنے ابروؤں پر انگلی پھیرتے ہوئے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے بعد کہنے لگی۔ ''آج آنکھوں کو سرمے کی نہیں، تمھارے چہرے کی ضرورت ہے......'' پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی'' کچھ اپنا خیال رکھا کرو'' ......اتنے اداس کیوں ہو؟ ویسے اداس ہی رہا کرو، اچھے لگتے ہو......'' پھر وہ میرے سینے سے لگ کر ہنسنے لگی۔

میں البتہ بیوی کے وجود کی اس پوشیدہ جہت کے اپنے اوپر کھلنے پر کافی حیران تھا۔

☆☆☆☆

پروین ملک

پنجابی سے ترجمہ: سجاد بلوچ

مجھے کیا خبر کہ میں کون ہوں

میں برسوں بعد اپنے گاؤں جا رہی تھی، میں نے اتنے برس اپنے ہی دیس میں پردیسیوں کی طرح کاٹ دیے تھے۔

لیکن میرے اس طرح دیس میں پردیسی ہونے میں کسی کا کوئی دوش نہ تھا۔ میں نے خود ہی یہ جوگ لیا تھا اور نئے زمانے میں جوگ شہروں کی طرف لے آتا ہے۔

میں شہر میں تو پہنچ گئی لیکن نہ جانے پھر کیا ہوا، شاید مجھے نیند آ گئی، یہی کوئی پل دو پل سوئی ہوں گی کہ آنکھ کھلی اور دیکھا تو زمانہ بدل چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں محلے کے بچوں کو اکٹھا کر کے کہانیاں سنا رہی تھی، میں نے آنکھ جھپکی اور اتنی سی دیر میں وہ بچے بڑے بھی ہو گئے۔ لڑکیوں کے پہلوؤں میں بچے آ گئے اور لڑکے اپنے اپنے بچوں کے رزق کی فکر میں مصروف ہو گئے۔

اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ میں اتنے برس سوئی رہی تھی۔ لیکن نہیں مجھے یاد ہے یہ کوئی پل دو پل پہلے کی بات ہی تو ہے جب مجھے ایک خاکی لفافہ ملا تھا۔

"آپ کی خدمات اپنے دفتر کے لیے حاصل کر کے ہمیں خوشی ہو گی، آپ جلد از جلد ڈیوٹی پر حاضر ہوں۔"

اور میں ڈیوٹی پر حاضر ہو گئی لیکن اگر میں حاضر تھی تو پھر غائب کیسے ہو گئی، چھوٹے چھوٹے بچے اتنے بڑے کیسے ہو گئے، میرے اپنے بچوں نے سکول جانا شروع کر دیا لیکن میں سوئی ہی رہی۔ چاند اور سورج کا چکر تو مجھے یاد ہے لیکن میں نے آنکھیں کھول کے کچھ دیکھا ہو یا سوچا ہو، یہ نہیں یاد۔ گملے میں لگے پودے کو موسم بدلنے کی خبر نہیں ہوتی۔ اس کے لیے دھوپ چھاؤں کے ساتھ سفر کرنا تو آسان ہو جاتا ہے، کیا ہوا اگر اس طرح اس کی جڑیں کمزور رہ جاتی ہیں۔ اسی باعث اب زمینوں میں درخت لگانے کی روایت ختم ہوتی جا رہی ہے۔

بسوں، رکشوں، ویگنوں کے ہارن اور لوگوں کا شور۔۔۔ ایسی بھاگ دوڑ، جیسے کہیں آگ لگ گئی ہو۔ گرد و غبار میں اڑتے ہوئے دھوئیں کے بادل، یہی تو زندگی ہے۔ سرسوں کے پھولوں کی نرمی، شریہہ اور دھریک کے پھولوں کی خوشبو، جو خود بخود سانسوں میں گھل جاتی ہے۔۔۔ وہ تو ایک سپنا تھا۔

کہا جاتا ہے کئی کارخانے ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں ایک دفعہ چلا دیا جائے تو اس وقت تک

نہیں رکتے جب تک کہ ان کا کوئی پرزہ خراب نہ ہو جائے۔ (روڈ ایکسیڈنٹ) ہارن بج رہے ہیں، شور مچا ہوا ہے۔۔۔ شاید مشین میں کچرا آ گیا، یہ کارخانہ ابھی پھر چل پڑے گا لیکن میرے اپنے سال کہاں گئے میں تو ان کا حساب لگانے بیٹھی تھی۔ میں تو اب بھی شاید سپنوں پر گزارا کر لیتی لیکن میری بیٹی نے مجھے جگا دیا۔ وہ کہیں باہر سے بجھی بجھی گھر لوٹی اور کہنے لگی۔

"امی! کیا ہمارا کوئی گاؤں نہیں۔"

"ہاں بیٹا ہے۔" میری آنکھ پوری طرح کھل گئی۔

"امی! ہمیں اپنے گاؤں لے چلیں نا۔ کوثی لوگ اپنے گاؤں جا رہے ہیں اور ہمیں کہتے ہیں آپ کا کوئی گاؤں ہی نہیں۔"

"تم انھیں بتا آؤ کہ ہمارا ایک گاؤں ہے اور اس میں پیارا سا گھر بھی ہے۔ صحن میں ایک بیری کا درخت ہے، اس کا پھل اتنا میٹھا ہے کہ کھا کے سیب کا ذائقہ بھول جاؤ گے۔"

"اچھا امی جی!" اس کی آنکھوں میں خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ "پھر ہمیں لے چلیں نا، اب تو ہمیں چھٹیاں بھی ہیں۔" اس نے بھائی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور دونوں میرے پیچھے ہی پڑ گئے اور مجھے اپنے ان کاموں سے نکلنا ہی پڑا جو مکڑی کے جالے کی طرح میرے گرد لپٹے ہوئے تھے۔

بڑی طویل مسافت تھی یا مجھے ہی اب سفر کی عادت نہیں رہی تھی۔ جب ہمارا تانگہ گاؤں کی کچی سڑک پر مڑا تو گرد کے بادل اٹھ اٹھ کر ہمیں گلے لگانے لگے لیکن یہ گرد پیچھے نہیں پڑ جاتی تھی، ہمیں خوش آمدید کہہ کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی تھی۔

گاؤں میں داخل ہوئی تو ایسا لگا جیسے گاؤں کی ساری دیواریں مجھ سے روٹھی ہوئی ہیں۔ اپنے صحن میں پہنچی تو بیری کا درخت چپ چاپ کھڑا رہا، پہلے تو وہ میرے لیے پکے بیر خود ہی گرا دیتا تھا۔ "خیر سب کو منا لوں گی" میں نے یہ سوچا اور بند دروازے کھولنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد سارے گاؤں کو میرے آنے کی اطلاع مل گئی اور لوگ ملنے کے لیے آنے لگے۔ گاؤں میں کوئی ہمسایہ نہیں ہوتا، سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ جڑا ہوتا ہے۔ میرے بچے کچھ دیر تو ایک طرف حیران کھڑے رہے پھر ان سے رہا نہ گیا اور میرے پاس آ کر کہنے لگے۔ "امی جی آپ نے تو کبھی ہمیں بتایا ہی نہیں کہ گاؤں میں ہماری اتنی نانیاں اور خالائیں ہیں"

"بیٹا تیری ماں زیادہ پڑھ گئی ہے نا، اس لیے اسے اب رشتوں کی پہچان نہیں رہی۔"

میں خجل سی ہو کر رہ گئی۔ "خالہ کام ہی ختم نہیں ہوتے۔ یاد تو میں آپ سب کو کرتی ہوں"

"بیٹا جب کام انسان کو آگے لگا لیں تو زندگی دشوار ہو جاتی ہے"

خالہ نے مجھے لاجواب کر دیا۔

''ہمارے گھر کے ساتھ ہی لالہ ممتاز کا گھر تھا۔ جب میں چھوٹی سی تھی تو امی کے ساتھ ان کے گھر جاتی تھی ۔ ان کے گھر نہ جانے کون سے زمانوں کی ایک سیڑھی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی ۔ ویسے تو گاؤں کے ہر گھر میں لکڑی کی سیڑھی ہوتی ہے کیوں کہ چھتیں کچی ہوتی ہیں اور سیڑھی بہت ضروری ہوتی ہے، نہیں تو انسان کا چھت سے رابطہ کٹ جاتا ہے۔

لیکن لالہ ممتاز کے گھر جو سیڑھی تھی وہ ضرورت کی چیز سے کچھ زیادہ ہی تھی ۔ اس پر لکڑی کے خوبصورت تختے ایسے لگے ہوئے تھے کہ بندہ بڑے آرام سے ہاتھ چھوڑ کر بھی چھت پر پہنچ سکتا تھا۔ ایک طرف دیوار تھی اور دوسری جانب لکڑی کا جنگلہ۔ اس جنگلے کے ہر ڈنڈے پر گول گول لٹو سے لگے ہوئے تھے اور پوری سیڑھی پر بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔

ان بیلوں کے بیچ پیتل کے کیل لگے ہوئے تھے، کالی سیاہ لکڑی پر یہ کیل ستاروں کی طرح دمکتے تھے۔ مجھے یہ سیڑھی بہت پسند تھی، میں جاتے ہی وہاں بیٹھ جاتی اور آہستہ آہستہ کھسکتی کھسکتی اوپر والی سیڑھی پر جا کر امی کو آواز دیتی تھی ''امی جی!'' وہ ایک دم گھبرا کے کہتیں ۔'' نیچے آ، گر جائے گی۔'' کتنے برس تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ نہ امی نے گھبرانا چھوڑا، نہ میں نے سیڑھی پر چڑھنا۔

اب جب گاؤں گئے تو لالہ ممتاز کے گھر بھی جانا ہوا۔ میں ان کے صحن میں بیٹھی بھابی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ مجھے آواز آئی ''امی جی!''

میری بیٹی سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑی تھی ۔

'' نیچے اتر، گر جائے گی' میرے منہ سے بے اختیار نکلا ۔

اور پھر نجانے کیا ہوا، میں سیڑھی پر بھی کھڑی تھی اور صحن میں بھی ۔

☆☆☆☆

تخلیق و ترجمہ: اعظم ملک

گھاؤ

(دہشت گردی کے پس منظر میں لکھی گئی نظم)

سرخ پھولوں کے رنگ زرد ہوئے
خوشبوئیں بے وجود لگنے لگیں
بلبلیں بین کرتی پھرتی ہیں
گولیوں کی وہ گھن گرج ہے یہاں
اپنی آواز بھی نہیں آتی
ہر گھڑی اب یہ حال ہے کہ یہاں
گھاؤ بڑھنے لگے ہیں مٹی کے

☆☆☆☆

منظور عارف
چھاچھی سے ترجمہ: علی یاسر

گیت

اللہ جانے کون وہ تھا
کہاں سے آیا کدھر گیا
انیس برس ہے عمر کمال
شہزادوں سا اس کا حال
پکے پکے اس کے خیال
مجھ سے بڑا ہے وہ اک سال
اللہ جانے کون تھا
کہاں سے آیا کدھر گیا
آنکھوں کو نیچا کرکے
پوچھا اس نے ڈر ڈر کے
میں نے دیکھا جی بھر کے
میں بھولی اپنا رستا
اللہ جانے کون وہ تھا
کہاں سے آیا کدھر گیا
وہ کوئی ہو مجھ کو کیا
میرا اس کا کیا رشتہ
خوب حسیں ہے وہ، ہو گا
مجھ کو کسی کی کیا پروا
اللہ جانے کون وہ تھا
کہاں سے آیا کدھر گیا

☆☆☆☆

خواجہ غلام فرید
سرائیکی سے ترجمہ: سید تابش الوری

سانوریا!

توری منتی کروں میں؛ ایک نجر تو ڈال
سنوریا! دیکھ ہمارو حال
غمزے، شوخی، خوش گفتاری؛ نخرے، ناز، تلک گلہاری
واہ زلفیں واہ خال
بن کر دام دلوں کو جکڑیں؛ بن کر سانپ جگر تک ڈس لیں
تیرے مہکتے بال
جب سے ساجن ہم سے رُوٹھے؛ ڈوریے، ململ، مخمل چھوٹے
چھوٹے ریشم، شال
بھائیں نہ من کو بن ساجن کے؛ کپڑے رنگ برنگے
زیور پیلے لال
درد فراق کی چال ہماری؛ ویرانوں میں عمر گزاری
بے کس کا کیا حال
اتنے ظلم مناسب ناہیں؛ روتے، تڑپتے، کرتے آہیں
بیتے کتنے سال
یار فرید نہ تڑپائے گا؛ پہلو میں آخر بٹھلائے گا
ساجن ہے لج پال

☆☆☆☆

غلام حسن حیدرانی
سرائیکی سے ترجمہ: سلیم شہزاد

باپ یا بھائی

جندن آٹھ نو برس کی ہوگی جب قادر اللہ کو پیارا ہوا۔ قادرے نے تو اس دنیا کے دکھوں سے جان چھڑا کر قبر کو گلے لگا لیا۔ مگر صابو کے سر پر بیوگی کا جو پہاڑ ٹوٹا وہ صرف وہی جانتی تھی۔ اس کی شادی کو سترہ برس بیت گئے لیکن وہ اولاد سے محروم رہی۔ جب اللہ نے اپنا کرم فرمایا تو جندن پیدا ہوئی۔ وہ ابھی آٹھ نو برس کی ہی ہوئی تھی کہ باپ اس دنیا سے سدھار گیا۔ دونوں ماں بیٹی ساون کی طرح روئیں۔ ان کے بین سن کر دل دہل جاتا تھا۔ مگر خدا کی کرنی پر آخر صبر آ ہی جاتا ہے۔ صابو بیوہ اور جندن یتیم ہو کر رو رو کے بالآخر خاموش ہو گئیں۔ دوسری بات کہ کوئی قریبی عزیز، چچا، ماموں بھی نہیں تھا جو بیوہ کے سر پر دوپٹہ اور یتیم کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ ویسے بھی غم تو غم ہی ہوتا ہے مگر جب آس پاس کوئی ایسا شخص نظر نہ آئے جو صابو کو سہارا دے اور جندن کے سر پر ہاتھ دھرے تو ایسی حالت میں اچھے بھلے ہوش گنوا بیٹھتے ہیں وہ تو بیچاری عورتیں تھیں۔

جبار بھی قرابت دار تو نہیں تھا مگر زمانے بھر کی حرص و ہوس اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ اگر معمولی سی ہمدردی سے مفت کا رشتہ اور تین مکان مل جائیں تو سودا مہنگا نہیں۔ ایک دن بیوی سے بات کی۔ ”اندھا کیا مانگے دو آنکھیں۔“ وہ بھی خوش ہوئی۔ جبار کی بیوی صابو سے ہمدردی جتانے لگی۔ جہاں بار بار ملنے سے پیار بڑھتا ہے وہیں سالن ترکاری اور موسمی پھل بھی دے دیتی۔ میل جول بڑھ گیا۔ ایک دن جبار کی بیوی عزت نے صابو سے کہا:

”صابو بہن مجھے جندن بہت پیاری لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے جندن میری اپنی بیٹی ہے۔“

صابو نے جواب دیا: ”عزت بہن، دکھیاروں کے ساتھ ہمدردی تمھارا فرض ہے۔ اگر تم مجھے سہارا نہ دیتیں تو ہم ماں بیٹی رو رو کر مر جاتیں۔“

عزت بولی: ”کئی مرتبہ دل میں خیال آیا مگر ڈر کے مارے تم سے بات نہیں کر سکی۔“

صابو نے پوچھا: ”کون سی بات؟“

عزت محتاط انداز میں بولی: ”پتا نہیں تمھارے دل میں کیا آئے۔ میں نہیں کرتی بات۔“

صابو بولی: ”واہ بہن تمھارے سلوک نے مجھے زندگی دی ہے۔ مجھے تو تم سے توقعات ہیں مگر تم نے بات چھپا کر مجھے اداس کر دیا ہے۔ اچھا تمھاری مرضی۔“

عزت منت سے بولی: ''نہ بہن، ناراض نہ ہو۔ زمانہ بہت خراب ہو گیا ہے، لالچ کے بنا کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے، میری بات کو بھی لالچ سمجھا گیا تو میرے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔''

صابو بولی: ''بہن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔''

عزت بولی: ''نہیں صابو بہن۔ مجھے عقل روکتی ہے کہ زبان پر آئی بات نہ کروں تو بہتر ہے۔''

''اچھا بہن جیسے تمھاری مرضی، میں ایک بے سہارا بیوہ عورت کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''صابو بہن تم تو واقعی ناراض ہو گئی ہو۔''

''پھر بات کیوں چھپا گئی ہو۔''

''میں...... چند......''

''عزت بہن جھجکتی کیوں ہو بتاتی کیوں نہیں؟''

''بہن میں اقبال تمھیں دینا چاہتی ہوں۔'' آخر عزت نے کہہ ہی ڈالا۔

صابو نے عزت کو گلے لگا لیا اور بولی: ''یہ تو تم نے میرے دل کی بات کی ہے۔ تمھارے سلوک سے تو میں زندہ پھرتی ہوں۔ دودھ مکھن کھانے پینے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔''

اس بات پر دونوں کھل اُٹھیں۔ ساتھ ہی جبار کا مقصد بھی آج پورا ہو گیا تھا۔ پھر عزت ایک اچھا موقع دیکھ کر جندن کی منگنی کے کپڑے بھی دے آئی۔ رشتہ طے پایا تو میل جول اور بڑھ گیا اور یہ تعلقات مزید مضبوط ہو گئے۔

صابو اور جندن کو اچھا سہارا مل گیا لیکن کبھی کبھی تنہائی میں قادرے کو یاد کر کے صابو کے دو آنسو نکل ہی پڑتے۔ البتہ ان کو کوئی اور فکر نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار سال کا عرصہ گزر گیا۔

انسان اللہ کی فصل ہے وہ جیسے چاہتا ہے اسے کاٹتا رہتا ہے۔ اللہ کو یہ منظور تھا کہ جبار کی بیوی عزت کئی روز کی بیماری کے بعد فوت ہو گئی۔ اقبال کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ سیانے سچ کہتے ہیں کہ باپ مرا تو آدھا یتیم اور ماں مری تو پورا یتیم۔ اقبال کے ساتھ ساتھ جبار کی پریشانی بھی کچھ کم نہ تھی۔ اللہ کسی کا گھر برباد نہ کرے۔ ہنستا بستا گھر لحہ بھر میں اجڑ گیا تھا۔ جوں جوں جبار سوچتا توں توں اس کی حالت خراب ہوتی جاتی کیوں کہ جندن بھی ابھی چھوٹی تھی۔ اس لیے وہ اقبال کی شادی بھی نہیں کر سکتا۔

صابو اکثر گھر آتی جاتی تھی۔ عزت کو مرے ابھی چوتھا دن تھا کہ صابو جبار کے گھر آئی تو اس ویران گھر میں جبار سر جھکائے اداس اور پژمردگی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی تو جبار نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ صابو پر نظر پڑی، آنکھیں ملیں تو ملی ہی رہ گئیں۔ کئی بار انسان پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جو بات وہ زبان سے نہیں کہہ سکتا وہ آنکھیں کہہ ڈالتی ہیں۔ آج بھی آنکھوں نے کوئی ایسی بات کی کہ آٹھویں دن جبار اور صابو کی شادی ہو گئی۔

دونوں ہی بہت خوش تھے۔ جبار کا اجڑا گھر پھر سے آباد ہو گیا۔ صابو خوش تھی کہ دونوں ماں بیٹی ایک ہی گھر میں آ گئیں۔ بیٹی بھی جدا نہ ہوئی، بہت اچھی گزر رہی تھی۔ جبار شروع ہی سے اچھا کھانے پینے اور پہننے کا عادی تھا۔ اب جونئی شادی ہوئی تو ہر روز میوے، پھل، کھوپرا، بادام لے آتا۔ موسمی پھل اور ہر نئی چیز اس گھر میں آتی رہتی۔ دونوں ماں بیٹی مل کر کھاتیں اور عیش کرتیں۔ تین سال بعد اقبال کی بھی شادی ہو گئی۔ چاروں کی گھر میں خوش باش گزر رہی تھی۔ کوئی اداسی بھوک اور دکھ نہ تھا۔ جندن ہر وقت چچا چچا کرتی اور لاڈلی بنی رہتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ چچا کے ساتھ ایسی بے تکلف ہوئی کہ جبار مٹھائیاں، پھل لاتا تو دلار کے ساتھ ہاتھوں سے چھین لینے سے بھی باز نہ آتی۔ جبار بھی جندن کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا۔

دیہات کی زندگی اصل اور سادہ ہوتی ہے، جھجک نہ بناوٹ اور نہ جھوٹ۔ ہر بات میں سادگی، بیٹھنا اٹھنا، سب سادہ اور خوبصورت۔ گرمیوں میں جب حبس ہوتا تو آدھی رات تک بیٹھکیں اور ڈیرے آباد رہتے۔ بستی والے کھانے کا آخری لقمہ لیتے ہی مردانے میں آ جاتے۔ سر شام ہی چھوٹی بڑی چٹائیاں بچھ جاتیں اور لوگ ان پر بیٹھے اور لیٹے حقہ پیتے رہتے۔ گپیں ہانکتے، ٹپے ماہیے، حال احوال آپ بیتیاں، پرانے زمانے کے قصے کہانیاں، سیف الملوک، یوسف زلیخا، ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال کے قصے سناتے، مثنویاں گاتے، گھڑے بجتے اور تال سے تال مل جاتی۔

اقبال کی شادی کو سال ہونے والا ہو گا کہ ایک رات جبار جب آدھی رات کو اٹھ کر گھر جانے لگا تو اقبال چٹائی پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ جبار نے سوچا: میٹھی نیند سو رہا ہے نہ جگاؤں، جب جاگے گا تو خود ہی آ جائے گا۔ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ رات چاندنی تھی اور پوربی ہوا کے تیز جھونکے چل رہے تھے، موسم بہت نشیلا تھا۔ جبار مسرور گھر آیا۔ صابو اور جندن میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھیں۔ چاندنی سارے گھر میں دھوبی کی دھلی سفید چادر لگ رہی تھی۔ پہلی چارپائی اقبال کی تھی جو خالی تھی، آگے جندن کی اور پھر صابو کی چارپائی اور آخر میں جبار کی چارپائی تھی۔ جبار جندن کے سرہانے سے گزرنے لگا تو اس کی نظر جندن پر پڑ گئی۔

جندن خوبصورت تو تھی ہی اوپر سے سولہ سترہ کا سن مگر اس چاندنی رات میں بے خبر سوئی جندن کے دودھ جیسے رنگ کا نکھار یوں تھا کہ اگر کوئی زاہد بھی دیکھ لیتا تو اس کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ جاتی۔ جبار کو جندن جنت کی حور لگی اور وہ خدا کے تراشے اس بت کو دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ وہ چارپائی کے ساتھ کھڑا کافی دیر حسن و جمال کے اس شہکار کو دیکھتا رہا۔

شیطان ہر انسان کے ساتھ ہے۔ وہ ہمیشہ پہلے آنکھوں پر دھاوا بولتا ہے۔ ادھر آنکھیں پھسلیں ادھر گمراہ ہوا اور عقل پر پردہ پڑا۔ آج یہی حالت جبار کی ہو گئی تھی۔ عقل ساتھ چھوڑ گئی۔ ہوس بڑھی تو وہ اس حسن کو قریب سے دیکھنے کے لیے جھک گیا۔ جبار کے ہاتھ جھکتے ہوئے چارپائی کی پٹی تک پہنچ گئے۔ نشہ بڑھا تو اس کے ہونٹ تڑپ کر جندن کے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے۔ جندن جاگ تو گئی مگر ہوش نہ آیا، نشے نے مدہوش

کر دیا۔ سانس تیز ہوئے۔ دل دھڑکنے لگے۔ نشہ بڑھا تو رہا سہا ہوش بھی جاتا رہا جو حیا کے شکوے پر بھی نہ آیا۔ ہوش آتا بھی کیسے! جبار بیٹھک سے ہی مدہوش ہو کر آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ گھر پہنچا تو شیطان نے اور ہی راستے پر ڈال دیا۔ ہوش آیا تو جبار چارپائی پر تھا۔

ضمیر جاگا تو اس نے خشک جوتا ہاتھ میں پکڑ کر جبار کو دے مارا۔ جبار کا سر اور ضمیر کا جوتا پھر ہر جوتے کی ہر چوٹ کے ساتھ ضمیر کی طعن و تشنیع۔ یہ کیا کیا ہے؟ اس حالت میں نیند کیسے آتی۔ جب علی الصبح نیند سے اٹھ کر بیٹھی ہوئی جندن کو جبار نے ڈرتے ڈرتے چور آنکھوں سے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ پتا نہیں اس کی مسکراہٹ تلوار تھی یا خنجر یا ظالم خونی برچھی۔ جو جبار کے ضمیر کے دل میں لگی تو وہ ہچکی لے کر مر گیا۔ جبار اٹھا اور باہر چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد گھر آیا تو اس کے ہاتھوں میں قلمی آموں کی ٹوکری تھی جس کو جندن نے بڑے نخرے اور دلار کے ساتھ جبار سے چھیننے کے انداز میں لے لیا۔

انسان مطلب پرست ہے۔ جندن پھل فروٹ کھاتی اور خوش ہوتی رہی، اس نے یہ تک نہ سوچا کہ وہ اس ذات کا اس ہستی کا اس مہربان کا حق چھین رہی ہے جس نے اسے نو ماہ پیٹ میں رکھا، تکلیفیں سہیں، پوہ ماہ کی راتوں میں نیند حرام کر کے سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر اسے دودھ پلایا۔ خود دکھ جھیلے، تکلیفیں سہیں مگر اس نے اولاد کو ہر سکھ دیا۔ جندن یہ سب باتیں بھول کر خوش خوراکی کی نذر ہو گئی تھی۔ مرد کو بھی اپنی عقل پر بہت ناز ہے۔ وہ ہمیشہ عورت کو ناقص العقل کہتا آیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عورت کی عقل اس کی گدی میں ہے۔ عورت اپنے مُنھ سے تو طلب کا اظہار نہیں کرتی مگر غلاظت کی پوٹ ہے۔ لیکن مرد نے کبھی اپنے اندر نہیں جھانکا وہ خود کو عقل مند سمجھتے ہوئے ایسے کام کیوں کرتا ہے۔ وہ عورت کو ماں، بہن، بیٹی کیوں نہیں مانتا۔ وہ عورت کو اپنی ہوس کی تکمیل کیوں سمجھتا ہے۔ پھر وہ انسان انصاف کیسے کر سکتا ہے جو پرائی آنکھ کے تنکے کو تو تاڑ لیتا ہے مگر اپنی آنکھ کے شہتیر سے بے خبر رہے۔ زبردست جو ہوا طاقت ور جو ہوا۔ سچ یہ ہے کہ طاقت ور کے سامنے سچ کون بولے۔

ایک سال بعد جبار نے صابو کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ ایسا کیوں نہ کرتا۔ گناہ کا دروازہ جو کھل گیا تھا۔ ٹھیک ہے اچھا نہیں کیا۔ ماس ہوتے چھچھڑے کون کھاتا ہے؟ صابو بہت عرصے تک خوار ہوتی بیٹی کے احسان کے زخم چاٹتے چاٹتے مر گئی۔ جندن نے بھی بھلے مانس ہونے کا ثبوت دیا کہ ماں کا مُنھ دیکھنے بھی نہ گئی، ٹھیک تو کیا تھا جا کے سوتن کا مُنھ کیوں دیکھتی۔

مگر آج تو جندن کی چیخیں نکل گئیں، یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی ہمیشہ سیر کا سوا سیر تو دینا پڑتا ہے۔ جندن کو اپنے بیٹے اکبر کی شادی کیے ابھی چھ ماہ ہی گزر رہے تھے کہ اکیس سال پہلے کا ڈرامہ جندن کے سامنے آ گیا۔ بلا شبہ پیر پیغمبر یہ کہتے آئے ہیں کہ جو اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسرے کے لیے بھی پسند نہ کرو۔ مگر کس کے پاس اتنا وقت ہے جو ان باتوں پر دھیان دے۔ ''میٹھا میٹھا ہپ، کڑوا کڑوا تھو۔''

آج جندن کی دھاڑیں نکل گئیں۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ سسر بوڑھا، خاوند بے راہ رَو، بیٹے کی عزت

خوار۔ اپنے سر پر پڑی تو ہڈیاں چیخ اٹھیں۔ وہ بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کہ اس کے بچپن کی سہیلی عزیزاں آ گئی۔ وہ جندن کو روتا دیکھ کر حیران ہوئی پھر ساتھ بیٹھ کر ہمدردی سے پوچھنے لگی۔

"بہن، کیوں رو رہی ہو؟ خیریت تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہی ہے۔" جندن نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ رونا کس بات کا؟"

"بس دل جو ہوا کسی لپیٹ میں آ گیا۔"

"بہن مجھ سے بات نہ چھپاؤ آج تمھاری حالت وہ نہیں۔"

"یہ تمھارا وہم ہے۔"

"پتا تو چل گیا۔"

"کس بات کا؟"

"یہی کہ میں غیر ہوں۔ مجھ پر اعتبار ہی نہیں۔"

"نہیں بہن یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر مکرتی کیوں ہو؟"

"کوئی بات ہو تو بتاؤں۔"

"مجھے تو بہت امیدیں تھیں۔ آج بات چھپا کر میری آنکھیں کھول دی ہیں۔"

جنداں نے عزیزاں کے مُنھ کی طرف دیکھا۔ ہونٹ پھڑ کے مگر بول نہ سکی اور ایک بار پھر رونے لگی۔ وہ دیر تک سسکیاں بھر بھر کے روتی رہی۔ عزیزاں اسے گلے لگا کر دلاسے دیتی رہی۔

"عزیزاں بہن! خدا کرے مجھے موت آ جائے۔ مجھے پتا ہوتا تو میں اکبر کی شادی ہی نہ کرتی۔"

"وہ کیوں؟ کتنے ارمانوں سے تو تم نے بیٹا بیاہا ہے تمھاری عقل تو ٹھکانے پر ہے؟"

"بہن عقل کیسے ٹھکانے پر ہو سکتی ہے جس وقت بہو سوتن ......"

بات حلق میں اٹک گئی اور پھر چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ عزیزاں بار بار دلاسا دیتے بولی: "بہن! تمھیں غلط فہمی ہوئی ہو گی یہ کوئی ماننے والی بات ہے خواہ مخواہ اپنا دل جلاتی ہو۔"

"عزیزاں بہن! دکھ تو یہ ہے کہ یہ غلط فہمی نہیں۔"

"عقل نہیں مانتی۔"

"عقل والی بات ہو تو عقل مانے مگر آنکھوں دیکھی بات کو کیسے غلط فہمی کہوں۔"

عزیزاں کانوں کو ہاتھ لگاتی، توبہ توبہ کرتی اٹھنے لگی تو جندن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی: "بہن خدا کے واسطے کسی کو بتانا نہیں۔

''واہ بہن جندن! بھلا، یہ کوئی کہنے والی بات ہے۔''

عزیزاں گھر لوٹ گئی۔ جندن بھی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی دونوں کو یہ پتا ہی نہ چلا کہ اکبر نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔

اکبر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا کھانا، پینا، چین آرام سب کچھ حرام ہو گیا۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ پہاڑ بن گیا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ لیکن اگلے ہی روز لوگوں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ ایک نوجوان نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر دیا اور مقتول قاتل کا سگا باپ تھا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

یہ بات صرف جندن ہی جانتی تھی کہ ''مقتول قاتل کا سگا باپ تھا یا بھائی!''

☆☆☆☆

رمضان نول

سندھی سے ترجمہ: محمد مشتاق آثم

طوفان

رات
طوفان آیا
مرے دل کی دنیا میں
سپنے بھی
مثلِ طائر اُڑے
آپ کی سمت
اب آپ بتلائیں
اس باد و باراں میں
کیسے تھے خواب آپ کے؟

☆☆☆☆

رمضان نول

سندھی سے ترجمہ: محمد مشتاق آشم

چراغ

نفرتوں کی ہواؤں نے گُل کر دیے
جل رہے تھے
جو من میں ہزاروں دیے
ہاں مگر
میرے محبوب کے نام کا
جل رہا ہے سدا

☆☆☆☆

ڈاکٹر ادل سومرو
سندھی سے ترجمہ: حبدار سولنگی

ہاں تم بہت با اختیار ہو

ہم جانتے ہیں کہ
تم بہت با اختیار ہو

پیاسی ہرنی کو
جیپ کے آگے دوڑا دوڑا کے مار سکتے ہو
لیکن
تھر کی ریت پر
ننگے پاؤں دوڑتی
مائی بھاگی کی صداؤں کو روکنا
تمھارے بس میں نہیں

تم بہت با اختیار ہو
تیزاب اور آگ کے خوف سے ڈرتی ہوئی
لڑکیوں کے احساسات کو مسل کر
اُن کے آنسو روک سکتے ہو
لیکن دھرتی کے انیا پر
اداس بادلوں کو رونے سے روکنا
تمھارے بس میں نہیں

تم بہت بااختیار ہو
باغ مٹا کر، درخت کٹوا کر
گھونسلے اُجاڑ سکتے ہو
لیکن آزاد پرندوں کے گیتوں پر
پابندی لگانا
تمھارے بس میں نہیں

تم بہت بااختیار ہو
تم حویلی کی طرف دیکھنے والوں کی
آنکھیں نکلوا سکتے ہو
لیکن
حویلی پر چاند کو
اُبھرنے سے روکنا
تمھارے بس میں نہیں

ہاں ہم جانتے ہیں کہ
تم بہت بااختیار ہو

☆☆☆☆

مصطفیٰ ارباب
سندھی سے ترجمہ: حبدار سولنگی

اُس کو دیکھنے کے لیے

محبت
ایک چار حرفی لفظ ہے
جب میں کہتا ہوں
”محبت“
چاروں اطراف
اس لفظ کے اندر آجاتے ہیں
میں ایک ایک کر کے
ہر طرف سے
گھوم کر آتا ہوں
اس لفظ کے اندر آنے کے بعد
ہر طرف محبت کا راستہ بن جاتا ہے
ایک لڑکی کے علاوہ
اس میں ہر چیز نظر آتی ہے
میری آنکھیں
اس لڑکی کو دیکھنا چاہتی ہیں
اس کو دیکھنے کے لیے
میں چار حرفی لفظ
”نفرت“
کبھی ادا نہیں کروں گا

منور سراج

سندھی سے ترجمہ: حبدار سولنگی

پانچواں طرف

‘‘سنو۔’’

‘‘جی۔’’

‘‘جاگ رہی ہو؟’’

‘‘ہاں۔’’

‘‘ایک بات تو سنو۔’’

‘‘ہو.........کہو۔’’

‘‘وہ کون تھا؟’’

‘‘کون وہ؟’’

‘‘وہ جو آیا تھا۔’’

‘‘پتہ نہیں کون آیا تھا؟’’

‘‘مجھے پریشان نہ کرو، بتاؤ۔’’

‘‘کیا؟’’

‘‘وہی کہ وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا؟’’

‘‘پتہ نہیں کون تھا، کہاں سے آیا تھا؟’’

‘‘تمھارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟’’

‘‘کوئی بھی نہیں۔’’

‘‘جب سے وہ گیا ہے، تم اداس رہنے لگی ہو!’’

‘‘ایسا تو نہیں ہے۔’’

‘‘تو پھر؟’’

‘‘یہ اداسی نہیں ہے۔’’

‘‘تو پھر کیا ہے؟’’

”اطمینان ہے شاید۔ “

”ہنس کر نہیں بولتی؟“

”ہنسنا بولنا خوشی کا دلیل تھوڑی ہے۔ “

”تو پھر۔ “

”خوشی کوئی اور چیز ہے۔ “

”اس کا مطلب تمھاری ہنسی جھوٹی تھی؟“

”جھوٹی تو نہیں تھی مگر......“

”مگر کیا؟“

”لیکن سچ بھی نہیں تھی۔ “

”تو پھر کیا تھی؟“

”سچ اور جھوٹ کے بیچ میں تھی۔ “

”کیا مطلب؟“

”ہم سب سچ اور جھوٹ کے بیچ جی رہے ہیں۔ “

”جو کچھ تمھارے لیے کیا وہ بے معنی تھا؟“

”کیا؟“

”گھر، سہولتیں، دولت۔ “

”مجھے تمھاری ضرورت تھی!“

”میں بھی تو تمھارے پاس ہی تھا۔ “

”کہاں تھے میرے پاس؟“

”اور نہیں تو کیا آٹھویں آسمان پر تھا؟“

”ہاں، آٹھویں آسمان پر تھے۔ “

”کیا مطلب کس کا آٹھواں آسمان؟“

”بے دھیانی کا آٹھواں آسمان!“

”تمھارے لیے تو وہ سب کچھ کیا جو......“

”جو......؟“

”جو ایک عورت کو خوش کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ “

”مثال کے طور پر؟“

”گھر، سہولتیں، دولت۔“

”یہی تو تمھاری بھول تھی۔“

”مطلب یہ کہ؟“

”عورت پھول کی طرح توجہ چاہتی ہے، اگر اس کو نہیں ملتا تو ......“

”تو ......؟“

”تو وہ مرجھا جاتی ہے، عورت محض ......“

”محض گوشت پوست نہیں ہوتی۔“

”تو پھر؟“

”عورت احساس ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”عورت، عورت ہے۔“

”ہمیشہ تم پر توجہ دی ہے۔“

”ہوں ......“

”ہنسی کیوں تم؟“

”ویسے ہی۔“

”پھر بھی۔“

”واقعی توجہ دیتے ہو۔“

”ہنس دیتا؟“

”دیتے ہو لیکن ......!“

”لیکن کیا؟“

”لیکن جب تم کو اپنی ضرورت پڑتی ہے۔“

”بکواس کر رہی ہو۔“

”یہ سچ ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“

”تو سچ کون سا ہے؟“

”سچ یہ ہے کہ میں نے تم سے محبت کی شادی کی تھی۔“

”اور ......؟“

''تم کو خون سے خط لکھتا تھا، ہم دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کا عکس رہتا تھا۔''

''ہوں......!''

''ہنستی ہو؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''ویسے ہی۔''

''پھر بھی۔''

''شوپیس کی طرح گھر میں رکھ کر بھول بیٹھے۔''

''پھر کیا گھر میں بیٹھ کر تم کو دیکھتا رہوں۔''

''کب کہا تھا کہ بیٹھے دیکھتے رہو؟''

''تو پھر؟''

''تم نے تو کبھی بھول کر بھی میری آنکھوں میں نہیں جھانکا۔''

''وقت نہیں گیا، ابھی ہم بوڑھے نہیں ہوئے۔''

''جوانی اور بڑھاپا جسم کا نام تھوڑی ہے۔''

''تو پھر؟''

''وہ تو احساس کا نام ہے۔''

''تم اب بھی خوبصورت اور جوان ہو۔''

''میں تو اسی شام ہی بوڑھی ہو گئی تھی، جس شام......''

''جس شام......''

''جس شام تم نے مجھ سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک واک کا وعدہ کیا تھا، لیکن......''

''لیکن؟''

''لیکن میں نے اپنی پسند کی پیلی ساڑھی پہن کر بال بھی نہیں باندھے تھے کہ......''

''کہ......؟''

''کہ تم فون کی گھنٹی پر پارٹی سے سودا طے کرنے چلے گئے اور میں......''

''اور تم کیا؟''

''اور میں کھلے ہوئے بالوں کے ساتھ بکھر گئی تھی۔''

''یہ بھاگ دوڑ نہیں کرتا تو تم......''

”تو میں؟“

”تو تم اپنی پسند کی ساڑھی پہن سکتی تھی ...... بتاؤ؟“

”میں بحث نہیں کرنا چاہتی، مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”مجھے بھی نیند آ رہی ہے، مگر میں سونے سے پہلے ......“

”سونے سے پہلے؟“

”پھر بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“

”یہی کہ وہ کون تھا؟“

”یہ تو پتہ نہیں کہ وہ کون ہے لیکن ......“

”لیکن کیا ......؟“

”لیکن اس کے آنے سے پہلے آسمان پرنوں سے بھر گیا تھا۔“

”تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق تھا؟“

”شاید کوئی بھی نہیں ...... شاید اُداسی کا۔“

”تم نے اس سے کیا کہا؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

”اس نے کیا کہا؟“

”مائے گاڈ! گونگا تھا کیا؟“

”گونگا تو نہیں تھا لیکن ......“

”لیکن ......؟“

”لیکن لفظوں کا محتاج نہیں تھا۔“

”تو پھر؟“

”سب کچھ اس کی آنکھوں میں تھا۔“

”کیا؟“

”ایک بے انت خالی پن۔“

”خالی پن کیا ہے؟“

”خالی پن ہی سب کچھ ہے۔“

”مثال کے طور پر ......؟“

”خالی پن میں پرندے اڑتے ہیں اور ......“

”اور کیا؟“

”اور بادل برستے ہیں، شاید خالی پن۔“

”شاید کیا ......؟“

”خالی پن خدا کی آغوش ہے۔“

”اور؟“

”اور اس کی آنکھوں میں ایک دکھ لکھا ہوا تھا۔“

”کون سا؟“

”کہ لوگ محبت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اور ......؟“

”اور؟“

”دوستی میں منافقت اور رشتوں میں سیاست شامل ہو گئی ہے، اس لیے ......“

”اس لیے؟“

”لڑکیاں محبت سے، پرندے درختوں سے، بچے گلیوں سے ڈرنے لگے ہیں اور یہ کہ ......؟“

”یہ کہ؟“

”کہ لوگوں کی آنکھوں میں خوابوں کے لیے اسپیس نہیں بچا ......“

”عجیب ایب نارمل آدمی تھا .... جسٹ میڈیکل کیس۔“

”ایب نارمل آدمی نہیں تھا لیکن ......“

”لیکن؟“

”ابنارملٹی کے دور میں نارملٹی کا احساس تھا۔“

”تمھاری وہی الجھن ...... فینٹسی ...... اوپر سے رات بیتی جا رہی ہے۔“

”تو پھر؟“

”مجھے صبح سویرے اٹھنا ہے اور کل بھی آتے آتے ......“

”آتے آتے؟“

”آتے آتے رات ہو جائے گی۔“

”اس لیے؟“

”کل تم کسی سائکاٹرسٹ سے مل لینا۔“

”ہوں۔“

“ہنستی کیوں ہو؟”

“ویسے ہی۔ ”

“پھر بھی۔ ”

“جن کو خود علاج کی ضرورت ہوتی ہے، وہ......”

“وہ؟”

“وہ دوسروں کو علاج کا مشورہ دیتے ہیں۔ ”

“کیا مطلب، میں بیمار ہوں؟”

“میں بحث نہیں کرتی۔ ”

“بحث کرنے کا شوق مجھے بھی نہیں۔ ”

“تو پھر سو جاؤ، آپ کو صبح آفس بھی جانا ہے۔ ”

“لیکن سونے سے پہلے آخری مرتبہ تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ”

“کیا؟”

“یہی کہ وہ کون تھا؟”

“سچ بتاؤں؟”

“ہاں بتاؤ؟”

“وہ اداس قبیلے کا آخری فرد تھا۔ ”

“اداس قبیلہ، کیا مطلب؟”

“ہاں دنیا میں اداس لوگوں کا ایک الگ قبیلہ ہے۔ ”

“کہاں سے آیا تھا؟”

“پانچویں طرف سے آیا تھا۔ ”

“پانچواں طرف، چار اطراف سے الگ ایک طرف ہے۔ ”

“کہاں ہے؟”

“جہاں چار اطراف ختم ہوتے ہیں وہاں سے پانچواں طرف شروع ہوتی ہے۔ ”

“لیکن دیکھنے میں تو نہیں آتا۔ ”

“ایسے نظر نہیں آتا۔ ”

“تو پھر؟”

“اس کے لیے باہر دیکھنا نہیں پڑتا۔ ”

”مطلب؟“

”مطلب کچھ نہیں۔“

”تو پھر وہ کہاں چلا گیا؟“

”وہاں، جہاں سے آیا تھا، اور جاتے جاتے اپنے ساتھ......“

”اپنے ساتھ کیا؟“

”اپنے ساتھ مجھے بھی لے گیا۔“

”ہوں۔“

”ہنستے ہو؟“

”ہاں......ہنسی آ رہی ہے!“

”کیوں کر؟“

”تمھاری وہی الجھن......فینٹسی......وہم......تم تو......!“

”میں تو کیا؟“

”تم تو میرے پاس ہو......میرے بیڈروم میں......میرے ساتھ۔“

”تمھارے پاس صرف میرے ہاتھ، پاؤں، چہرہ اور بال ہیں۔“

”تو پھر وہ کیا لے گیا؟“

”وہ میرے دل کی دھڑکن اور......“

”اور کیا؟“

”اور آنکھوں کے چاروں ہی موسم لے گیا۔“

☆☆☆☆

کشمیری لوک کہانی

کشمیری سے ترجمہ: غلام حسن بٹ

گاؤں کا استاد

یہ کہانی اس دیہات کے متعلق ہے، جہاں پر ایک سکول روایتی انداز سے چل رہا تھا۔ سکول کا سفید ریش استاد جو تیس سال سے پڑھا رہا تھا، وفات پا گیا۔ اس کے چلے جانے پر گاؤں والوں کو بہت دکھ ہوا حالاں کہ اس نے بہ یک وقت صرف تین سے چار شاگردوں کو ہی پڑھایا ہوگا لیکن اس کے کردار، تہذیب اور اخلاق کی وجہ سے سب اس کی عزت کرتے تھے اور اب اس کی کمی محسوس کر رہے تھے۔

اس کی وفات کے بعد دوسرے استاد نے اس کی جگہ لی، نیا استاد جوان تھا اور اس میں اچھے نوجوان کی طرح صحت مند جذبہ امید جیسی خوبیاں موجود تھیں۔ اس کی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں اسے دیگر سرگرمیوں میں شریک ہونے کی اجازت تو نہ دیتی تھیں لیکن وہ نوجوان لوگوں کی محفل میں رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ دوستوں کے درمیان رہ کر اسے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ چند بزرگ مرحوم استاد کے اخلاق اور رویے کو یاد کرتے اور اس کی کمی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔

شہر میں زندگی بسر کرنے والی خواتین کی زندگی دیہات میں بسنے والی عورتوں کی نسبت مختلف ہوتی ہے۔ شہر میں تعلیم یافتہ تاجر اور آفیسر لوگ آباد ہوتے ہیں۔ ماضی میں ہندو اور مسلم خواتین پردہ کرتی تھیں اور مرد کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھیں۔ کسی اجنبی سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تاہم دیہات کی خواتین ان بندشوں سے بڑی حد تک آزاد ہوتی تھیں، وہ ہنسی خوشی گھومتی پھرتی اور شوہر کے ہمراہ کھیتوں میں جاتیں، وہ ہر شخص کو، چاہے چور، گنوار بھی ہو، بغیر ہچکچاہٹ کے ملتیں اور انھیں کسی قسم کا ڈر خوف محسوس نہیں ہوتا، بہ نسبت ان خواتین کے، جو جالی دار پردوں کے اندر رہتی تھیں۔ وہ چاہے کچھ بھی کرتیں لیکن ان کے کردار پر کسی قسم کا الزام نہ آتا۔

نیا استا، دان دیہاتی عورتوں کے متعلق غلط اندازہ کر بیٹھا تھا، اس نے سوچا کہ وہ خود نمائی کے ذریعے اپنے آپ کو بے مثال انسان ثابت کرے گا، جب عورتیں آزادانہ کھیتوں میں جاتیں تو عین اسی وقت ان کے قریب سے گزرتا۔ بعض اوقات جب عورتیں چشمے پر پانی لانے جاتیں تو یہ استاد ان سے بات چیت کرنے کی کوشش بھی کرتا اگرچہ اس کا یہ انداز نا مناسب نہ تھا لیکن گاؤں والے برا سمجھتے تھے۔

اس گاؤں میں ایک خاتون خوبصورت اور اچھی شہرت رکھتی تھی، استاد کا مقصد اس عورت سے

دوستانہ تعلقات قائم کرتا تھا۔ اس نے کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن عورت نے خاطر میں نہ لایا اور کوئی شناسائی قائم کرنے سے باز رہی۔ جب استاد کو کامیابی نہ ملی تو اس نے اپنا طریقہ واردات بدلا، اس عورت کا بیٹا اسی سکول میں پڑھتا تھا، استاد بچے سے اکثر کہتا’’ اپنی ماں کو میرے بارے میں کہنا‘‘ لڑکا ماں کے پاس یہ پیغام روز لے کر جاتا ..... عورت نے محسوس کیا کہ کہ استاد کے دل میں ایسے خیال نہیں ہونے چاہئیں۔ عورت نے بیٹے کے ذریعے استاد کو پیغام بھیجا کہ اس کا شوہر پورا دن گھر میں نہیں ہوتا وہ آ جائے۔ استاد یہ خبر سن کر پھولے نہ سمایا اور مسرت وخوشی سے اگلی صبح عورت کے گھر پہنچ گیا۔ خاتون نے استاد کا استقبال تو کیا مگر اس میں گرم جوشی نہ تھی۔ مگر اس نے دوستی کا اعتماد دلانے کی پوری کوشش کی اس نے نظروں میں کوئی اجنبیت ظاہر نہیں کی، استاد کو اندر بٹھایا اور چائے پیش کی۔

جوں ہی استاد نے چائے پینا شروع کی باہر سے گھر کے مالک کی آواز آئی، استاد نے کوئی خوف محسوس نہیں کیا کیوں کہ عورت نے اعتماد دلا دیا تھا۔ شوہر برآمدے سے گرج دار آواز میں چلایا۔ عورت ڈر کے مارے زرد ہو گئی اور کانپنے لگی۔

عورت نے دھیمی آواز میں کہا’’ میں تو تباہ ہو گئی اگر اس نے تمھیں دیکھ لیا تو یہ تمھیں بھی مارے گا اور مجھے بھی۔‘‘

استاد بولا: ’’ڈرو مت وہ زیادہ غصے میں نہیں ہوگا۔‘‘

عورت بولی: ’’مجھے پتہ ہے کہ وہ کتنا اکھڑ مزاج انسان ہے۔ اس سے بہتر تھا مجھے موت آ جاتی۔‘‘ اور عورت سینہ کوبی کرنے لگی۔

استاد بولا: ’’کوئی متبادل راستہ باہر بھاگنے کا ہے۔‘‘

عورت بولی: ’’کوئی نہیں وہ مجھے بھی قتل کر دے گا اور تجھے بھی‘ وہ خون خوار ہے۔

’’مجھے کوئی نہیں بچا سکتا جب تک ....‘‘ عورت دبکی آواز سے بولی: ’’جب تک ....اس کے شک سے بچنے کے لیے تمھیں بھیس بدلنا ہوگا۔‘‘

استاد بولا: ’’میں تمھاری خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہوں مگر بچنے کی صورت دکھا دو۔‘‘

خاتون خانہ نے اگلے ہی لمحہ استاد کو ایک لمبا ’’پھرن‘‘ پہننے کو دیا اور سر پر سکارف اوڑھنے کو پیش کیا اور ساتھ ہی مکئی کی ایک ٹوکری اور آٹا پیسنے کی چکی دی انھوں نے پلک جھپکنے میں یہ کام شروع کر دیا۔

خاتون خانہ نے استاد پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ مسلسل نگاہ نیچی رکھے، نیچے دیکھتا رہے اور چکی کا اوپر والا پاٹ چلاتے ہوئے جلدی جلدی پیلا آٹا پیسے۔

استاد نے ایسا ہی کیا اور چکی سے آٹا پیسنے لگا۔ عورت جلدی جلدی سیڑھیوں سے نیچے اتری تا کہ اس کے شوہر کو شک نہ ہو کہ آٹا پیسنے والی عورت ہے مرد نہیں۔ عورت نے مسکراتے ہوئے شوہر کو سلام کیا۔ شوہر نے

پوچھا: ”یہ اوپر گڑگڑاہٹ کی آواز کیسی ہے۔“

بیوی نے جواب دیا: ”یہ وہ گونگی عورت آئی ہے اور آٹا پیس رہی ہے۔“

دونوں میاں بیوی باہر لان میں کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ چکی کی گڑگڑاہٹ کبھی زیادہ اور کبھی کم ہوتی۔ کافی دیر یہ سلسلہ چلتا رہا اور چکی چلا چلا کر استاد کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی، سکارف اور ’چھرن‘ چھپانے کی کوشش کرتا رہا، اس نے سوچا کہ وہ بھاگتے ہوئے ایک آوارہ کتا لگے گا۔

شوہر نے بیوی سے کہا: ’’عورت بہت تھک چکی ہے اسے اب گھر جانے دو۔‘‘

اب اس نے سبق سیکھ لیا ہوگا۔

خاتون خانہ اوپر گئی اور استاد سے کپڑے لیے اور قیدی کو آزاد کر دیا اور استاد بغیر کوئی لفظ بولے بھاگ نکلا۔ اگلے روز بہت سارے لوگ کہنے لگے کہ استاد کا خمار اتر گیا ہے۔ اس کی روح پر کالے بادلوں کا اندھیرا چھایا ہوگا لیکن کوئی نہیں جانتا یہ کیسے ہوا کیوں کہ نہ تو عورت نے اور نہ اس کے شوہر نے، گونگی عورت کا آٹا پیسنے والا راز فاش کیا۔ چند دن بعد عورت نے دوبارہ استاد کو پیغام دیا کہ ان کے گھر آئے۔ بچے نے پیغام استاد کو پہنچایا لیکن اس بار استاد کو کوئی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ استاد نے جواب میں کہا کہ ماں سے کہنا: ”پہلا پیسا ہوا آٹا ختم ہوگیا؟“

☆☆☆☆

کشمیری لوک کہانی

کشمیری سے ترجمہ: غلام حسن بٹ

لالچی طبیب

ہر دور میں لالچی طبیب، حکیم یا جراح ہوا کرتے ہیں جو بیماریوں کو معجزانہ ٹھیک کرنے کے دعوے کرتے رہے ہیں، درحقیقت ہر ملک میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو وقت کا مسیحا ہونے کا لقب حاصل کرتے ہیں، وادیٔ کشمیر میں اسی طرح کے 'طبیب' گزرے ہیں، جنھوں نے مسیحائی کا دعویٰ کیا ہے۔ آج کل بیماریوں کی تشخیص کے سلسلہ میں جدید تحقیق نے تو بین الاقوامی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ اسی تحقیق کی بنیاد پر لوگوں نے ماسکو، لندن، نیویارک جیسے بڑے بڑے شہروں میں لوگوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ ماضی میں ہر ضلع گاؤں میں بیماریوں کے علاج کے لیے دیسی جڑی بوٹیوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا یا پھر کسی ماہرِ طب سے رجوع کرنا پڑتا، یہ کسی حد تک ٹھیک تھا کہ قدرت نے لوگوں کو عقل کے ساتھ اچھی صحت بھی دی تھی اور وہ جڑی بوٹیوں سے علاج معالجہ کرتے رہتے تھے۔

وادیٔ کشمیر میں ایک مشہور طبیب رہتا تھا۔ اس نے حکمت کا پیشہ شوق یا ضرورت میں اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اسے یہ آباؤاجداد سے ورثے میں ملا تھا۔ اسے کئی نسلوں سے حکمت کا تجربہ تھا۔ اس نے علاج ومعالجہ کے بارے میں کئی مستند کتب لکھی تھیں جن میں علاج کے فارمولے موجود تھے۔ انھی فارمولوں کے ذریعے وہ اور اس خاندان علاج کرتے تھے۔ ان کتب کے اندر اس کے آباؤاجداد کی اختراعات تھیں جنھیں خریدا نہیں جا سکتا تھا وہ روزانہ اپنے گھر میں ایک مخصوص کمرے میں بیٹھتا اور لوگ کھانستے، کراہتے بخار میں مبتلا ہوتے جو اس کے پاس آتے رہتے۔ مریض چند منٹوں میں دوا کی چٹ لیے اس عطار کے دواخانہ میں جاتے بہت سے مریض بیماری ٹھیک ہونے پر چند سکے شکرانے کے طور پر اس کے قدموں میں رکھ کر چلے جاتے۔ بعض مریض تو اتنے خوش ہوتے کہ فیس ادا کرنے کے ساتھ ساتھ، کشمیری سیب، سنگھاڑے، گیریاں بطور تحفہ طبیب کو پیش کرتے۔ وہ جہاں بھی جاتا لوگ اس کی عزت کرتے اور احتراماً نشست چھوڑ دیتے وہ معمولی طبیب نہیں تھا۔ ایسے لوگ جو قریب المرگ بھی ہوتے اس کے علاج سے ٹھیک ہوجاتے۔

ایک دفعہ ایک مریض جو (Sanity) صفائی کے کسی مرض میں مبتلا تھا اور اسے کئی حکیموں، معالجوں کے پاس علاج کی غرض سے لے جایا گیا لیکن وہ صحت یاب نہ ہوا۔ دیوتاؤں کے آگے چڑھاوے چڑھانے، نذر نیاز دینے کے باوجود ٹھیک نہ ہوا۔ آخر کار مریض ''طبیب'' کے پاس علاج کی غرض سے حاضر ہوا۔ مریض

کا بغور معائنہ کرنے کے بعد، اسے طبیب اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا اور مریض کو رسی کے ساتھ باندھ کر رسی کو ایک مضبوط کیل سے باندھ دیا گیا۔ پانی کے کئی گڑھے لا کر اس کے سر پر ڈالے گئے یہ علاج ایک ہفتہ جاری رہا اور مریض ٹھیک ہو کر چلا گیا۔

ایک مرتبہ ایک مریض کی کمر درد کی شکایت لے کر آیا وہ اپنی جلد بار بار مسلنے اور خارش کرنے کی وجہ سے شدید درد محسوس کر رہا تھا مل کہ یوں سمجھیں ایک گدھا بار بار رگڑنے (کھرچنے) کے بعد کھڑا ہوتا ہے۔ مریض بولا: ''میں نے کئی گڑھے 'جوشاندہ' جو خون کو گرم رکھتا ہے لیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔'' وہ پیلا اور لاغر ہو گیا تھا۔ آخر پر وہ مریض 'وقت کے مسیحا' اس طبیب کے پاس آیا۔ طبیب نے مریض کو دیکھا اور بولا: ''میں نے پہلی بار ایسے مریض کو دیکھا۔'' درد کئی بیماریوں کی علامات کو ظاہر کرتا تھا لیکن یہ بیماریاں مختلف تھیں۔ طبیب نے اپنی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ساتھ ساتھ مریض کا معائنہ بھی کرتا رہا۔ اس نے مختلف اقدام کے تیل کا مکسچر مساج کرنے کے لیے دیا اور دو دن کے بعد واپس آنے کو کہا۔ جب مریض دوبارہ طبیب کے پاس گیا تو طبیب نے اسے ماضی کے برعکس دوسرا طریقہ علاج بتایا۔ طبیب نے کہا کہ وہ صبح سویرے قربان گاہ جائے اور ایک تازہ ذبح کی ہوئی بکری کی چمڑی حاصل کرے، مریض نے اس تازہ چمڑی کو اپنے اوپر اوڑھنا تھا اور ایک گھنٹہ کے لیے تیز دھوپ میں بیٹھنا تھا۔ طبیب نے مریض کو وہم سے نکالنے کا تجربہ اور آزمائش کے طور پر یہ علاج تجویز کیا تھا۔ طبیب نے مریض کو ایک گھنٹہ چمڑی اوڑھنے اور دھوپ سینکنے کے بعد جب اس کے اوپر سے کھال اتاری تو سینکڑوں کی تعداد میں بکری کے خون میں موجود جوویں (Lice) مزے لے رہی تھیں اور مریض ٹھیک ہو گیا۔

ایک مرتبہ ایک خوشحال قصائی اس طبیب کے پاس آیا اور آنکھوں میں درد کی شکایت کی، طبیب نے اس کی دونوں آنکھیں معائنہ کیں اور آنکھوں کو سینک Fomentation دینے کو کہا۔ قصائی مطمئن ہو کر گھر چلا گیا۔ طبیب نے کہا تمھاری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ قصائی نے شکرانے کے طور پر بھیڑ کے گردے پیش کیے۔ تقریباً ایک ہفتہ کے بعد قصائی طبیب کے پاس معائنہ کرانے دوبارہ آ گیا۔ طبیب نے پوچھا: 'اب کیسا محسوس کر رہے ہو، میرا خیال ہے تمھاری آنکھیں اب بہتر ہیں۔'' قصائی نے جواب دیا'' بہت بری'' کوئی خاص بہتر نہیں۔'' قصائی نے طبیب کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس کا کاروبار متاثر ہو رہا ہے اگر یہی حال رہا تو اس کا گزارہ مشکل ہو گا۔ طبیب نے جواب دیا۔ ''میرے دوست فکر نہ کرو تم بہتر ہو جاؤ گے، میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، تمھاری آنکھیں اتنی دیر میں ٹھیک ہو جائیں گی جتنی دیر مکھی کو دودھ سے نکالنے میں لگتی ہے۔' قصائی واپس آنے سے پہلے طبیب کو ایک کلو بکری کا گوشت اور مغز پیش کیا۔

قصائی روزانہ طبیب کے پاس ہدایات لینے کے لیے آیا اور ہر بار طبیب کے لیے تحفہ لاتا۔ قصائی معمولی بہتری محسوس کرتا اسے تکلیف کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی بیماری چند دنوں

میں ختم ہو جائے گی اور ساتھ تذبذب کا شکار تھا۔ اس کی بیماری کسی پرانے انفیکشن کا نتیجہ لگتی تھی۔ تاہم اس نے طبیب کے پاس روزانہ آنے کا سلسلہ جاری رکھا اور طبیب کے لیے ہڈیوں کا گودا، چربی، تازہ گوشت بطور تحفہ لاتا۔

ایک دن قصائی معمول سے زیادہ دکان پر مصروف ہو گیا دوسری جانب طبیب کو بھی ایمرجنسی معائنہ کے لیے گھر سے دور جانا پڑا۔ جب قصائی طبیب کے گھر پہنچا اسے گھر میں نہ پایا تو غمگین ہوا۔ طبیب کے گھر میں اس کا بیٹا جو اس کی معاونت کرتا موجود تھا۔ تاہم غیر ارادی طور پر اس نے اپنا معاملہ کم تجربہ کار معالج طبیب کے بیٹے کو بتایا، یہ سوچا کہ نہ ہونے سے کچھ بہتر ہے (نہ ہونے سے آدھی روٹی بہتر ہے)۔

نوجوان طبیب نے قصائی کا بغور معائنہ کیا اور (Eyelid) پپوٹے کے نیچے ایک چھوٹا ہڈی کا ٹکڑا پایا۔ اس نے ہڈی کا ٹکڑا نکالا اور قصائی کو فوراً آرام آ گیا اور خوشی سے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن طبیب نے جب رات کا کھانا کھایا اور کوئی گوشت وغیرہ روٹی کے ساتھ موجود نہ تھا اور چاول کے ساتھ سبزی، دال ہی موجود تھی۔ اسے کھانے میں کوئی مزہ نہ آیا جو اسے روزانہ گوشت کھا کر آتا تھا۔ بیٹے سے بولا:

''کیا وہ قصائی سوجھی ہوئی آنکھیں لے کر تمھارے پاس آیا تھا۔''

بیٹا بولا: ''ہاں ابا، میں نے اس کی آنکھوں سے ہڈی کا چھوٹا سا ٹکڑا نکالا اور اس کا درد ٹھیک ہو گیا۔''

''کیا ایسا ہوا۔'' باپ نے بیٹے سے کہا: ''تم کیا اب عمدہ طبیب ہو۔'' کیا مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں ہڈی کا ٹکڑا ہے۔

''اب تمھیں تمھارے کام کے عوض یہ معمولی سبزی ہی کھانے کو ملے گی، کیا تمھیں وہ مزیدار کھانا یاد نہیں رہا ہے۔''

☆☆☆☆

بشریٰ فرخ

ہندکو سے اردو ترجمہ: خالد مصطفیٰ

کیا ملا ضبط آزمانے سے
درد چھپتا نہیں چھپانے سے

جانے کتنی خوشی ملی اُس کو
اس طرح میرا دل دکھانے سے

اپنی موت آپ مر گئے جذبے
اک تری آرزو مٹانے سے

فاصلے کم دلوں کے ہوتے نہیں
تیرے میرے قریب آنے سے

کُھل گیا خوب دوستی کا بھرم
اک ذرا اُس کو آزمانے سے

اپنے اپنے نصیب کے قیدی
مر گئے ہیں رہائی پانے سے

کٹ گئی ساری زندگی بشریٰ
کچھ بنانے تو کچھ مٹانے سے

☆☆☆☆

مشتاق عاجز

ہندکو سے اردو ترجمہ: خالد مصطفیٰ

مَنت مانگی، مِنت کر کر ہار گئی
تیری بے پرواہی سجنا مار گئی
بیس برس تک تُو نے میری خبر نہ لی
پڑھ پڑھ نفل نمازیں عمر گزار گئی
بالا پیرؒ پہ حاضر ہر جمعرات ہوئی
گیارہ بار میں داتا کے دربار گئی
دیپ جلائے زندہ پیرؒ پہ جا جا کر
حضرت جی باباؒ پہ ہر اتوار گئی
عَلَم چڑھائے، چادر ڈالی مَنّت کی
پیدل چلتے چلتے بری سرکارؒ گئی
رستے ناچتے پاؤں سوجھ گئے
چلنے پھرنے سے بھی ہو لاچار گئی
بالی عمر میں پیار کی بازی کھیلی میں
چھلیارے! میں بھولی بھالی ہار گئی
کھو گئی تھی میں رنگ برنگی چیزوں میں
پاگل تھی جو ساتھ ترے بازار گئی
بھول نہ پائی تیکھا، لحہ جس لمحے
میں تیرے ڈیرے پہ پہلی بار گئی
گھیر لیا باتوں میں سندھ کی لہروں نے
ڈوب گئی میں، تیری نیا پار گئی
سات سمندر پار کے باسی، بے خبرے
میری چیخ تو سات اُفق کے پار گئی

☆☆☆☆

ملک ناصر داؤد

ہندکو سے ترجمہ: سید ماجد شاہ

قینچی

شمائلہ جب شمالی علاقوں کی طرف نکلی تو اسے احساس ہوا کہ وہ ویسے ہی ہر سال، غیر ملکوں میں سیر کرنے جاتی رہی۔ اسے اپنے ملک کے جنت نما حسن کا پتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو بھلا ہو اس کی جان سے عزیز سہیلی نازیہ کا جس کی ان دور دراز علاقے میں بحیثیت ڈاکٹر پوسٹنگ ہوئی تھی۔ شمائلہ اسی کی دعوت پر یہاں آئی تھی۔ یہاں ہر قدم پر نئے نظارے تھے۔ برف سے ڈھکی فلک بوس چوٹیاں، سبزے سے بھری وادیاں، نیلا خود پانی، پہاڑوں سے پھوٹتے چشمے، ٹھنڈی اور پاکیزہ ہوا، کالی گھٹاؤں کو چھوتی چوٹیاں، لگتا تھا کہ جنت کی تمام خوبیاں ان پہاڑوں اور وادیوں میں در آئی ہیں۔ فضاؤں میں اڑتے پنچھی ان فضاؤں کو اور بھی رومینٹک بنا رہے تھے۔ شہروں میں تو انسان سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اس سفر میں، اس کا خیال تھا کہ وہ جھیل سیف الملوک ضرور دیکھے گی جس سے وابستہ ایک رومانوی داستان اس نے پڑھ رکھی تھی۔

اس علاقے کے آخری پیٹرول پمپ سے ڈرائیور نے ٹینکی فل کروالی۔ وہ پہلے بھی اس علاقے میں آچکا تھا۔ خود شمائلہ بھی ایک اچھی ڈرائیور تھی لیکن اس کے والد نے اسے پہاڑی سفر میں اکیلا بھیجنا مناسب نہیں سمجھا۔ پمپ سے ہی انھوں نے اپنی منزل کا پتا بھی لے لیا جو تقریباً چار گھنٹے کی مسافت پر تھی۔

ابھی وہ تھوڑا ہی آگے گئے تھے کہ ایک لڑکی نے ان کی گاڑی کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا، ڈرائیور نہ رکا، لیکن شمائلہ نے گاڑی رکوائی اور ڈرائیور سے کہا، اس سے پوچھے کہ کیا مسئلہ ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی روک کر شمائلہ کو سمجھاتے ہوئے کہا آگے راستہ جنگل کا ہے ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔ لڑکی گاڑی کے قریب آئی تو شمائلہ نے خود شیشہ نیچے کر کے پوچھا۔ لڑکی نے کہا وہ کچھ دور جا کر اتر جائے گی، اسے ساتھ لے لیں کیوں کہ شام کا وقت ہے اب اسے یہاں کوئی گاڑی نہیں ملے گی۔ شمائلہ نے اسے اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا اور لڑکی کا جائزہ لیا۔ وہ ایک جوان لڑکی تھی، جس نے ایک بڑی چادر لپیٹ رکھی تھی، ہونٹوں پر دنداسے کی لالی،، چٹیا بنائی ہوئی، گندمی رنگ، اس کی بڑی بڑی آنکھوں کا کچھ عجیب سا رنگ تھا۔ وہ بہت دکھیا، تھکی ہوئی، مایوس اور بے چین لگ رہی تھی۔ انگریزی فلموں کے خوفناک کرداروں کی طرح اس کی آنکھوں میں ڈر کے ساتھ ساتھ کوئی خاص بات تھی۔

شمائلہ نے جب اس لڑکی سے پوچھا کہ وہ اس ویران علاقے میں کیا کر رہی ہے؟ تو اس نے

کہا: ’’میم صاحب۔ میرے گھر کوئی مرد نہیں اس لیے مجبوراً نکلنا پڑا۔‘‘

’’تم اس جنگل میں تنہا رہتی ہو؟‘‘ شمائلہ نے پوچھا۔

’’میم صاحب! ان جنگل کے باسیوں نے میرے منشی کو مار ڈالا ہے۔ وہ میرے بھی دشمن ہیں۔ ان ظالموں نے مجھے اکیلا کر دیا ہے۔‘‘ اس نے درد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

’’منشی تمھارا شوہر تھا؟‘‘ شمائلہ نے سوال کیا۔

اس نے کہا: ’’منشی اس علاقے میں جنگل کا ملازم تھا۔ بہت اچھا اور بہادر، وہ زبردست شکاری تھا۔ اس جنگل میں وہ اور میں ملے اور ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔ ہماری محبت برف کی طرح پاک تھی۔ ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ ان وادیوں کے درخت ہماری خلوص بھری محبت کی گواہی دیں گے لیکن۔۔۔۔‘‘ شمائلہ کا تجسس بڑھ گیا تھا۔ اس نے لڑکی کو پانی پلایا اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ’’میرا منشی بہت سمجھدار آدمی تھا اس نے میرے باپ سے میرا رشتہ مانگا تھا جو میرے باپ نے میری خوشی کی خاطر قبول کر لیا تھا۔‘‘

’’پھر تو تمھارا کام آسان ہو گیا نا!‘‘ شمائلہ نے کہا

لڑکی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا: ’’باپ کے ہاں کرتے ہی گاؤں والے ہمارے دشمن ہو گئے۔ ہماری روایات میں لڑکی کا رشتہ نہ باہر دیا جاتا ہے نہ باہر سے کیا جاتا ہے۔ لوگوں نے ہمارا اور منشی کا جینا حرام کر دیا۔‘‘

’’پھر کیا ہوا۔‘‘ شمائلہ نے بے تابی سے پوچھا۔

’’میرا سٹاپ آ گیا ہے۔‘‘ اُس لڑکی نے شمائلہ سے کہا ’’آپ آئیں نا! میں آپ کو چائے پلاتی ہوں باقی باتیں وہیں کریں گے۔‘‘

ڈرائیور سمجھاتا رہا مگر شمائلہ اس کے ساتھ، سڑک کنارے بنے کچے گھر میں چلی گئی۔ عجیب اجڑا اجڑا گھر تھا۔ چیزیں بکھری ہوئیں ہر طرف گندگی لڑکی نے اسے برآمدے میں بٹھایا خود اندر گئی کچھ دیر بعد وہ دو کپ چائے لے آئی۔ اندھیرا کم کرنے کے لیے اس نے طاق میں چراغ روشن کیا اور چائے پیتے ہوئے اپنی بپتا کہنی شروع کی۔ ’’میم صاحب! اس کے بعد منشی اس ارادے سے شہر جانے لگا کہ وہاں جا کر وہ اپنے ماں باپ کو لائے اور قاعدے قانون کے مطابق مجھے بیاہ کر لے جائے۔‘‘ یہ کہہ کر لڑکی رونے لگی جب اس کے آنسو تھمے تو بولی: ’’میرے رشتہ داروں نے اسے جاتے ہوئے گھیر لیا اور ظالموں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی بوٹی بوٹی جنگل میں بکھیر دی۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ اس نے مجھ سے محبت کی تھی۔ اس کے بعد میں نے بھی کبھی کسی کو اپنی زندگی میں نہیں آنے دیا۔‘‘ وہ پھر رونا شروع ہو گئی، شمائلہ نے ٹشو پیپر نکال کر اس کے آنسو پونچھے۔

”میڈم جی جلدی کریں آگے راستہ بہت ہے اور اندھیرا بھی ہو رہا ہے۔“ باہر سے ڈرائیور نے آواز دی تو شمائلہ اسے وہیں روتا چھوڑ کر گاڑی میں جا بیٹھی اور اندھیرا ہونے سے پہلے نازیہ کے کالج میں پہنچ گئی۔ دونوں سہیلیاں ملیں تو خوب باتیں ہوئیں۔ کھانے پر اگلے دن گھومنے کا پروگرام بنا اور وہ جلد ہی سو گئیں۔

اگلے دن تیار ہو کے دیسی انڈوں اور خالص گھی کے پراٹھوں کا مزے دار ناشتہ ہوا۔ دونوں سہیلیاں ڈرائیور کو وہیں چھوڑ کر سیر کو نکل گئیں۔ شمائلہ نے مووی کیمرہ بھی ساتھ رکھ لیا۔ دونوں پھرتی پھراتی وہیں پہنچ گئیں جہاں گزشتہ شام شمائلہ نے اس لڑکی سے چائے پی تھی۔ شمائلہ نے ڈاکٹر نازیہ کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا۔

”او مائی گاڈ! ڈاکٹر نازیہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ تمھیں اس لڑکی کی روح ملی تھی جس کے عاشق کو لوگوں نے مار دیا تھا۔ کئی مرتبہ لوگوں نے اس کی روح یہاں دیکھی ہے۔ اپنے عاشق کی یاد میں روتی تڑپتی نظر آتی ہے۔“

”نہیں نہیں وہ روح نہیں ہو سکتی، اس نے ہمارے ساتھ سفر کیا، اپنی کہانی سنائی، اس نے تو مجھے چائے بھی پلائی تھی۔“ شمائلہ نے بتایا۔ شمائلہ نازیہ کو ساتھ لے کر گھر کے اندر گئی۔ وہ ایک ویران مکان تھا۔ دیواروں پر جالے اور چھت میں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے، البتہ طاق میں چراغ رکھا ہوا تھا اور شمائلہ کا استعمال کردا ٹشو پیپر اور چائے کا کپ بھی وہیں اوندھا پڑا تھا، مگر وہاں اور کوئی نہیں تھا ہوتا تو نظر آتا۔ وہ گھر تو زمانوں سے اجڑا ہوا ایک ویرانہ تھا۔

شمائلہ کو اندازہ ہو گیا کہ کل اس کے ساتھ عجیب واقعہ ہوا ہے۔ اس لڑکی کی آنکھوں کی ویرانی اور خوف کی حقیقت کا اسے پتا چل گیا۔ اس سے پہلے کہ شمائلہ بے ہوش ہو جاتی نازیہ اسے گاڑی میں ڈال کر کالج تک لے آئی۔ اس حادثے سے شمائلہ کو شدید بخار ہو گیا۔ بخار اترا تو نازیہ نے اسے شہر واپس پہنچا دیا۔

☆☆☆☆

عبدالوحید بسمل

ہندکو سے ترجمہ: مفیدہ ماجد

ساڑ

اس نے کیشیر کے ہاتھوں سے رقم، اس طرح لینے کی کوشش کی جیسے سؤر جھپٹا مارتا ہے۔ پیسے بنیان کی جیب میں ڈال کر، بڑے گیٹ سے باہر نکلا اور بھاگتا ہوا، فیکٹری کی سڑک پر پہنچ گیا۔

آج وہ بہت خوش تھا اس لیے کہ آج اسے اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آ رہی تھی۔ رکشے میں بیٹھے ہوئے بھی وہ خود کو آسمانوں میں اُڑتا اور ہواؤں کے جھولتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ جیب پر اور دوسرا اس بودے کاغذ کے پرزے پر تھا۔ جسے سائیڈ والی جیب سے نکال کر اس پر لکھی فرمائشیں پڑھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا: ”ہاں ہاں پیو! میں تمھیں اور اپنی بوڑھی ماں کو اس ایک اکیلے گھر میں جو گاؤں کے ڈراؤنے اور ویران کونے میں ہے، تنہا چھوڑ کر نوکری کے لیے لاہور آیا ہوں۔

ہاں پیو! ہاں میں تیری لکھی ہوئی ساری چیزیں لے کر جتنا جلدی ممکن ہوا واپس آؤں گا۔ چن زیب ان ہی خوش خیالیوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ رکشا ایک جھٹکے سے رکا اور ڈرائیور نے پیچھے مڑ کے کہا: ”لو جی بابو جی یہی انارکلی ہے، نئی پرانی خود ہی پوچھ لینا۔“

انارکلی کی رونق نے کچھ دیر کے لیے تو چن زیب کے ہوش ہی اڑا دیے۔ اسے آج کوئی چیز اپنی مرضی کی لگتی ہی نہیں تھی۔ وہ کبھی ایک چیز دیکھتا کبھی دوسری، کبھی وہ دوسرے خریداروں سے مشورہ لیتا، کبھی دکان داروں سے اچھی اور نئی آئی ہوئی چیزوں کا تقاضا کرتا۔

کبھی چن زیب کپڑے پسند کرتا تو پیسے کم پڑ جاتے، کبھی پیسوں کے مطابق چیز اسے پسند نہ آتی اسی اکھاڑ پچھاڑ میں بہت سا وقت صرف ہو گیا، بالآخر اس نے جیسے تیسے چیزیں پوری کیں اور اڈے پر پہنچا۔

آج وہ راوی سے گزرا ضرور لیکن اس نے راوی کے خوبصورت کناروں پر کشتیوں، دریا کے پانی سے اُٹھتی ننھی ننھی لہروں اور ٹھنڈی ہوا کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کوچ میں جہاز کا انجن فٹ ہو جائے اور وہ اڑ کر اپنے گاؤں جا اترے، جہاں اس کی پیو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جو صرف اس کی لاڈلی بیوی ہی نہ تھی بلکہ اس کے باپ جیسے مشفق ماموں کی اکلوتی بیٹی بھی تھی اور سب باتوں کی ایک بات پیو اس کی بچپن کی محبت تھی۔ جس کی خاطر چن زیب نے خود کو مشکل میں ڈال کر اس کی ہر خواہش پوری کی تھی۔

آج چن زیب کو گاؤں کا کچا راستہ کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اس نے سوچا گاؤں کی گاڑی تو سواریاں

پوری کر کے چلے گی کیوں نہ میں کیری ڈبہ ہی بک کروالوں۔ جب ڈرائیور کچی سڑک پر کھڈے بچاتا ہوا آہستہ آہستہ گاڑی چلانے لگا تو چن زیب کو الجھن ہونے لگی۔ اس سے نہ رہا گیا وہ بول پڑا۔

”او یار! گاڑی کو کچھ نہیں ہوتا، تیز چلا آخر میں نے گاڑی بک کروائی ہے۔ اگر ایسے ہی ٹہلنا ہوتا تو میں پیدل نہ آجاتا۔“

”جی بابو جی! میں تو آپ کے نئے صاف ستھرے استری ہوئے کپڑوں کا خیال رکھ رہا تھا ورنہ تو دس منٹ کی بات ہے۔“ ڈرائیور نے گیئر بدلتے ہوئے کہا پھر تو گاڑی نظر ہی نہیں آتی تھی۔ ایک گرد کا اندھیرا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے پھر اس کا دل زور زور سے دھڑکا۔ وہ بھاگنے کے سے انداز میں تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چل پڑا۔

سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ چن زیب کو وہ دور کے منظر بھی صاف دکھائی دے رہے تھے جو کبھی دھندلے ہوا کرتے تھے۔ آج اسے جھاڑیوں سے نکلتی شوہڑیں (پرندہ) اور درختوں پر پھُر پھُراتی بلبلیں بہت بھلی معلوم ہوئیں۔ اس نے جیب سے چھوٹا آئینہ اور کنگھی نکالی، تھیلے نیچے رکھ کر بال ٹھیک کیے اور گھر کی طرف تیزی سے دوڑا، جوں ہی وہ پتھروں سے بنی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ گھر کے بیرے سے جڑے کھیت کے کنارے، حقے کی ساڑ پڑی ہے۔ وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے اس ویران جگہ بنے گھر کے پاس کوئی حقہ پیتا رہا ہوگا۔ اس کی خوشی غارت ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ جس طرح کسی نے یہ تمباکو جلایا ہے، وہ اپنی تمام امیدیں جلا کر راکھ کر دے لیکن اسے اپنی بچپن کی محبت پینو کی قربانیوں اور ماں کے خیال نے خاموش کروا دیا۔ اس نے دانتوں میں زبان دبا کر لہولہان کر لی، پر منہ سے کچھ نہ بولا اور دہلیز تک پہنچ گیا۔ جھاڑو دیتی پینو بھاگ کر آئی اور چن زیب کا اڑا ہوا رنگ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سلام کے بعد اس نے باتوں کی کوشش کی لیکن۔۔۔۔

بے بے جی کہاں ہیں اس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔ ماں باڑے سے بکری کھولتے کھولتے، بیٹے کی آواز سن کر اس سے ملنے بھاگی آئی۔ آج چن زیب کو ماں کی ممتا اور پینو کی محبت متاثر نہ کر سکی۔ ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے چن زیب سو گیا۔ شام کو اٹھا اور کوئی بات کیے بغیر واپس چلا گیا۔

اب تو اس کی زندگی اجڑ گئی تھی، اس کا دل کہیں نہیں لگتا تھا۔ وہ باقاعدگی سے ماموں فیض عالم کے پاس ماں اور پینو کا خرچہ بھجواتا رہا۔ کئی سال گزر گئے۔ وہ واپس نہ آیا۔ سارا گاؤں حیران تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ پینو مٹی کی طرح ذرہ ذرہ بکھرتی رہی۔ چن زیب کے لیے گھر واپس آنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا سمندر میں ڈوبی کشتی کو تن تنہا نکالنا، پھر زندگی کا ایک لمبا حصہ گزر گیا۔

محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ چن زیب کے مالک اس کی محنت سے بہت خوش تھے۔ اس کی ترقی ہوتی رہی اور اب وہ ترقی کر کے افسر بن گیا تھا۔

آج وہ بہت دنوں بعد سب سے پہلے فیکٹری پہنچا، اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا کیا دیکھتا ہے کہ زمین پر ایک لفافہ پڑا ہے۔ اس نے اٹھا کر دیکھا تو حیران ہوا کہ محمد عالم ماموں کا خط ہے۔ وہ تو شادی کے دن سے اس سے ناراض تھے ان کا خط کیسے آگیا۔ چمن زیب نے جلدی سے لفافہ کھولنے کے بجائے کونے سے پھاڑا تو ایک چھوٹے سے کاغذ پر چند سطور لکھی تھیں۔

چمن زیب!

مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تو نے اپنی آخرت کیوں خراب کر لی ہے۔ ارے کم بخت تیرا وہ ماموں جس نے تیرے لیے دنیا چھوڑ کر اپنی زندگی مشکل میں ڈالی۔ وہ تیرے لیے سسک سسک کر آج آخری سانس لے رہا ہے۔

چمن زیب!

یہ تیرا وہی ماموں ہے جس نے تیری غیر موجودگی میں تیرے گھر کی حفاظت کی ساری ساری رات جاگ کر تمبا کو کی گٹھیاں جلاتا رہا، پر تم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔

تیرا ماما

محمد عالم

☆☆☆☆

اپنے ہی خون سے لکھنی تھی حکایت مجھ کو

(فکشن)

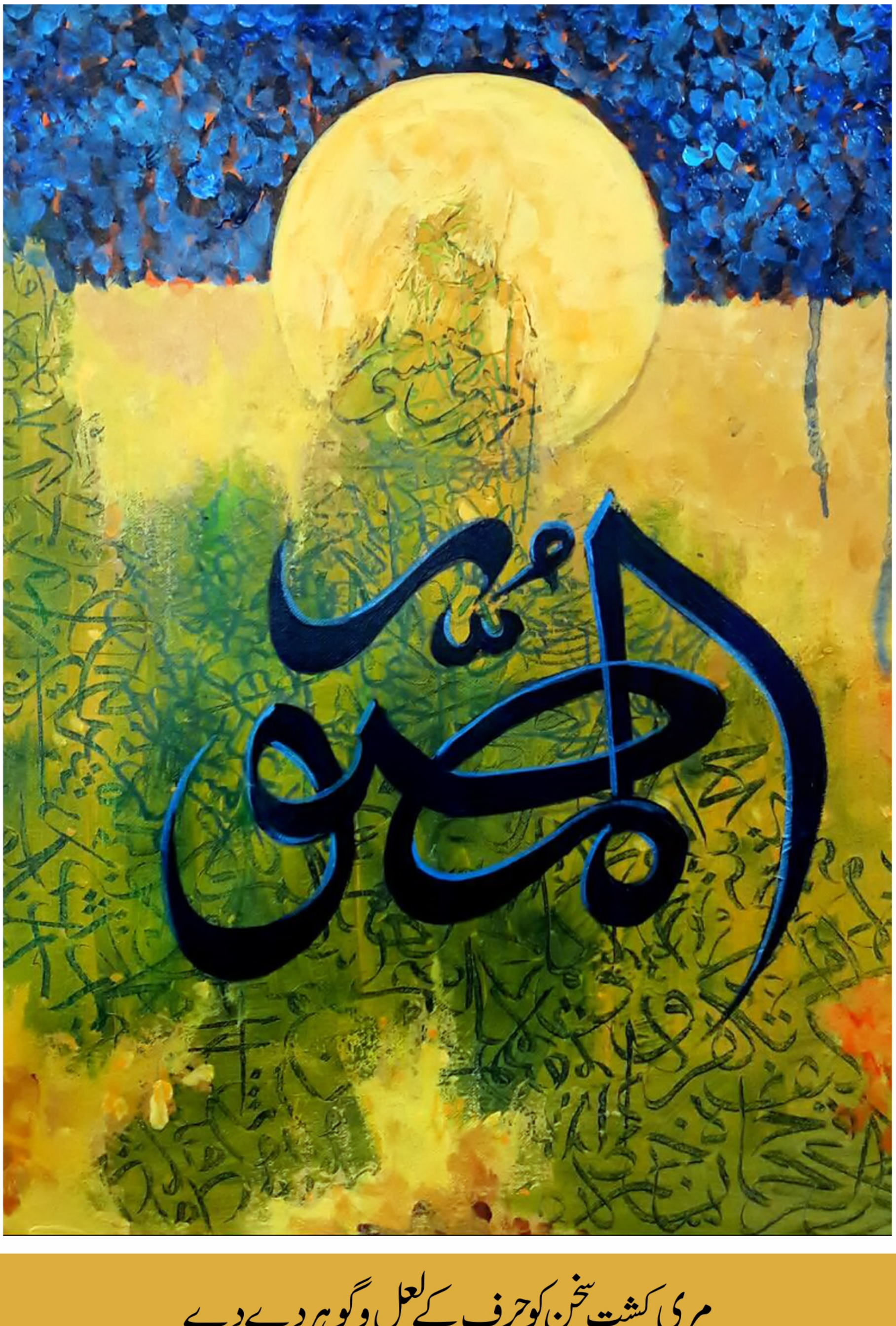

مری کشتِ سخن کو حرف کے لعل و گوہر دے دے

(عقیدت)

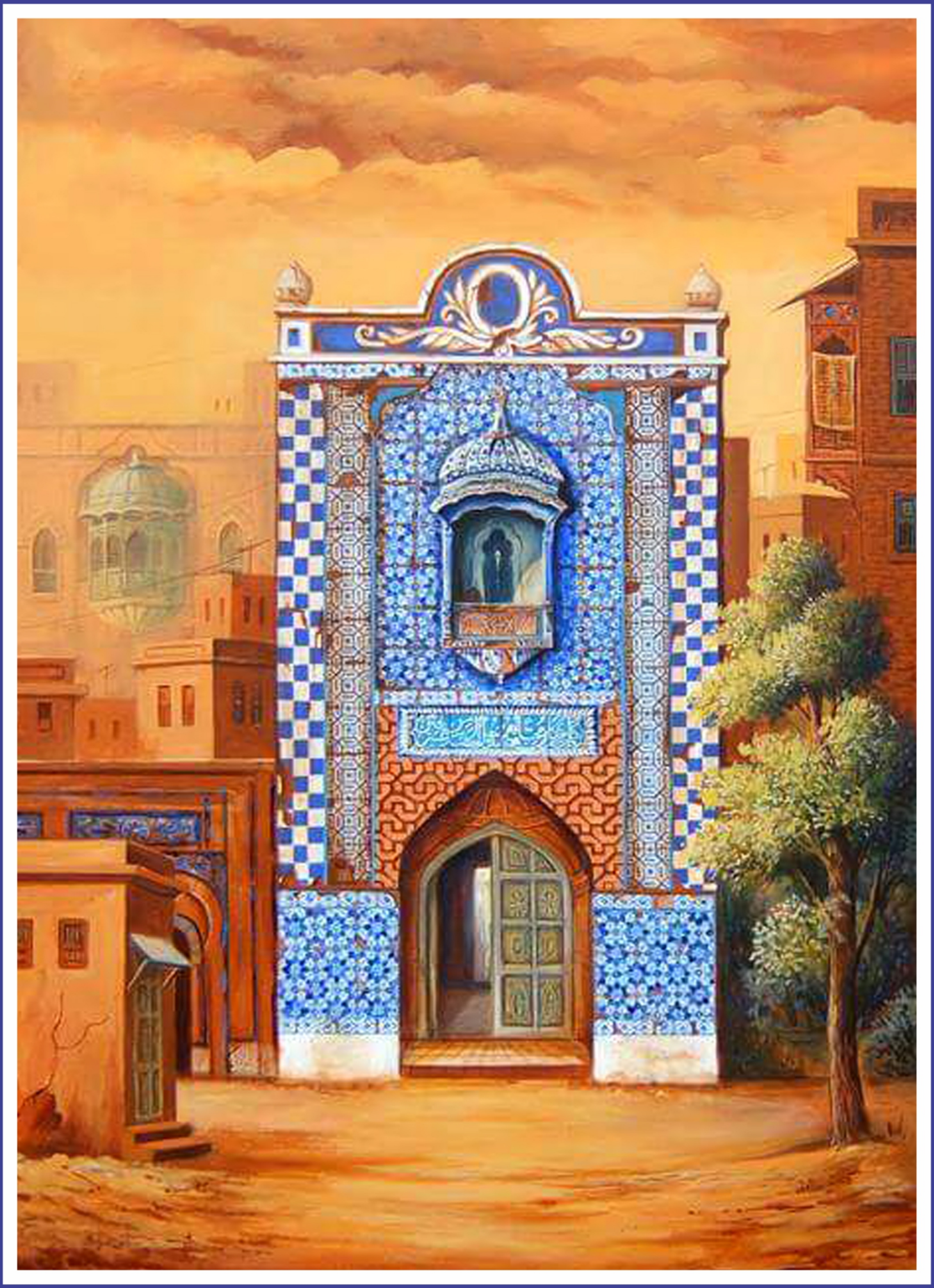

نظموں کی ابھی شال کا ریشم نہیں کاتا

(نظمیں)

مجھ کو کچھ یوں بھی خوش آیا ہے غزل کا پیکر

(غزلیں)

روشنی کی سطر کوئی لکھ رہا تھا سانس پر

(خصوصی گوشہ: نسلِ نو)

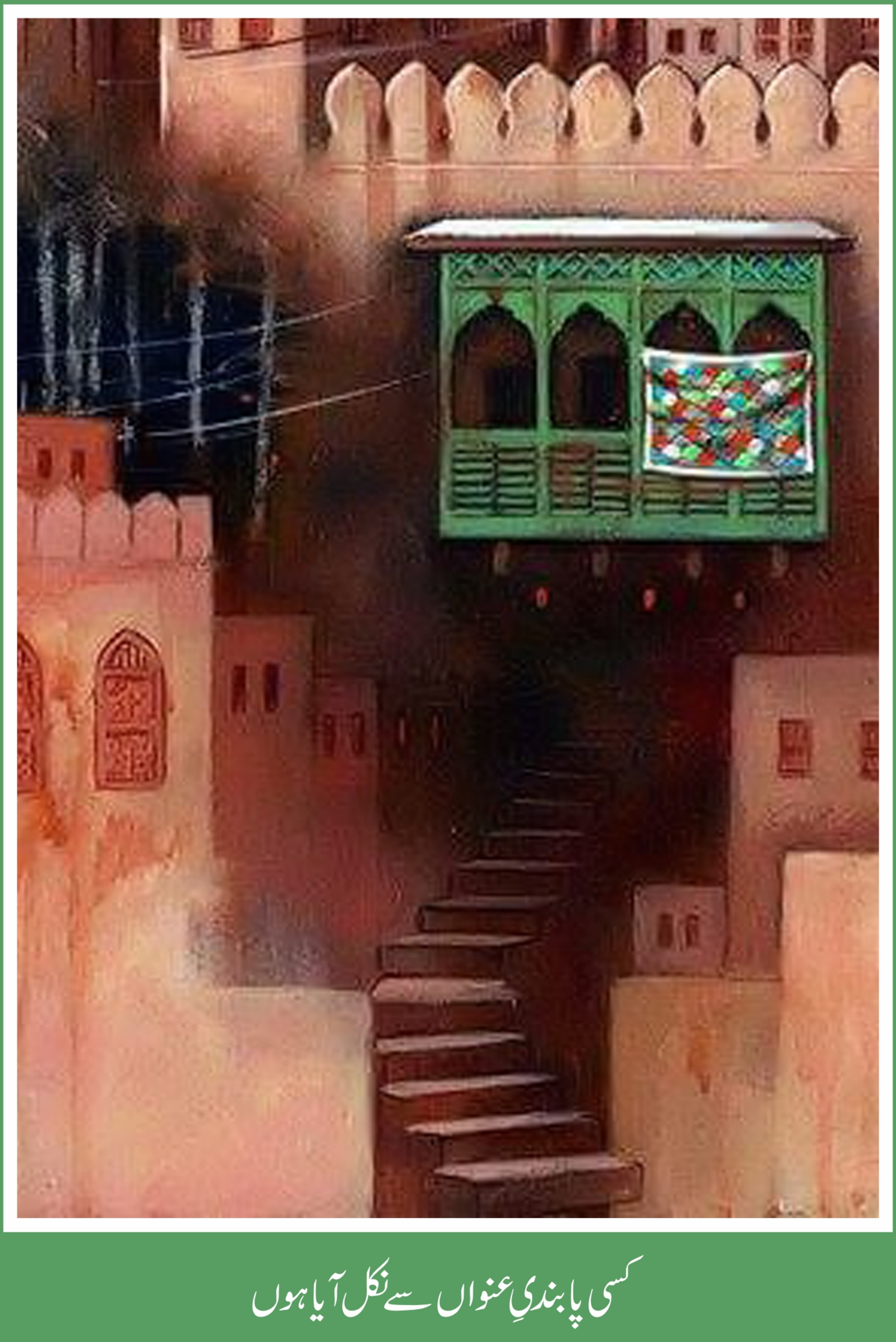

کسی پابندیِ عنواں سے نکل آیا ہوں

(رپورتاژ، مزاح)

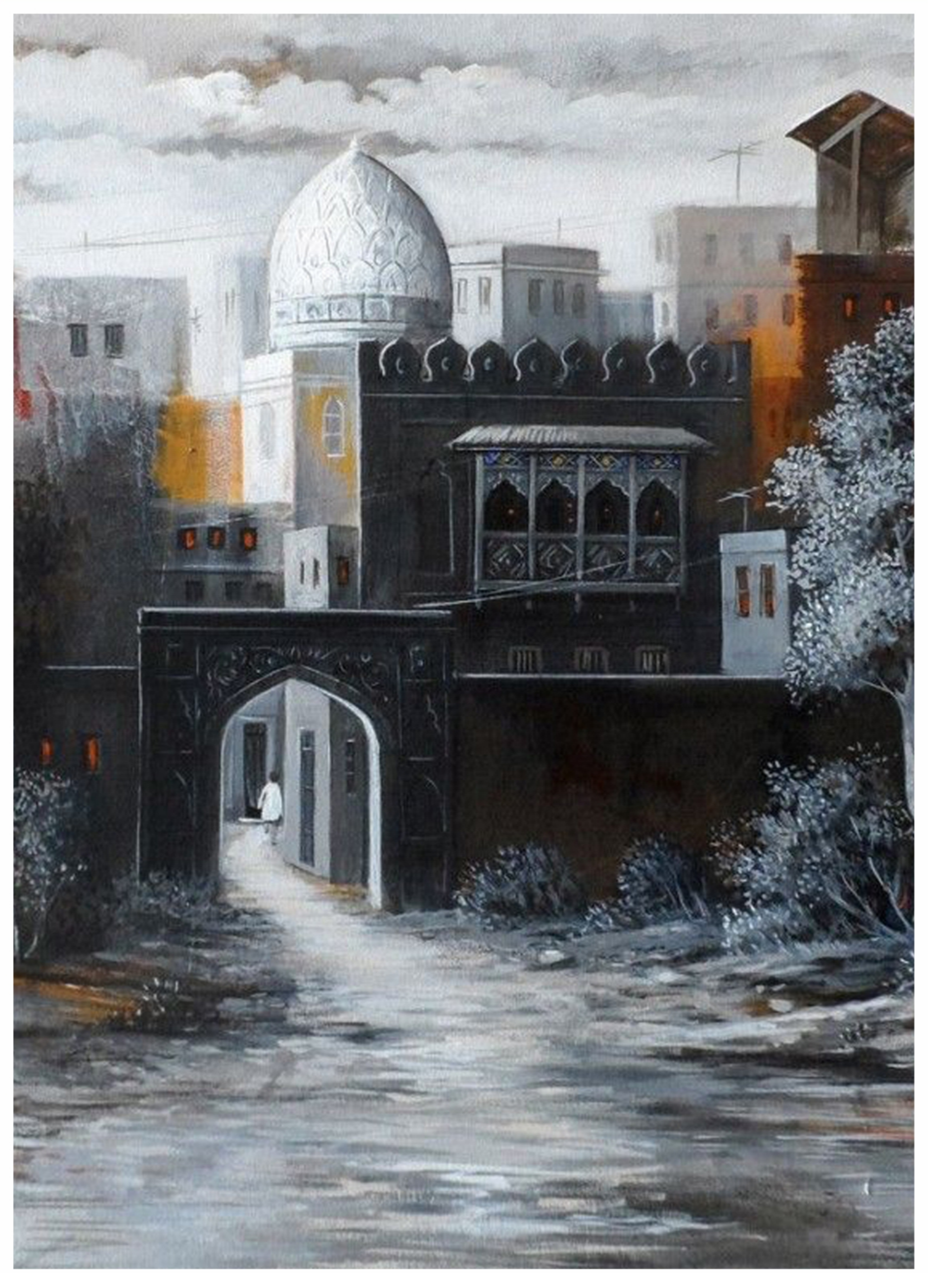

چراغ آنکھ کی سب بولیاں سمجھتے ہیں

(پاکستانی زبانوں کا ادب)

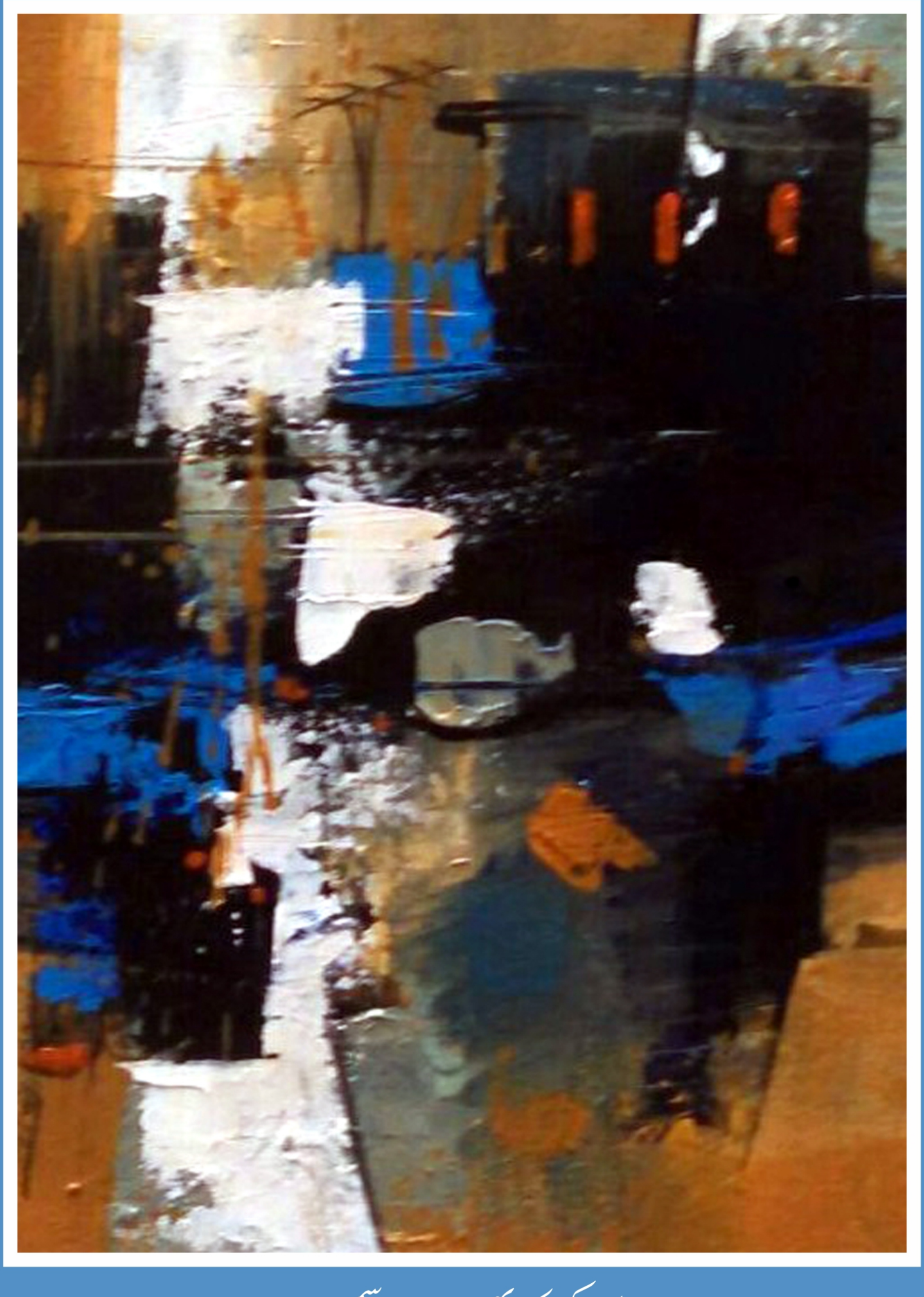

ہم اَن کہی کو ابھی درمیاں سمجھتے ہیں

(بین الاقوامی ادب)

اکادمی ادبیات پاکستان کے سہ ماہی جریدے سہ ماہی ادبیات کے دو خصوصی شمارے:

انتظار حسین نمبر اور عبداللہ حسین نمبر

زیر ترتیب ہیں۔

جن میں انتظار حسین اور عبداللہ حسین کے حوالے سے خصوصی مقالات، مضامین، شخصی خاکے اور یادداشتیں شائع کی جائیں گی۔ علاوہ ازیں شعرا کی جانب سے منظوم خراج تحسین بھی ان خصوصی شماروں کا حصہ بنایا جائے گا۔

ادبا، شعرا، محققین اور ناقدین سے گزارش ہے کہ ان خصوصی نمبروں کے حوالے سے اپنی نگارشات 31 مارچ 2017 تک ہمیں ارسال فرمائیں۔

برائے ترسیل نگارشات

اختر رضا سلیمی (مدیر)

اکادمی ادبیات پاکستان، پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ ایٹ ون، اسلام آباد
Phone: +92-51-9269714 **Fax:** +92 -51-9269719
E-mail: ar.saleemipal@gmail.com

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

October to December 2016

ISSN: 2077-0642

اکادمی ادبیات کی نئی مطبوعات

نئے لکھنے والوں کے لیے رہنما کتابیں
ٹی وی ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے
شعیب خالق
اکادمی ادبیات پاکستان

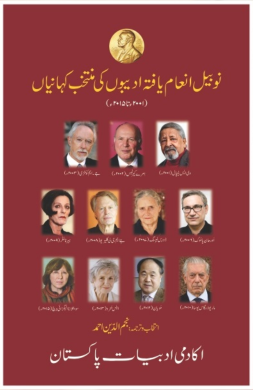
نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کی منتخب کہانیاں
(۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۵ء)
انتخاب و ترجمہ: نجم الدین احمد
اکادمی ادبیات پاکستان

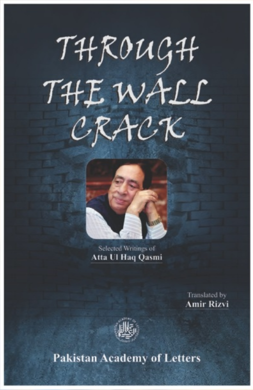
THROUGH THE WALL CRACK
Selected Writings of
Atta Ul Haq Qasmi
Translated by
Amir Rizvi
Pakistan Academy of Letters

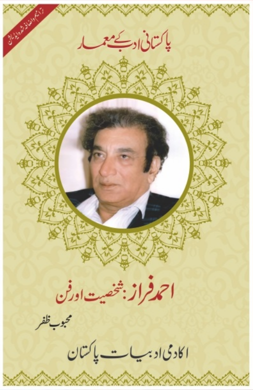
ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن
پاکستانی ادب کے معمار
احمد فراز: شخصیت اور فن
محبوب ظفر
اکادمی ادبیات پاکستان

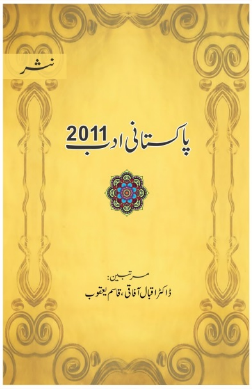
نثر
پاکستانی ادب 2011
مرتبین:
ڈاکٹر اقبال آفاقی، قاسم یعقوب

شاعری
پاکستانی ادب 2011
مرتبین:
آصف ثاقب، احمد حسین مجاہد

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: adabiyaat@pal.gov.pk